
ماہنامہ
فنون

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹ ٹیلی فون نمبر : ۲۱۵۵۶۳

مجلّہ

فنون

دھنوع

مدیر

احمد ندیم قاسمی

تزئین

مُوجد

شمارہ : ۳۰
جون، جولائی ۱۹۹۰ء

سالانہ چندہ
بذریعہ رجسٹری : ۱۵۰ روپے
غیر ممالک سے : ۳۰۰ روپے

قیمت موجودہ شمارہ : ۷۵ روپے

مقامِ اشاعت : ۶/۳۹ ملک چیمبرز، لوئر مال، لاہور

مندرجات

نظمیں

افسانے

غزلیں

تشخص

رپورتاژ

رفتید ولے نہ از دل ما

انشائیہ

غزلیں

اختلافات

غزلیں

تبصرے

سرورق : موحد

حرفِ اوّل

ندیم

ہمارے آج کے معاشرے کی طرح ہمارا آج کا ادب بھی انتشار کا شکار ہو رہا ہے۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی معیار تو بحمد اللہ سلامت ہیں مگر بعض اہلِ ادب نے دشنام و بہتان طرازی، تاریک اندیشی و بدخواہی کا جو ناپاک سلسلہ کم و بیش ربع صدی سے شروع کر رکھا ہے، وہ خود شعر و ادب کے معیاروں کو بھی اپنے غلیظ دھارے میں جکڑے چلا جا رہا ہے۔ جس طرح ہمارے معاشرے میں بد دیانتی اور فریب دہی، کُشت و خون اور مار دھاڑ کا سلسلہ چل رہا ہے، بعینہٖ ادبی سطح پر بھی بعض عناصر علم و ادب کی نقاب اوڑھے غیر علمی اور غیر ادبی سرگرمیوں میں ناک ناک تک ڈوبے ہوئے ہیں اور منافقت اپنی انتہا تک جا پہنچی ہے۔ ایک طرح سے یہ بھی "ماحولیات" کا مسئلہ ہے کہ شعر و فن کی صاف ستھری فضا میں یہ بدنصیب اور کوتاہ اندیش عناصر زہریلا گرد و غبار اڑا رہے ہیں اور بعض روزناموں کے ادبی صفحات کے علاوہ بعض بظاہر "ادبی" رسائل بھی اس منافقت اور عداوت کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور ستم یہ ہے کہ بیشتر اہلِ شعر و ادب جانتے بوجھتے ہوئے بھی ان عناصر کی ناپاک سرگرمیوں سے بے خبری کا اظہار کرتے ہیں اور شاید اس خوف کے تحت کہ کہیں ان کی غلاظت اچھالتی توپوں کا رخ ان کی طرف بھی نہ ہو جائے، ان عناصر کی ناموری اور شہرت کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔

اس دورِ ابتلا میں تنقید اور تنقیص کی حدِ فاصل کو منافقانہ رویوں سے مسمار کیا جا رہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان تنقیصی یاوہ گوئیوں کو مجموعوں کی صورت میں شائع بھی کیا جا رہا ہے اور ان کی رونمائیوں کی تقاریب بھی بلند بانگ انداز میں منعقد ہو رہی ہیں۔ اختلافِ رائے کی اہمیت و افادیت سے کسے انکار ہوگا، مگر اظہارِ اختلاف کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے اور صدیوں کی آزمائش کے بعد انسانوں کے ہاں جو تہذیب صورت پذیر ہوئی ہے، اس کے بھی چند تقاضے ہوتے ہیں، مگر اب تو تہذیب کی چھاتی پر چڑھ کر بدتہذیبی کی نمائش، تہذیب کے نام پر ہو جاتی ہے اور ایسے بھی یار لوگ ہیں جو ان بدتہذیبیوں کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ دراصل یہ کردار کی کمزوریاں ہیں جو کسی طرح بھی چھپائے نہیں چھپتیں اور ان کی بدصورتی پر سے ایک نہ ایک روز نقاب سرک جاتی ہے۔ ان عناصر کی رہنمائی کرنے والے اور ان کی دریدہ دہنیوں کے منصوبے تیار کرنے والے، عام محفلوں میں مرنجاں مرنج قسم کے "سادھو سنتوں" کے روپ میں سامنے آتے ہیں اور کچھ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ان کی بے خبری میں ہو رہا ہے ورنہ ان جیسے "درویشوں" کو ان زبان درازیوں سے کیا لینا! دراصل یہی وہ بگلا بھگت ہیں جنھیں اپنے احساسِ کمتری کو تھپکنے تھپکانے کا یہی بیہودہ طریق کار سوجھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شعر و ادب اور علم و فن کی دنیا کو اس آلودگی سے پاک کیا جائے اور نظریاتی اختلاف کو ذاتی عداوت بننے سے کیسے روکا جائے۔ اس سوال کا جواب خود اہلِ قلم کے پاس ہی ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح کے مسائل سیاست دانوں یا اربابِ اقتدار کے سامنے پیش نہیں کیے جاتے۔ اس مقصد کے لیے ذرا سی وسیع القلبی، تھوڑی سی بے تعصبی اور کسی حد تک علم و فن کے مجموعی مفاد کے احساس کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے ان دنوں بیشتر اہلِ قلم کے ہاں انہی کی کمی ہے۔ تاہم صورتِ حال اس قدر مایوس کن بھی نہیں ہے اور اصلاحِ احوال کی کوئی نہ کوئی سبیل یقیناً دریافت ہو سکتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ادب کے میدانِ کارزار میں اترے ہوئے عناصر کے منصوبہ ساز اپنے ضمیر کو بیدار کریں، اپنے اپنے "حامیوں" کے منہ میں لگام دیں اور انھیں بتائیں کہ تاریک اندیشی کے علاوہ ایک چیز روشن خیالی بھی ہوتی ہے اور شعر و ادب ہمیشہ روشن خیالی ہی کے ماحول میں پنپتے ہیں ____ بشرطیکہ ان عناصر کو اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کی بجائے شعر و ادب کا بحیثیت مجموعی اپنا کہیں زیادہ عزیز ہو۔

اگر نیت نیک ہو اور ارادہ سچ مچ کی اصلاح کا ہو تو ان خواتین و حضرات کو اُن خواتین و حضرات سے بھی خبردار رہنا چاہیے، جو جن لوگوں کی محفل میں بیٹھتے ہیں اُن کے سامنے اُنھی کے گن گاتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ انھی کے ہم خیال ہیں، حالانکہ وہ طرفین میں سے کسی کے ہم خیال نہیں ہوتے۔ وہ صرف اپنا اُلو سیدھا کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے لگائی بجھائی کا مشغلہ بھی شروع کر رکھا ہے اور وہ کوئی نیا فتنہ برپا کر کے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی منافقت کی کامیابی پر مسکراتے ہیں۔ ان لوگوں کو ادب کے مستقبل کی بجائے خود اپنا مستقبل عزیز ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ انتہا درجے کی بے ضمیری سے کام لینے سے بھی نہیں چوکتے۔

وفیات

گزشتہ پانچ سات ماہ کے دوران شعر و ادب، علم و فن اور سیاست و ثقافت کی بعض نہایت اہم شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔

دادا امیر حیدر بائیں بازو کی سیاست کی ایک پہاڑ شخصیت تھے، جن کی زندگی سرتاپا ایثار تھی۔ ساری عمر قید و بند کے عذاب جھیلے اور جب اربابِ حکومت انھیں جیل میں بھیجتے بھیجتے تھک گئے اور دادا کو سکون سے سانس لینے کا موقع ملا تو وہ نچلے نہیں بیٹھے بلکہ اپنے گاؤں میں اپنی ہی زمینوں پر ایک سکول کی عمارت تعمیر کرنے میں لگ گئے اور اس سلسلے میں عمر رسیدگی کے باوجود خود ہی پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے رہے۔ اگر بیسویں صدی کے سیاست دانوں میں ان کی کوئی مثال ڈھونڈی جائے تو درویشی اور بے لوثی کے معاملے میں صرف مولانا حسرت موہانی ہی یاد آتے ہیں۔

علامہ نصیر الاجتہادی ایک ہر دلعزیز شیعہ عالم دین تھے۔ اور شہزاد خلیل ٹی وی کے ایک مقبول اور کامیاب افسر اور پروڈیوسر تھے۔ یہ سب اسی عرصے میں رخصت ہوئے۔

سید انور اردو کے ایک نامور ترقی پسند افسانہ نگار اور ناول نویس تھے۔ نصف صدی تک انھوں نے اپنے بھرپور افسانوں سے اردو فکشن کو سیراب و شاداب کیا۔ ان کی شخصیت بھی ان کے ادب کی طرح بھرپور تھی۔ سمندر خاں سمندر پشتو کے ایک کامیاب شاعر اور اس زبان کے ایک جانے پہچانے براڈکاسٹر تھے۔ انجم اعظمی اردو ادب کے ان تخلیق کاروں کے گروہ میں شامل تھے جنھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد شاعری اور تنقید میں صاف ستھرے معیار قائم کیے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے سے ماہر لسانیات اور ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کے سے ماہر اقبالیات بھی اسی وقفے میں ہم سے چھن گئے۔ راسخ عرفانی شاعری میں اور اشرف صبوحی نثر میں اسلوب ساز کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان دونوں بزرگانِ ادب کی شخصیتیں بھی نہایت درجہ دلآویز تھیں اور وہ جہاں بیٹھتے تھے، محبت اور خلوص کی فضا قائم کر دیتے تھے۔

منصور قیصر ایک شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور وہ جہاں بھی جاتے تھے، ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے افسانہ نگاری اور کالم نویسی کے علاوہ طنز و مزاح کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑے۔ رفیق خاور اس علمی و ادبی خاندان کے رکن تھے جس نے ہمیں ڈاکٹر تصدق حسین خالد کا سا شاعر اور ڈاکٹر محمد صادق کا سا نقاد و محقق عطا کیا۔ رفیق خاور ان دونوں بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ مدت تک رسالہ "ماہ نو" کے مدیر رہے۔ اقبال کے فارسی کلام کے منظوم اردو تراجم کے سلسلے میں انھوں نے بڑی شہرت پائی۔

مسعود انور شفقی اور عبدالودود قمر کا شمار صوبہ سرحد کے ان شعرا میں ہوتا تھا جنھوں نے اردو شعر و ادب میں قیمتی اضافے کیے اور عمر بھر مختلف محفلیں سجائیں۔ یزدانی جالندھری نعت، غزل اور رباعی کے استاد مانے جاتے تھے۔ رحمٰن کیانی نے دینی اور وطنی موضوعات پر قطعی طور سے منفرد شاعری کی۔ ان کی نظموں میں دریا کی سی روانی ہوتی تھی۔ قمر تسکین کے ادبی مشاغل متنوع تھے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا مگر نام و نمود سے بے نیاز رہے۔ اقبال چوہدری نے بھی چند یادگار کہانیاں لکھیں۔ سندھی کے مشہور ادیب ولی محمد انصاری سندھی ہی کے صوفی شاعر علی گوہر شاد اور گجراتی زبان کے شاعر و ادیب نقی علی جی ربل نے بھی انھی دنوں وفات پائی۔ پاکستان کی فلموں میں سالہا سال تک اپنی آواز کا جادو جگانے والی مالا بھی رخصت ہو گئیں۔ ادارۂ "فنون" ان رفتگانِ گرامی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ معروف نعت گو اور قطعہ نگار سلیم تابانی کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

اس کی قدرت کا ہے حسیں منظر
چاند کا اپنی منزلوں میں سفر

اس سے روشن ہے چہرۂ خورشید
ہے جمال آفریں ہر ایک سحر

اس سے دریاؤں میں روانی ہے
موج موج اس کی ہے ستائش گر

وہی طوفان سے بچاتا ہے
وہی لاتا ہے ناؤ ساحل پر

وہ کھلاتا ہے پھول گلشن میں
وہ دکھاتا ہے خوشنما منظر

وہ سجاتا ہے ان کو رنگوں سے
کیا منقش ہیں تتلیوں کے پر

ذرے ذرے کو اس نے چمکایا
قطرۂ آب کو کیا گوہر

نور اس کا ہے سبزہ زاروں میں
کوہساروں میں ہے وہ جلوہ گر

اس کے جلوے جہاں میں بکھرے ہیں
اس کے ہی آئنے ہیں شام و سحر

تھامتا ہے وہی پرندوں کو
بند کرتے ہیں جب ہوا میں پر

ہر گھڑی ہے وہ ساتھ ساتھ مرے
ہر قدم پہ ہے وہ مرا رہبر

مجھ سے وہ ہمکلام رہتا ہے
ہے مرا قلب اس کی راہگزر

وہی خلاق ہے زمانے کا
اس کا شہکار ہے ہر ایک بشر

عالم الغیب ذات ہے اس کی
اس کو ہر اک کے حال کی ہے خبر

ہے وہ حاجت روا زمانے کا
سب کی ہے اس کے آستاں پہ نظر

اس کی عظمت ہے ماورائے خیال
ہر حسیں نقش اس کا ہے مظہر

اشکِ غم کی صدائیں سنتا ہے
ڈالتا ہے وہ دامنوں میں گہر

وہ سجھاتا ہے نت نئے مضموں
ہے عطا اس کی، فکر کا جوہر

میری باتوں میں اس کی خوشبو ہے
میرے اشعار میں ہے اس کا اثر

اس سے تابندہ ہیں مرے افکار
اس پہ قرباں مری متاعِ ہنر

اس کے در کا فقیر ہے حافظ
ہے شکستہ دلوں کا جو محور

سید مشکور حسین یاد

حمد

بات بات لامحدود، کل صفات لامحدود
تیری ذات کے صدقے میری ذات لامحدود

جزو کُل کی سب باتیں، رشتہ ہائے بے پایاں
جزئیات لامحدود، کلیات لامحدود

ہم حدیں لگاتے ہیں خود کو آزماتے ہیں
تو نے تو عطا کی ہے کائنات لامحدود

کیا ثبات کی حد ہے، کیا ثبات کی حد ہو
ہے ثبات کی حد میں بے ثبات لامحدود

تیرے حسن و خوبی کی انتہا نہیں، مولا!
ممکنات سے آگے، ممکنات لامحدود

ہم ہی کم اٹھاتے ہیں فیض خواب و کم خوابی
تو نے تو بنائے ہیں دن کہ رات لامحدود

چاہتا ہے جتنا بھی کوئی چاہنا، چاہے
سالکِ محبت کی ہے نجات لامحدود

تیرے باغِ ہستی کا ہم وہ نخل ہیں، جس کی
شاخ شاخ لامحدود، پات پات لامحدود

خواجہ رحمت اللہ جری

حمد

کیوں دوسروں کے پیر میں لوں، تیرے سامنے
گرنا ہی ہو تو کیوں نہ گروں، تیرے سامنے

میں جانتا ہوں مجھ میں ہیں کیا کیا خرابیاں
کیسے میں سر اٹھا کے چلوں، تیرے سامنے

شیطانی وسوسوں کا کبھی سامنا نہ ہو
تو میرے سامنے رہے میں تیرے سامنے

دیوار پر لکھا ہوا جب سب ہے صاف صاف
کیسے میں اس جبیں کو رکھوں تیرے سامنے

پھولوں کے پاس بھی ہوں میں خوشبو سے بے خبر
یعنی تجھے تلاش کروں تیرے سامنے

عبداللہ جاوید

حمد

ہر شے میں وہ
ہر شے اُس سے
پھر بھی وہ یکتا !

گیانی سے گیانی نے بھی
کب اُس کو دیکھا ؟

اُس کے گیان سے عاجز پا کر
میں نے دھیان کیا
اپنا گیان کیا

اپنا کوئی مثل نہ پا کر - سوچا
میں ہوں کیا ؟

کیا میں بھی یکتا ؟

میری یکتائی کے اندر
تھا ، وہ ہی دوجا !
پھر بھی وہ یکتا !

طیّب مُنیر

حمد

شام کے دھندلکوں میں
ادھ کھلے دریچوں میں
روشنی سی کھلتی ہے
روشنی سے آگے بھی
روشنی سی ملتی ہے

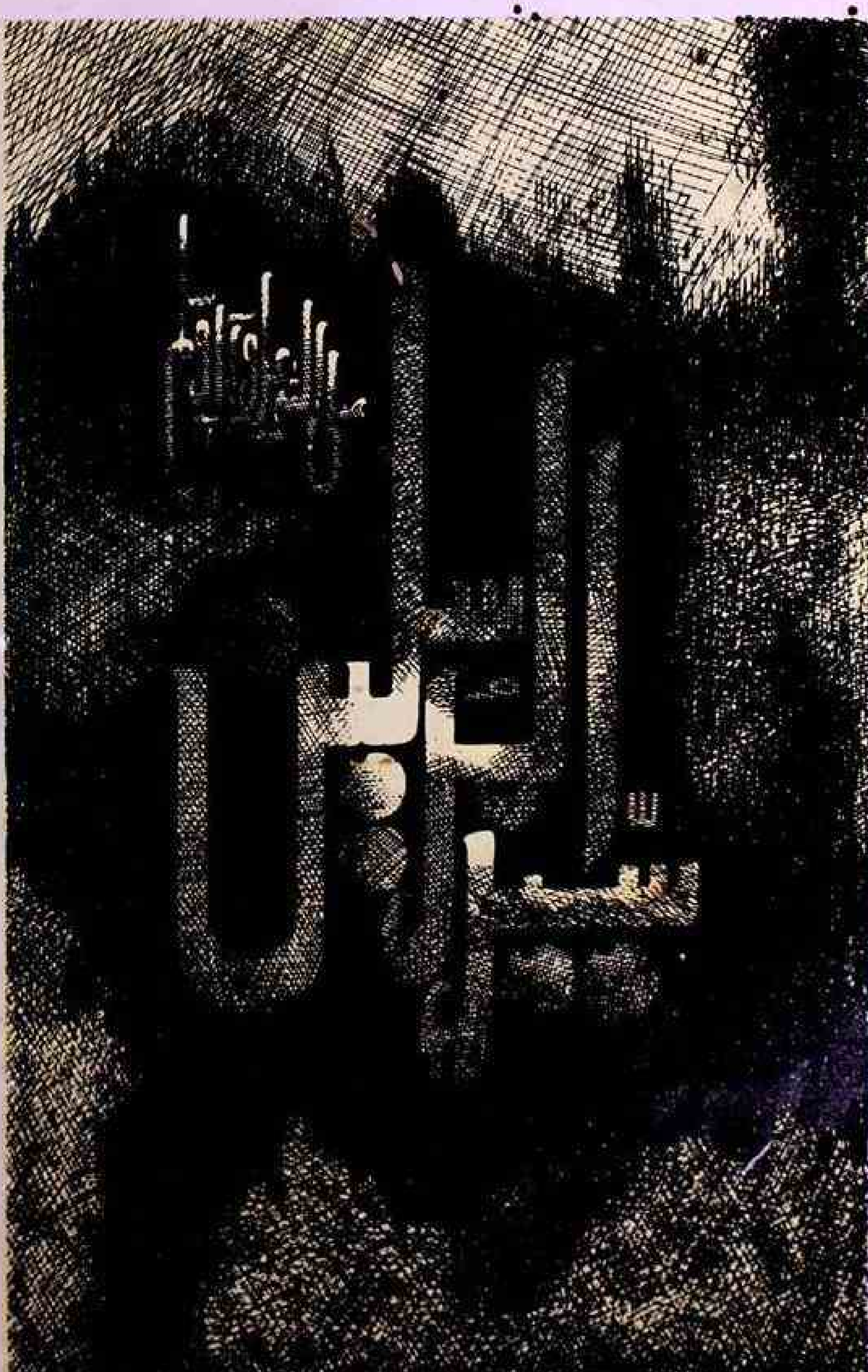
روشنی میں ڈوبے ہیں
بام و در تمام اُس کے
حُسن ہے سپہ اُس کی
معجزے غلام اُس کے
کائنات میں رقصاں
رنگ صبح و شام اُس کے

بے خبر نہیں ہے وہ
بے خبر سا لگتا ہے
بے یقین صورت میں
معتبر سا لگتا ہے
رنج سے رہائی کا
راستہ نہیں ملتا
مثلِ موج اٹھتی ہیں
دوریوں کی دیواریں

پھر بھی اِک یقیں سا ہے
دُور دُور رہ کر بھی
دل کے وہ قریں سا ہے



KHATTATEE BY MOOJID



KHATTATEE BY MOOJID

سید منیر

نعت

خدا کا شکر کہ عادت مجھے وفا کی ہے
مرے نصیب میں راحت تری ثنا کی ہے

نبیؐ کی نعت میں بھی حمد کبریا کی ہے
ثنا رسولؐ کی گویا ثنا خدا کی ہے

خدا کے ساتھ نبیؐ اور نبیؐ کے ساتھ شہید
یہ حسن و عشق کی ترتیب بھی خدا کی ہے

اُسے تو علم ہے، مقصد تری شفاعت تھی
ترے وسیلے سے کی ہے، اگر دعا کی ہے

نہ قہر ہے نہ غضب ہے نہ طیشِ جبر و سزا
یہ سروری تو کسی دردِ آشنا کی ہے

اُسی کے ساتھ نبوت کا اختتام ہوا
کہ جس نے ظلم سے لڑنے کی ابتدا کی ہے

حصولِ منزلِ اقرار، کمالِ کسبِ کلام
نبیؐ کے لب کو میسر وحی خدا کی ہے

منیرؔ نور کو رنگیں بنا دیا جس نے
وہ آل بھی تو اسی فخرِ انبیاءؐ کی ہے

امیر خسرو

ترجمہ: صبا اکبر آبادی

نعتیہ رباعیات

اے آنکہ شدہ طفلیت آدم پیدا
گشت از سببِ تو چرخِ اعظم پیدا
قدر تو نگنجید چو در یک عالم
بہر تو خدا، کرد دو عالم پیدا

صدقے میں ترے ہوئے تھے آدم پیدا
ہے تیرے سبب سے چرخِ اعظم پیدا
جب نور سمایا نہ ترا عالم میں
اس واسطے کر دیئے دو عالم پیدا

○

احمدؐ نامی کہ کانِ عالم زد بود
یکسوئے قبائش فلک نہ تو بود
بسیار چکید، قطرہ ہا از آدم
آن قطرہ کہ بحر گشت آخر او بود

اسم احمدؐ میں کتنے عالم گم تھے
دامن میں تمہارے ماہ تھے انجم تھے
فطرت کی جبیں سے لاکھ قطرے ٹپکے
وہ قطرہ جو بحر بن گیا وہ تم تھے

○

از عزِ محمدؐ ار نداری خبری
کن از رہ عقل در شہادت نظری
اللہ و محمدؐ ست پیوستہ بہم
یعنی کہ میانشان نگنجد دگری

واقف نہیں اعزازِ محمدؐ سے اگر
کر عقل و خرد سے اُنکے رُتبے پہ نظر
اللہ و محمدؐ تو ہیں اتنے نزدیک
ممکن نہیں بیچ میں کسی کا ہو گزر

○

اے باد کہ از کوئے وفا می آئی
آلودہ بہ بوئے آشنا می آئی
زانگو کہ نغز و جانفزا می آئی
من می دانم کہ از کجا می آئی

اے بادِ سحر کہاں سے تُو آئی ہے
کیا حسن کے بوستاں سے تُو آئی ہے
بہکی ہوئی چال، روح پرور انداز
معلوم ہوا جہاں سے تُو آئی ہے

صوفی عبد الرشید

نعت

اُنؐ پہ اُمّ و اَب میرے
جان و دل سے ہوں قربان
جن کے باب میں یارو
عائشہؓ کا ہے فرمان
کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن [1]

وہ کہ جن کی بعثت ہے
خالقِ دو عالم کا
ہم پہ اِک بڑا احسان [2]

اُن سے قبل ہی دیکھا
اور نہ بعد میں دیکھوں [3]
دہر میں مثیل اُن کا
پایۂ نبوت میں
کون ہے عدیل ان کا
خُلق ہے جمیل ان کا
نقش ہے جلیل ان کا

مجھ کو ان سے نسبت ہی
مایۂ شرف بس ہے
اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
دوستو، مری پہچان؟

وصف کے سبھی اسلوب
ہو گئے تمام اُنؐ پر
لاکھ ہو درود اُنؐ پر
لاکھ ہو سلام اُنؐ پر

---

[1] ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا معروف قول [2] آیۂ کریمہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْن

[3] لَمْ اَرَ قَبْلَہٗ وَلَا بَعْدَہٗ مِثْلَہٗ : شمائل ترمذی، روایت حضرت علیؓ

اقبال کوثر

نعت

کوئی ایک سطر نہ باب ہے
ترے نام پوری کتاب ہے

ترے در پہ جانا طلب مری
تجھے دیکھنا مرا خواب ہے

ہمہ کائنات سوال تھی
ترا انتخاب جواب ہے

(ق)

مرا مدّعا ، مرا منتہا
فقط آپ ہی کی جناب ہے

مری تشنگی کے لیے ندی
کوئی اور ہے، تو سراب ہے

• تری مدحِ پاک کے بحر میں
مری سعیِ فکر حباب ہے

غلام محمد قاصر

نعت

میں اپنی ہی تاریکی میں رستہ بھول گیا
تُو نے تو اُن کو دیکھا تھا اے سورج تُو ہی بتا

کیسے تھے وہ ہونٹ، وہ سچائی کا سرچشمہ
کیسی تھیں وہ آنکھیں جن میں کوئی غیر نہ تھا

کیسی تھیں وہ زُلفیں جن پر آیتیں اُتری تھیں
اپنوں بیگانوں پر جن کا یکساں تھا سایا

ذہن سے ذہن ملائے اُس نے دل سے جوڑے دل
کب کوئی دیوار اُٹھائی، کب بانٹے دریا

برف پگھلنا بھول چکی تھی، ہم غفلت میں رہے
اور پھر ہوتے ہوتے آگ نے جلنا چھوڑ دیا

آنکھیں ریگستان ہوئیں، مرجھانے لگے ضمیر
جن گلیوں سے روٹھ گئی طیبہ کی آب و ہوا

عبداللہ جاوید

نعت

سب سے پہلے دُنیا میں
'انجمادِ دولت' کو آپ نے بُرا جانا
'ارتکازِ دولت'' کی آپ نے نفی کر دی
آپ ہی نے طبقاتی تفرقوں سے نفرت کی
اور ذہنِ انساں کو
آدمی کے رُتبے کی آشنائیاں بخشیں

فرد، فرد لوگوں کو، بھائی بھائی ٹھہرا کر
جب 'کمیون' میں بدلا
اجتماعیاں سونپیں

آپ ہی نے محنت کو احترام سے دیکھا
'کسبِ زر' کے ذریعوں کو
چند خاص ہاتھوں کی
قید سے بری کر کے
وقفِ عام کر ڈالا

آدمی کو دکھلائی راہ کامرانی کی
ایسی زندگانی کی
جس کی منزلِ آخر ہے فلاحِ انسانی
اور اُخوتِ باہم
گام گام پر جس کی، کائنات کی تسخیر!

سعدیہ روشن صدیقی

نعت

اب نصیب جاگ اٹھا، خواب جیسا منظر ہے
جالیاں ہیں روضے کی، میرے آقا کا گھر ہے

جس ہوا میں مہکی تھی ان کے سانس کی خوشبو
اس کا ایک جھونکا بھی کیا حیات پرور ہے!

ریت کے یہ سب ذرے جن پہ وہ قدم گزرے
کتنے یہ معزز ہیں، جیسے تاج سر پر ہے

اب اندھیرا قسمت کا کیا مجھے ڈرائے گا
میں ہوں جس سے وابستہ، روشنی کا پیکر ہے

اس کا خلق قرآں ہے، بہترین انساں ہے
اسوۂ مکمل ہے، آخری پیمبر ہے

اپنے جیسے انساں پر شعر کب تلک کہتے
اب جو نعت لکھتا ہے بس وہی سخنور ہے

خوں میں جتنے قطرے ہیں سب حروف بن جائیں
سانس لینے کا مقصد صرف مدحِ سرور ہے

ضمیر اظہر

نعت

تجھ کو دیکھا ہی نہیں پھر بھی ہمیشہ دیکھوں
جس طرف دیکھوں تیرا جلوۂ زیبا دیکھوں

کارسازی میں ہے تو بعدِ خدا سب سے بڑا
نام لوں تیرا تو دریا میں بھی رستہ دیکھوں

ساتھ ہر حال میں رہتا ہے سہارا تیرا
قہر کی دھوپ میں بھی سر پہ میں سایہ دیکھوں

عزم کو تیری عنایت سے توانا پاؤں
ڈوبتی کشتی میں جب دور کنارا دیکھوں

اب کوئی غم ہے تو بس ایک ہی غم ہے اظہر
بن کے دیوانہ شب و روز مدینہ دیکھوں

غفار بابر

نعت

میں نے اُس ذات پہ لکھنے کی جسارت کی ہے
جس کے دامن پہ فرشتوں نے عبادت کی ہے

جس نے ہم خاک نشینوں کو فلک بوس کیا
جس نے بونوں کو عطا خلعتِ قامت کی ہے

کس کی جرأت میرے آقا کے برابر آئے
میرے آقا نے تو نبیوں کی امامت کی ہے

اللہ اللہ وہ کیا لوگ تھے جن لوگوں نے
چلتے پھرتے مرے آقا کی زیارت کی ہے

میں کہ اک ذرہ ہوں، خورشید بکف ہوں بابر
مجھ پہ اُس ذاتِ گرامی نے عنایت کی ہے

توقیر چغتائی

شبیر افضل جعفری کے لیے

سادھو بچھڑا
کُٹیا روئی
شام ڈھلے

میلہ اُجڑا
دُنیا روئی
شام ڈھلے

مانجھی ہارا
بپھرا دریا جیت گیا
ٹوٹی پھوٹی نیّا روئی
شام ڈھلے

پُستک کے سب پنّے
آندھی لے بھاگی
لہولہان کویتا روئی
شام ڈھلے

بکھرے سارے راگ
مُرلیا کے مُنہ سے
بن میں زخمی پُروا روئی
شام ڈھلے

رُوٹھا رانجھا
تخت ہزارے نوٹ گیا
ہیر کی خالی بگیا روئی۔
شام ڈھلے

ثاقب عرفانی

برادرِ بزرگ و شفیق مولانا راسخ عرفانی کی وفات پر

چاند غمگیں، ستارے چُپ چُپ سے
پھول رُت کے نظارے چُپ چُپ سے

کیا قیامت گزر گئی ہو گی
لوگ بیٹھے ہیں سارے چُپ چُپ سے

شہرِ علم و ادب ہے افسردہ
حرف، نقطے، اشارے چُپ چُپ سے

بحرِ شعر و سخن کی جولانی
موج، دریا، کنارے چُپ چُپ سے

مرگِ راسخ کا سانحہ لکھوں
لفظ گنگ، استعارے چُپ چُپ سے

زخم گہرا ہے اس قدر ثاقب
چارہ گر ہیں بچارے چُپ چُپ سے

موج فرازی

○

جو شہر میں ہوتا ہے وہ چرچا بھی تو دیکھوں
ٹوٹا جو نہ پتھر سے وہ شیشہ بھی تو دیکھوں

یہ کیا کہ خوشامد ہی کروں شوخ ہوا کی
آندھی میں چراغوں کا تماشا بھی تو دیکھوں

کیوں مجھ کو لیے جاتے ہیں بستی سے الگ لوگ
جلتے ہوئے گھر کا میں اُجالا بھی تو دیکھوں

سیلاب میں کس کس کو بہا لایا تھا ہمراہ
اب کیا ہے، وہ اترا ہوا دریا بھی تو دیکھوں

آنے سے ترے سب در و دیوار ہیں روشن
کیا رات ہے! اس رات کا چہرہ بھی تو دیکھوں

دنیا کو بہت دیکھ لیا موج فرازی
قاتل جو ہے میرا وہ شناسا بھی تو دیکھوں

(بریڈفورڈ۔ انگلستان)

راسخ عرفانی

○

یہ کس مقام پہ لایا ہے راہبر میرا
نہیں پتا کہ کہاں تھا کبھی نگر میرا

میں اگلے موڑ پہ تجھ سے بچھڑنے والا ہوں
یہ چند گام غنیمت سمجھ سفر میرا

پرائے دیس میں جا کر بھی آزما دیکھا
کسی بھی کام نہ آیا کوئی ہنر میرا

میں اس کے چہرے سے پڑھتا ہوں اپنی نبضوں کو
بڑا اداس سا رہتا ہے چارہ گر میرا

ڈھلے ہیں سائے تو کھٹکا لگا ہوا ہے مجھے
بچھڑ نہ جائے کہیں مجھ سے ہمسفر میرا

تھمی ہیں بارشیں، اترا ہے سیل غم راسخ
گھرا ہوا ہے ابھی پانیوں میں گھر میرا

بات سے بات

محمد ارشاد

اقبالؔ اور رومیؔ کا تعلق اقبالؔ پر لکھنے والوں کے لئے ہمیشہ الجھن اور پریشانی کا باعث رہا ہے۔ اقبال مرید تھا اور رومی پیر۔ اقبال نے قدم قدم پر رومی سے اکتسابِ فیض کا اقرار کیا ہے۔ اقبال وحدۃ الوجود کے عقیدے کو رد بھی کرتا ہے اور رومی کی پیروی کا دم بھی بھرتا ہے۔ اقبال کا یہ رویہ ہمیں واقعی عجیب نظر آتا ہے جبکہ ہمیں اپنے طور پر یہ یقین ہے کہ رومی وحدۃ الوجود کے عظیم ترین شارحین میں سے ایک تھے۔ اسی لئے بعض فضلا نے رومیؔ اور اقبالؔ میں تطبیق کی صورت یہ نکالی کہ اقبالؔ کو بھی وحدۃ الوجودی ثابت کر دیا۔ اقبال کے بارے میں یہ رویہ بظاہر نہایت معقول ہے۔ اس رویے کے حامل افراد کا کہنا ہے کہ اقبالؔ شروع شروع میں وحدۃ الوجود کا پرچارک تھا، بعد میں اس کی تکذیب کی لیکن یہ دور عارضی ثابت ہوا اور جلد ہی وہ وحدۃ الوجود کا دوبارہ پرچارک ہو گیا۔ پروفیسر علی عباس جلالپوری اس موقف کے حامل افراد کے سرخیل ہیں۔

اگر ہم اس موقف کو درست تسلیم کریں تو ہمیں ایک ایسی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے جسے سلجھائے بغیر ہم اس موقف کی صحت پر اصرار نہیں کر سکتے۔ اقبالؔ از اول تا آخر خودی کی حقانیت (REALITY) کا قائل رہا ہے۔ وحدۃ الوجود میں خودی کے لئے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وحدۃ الوجودی صوفیا اثباتِ خودی کو گمراہی اور نفیِ خودی کو صحیح موقف خیال کرتے ہیں۔ وحدۃ الوجود اور اثباتِ خودی اجتماع بین الضدین ہے اور یہ محال ہے۔ کسی وحدۃ الوجودی صوفی کا شعر ہے:

خودی کفر است نفیِ خویش کن زود　　　　که جز حق درحقیقت نیست موجود

اور اقبالؔ کے نزدیک خودی ایک حقیقت ہے اور اس کی نفی گمراہی اور اثبات اصل ایمان ہے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے ایک ایسے رومیؔ کو پڑھا ہے جس کی مثنوی پر وحدۃ الوجود کی چھاپ اُسے کہیں نظر نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ الاکبر محی الدین ابن عربیؒ سے اپنا معاملہ کسی موقعے پر بھی طے کرتا دکھائی نہیں دیتا اور رومیؒ کا دامن کسی ایک لمحے بھی چھوڑتا نظر نہیں آتا۔ کم از کم اس دور میں جو ہمیشہ طور پر وحدۃ الوجود سے اقبالؔ کے انحراف کا دور بتایا جاتا ہے، اقبالؔ کو رومیؒ سے اسی طرح بیزاری کا اظہار کرنا چاہیئے تھا جس طرح کی بیزاری کا اظہار اس نے ابن عربیؒ سے کیا ہے۔ رومیؒ کسی دور میں بھی غیر معروف ہستی نہیں رہا اور نہ بے اثر رہا ہے۔ اقبالؔ کے بارے میں ہمارے مذکورہ رویّے میں خرابی اس لئے پیدا ہو رہی ہے کہ ہم رومیؒ کے بارے میں اپنے اس نقطہ نظر کو کہ وہ وحدۃ الوجودی تھا، اقبالؔ کا نقطۂ نظر بھی سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ اقبال کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ آیا رومیؒ کے افکار کی وہ تشریح درست ہے جو اقبالؔ نے کی ہے یا وہ جس سے ہم متعارف رہے ہیں، ایک ایسی بحث ہے جس کی ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس موقعے پر ہماری دلچسپی کا سامان جس بات سے فراہم ہوتا ہے یہ ہے کہ اقبال وحدۃ الوجود کو اندیشۂ عجم قرار دیتا ہے دراں حالیکہ ابن عربیؒ نسلاً اور وطناً عرب تھے جبکہ رومی کا تعلق عجم سے تھا۔

رومیؒ کے بارے میں اقبالؔ کا موقف حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیئے۔ رومیؒ کی مثنوی بڑی تہہ دار ہے۔ رومیؒ کو جتنی آسانی سے وحدۃ الوجودی ثابت کیا جا سکتا ہے اتنی ہی آسانی سے اسے وحدۃ الشہودی بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ وحدۃ الشہود بہرحال اس وحدۃ الشہود سے مختلف ہے جس کے قائل شیخ احمد سرہندیؒ اور ان سے پہلے ہندوستان میں اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور ایران میں ان کے شیخ علاؤ الدولہ سمنانیؒ رہے ہیں رومیؒ انسانی خودیوں کی حقیقت کے قائل ثابت کئے جا سکتے ہیں اور اسی بنا پر وہ اقبالؔ کے مرشد بھی ٹھہرے ہیں

رومیؒ کے بارے میں اقبالؔ کا موقف جو رہا ہے سو رہا ہے، حلاجؔ کے بارے میں اس کا رویہ یقیناً پُر اسرار رہا ہے۔ حلاج کو اس نے رد بھی کیا ہے اور قبول بھی کیا ہے۔ حلاج وحدۃ الوجودی تو یقیناً نہیں تھا کہ وحدۃ الوجود خدا اور کائنات کے باہمی تعلق کی ایک خاص تعبیر ہے اور مسلم تصوف میں اس کا اظہار چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں ہونا شروع ہوتا ہے۔ حلاج تیسری صدی ہجری کا آدمی تھا۔ حلاج کا دعویٰ انا الحق صرف اپنے بارے میں تھا۔ بہرحال اسے رومیؒ اور ابن عربیؒ دونوں کے نزدیک انتہائی اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی وجوہ موجود ہیں۔ ابتدا میں حلاج کے دعویٰ انا الحق کو اقبالؔ نے اس بنا پر رد کر دیا تھا کہ یہ وحدۃ الوجود کی طرف پہلا قدم تھا لیکن بعد میں اس دعویٰ کو قبول کر لیا مگر اپنی شرائط پر۔ لیکن اقبال کی شرائط عجیب نہیں ہیں۔ اقبالؔ نے انا الحق کو خودی کے اثبات پر محمول کیا۔ میں حق ہوں یعنی میری خودی یا انا حق ہے۔

حسین بن منصور حلاج کے نزدیک ابلیس قابل رشک شخصیت کا مالک ہے۔ جبکہ علماء کے نزدیک حلاج اور ابلیس دونوں قابل نفرین ہیں۔ کچھ بھی ہو، ابلیس بہرحال صوفیاء اور علماء دونوں کے لئے باعث حیرت اور تعجب انگیز ہستی ہے۔ وہ ہمہ موجود اور بے پناہ قدرت کا مالک ہے اور شاعروں، فلسفیوں، مفسروں، محدثوں، فقیہوں، واعظوں کو باآسانی بہکا لیتا ہے۔ حتیٰ کہ جنت میں آدم اور حوا تک کو بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔ شاعروں، فلسفیوں، مفسروں، محدثوں، صوفیوں، عالموں، زاہدوں اور فقیہوں کو جس جس طرح اس نے اپنے دام تلبیس میں پھنسایا ہے اس کی مکمل روداد حافظ ابو الفرج، علامہ ابن جوزی نے اپنی ایک کتاب "تلبیس ابلیس" میں لکھ دی ہے، جو واقعی عالمانہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

لیکن زیادہ دلچسپ مفسرین کی وہ تحقیقات ہیں، جو انھوں نے ابلیس کے گھریلو معاملات و حالات کے بارے میں کی ہیں۔ سورہ کہف کی اڑتالیسویں اور انچاسویں آیات میں ابلیس اور اولاد ابلیس کا ذکر آیا ہے اور ان کی دوستی سے منع کیا گیا ہے کہ ان سے دوستی زیان و ذلت و عقوبت کا باعث ہے۔ اولاد کے ذکر پر بعض مفسرین کو ابلیس کی بیوی کا خیال آنا لازمی تھا جو آیا۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ ابلیس کی اولاد اس کی بیوی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اس طرح کے توالد اولاد کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ اُن کی تحقیق کے مطابق ابلیس کی بیوی پرندوں کی طرح انڈے دیتی ہے اور ابلیس کے بچے انہی انڈوں سے نکلتے ہیں۔ یہ خیال انہیں اس لئے پیدا ہوا کہ ابلیس اور اولاد ابلیس سرعت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں، پہاڑ اور دریا ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے اور ایسا پروں کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا وہ پرندہ قسم کی مخلوق ہیں۔ اُن مفسرین نے جو توالد از بطن کے قائل ہیں، ابلیس کے نو بیٹوں کے نام بھی معلوم کر لئے ہیں۔ پہلے لڑکے کا نام لاقیس، دوسرے کا والہان، تیسرے کا الغاف، چوتھے کا مرہ، پانچویں کا زلن بور، چھٹے کا بتر، ساتویں کا اعور، آٹھویں کا مسطوس اور نویں کا داسم ہے۔ ان نو لڑکوں نے اولاد آدم کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے حلقے کے امور کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ابلیس کی بیوی کا نام البتہ کوئی معلوم نہ کر سکا۔ دوسرے مفسرین اولاد ابلیس کی تعداد کو نو تک محدود نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں آدم کے ہر بیٹے کے لئے ابلیس کا ایک بیٹا موجود ہے، جو آدم کے بیٹے کے ساتھ اس کی زندگی بھر لگا رہتا ہے اور اسے مرنے تک نہیں چھوڑتا۔

ملا صدرا کے استاد شیخ بہائی آملی کا کہنا تھا کہ شیطان نفس امارہ کا دوسرا نام ہے اور نفس امارہ کے تمایلات ہی اولاد ابلیس ہیں۔ معلوم نہیں شیخ بہائی آملی اس تنقیح کا کیا جواب دیتے کہ ابلیس تو تخلیق آدم سے پہلے سے موجود تھا۔ اگر ابلیس نفس امارہ کا نام ہے تو نفس ا...

اس سے پہلے کیونکر وجود میں آگیا جس کا یہ نفس امارہ ہے۔ حسین بن منصور حلاج کی طرح شیخ بہاءالدین بہائی آملی بھی ہندوستان آئے تھے۔ یہاں ان کی ملاقات بقول صاحب "دبستان مذاہب" آذر کیوان (۱۰۲۷ھ،۲۳ء۔۶۷۶ء) سے ہوئی اور یہ آذر کیوان کے پیرو ہو گئے تھے۔ آذر کیوان پارسی تھے۔ ملا صدرا کے دوسرے استاد میر ابوالقاسم فندرسکی بھی آذر کیوان کے عقیدت مند تھے، جانوروں سے بیرحمی سے متنفر تھے۔ حج اس لئے نہیں کیا کہ قربانی دینی پڑتی تھی۔

حسن بن منصور حلاج کے نزدیک بہرحال ابلیس آدم کے نفس امارہ کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ تابندہ ہستی کا نام ہے۔ "طاسین الازل والالتباس" میں حلاج نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ وَمَا كَانَ فِي أَهْلِ السَّمَاءِ مُوَحِّدٌ مِثْلُ إِبْلِيسَ یعنی آسمان والوں میں ابلیس جیسا موحد اور کوئی نہیں اپنے دعووں میں سوائے ابلیس اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا نہیں (ما صحت الدعاوی للاحد الا ابلیس واحمد صلی اللہ علیہ وسلم) ابلیس کو حکم ہوا سجدہ کر (اُسْجُدْ) اور احمدؐ کو حکم ہوا کہ دیکھ (اُنْظُرْ)۔ نہ ابلیس نے سجدہ کیا اور نہ احمدؐ نے دیکھا یعنی دائیں بائیں التفات نہیں کیا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى نہ نگاہ (دائیں) بھٹکی اور نہ حد سے (بائیں) بڑھی۔ آپ نے ماسوا اللہ کی طرف التفات نہیں کیا بلکہ استقامت لقیام کئے رہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابلیس مقام عین سے گر پڑا اور احمدؐ پر عین العین مکشوف ہو گیا۔ ابلیس نے دعویٰ تو کیا لیکن اپنے حول کی طرف رجوع نہیں کیا اور احمدؐ نے اپنے حول سے رجعت اختیار کی۔ چنانچہ فرمایا بک احول وبک اصول تجھی سے پلٹتا ہوں اور تجھی سے اصل پر قائم رہتا ہوں۔

ابلیس مقام تجرید پر جب تک تھا، عبادت گزار رہا لیکن مقام تفرید پر ملعون ہوا۔ جب اسے سجدے کا حکم ہوا تو وہ مقام تفرید پر تھا۔ اس کا رویہ مقام تفرید (فردانیت، خودی) کے تقاضے کے مطابق تھا پس جب اس سے کہا گیا کہ اُسْجُدْ (سجدہ کر) تو کہا لا غیر اور جب کہا گیا کہ وان علیک لعنتی الی یوم الدین (بے شک میری لعنت تجھ پر تا قیامت رہے گی) تو کہا لا غیر۔ میں تیرے سوا کسی کو نہیں چاہتا اور محبت کرنے والا ذلت ہی پاتا ہے۔ میں تیرے غیر کو کیسے سجدہ کروں، اسے سجدہ کرنا اپنی اصل کو چھوڑ دینا ہے۔ خلقتنی من نار میری اصل آگ ہے۔ میں اصل سے کیسے رجوع کروں۔ میرے لئے من النار نہ ہونا ممکن ہے ہی نہیں۔ نار اپنی اصلیت سے نہیں ہٹ سکتی۔ یہی میری تقدیر ہے اور یہی تیری مشیت ہے اپنی اصلیت سے نہ ہٹ سکنا ہٹ دھرمی نہیں ہے، یہ تقاضائے مشیت ہے۔

جحودی فیک تقدیس
وعقلی فیک تھویس

میرا انکار ہی تیری تقدیس ہے، اور میری عقل کو تیری ہوس ہے۔

کوہ طور کی ایک گھاٹی پر حضرت موسیٰؑ اور ابلیس کی ملاقات ہوئی۔ موسیٰؑ نے پوچھا، اے ابلیس تجھے کس بات نے سجدہ کرنے سے منع کیا تھا تو جواب دیا کہ اس دعوے نے کہ معبود ایک ہی ہے۔ اور اگر میں سجدہ کرتا تو تیری طرح ہوتا۔ تجھے ایک ہی بار کہا گیا کہ اُنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ (پہاڑ کی طرف دیکھ) اور تو دیکھنے لگا۔ اور مجھے ہزار بار کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کر لیکن میں نے بمنائے دعویٰ (معبود ایک ہی ہے) سجدہ نہیں کیا۔ موسیٰؑ نے کہا، تو نے حکم کو ترک کیا تو جواب دیا کہ وہ حکم نہیں تھا آزمائش تھی۔ موسیٰؑ نے کہا، لاجرم تیری صورت متغیر ہو گئی تو جواب دیا کہ یہ محض ایک پندار ہے۔ تو میرے حال کی بات کر رہا ہے تو حال نام ہی تحول کا ہے لیکن معرفت صحیح تحول و تغیر سے بری ہے۔ موسیٰؑ نے پوچھا کیا اب تو اسے یاد کرتا ہے، تو کہا، اے موسیٰؑ یہ فکر کا مقام ہے ذکر کا نہیں ہے۔ میں بھی مذکور رہوں اور وہ بھی مذکور رہے۔ اس کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر اس کا ذکر ہے...... اگر وہ مجھے ابد تک عذاب جہنم میں مبتلا رکھے تو بھی میں غیر اللہ کو سجدہ نہیں کروں گا اور نہ کسی شخص و جسد کے آگے جھک کر اپنے آپ کو ذلیل کروں گا۔ میں نہ تو اس کی ضد کو جانتا ہوں اور نہ ولد (بیٹے) کو۔ میرا دعویٰ سچوں کا دعویٰ ہے اور میں ان محبت کرنے والوں میں ہوں جو سچے ہیں۔

موسیٰؑ اور ابلیس کی ملاقات کو نظامی گنجوی نے، جو نہ صرف فارسی کے عظیم ترین شاعر تھے بلکہ عرفان و تصوف میں بھی بلند تر مقام پر فائز تھے، ایک قطعے میں بیان کیا ہے:

روزے بگرم رفتن گاہاں پیادہ ای ‏ ‏ ابلیس پیش آمد موسیٰ کلیم را
مانند زاہدے کہ رود سوئے صومعہ ‏ ‏ بر سر سجادہ کردہ مرقع گلیم را
گفتش نصیحتے کز اغیار بوالفضول ‏ ‏ اے از بزرگ یافتہ ملک نعیم را
تو خازن بہشت بدی و امین ملک ‏ ‏ گشتی چرا تو در خورِ تحلۂ جحیم را
با آدمِ صفی چو تو دیدی مخالفت ‏ ‏ کردی تباہ دیگر عہد قدیم را
دادش جواب شافی کاے موسیٰ کلیم ‏ ‏ بشنو ز من بگویم بہر کریم را
کردم ہر آنچہ خواست نکردم ہر آنچہ گفت ‏ ‏ اندازہ کس ندانند علم علیم را

نظامی گنجوی کے اس قطعے میں حضرت موسیٰؑ کے طویل کلام کے جواب میں، جس میں ابلیس کو اس کے گزشتہ مقام و مرتبہ کی رفعت کی یاد دہانی کرائی گئی تھی، ابلیس نے مختصر اور شافی جواب یہ دیا ہے کہ "میں نے وہی کیا جو اس نے چاہا یعنی جو مشیت میں تھا، اور جو اس نے کہا وہ نہیں کیا۔ اے موسیٰؑ علم علیم کا احاطہ کوئی نہیں کرسکتا۔" آیا مشیت الٰہی اور امر الٰہی میں تباین و مغایرت پائی جاسکتی ہے کہ مشیت کچھ اور ہو اور حکم کچھ اور؟ فلسفیانہ سوال ہے اور اس پر بحث بے محل ہے۔ البتہ اسی حوالے سے شیخ محی الدین ابن عربی سے ماخوذ اقبال کی ایک نظم ضربِ کلیم میں موجود ہے اور موقعے کی مناسبت یہ چاہتی ہے کہ اُسے نقل کیا جائے۔ یہ نظم ایک مکالمے کی صورت میں ہے جو موسیٰؑ اور ابلیس کے درمیان نہیں یزداں اور ابلیس کے درمیان ہے۔

ابلیس

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد! اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود

یزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے 'تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود'
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اس نظم میں یزداں کے اس سوال سے کہ "کب کھلا تجھ پر یہ راز؟" سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ ابلیس کا وجود یزداں کی مشیت میں نہیں تھا اور بدقسمتی سے یہ راز ابلیس پر انکار کے بعد کھلا تھا۔ ابلیس کا جواب سُن کر یزداں نے ابلیس سے کچھ کہنے کی بجائے فرشتوں کو مخاطب کرنا مناسب خیال کیا اور کہا کہ اسے یہ حجت اس کی پستی فطرت نے سکھائی ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے۔ اگر ابلیس آگ سے پیدا ہوا ہے تو آگ کی فطرت میں علو ہے اور خاک کی فطرت کا تقاضا پستی ہے لیکن یہ ابن عربی کا مکاشفہ ہے، اور بات کو آگے بڑھانا اس لئے ٹھیک نہیں کہ یہ معلوم نہیں کہ پستیٔ فطرت کے الفاظ اقبال کے ہیں یا خود ابن عربی کے۔ اقبال نے یہ مکالمہ جس کتاب سے نقل کیا ہے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ البتہ خود اقبال نے "بال جبریل" میں جو مکالمہ نظم کیا ہے وہ یزداں اور ابلیس کے درمیان نہیں بلکہ جبریل و ابلیس کے درمیان ہے۔ جبریل سوال کرتا ہے اور ابلیس جواب دیتا ہے۔

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میرا گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اقبال کی یہ نظم آفاقی شاہکار ہے اور یقیناً عربی فارسی زبانوں کی صوفیانہ شاعری میں اس کا جواب ڈھونڈنا ممکن نہیں۔ پنجابی زبان میں بھی نہیں کہ اس زبان کی صوفیانہ شاعری بلاشبہ عربی اور فارسی کی صوفیانہ شاعری سے بلحاظ کمیت و کیفیت کسی طرح کمتر نہیں۔ حلاج کا اگر دوبارہ دنیا میں آنا ممکن ہوتا اور وہ اُردو سے واقف ہوتا تو اقبال کی قبر کا بار بار طواف کرتا۔ حلاج اگرچہ یہی کچھ کہتا رہا جو اقبال نے کہا ہے لیکن یہ کچھ وہ خود اپنی شاعری میں اتنی خوبصورتی، سلاست اور صفائی سے نہیں کہہ پایا۔ یہ اقبال کا مقدور و مقدر تھا۔ بے شک اللہ نے کسی کو عبث پیدا نہیں کیا حتیٰ کہ ابلیس کو بھی۔ اگر ایسا ہی ہے تو اقبال کی یہ نظم ابلیس کے وجود کا بہترین جواز ہے۔ آخری شعر کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ پہلے اشعار کا تعلق آدم کی زندگی میں ابلیس کے معنی آفریں کردار سے ہے۔ جو اس کردار سے مختلف ہے جو جبریل ادا کرتا ہے۔ جبریل وحی اور ہدایت لے کر آنے والا فرشتہ ہے اور مقرب ہے۔ ہُوْ ہُوْ، ہُوْ ہُوْ (وہ، وہ) کا مخفف ہے۔ تین بار اللہ ہو کا مطلب افلاطون کی زبان میں حقیقت سے سہ گونہ دوری، ہوا۔ میں کانٹا سہی لیکن ہوں تو یزداں کے دل میں پیوست، میں اس کے دل کی کھٹک ہوں۔ یہ مقام اے جبریل! تجھے کہاں نصیب۔ ”تو مقام ذکر پر ہے۔ میں اس مقام پر ہوں جہاں وہ بھی مذکور رہے اور میں بھی مذکور ہوں“ آدم کی زندگی میں ساری بہار میرے دم سے ہے حتیٰ کہ وحی اور ہدایت جو تو لے کر آتا ہے اس کا مفہوم بھی میرے حوالے سے متعین ہوتا ہے۔ اگر شر نہ ہوتا تو خیر کی پہچان کیسے ہوتی، بلکہ وحی اور ہدایت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور تجھے وہ اعزاز حاصل نہ ہوتا جو اب حاصل ہے۔

حسین بن منصور حلاج کے بارے میں، اپنے ایک مضمون ”دوا ہوئے تشنہ در تکرار“ ”فنون“ شمارہ ۲۶، نومبر، دسمبر ۱۹۸۶ء میں مجھ سے ایک کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ حلاج مذہباً شیعہ تھا اور اثنا عشری شیعوں کے گیارہویں امام حسن عسکری کے اصحاب میں سے تھا ابن ندیم جو خود شیعہ تھے۔ الفہرست میں لکھا ہے، کہ حلاج بباطن شیعی تھا اور بظاہر سنی المذہب۔ لیکن حلاج جیسے شخص سے جو رتبۂ شہادت ہر قیمت پر حاصل کرنے کا آرزومند تھا، تقیہ کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ طاسین السراج میں اس نے واضح طور پہ کہا ہے۔ ما ابصرہ احد علی التحقیق سوی الصدیق لانہ واقعہ ثم رفقہ لئلا یبقی بینھما فریق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بالتحقیق سوائے جناب صدیقؓ کے اور کسی نے نہیں دیکھا، صدیقؓ نے آپ سے موافقت کی، پھر رفاقت کی اور یقیناً دونوں میں فرق کرنے والی کوئی بات نہ رہی“۔ یہ الفاظ کسی شیعی کے نہیں ہو سکتے۔ پھر حلاج کے زمانے میں شیعی عقائد کا اظہار کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا تھا کہ وہ تقیہ کرتا۔ شیعہ زعما سرکار دربار میں پورا پورا رسوخ رکھتے تھے۔ حامد بن عباس، خلیفہ المقتدر کا وزیر جس شخص سے ہر امر میں مشورہ کرتا، شلمغانی تھا جو شیعی حلقوں میں علامہ شلمغانی کے نام سے مشہور رہے۔ اسے حامد کا شیعی داماد، واسطے سے لایا تھا۔ حامد بن عباس خود سنی تھا مگر بقول لوئی ماسینوں ”کوتاہ نظر، حریص اور کم عقل آدمی تھا“۔ شلمغانی حامد بن عباس کو حلاج کے خلاف برابر بھڑکاتا رہتا تھا۔ حامد بن عباس کی وزارت درحقیقت اس کے شیعی داماد اور اس کے استاد شلمغانی کی وزارت تھی۔ کسی شاعر نے حامد بن عباس کی حالت کا کیا عمدہ نقشہ کھینچا ہے:

اعجب کل ما رأینا ان وزیرین فی بلاد
ھذا سواد بلا وزیر وذا وزیر بلا سواد

عجیب ترین بات یہ ہے کہ وزیر ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ یہ صرف سیاہ جبّہ ہے جو وزیر سے خالی ہے اور وہ صرف وزیر ہے جس سے سیاہ جُبّہ خالی ہے۔

شلمغانی نے حلاج کے قتل کے بعد بزرگانِ قنائیہ کو جنھوں نے حلاج کی حمایت کی تھی، ۳۱۱ھ میں قتل کرا دیا تھا اور بعد میں خود بھی اپنے سے کمتر حریف ابن روح نوبختی کے ساتھ مباہلے کے نتیجے میں مرگیا تھا۔ حامد کو خلیفہ المقتدر باللہ نے معزول کر دیا اور پھر اسے اس کے شیعی جانشین وزیر علی ابن الفرات نے قتل کرا دیا تھا۔ حامد ۳۰۶ھ میں وزیر بنا تھا۔ علی ابن الفرات، حامد سے پہلے بھی المقتدر باللہ کا وزیر رہ چکا تھا۔ حلاج کے خلاف ریشہ دوانیوں کا آغاز اسی نے کیا تھا۔ علی ابن الفرات اور حسین النوبختی مستوفیانِ مال رہ چکے تھے اور خراج گیری میں سختی کرتے تھے۔ حلاج ستم رسیدہ کسانوں کا ہمنوا تھا۔ بات وہیں سے بگڑی تھی۔ حلاج کے خلاف بے سروپا قصے انھیں نے مشہور کر رکھے تھے۔ حلاج الاسرار حسین بن منصور کا لقب تھا، وہ پیشے کے اعتبار سے حلاج (دُھنیا) نہ تھا جیسا کہ اس کے دشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ علی بن الفرات بھی بالآخر قتل ہوا اور خلیفہ المقتدر باللہ بھی اور حامد بن عباس بھی۔

حلاج کے غیر شیعی ہونے کا دوسرا بڑا ثبوت یہ ہے کہ حنابلہ (امام احمد بن حنبل کے پیرو) حامد کے خلاف، حلاج کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ حامد پر بغداد کے گلی کوچوں میں علی الاعلان لعنت کرنے لگے تھے اور حلاج کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جب حلاج کے ایک بہی خواہ علی بن عیسیٰ کے ایما پر اس کے دوست مورخ ابن جریر طبری نے حنابلہ کو احتجاج کے اس طریقے پر ٹوکا اور روکا تو انھوں نے طبری کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اس پر "تشیع" کا الزام عائد کیا۔ وہ طبری کو ابن الفرات اور شلمغانی کا گماشتہ خیال کرتے تھے۔ حلاج کے قتل کے ایک دو سال بعد جب طبری کی وفات ہوئی تو حنبلیوں نے اس کی میت کو سنیوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

حلاج کے قتل کی اصل وجہ اس کا دعویٰ انا الحق نہ تھا کہ یہ دعویٰ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیا تھا، وہ بھی کسی گلی یا بازار میں نہیں، بلکہ طاسین الازل والالتباس میں، جو اس نے قید کے آخری دنوں میں لکھی تھی جبکہ یہ قید آٹھ سال پہلے عمل میں آئی تھی۔ اسی قید سے نکال کر وہ دار پر کھینچا گیا تھا۔ اس کا اصل قصور، کسانوں اور مزدوروں کی وکالت اور ان کے مفاد کا تحفظ تھا۔ وہ بقول ابن ندیم[1] امراء کے مقابلے میں ڈٹ جاتا تھا۔ وہ جرأت مند اور جرأت آزما شخص تھا۔ گیرودار کی اصل وجہ یہی تھی۔ زنگیوں کی شورش میں بھی اس کا ہاتھ یقیناً رہا ہوگا کہ اس کی پہلی گرفتاری اسی الزام میں ہوئی تھی۔ یہ زمانہ اس کی جوانی کا تھا۔ زنگی افریقہ کے حبشی غلام تھے اور کان کنی کرتے تھے۔ زنگبار، افریقہ کا ساحلی علاقہ ان کی خرید و فروخت کی سب سے بڑی منڈی تھا، اسی بنا پر انھیں زنگی کہا جاتا تھا۔ کسانوں کی طرح یہ بھی بے حد مفلوک الحال تھے۔ ان لوگوں نے سالہا سال سرکاری افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انھیں شکست دیتے رہے۔ یہ شورش معتمد علی اللہ (وفات ۲۷۹ھ) کے زمانے میں فرو ہوئی۔ حلاج آخری بار ۳۰۱ھ میں گرفتار ہوا۔ یہ مقتدر باللہ کا دور تھا۔ مقتدر باللہ تیرہ سال کی عمر میں خلیفہ بنایا گیا (۲۹۵ھ) حلاج کی گرفتاری کے وقت مقتدر باللہ کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ اس زمانے میں خلفائے عباسیہ خود بھی قید کی زندگی گزار رہے تھے۔ اصل حکومت، ابن الفرات اور حامد بن عباس جیسے دسیسہ کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ نام خلفاء کا چلتا تھا۔ کام دوسرے لوگ دکھا رہے تھے۔ خلیفہ معتمد علی اللہ (وفات ۲۷۹ھ) نے اپنی حالت زار اپنے ان اشعار میں بیان کی ہے:

---

[1] لوئی ماسینوں

الیس من العجائب ان مثلی | یری ما قل ممتنعا علیہ
وتوکل باسمہ الدنیا جمیعا | وما من ذاک شیٔ فی یدیہ
الیہ تحمل اموال طرا | ویمنع بعض ما یجبی الیہ

کیا یہ عجائبات میں سے نہیں کہ مجھ جیسا آدمی قلیل، اور معمولی معمولی چیزوں سے بھی محروم رہے۔ اس کے نام سے تو ساری دنیا کھائے، اور وہ خود خالی ہاتھ ہو۔ اموال سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلوں کے قافلے اس کے نام پر چلے آ رہے ہوں، مگر اس کا تھوڑا سا حصہ بھی اس تک پہنچنے سے روک دیا جائے۔

یہ تو معتمد باللہ کا حال تھا۔ مستعین باللہ (م۔ ۲۴۸ھ) کے حال کا نقشہ ایک شاعر نے بیان کر دیا ہے۔

خلیفۃ فی قفص | بین وصیف و بغا
یقول ما قالا لہ | کما تقول الببغا

خلیفہ پنجرے کا طوطا ہے۔ کچھ وفاداروں اور کچھ نافرمانوں میں گھرا ہوا۔ وہی کہتا ہے۔ جو اسے پڑھایا جاتا ہے۔

حلاج کی گرفتاری حامد بن عباس کے حکم پر عمل میں نہیں آئی تھی۔ وزارت ابن الفرات سے لے کر حامد کے حوالے (۳۰۶ھ) اس لئے کی گئی تھی کہ حلاج کے قتل کی ذمہ داری اس احمق کے سر تھوپی جا سکے۔ حلاج کا کام ختم ہونے کے بعد ابن الفرات دوبارہ وزیر مقرر ہو گیا تھا۔ ابن الفرات شیعہ ہونے کے سبب اس ردعمل سے بچنا چاہتا تھا جو اس کے خلاف، حامد بن عباس کی نسبت، زیادہ شدت اختیار کر سکتا تھا۔

آیا حلاج واقعی کسی غائب امام کی امامت کی دعوت لوگوں کو دے رہا تھا؟ اگر دے رہا تھا تو کیا یہ وہی امام غائب تھا جس کا نائب حسین بن روح نوبختی تھا۔ حسین بن منصور حلاج کے بارے میں میں نے لکھا تھا کہ وہ اثنا عشریہ کے گیارہویں امام حسن عسکری کے اصحاب میں سے تھا۔ یہ بات نادرست معلوم ہوتی ہے۔ حسین منصور کی عمر امام موصوف کی وفات کے وقت پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس زمانے میں وہ واسط میں طالب علم تھا اور حفظ قرآن کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے معروف صوفی سہل بن عبداللہ تستری کی شاگردی اور مریدی اختیار کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں وہ بصرہ آ گیا تھا۔ یہیں اس کا تعلق بنی مجاشع سے ہوا۔ جو زنگی شورش میں پیش پیش تھے۔ اس شورش کا قائد علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ بن زید بن حسین بن علی بن ابی طالب تھا۔ شیعی مورخ ابن طباطبا (ساتویں صدی ہجری) اس شجرہ نسب کو درست نہیں مانتا۔ شاید اس لئے کہ اس نے ان علویوں کو جو اس کے پاس پناہ کے لئے گئے تھے قتل کروا دیا تھا۔ سنی اور شیعہ سبھی مورخین اسے لٹیرا قرار دیتے ہیں۔ بہر حال حلاج اگر کسی امام کی امامت کی دعوت دے رہا تھا، جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے اور اگر یہ دعوت اس کی جوانی کے زمانے سے متعلق ہے تو اسی امام سے متعلق ہو گی۔ حسین بن روح کے ساتھ حسین بن منصور حلاج کے تعلقات ابن روح کے مستوفی محاصل و خراج ہونے کے زمانے سے خراب چلے آ رہے تھے۔ حسین بن روح کی دعوت جس غائب امام کے لئے تھی، حسین بن منصور کی دعوت اس کے لئے یقیناً نہیں تھی۔ یہ دعوت اگر آخری زمانے میں بھی تھی تو پھر یہ امام شاید ابن المعتز ہو گا یا وہ خود۔ ہر ایک جانتا تھا کہ خلافت عباسیہ معمولی دھکے کی محتاج تھی۔ لیکن یہ دھکا دینے کے لئے جس ہمت کی ضرورت تھی وہ کسی میں موجود نہ تھی۔ امام حسن عسکری کے اصحاب، محمد بن نصیر نمیری، احمد بن ہلال، ابو طاہر محمد بن علی جس غائب امام کی دعوت دیا کرتے تھے اسے ابو جعفر عمر، حسین بن روح اور علی بن محمد سمری نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ابو جعفر عمر، حسین بن روح اور علی بن محمد جس امام غائب کی دعوت دیتے تھے، اسے محمد بن نصیر نمیری، احمد بن ہلال اور ابو طاہر محمد بن علی نے تسلیم نہیں کیا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کی تردید کرتے تھے حالانکہ دونوں گروہ جس امام کی طرف لوگوں کو بلا رہے تھے وہ ایک گروہ کا اور، اور دوسرے گروہ کا اور تھا۔ یہی حال حسین بن منصور کا بھی تھا۔ وہ اس امام غائب کی طرف لوگوں کو نہیں بلا رہا تھا جس کی طرف حسین بن روح اور اس کے ساتھی بلا رہے تھے اور نہ وہ تھا جس کی طرف محمد بن نصیر، احمد بن ہلال اور ابو طاہر محمد بن علی بلا رہے تھے۔ چونکہ یہ سب حضرات کسی نہ کسی امام غائب کی طرف

لوگوں کو بلا رہے تھے اور ایک دوسرے کی تردید بھی کرتے رہتے تھے، اس لیے یہ تسامح قدرتی بات ہے کہ وہ کسی ایک ہی امام کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہوں، جو امام غائب ہے۔ اسی زمانے میں اسماعیلی بھی امام غائب کی دعوت دے رہے تھے۔ جو مہدی باللہ کے نام سے خلافتِ فاطمیہ کا بانی ہوا۔ مہدی باللہ نے قیروان (افریقہ) میں ۳۰۹ھ میں عنانِ حکومت سنبھالی۔ یہ حکومت اس کے لیے اس کے داعی ابوعبداللہ حسین نے حاصل کی تھی۔ ابوعبداللہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوا جو ابومسلم خراسانی کا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں قرامطہ نے بھی قوت پکڑ لی تھی۔ یہ اسماعیلیوں کی ایک دوسری شاخ تھی۔ یہ حج کے دنوں میں مکہ پہ حملہ آور ہوئے اور حجرِ اسود اکھاڑ لے گئے۔ ان کا امام ابوسعید تھا۔ ناصر خسرو نے اپنے سفرنامے میں اسے فاطمی النسل بنایا ہے۔ ابوسعید ۳۰۱ھ میں قتل ہوا۔ اس کا فرزند ابوطاہر اس کا جانشین ہوا۔ حجرِ اسود وہی اکھاڑ کر لے گیا تھا۔ یہ واقعہ ۳۱۷ھ کا ہے۔ ابوسعید کے ظہور سے پہلے قرامطہ بھی امام غائب کی طرف دعوت دیا کرتے تھے۔ ابوسعید اور ابوطاہر نے جزیرہ نمائے عرب، عراق اور شام کے علاقوں میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ پس یہ عجب نہیں کہ حلاج کو مستوجب سزا ثابت کرنے کے لیے اس کے گلے میں بڑا داعیِ قرامطہ کی تختی لٹکا دی گئی تھی۔ دراں حالیکہ قرامطہ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس کا تعلق ایک تو ان حنبلی کسانوں سے تھا جو مستوفیانِ خراج کے ظلم و ستم کا شکار تھے، اور پھر ان فاقہ کش حبشی غلاموں سے، جو نواحِ بصرہ میں شورے کی کانوں میں کان کنی کرتے تھے۔ حنابلہ کے ۲۹۶ھ کے نتیجے میں ۲۹۶ھ میں حنبلی خلیفہ ابن المعتز[۱] کو ایک دن کے لیے خلافت بھی مل گئی تھی۔ یہ گو مقتدر باللہ کے خلاف ہوا تھا۔ حلاج اس کی ناکامی کے بعد اہواز میں جا کر چھپ گیا تھا۔ اہواز حنبلیوں کا شہر تھا۔ وہی اس کی پشتیبانی کر رہے تھے۔ حکومت کے کارندے اسے ہر طرف ڈھونڈ رہے تھے۔ بالآخر ایک خائن کی مدد سے حامد بن عباس نے جو اس زمانے میں اہواز کا مستوفیِ مال تھا اسے ڈھونڈ نکالا اور گرفتار کر کے بغداد پہنچا دیا۔ علامہ ابن ندیم نے یہ جو لکھا ہے کہ حلاج اہلِ بیت کے کسی فرد کے حق میں لوگوں کی رائے ہموار کر رہا تھا۔ وہ بظاہر سُنّی اور در پردہ شیعہ تھا، اسے ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

حلاج کی خاطر کوڑے کھانے والے اور بغداد کی گلیوں اور دیواروں کو اپنے خون سے رنگین کرنے والے یہی حنابلہ تھے نہ کہ حنفی، مالکی، شافعی اور شیعہ مذاہب کے پیروکار۔ بغداد میں آنے والے یہ مفلوک الحال دیہاتی کسان، انا الحق کا دعویٰ کرنے کی بنا پر قتل نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس بنا پر قتل ہوئے تھے کہ وہ حلاج کے حامی تھے اور حلاج اُن کی آواز تھا۔ حلاج اُن کی حمایت کے سبب قتل ہوا تھا اور وہ حلاج کی حمایت کے سبب قتل ہو رہے تھے۔

حلاج کے مخالفین اس پر شعبدہ باز ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نے عجیب و غریب شعبدے دکھا دکھا کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ حالانکہ حقیقی شعبدہ باز اس کے یہی برسرِ اقتدار مخالفین تھے جن کے پھیلائے ہوئے افسانے، زمانہ مابعد کے حنبلی علماء، امام ابن جوزی اور امام ابن تیمیہ تک نے قبول کر لیے۔ امام ابن تیمیہ نے اگرچہ ایک موقعے پر اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ حلاج سے منسوب منظوم عربی کلام کا بیشتر حصہ وضعی اور الحاقی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہمیں حلاج کے ان اشعار کو بنیاد بنا کر اس کے بارے میں رائے زنی کرتے وقت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

---

[۱] ابن المعتز عربی زبان کا باکمال شاعر تھا۔ اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔

فیض اور ہمارے فکری مغالطے

شاہین مفتی

ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے

آزادی پاک و ہند سے کوئی ڈیڑھ دو سو برس پہلے مسلمانوں کے ہاں مسلمانوں کو دائرۂ اسلام میں داخل یا خارج کرنے کا رواج جڑ پکڑ گیا تھا، شاید یہ مرض بہت پہلے ہی سے کہیں موجود ہو لیکن اس کی صورتیں زیادہ شدید نہیں تھیں۔ وجہ یہ کہ ہندو نے اپنی چھوت چھات کے باعث مسلمانوں کو خود اپنے دائرے سے بارہ پتھر باہر رکھا تھا۔ پھر انگریز آئے جو حفظانِ صحت کے اصولوں اور ذاتی انانیت سے خود حفاظتی کے قلعوں میں محصور رہنا پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ مصافحے کی گنجائش بھی کم رہی۔ الہامی کتابیں یہود و نصاریٰ اور تعلقات کے بارے میں کچھ بھی کہیں، اہلِ کتاب اسی قسم کے مباحثوں میں الجھے رہے کہ قیام اور طعام کو کس طرح ایک دوسرے سے علیحدہ اور مخصوص کیا جا سکتا ہے اور پھر ع

اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

یہی وہ سماجی، مذہبی اور نفسیاتی ناپاکی تھی جو ہندوستان کے غلام مسلمان کو ورثہ در ورثہ نصیب ہوئی۔ پہلے وہ ارد گرد کے غیر مذاہب پر بھوں چڑھاتا تھا (اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا) پھر اپنے سے بہتر سماجی اور معاشی زندگی بسر کرنے والے مسلمین کو کرسٹان، نیچری، اور بدعتی قرار دینے لگا۔

تقسیم نے جب مسلمانوں کے ایک جمِ غفیر کو یکجا کیا تو ان رجحانات نے خارج کی جانب سفر کرنے کی بجائے داخلی جنگ کو ہوا دی جو نیم سیاسی، نیم سماجی، نیم مذہبی جماعتوں نے، جو اپنے آپ کو خلیفۃ الارض اور خداوند مکتب کا درجہ دیتی تھیں۔ اس مشغلے کی رہبر سل اور داڑھی کہ ہمہ وقت خلقِ خدا کو جدید رجحانات اور ناچنے والوں کی ننگی ٹانگوں سے ڈرانے کا ذمہ لے لیا۔ ان اصحاب جبل و علم کا اولیں یہی رہا کہ وہ ہر مسلمان کا دل دہلاتے رہیں اور اسے قاہر و جابر خدا سے متنفر کرتے رہیں۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

اگر اس طبقۂ فکر کو اپنی قوم کے آدرشوں، اس کے نظریۂ حیات، اس کی تمناؤں اور اس کی سیاسی حالت سے مکمل نفرت ہوتی تو یہ بھی بات تھی مگر نفرت کے لئے بھی آدمی میں بہت ساری اخلاقی جرأت کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ اتنا ہوا کہ ایک مصنوعی قسم کی مذہبی زندگی شیڈول کا بہت زیادہ پرچار کیا گیا۔ خدائی عذاب سے بچنے کے لئے ان آیات کے فروغ کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا جو رواداری، انصاف محبت اور ایسی ہی قدروں کی عکاس تھیں گویا مسلمان نے اخلاقی بہتری کی گیند بھی اٹھا کر خداوند کے گراؤنڈ میں پھینک دی کہ اب وہ آسمانوں سے بنفسِ نفیس اترے اور ہمیں رواداری کی تلقین کرے۔ حالت یہ ہوئی کہ سمندر پہلے، پھر ندی، پھر نالہ، پھر جوہڑ اور آخر آخر گلی

بسنے والی بدرد گیا۔ مسلمان عوام اس حالت کو پہنچے کہ وہ اپنے بنیادی عقائد سے قطع نظر اب صرف اور صرف اپنے فروعی تصورات پر جان دینے کو تیار رہیں۔ مسجدیں خدا کا گھر نہیں ملا کا حجرہ ہیں۔ نمازی بندہ و صاحب و محتاج و غنی کی حدود سے نکل کر مذہبی پہلوانی کے اکھاڑے میں اتر چکے اور محراب و منبر اسلحہ خانوں کی ڈھال بن گئے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ عمل جاری و ساری ہے۔ گذشتہ برسوں میں جب اسلامی قوانین کا بڑا شہرہ تھا۔ حافظ جیسے بین الاقوامی شاعر کو اردو ادب کے نصاب سے اس لئے خارج کر دیا گیا کہ اس کی غزلوں میں شراب کا تذکرہ بہت ہے:

یہ دوستوں کا کرم وہ عطائے شیخ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

اس سلطانی عیاری اور نیم ملائی کے ساتھ ساتھ نام نہاد انقلابیوں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہیں جو روایت، وراثت، مذہب، تاریخ، زبان و ثقافت کو ذہنی خرخشے قرار دیتے ہیں (اگرچہ لفظ کا پرچار بہت ہے) ان کا گذار صرف انقلاب کے نعرے پر ہے کیسا انقلاب؟ اس کی کوئی وضاحت ان کے ذہن کے کسی حصے میں موجود نہیں۔ یہ انقلاب محض فیشن ہے ٹھنڈے موسم میں گرم کافی کا ایک پیالہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

تالی بجانے سے کبھی انقلاب نہیں آتا، نہ داغ داغ اجالا سنورتا ہے، نہ شب گزیدہ سحر کی قسمت بدلتی ہے۔ نتیجہ صرف لیفٹ رائٹ کی بے معنی گردان۔ یہ وہ عجیب و غریب بٹوارہ ہے جس نے رہے سہے پاکستان کے نظریاتی تشخص کو تشدد کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے
خدا معلوم ایشیا سرخ ہے یا سبز، تاہم دونوں جانب اسلحے کا ڈھیر لگا ہے ؎

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

انسانی تاریخ میں مذہب کی اہمیت کبھی فنا نہیں ہو سکتی کیونکہ مذہب کا مرکز و منبع انسان کی تمنائیں ہیں جن کا محل اس کا نفس ہے جو خارجی حقائق کے مقابلے میں سب سے سب سے زیادہ حقیقی ہے۔ غور طلب بات فقط یہ ہے کہ مذہب کا پیغام نوع انسانی کے لئے کیا ہے؟ انسان کی تقدیر کی نسبت وہ کیا کہتا ہے اور جو کہتا ہے وہ سچ ہے یا نہیں ہے؟ کیا وہ کوئی واضح پیغام ہے یا محض مبہم تاثر؟

فیض نے اپنے ایک انٹرویو[1] کہا ہے:

"ہم تو سمجھتے ہیں دین، دنیا میں عوامی فلاح و انقلاب ہی کے لئے آیا تھا۔ جیسا بڑا انقلاب اسلام نے پیدا کیا اس سے بڑا انقلاب بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، دین کے صحیح معانی یہی ہیں کہ وہ خلق کی بہتری اور بہبود کے لئے ہے۔"

کراچی کے ایک اور روزنامے کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض نے اپنے ابتدائی حالات کے بارے میں بتایا:

"ہمارے گھر کا ماحول بڑا مذہبی تھا۔ گانے بجانے کی پابندی تھی۔ ہم صبح سویرے اذان کے وقت اٹھتے، فجر کی نماز کے لئے مسجد میں جاتے، اور پھر محلے کے مولانا صاحب سے قرآن سنتے۔"

سیکولرازم کے سیاسی الزام کے جواب میں فیض نے کہا:

"بھئی ہم اس قسم کے بہتانوں کا جواب دے کر وقت ضائع نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد کافر سازی کی رسم چلی ہوئی ہے۔ اپنی شخصیت کے خول سے نکل کر کوئی سوچتا نہیں۔ لوگ ایسے الٹے سیدھے قصے گھڑتے رہتے ہیں کہ اب ان کے بارے میں کوئی شکایت بھی باقی نہیں رہی۔ اب ہم کیا بتائیں کہ ہم نے بھی مکتب کی تعلیم مولوی ابراہیم سیالکوٹی کی مسجد میں حاصل کی۔ شمس العلماء سید میر حسن ہمارے بھی استاد تھے اور لاہور سے ہم نے بھی ایم اے عربی کیا تھا۔"[2]

"اپنے وقت کے بزرگان دین سے ہمیں برسوں نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ مولوی سید میر حسن، مولوی ابراہیم میر، سید عطاء اللہ شاہ بخاری

---

[1] روزنامہ جنگ، لاہور میگزین، ۵، ۱۱ اور نومبر ۱۹۸۴ء
[2] پنڈی پوائنٹ۔ منصور قیصر معبوذ جنگ دسمبر ۱۹۸۴ء

اور مولوی ثناء اللہ امرتسری، ان سب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور کبھی کسی نے حرف گیری نہیں کی۔"[۵]

فیض کے ان اعترافات کے بعد ان کی موت کے بعد ان کے مذہب و مسلک کے بارے میں ایک صحافی کا بیان دیکھئے:

"فیض اپنے ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں اگرچہ معروف معنوں میں بھی مذہبی اطوار و عادات کے حامل رہے لیکن ذہنی پختگی کی منزل کو پہنچنے کے بعد مذہبی شعائر وغیرہ (لفظ وغیرہ غور طلب ہے) سے ان کا کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا تھا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ انکارِ خدا یا الحاد کی منزل کو پہنچ گئے تھے بلکہ اس کی وجہ ان کے تصورِ مذہب کی تبدیلی تھی۔"[۶]

(یہ تصورِ مذہب کیا ہوتا ہے موصوف نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ ہماری ناقص رائے میں مذہب یا تو مذہب ہوتا ہے یا کچھ نہیں)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"یہ تبدیلی مذہبی شعائر سے لاپروائی یا عدم تعلقی کا جواز نہیں بن سکتی اور نہ اس کی مدافعت کی جا سکتی ہے۔ خود فیض نے ایک مجلس میں اپنی بعض عادات کو واضح طور پر ناپسندیدہ قرار دیا اور افسوس کے ساتھ اس زمانے کا ذکر کیا جب وہ بعض مکروہات کے عادی ہو گئے۔"[۶]

(یاد رہے یہ وہی فیض ہیں جو کہتے ہیں:

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

ارشاد صاحب تک شاید یہ خبر نہیں پہنچی کہ گلیوں بازاروں میں دھمال ڈالنے اور امرد پرستی کی طرف مائل دو اور لوگوں کو بھی مذہبی ٹھیکیداروں نے مسلمانی کا لائسنس جاری کر ہی دیا تھا۔ یہ چار عیب شرعی رکھنے والے گمنام حضرات پیر رومی اور شاہ حسین ہیں آج جن کے کلمات مسجد و منبر کی بیچی کاری کے کام آتے ہیں اور واعظین مائیکروفونوں پر لہرا لہرا کر پڑھتے ہیں تاکہ خلقِ خدا عبرت پکڑے۔

فیض کا کمال تو یہ ہے کہ موت کے بعد بھی ان پر انگلی اٹھانے والے کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان کی شفاف زندگی کے کس ورق کو میلا کر کے دکھائے۔

بہر حال موصوف صحافی کا کہنا ہے:

"لیکن بایں ہمہ اپنی دانست میں وہ نفسِ مذہب یا جوہرِ مذہب سے دور نہیں ہوئے۔ انھوں نے مذہب کو انسان دوستی اور انسان نوازی، اخوت و مساوات، بے غرضی اور بے نفسی، تعصبات سے بالاتری اور پاکیزگی کا ہم معنی سمجھا۔"

(یہاں لفظ "اپنی دانست میں" غور طلب ہے گویا فیض نے اخوت و مساوات کا پرچار کر کے مذہبی غلطی ہی نہیں کی بلکہ کسی اور دھرم کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ موصوف یہ بھول گئے کہ اسلام کی بنیاد اسی مساوات و مواخاۃ پر رکھی گئی تھی)

آگے دیکھئے:

"وہ اپنے انداز میں ان خصوصیات سے بھرپور وابستگی کا اہتمام کیا، آپ ان کے تصورِ مذہب سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن انھیں مذہب مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا، کم از کم راقم نے ان کے ساتھ اپنی معدودے چند گفتگوؤں میں یہی تصور قائم کیا لیکن اس رائے سے اختلاف کرنے والے کو اس کا حق حاصل ہے۔"

(کس بات کا حق؟ وہی دائرۂ اسلام میں داخل یا خارج کرنے کا حق)

---

[۵] ہنڈی بوائنٹ۔ منصور قیصر مطبوعہ جنگ دسمبر ۸۴ء

[۶] فیض احمد فیض، چند یادیں، ارشاد احمد حقانی، جنگ ۲۳ر نومبر ۸۴ء

"فیض صاحب کے نظریات اور ان کے مسلک سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان کے اخلاص سے نہیں ہے نہیں (موصوف تنقید نگار شاید مذہبی مسلک کے بنیادی فرق سے آگاہ نہیں) ان کے لئے اس قدر کریڈٹ کافی ہے کہ زندگی بھر انھوں نے اپنے آپ سے یا دوسروں سے منافقت کا رویہ اختیار نہیں کیا..... یقیناً یہ بہت بڑی متاع ہے اور اس کی قدر کی جانی چاہیئے"۔

لیجئے چھٹی ہوئی فیق کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ منافق نہیں ع کعبے میں گاڑو برہمن کو!

دوسرا فاضل مضمون نگار لکھتا ہے:

"سوال یہ ہے کہ ایسا کون پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو روح اسلام، قرآن حکیم اور سنتِ رسول ؐ سے کما حقہٗ واقف نہ ہو اور پھر اسلامی معاشرے میں غربت و افلاس، استحصال و اسراف، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام ہائے معیشت سے نجات دلانے کے خلاف نہ ہو؟ کیا ملوکیت اور استعماری ادوار کی یادگاریں مٹانا اور قدیم و جدید ذرائع پیداوار کی ازسرِ نو منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کرنا تاکہ اسلامی معاشرے میں طبقاتی تفاوت کم سے کم ہو، ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی مطالبہ ہے؟ کیا طبقاتی تفاوت کم کرنے سے معاشرہ بے شمار برائیوں سے پاک ہو کر ایک صحت مند توانائی اور فکر و عمل کی دولت سے آراستہ نہیں ہو جاتا؟ کیا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ اقبال کے افکارِ عالیہ اس سمت میں اصلاح معاشرہ سے اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے آغاز کی نشاندہی نہیں فرماتے؟ اگر یہ سب کچھ کہنا جرم ہے، در کہنے والا گردن زدنی تو اس جرم میں آج پاکستان سمیت آزاد دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک ملوث ہیں جو اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں"[۵]۔

پھر دل کو مصفا کرو اس لوح پہ شاید	مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے	تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے	لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

سچ تو یہ ہے کہ "سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ" والے اقبال سے بھی ہم بہت... عرصہ کھنچے کھنچے رہے اور مداری کے گولوں کی طرح اقبال اور فسطائیت، اقبال اور اشتراکیت، اقبال اور عشقِ رسول ؐ، اقبال اور فطرت، اقبال اور عورت، اقبال اور ریاست، اقبال اور ملتِ اسلامیہ، اقبال اور آفاقیت قسم کے موضوعات کی شعبدہ بازی میں الجھے رہے —— حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کا متمنی اقبال کبھی آدھا مسلمان کہلایا، ہم اسے غیروں کے ہاں ڈھونڈتے رہے، کبھی مارکس کے ساتھ، کبھی لینن کے ہمراہ، کبھی مسولینی کے سرہانے، کبھی نطشے، فشتے، برگساں اور کانٹ کے قافلے میں، اور وہ گستاخ کبھی رومی و حافظ کے جامۂ رندی سے نمودار ہوا، کبھی عبدالکریم الجیلی کے انسان کامل سے خوش گپیوں میں مصروف ملا۔ فیض کا کہنا ہے:

"آج کے دور میں اگر شعراء میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ہر نقاد اور ہر مبصر نے اقبال کو اپنے اپنے نظریات، خیالات اور عقائد کی اقلیم میں کھینچ تان کرلانے کی کوشش کی۔ علامہ نے تین چیزوں کی مذمت کی تھی ملوکیت، دہبہ خدائی اور ملائیت"۔

عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

خیر —— آخر آخر ہم نے اس معتوب اقبال کو مشرف بہ اسلام کیا، اسے رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ دیا، اس کے ارشادات کو اوڑھنا بچھونا بنایا اور قرطبہ کی مسجد میں اس کی نماز پڑھنے والی تصویر کو سرکاری پروانہ دے کر مشتہر خاص و عام کر دیا۔ اس طرح وہ شاہین زیرِ دام آیا اور ہمارے نظریات کے حرم میں پالتو کبوتر کی طرح مقدس کنکریاں چگنے لگا:

مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

---

[۵] "افسوس! اب وہ کہاں آئیں گے"۔ ممتاز احمد خان: مطبوعہ "جنگ" لاہور

مگر یقین مانیے اب اقبال کو ردو قبول ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا وہ اپنے حصے کا کام کرکے جاچکا۔ ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست! ہر حقیقت مجاز ہوجائے، کافروں کی نماز ہوجائے، والے فیض کو تہنیت ہو کہ اس کی موت پر بھی ایک اخبار نے اس کی ایک پاسپورٹ سائز تصویر کو اس سرخی کے ساتھ شائع کیا ہے:

"فیض صاحب اپنی وفات سے ایک روز قبل اپنے گاؤں کالا قادر گئے تو وہ مسجد بھی دیکھنے گئے جو ان کے والد نے بنوائی تھی اور جس کی مرمت کے لیے فیض صاحب نے چار ہزار روپے کی رقم بھی ماسکو سے بھیجی تھی۔ اس مسجد کے کتبے پر فیض صاحب کی نعت رسول مقبول ؐ کندہ ہے۔ فیض صاحب نے مغرب کی نماز بھی اسی مسجد میں ادا کی تھی اور جماعت کی امامت بھی کرائی تھی۔"[۱]

یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو

فیض نے ایک جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے:

"راستے اور منزل کے تعین کے بغیر شاعری کا کوئی مستقبل نہیں۔ شاعر، ادیب اور دانشور کو بنیادی طور پر آگاہ ہونا چاہیے کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے، عارضی کیا ہے مستقل کیا ہے، تصنع کیا ہے، حقیقت کیا ہے۔"[۲]

"ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہوتا ہے۔ خالی الذہن تو کوئی نہیں ہوتا۔ نظریہ کا مطلب یہی تو ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو کس زاویے سے دیکھتا اور کیا پاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے شاعر اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو، معاشرے کی تاریخ کو، اس کے مستقبل کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے یا تو سرے سے دیکھتے ہی نہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو کسی دوسرے زاویے سے۔"[۳]

اسی جگہ انتظار حسین کا یہ تبصرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

"ہوتا یوں ہے کہ کسی سیاسی جوش میں شاعر ہنگامہ میں کود تو پڑتا ہے لیکن ہنگامہ سے نکلنا اسے نہیں آتا۔ یہیں اسی میں کھیت ہوجاتا ہے جوشِ عشق میں بھی یہی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی جوشیلا عاشق اچھی عشقیہ شاعری کرتے ہوئے نہیں پایا گیا۔ وہاں بس Involvement ہوتا ہے، Detachment نہیں آپاتا۔ فیض صاحب نے قرب و دوری کی اور ربط و علیحدگی کی حکمت کو پالیا تھا۔ اپنی اسی بصیرت کی بدولت وہ خالی انقلابی شاعر بننے سے بچ گئے۔ اسی بصیرت کے باعث ان کا عاشقانہ لہجہ عاشقانہ ہی رہا ہے، رقیق القلب رومانیت میں آسودہ نہیں ہوتا۔ ان کے ترقی پسند ہم عصروں کا لہجہ اونچا تھا۔ کہیں خطیب کی گھن گرج، کہیں رقت کا عالم۔

---

[۱] روزنامہ جنگ لاہور اشاعت خاص
[۲] فیض صاحب کا ایک یادگار انٹرویو از نصرت چوہدری ۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ء "جنگ" لاہور
[۳] فیض ایک دوست، ایک دانشور از فقیر سید وحید الدین مرحوم "افکار" فروری ۱۹۸۱ء

فیض صاحب، جوشِ خطابت اور رقت دونوں صورتوں سے بچ کر نکل گئے۔ ایک متوازن لہجہ کو اپنا فن بنایا۔ ان کے بلند آہنگ ہم عصر جلدی چپ ہو گئے۔ ہو بھی جانا چاہیئے تھا۔ سٹیج پر آدمی کتنی دیر کھڑا رہ سکتا ہے اور کتنی دیر اونچا بول سکتا ہے۔ فیض صاحب آہستہ بولے اور لمبے چلے ہیں۔

حمد باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب	لمسِ جانانہ لیے، مستیٔ پیمانہ لیے

فیض کا جرم صرف اس قدر ہے کہ وہ عذابِ ابدی کی طرح مسرتِ ابدی پر بھی یقین رکھتا ہے۔ اسے انسان کی تذلیل سے زیادہ اس کی تکریم سے دلچسپی ہے۔ اس نے عمداً رجائی انداز اختیار کر کے اسے طلبِ مسرت کا وظیفہ بنا دیا ہے۔ انسان کے بلند اور صحت مندانہ تفکر ہی سے ترقی اور عرفان کے راستے پھوٹتے ہیں۔ خیال کا بہاؤ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے اور اس قسم کی منق ذہنی افق پر جمال کا سیلاب نور بن کر نمودار ہوتی ہے، ایک ایسا سیلاب جو زندگی، محبت، مسرت، رحم، عملِ حسن اور ارتفاع کی ست رنگی لہروں کا سرچشمہ ہے۔

تو پیارے قارئین! میں اس گول مول الجھے ہوئے مضمون کو آپ کی فکر کے ساتھ چھوڑے جا رہی ہوں۔ ایوب خاں کے اس زمانے کی بازگشت کے ساتھ جب تانگے پر بیٹھا لاؤڈ سپیکر والا باآوازِ بلند اعلان کرتا تھا:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو	کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی	اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

شعروں کی گھن گرج فضا میں ڈوبتی ابھرتی رہتی اور بھلے لوگ توبہ استغفار کرتے پچھلے کمروں میں جا گھستے۔ نہیں معلوم آج کی فضا میں ان بھلے لوگوں کو اہلِ صفا راس آئیں گے یا نہیں۔ مردودِ حرم مسند نشیں ہوں گے یا نہیں۔ ہونٹ نجات پائیں گے یا نہیں۔ ارضِ خدا کے کعبے سے بت اٹھوائے جائیں گے یا نہیں ——— تاہم آپ رہے تو آپ دیکھیں گے، ہم رہے تو ہم بھی دیکھیں گے کہ انا الحق کا نعرہ کیسے گونجتا ہے اور خلقِ خدا کیسے راج کرتی ہے۔

باقی رہے نام اللہ کا!

---

۱۰ فروری کو کرتمہ مطبوعہ "جنگ" از انتظار حسین

مقبول شاعری اور نامقبول شاعری — ساقی فاروقی کی ایک تحریر کے حوالے سے

کاوش عباسی

یہ مضمون جناب ساقی فاروقی کی ایک تحریر[1] کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے "۳۶ء" اور بعد کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں (سوائے فیض کے) کو بہ یک جنبشِ قلم رد کیا ہے۔ یہ مضمون اس لئے نہیں لکھا گیا کہ ساقی صاحب کے کچھ شاعروں کو ناپسند کرنے کے حق کو مسترد کیا جائے۔ اس میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ "معتوبین ساقی (ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی و دیگر نیز بعد میں آنے والے احمد فراز، حبیب جالب اور افتخار عارف وغیرہ) ساقی صاحب کو اس لئے ناپسند نہیں کہ ان کی شاعری مجموعی طور پر ناقابلِ پسند، دل و دماغ کے تاروں کو نہ چھونے والی اور یکسانیت[2] اور بے تہی کا شکار ہے بلکہ اس لئے کہ شعر و ادب کو دیکھنے اور پرکھنے کے لئے جس "زاویۂ فکر" پر ساقی کھڑے ہیں وہاں سے وہ خود کو خواہ کتنا ہی غیر جانبدار اور "مطلق الخیال" کیوں نہ سمجھیں، اس "زاویے" سے انھیں یہ شاعر اور اُن کی شاعری پسند آ بھی نہیں سکتے۔ شعر و ادب میں اپنے زاویۂ فکر کی نشاندہی انھوں نے اس تحریر میں "جدیدیت" والوں کے تکبیری استحسان سے کر دی ہے، وہ بھی ان ناموں کے حوالے سے جو (اپنے کئے پر) یوں شرمندۂ وقت ہیں کہ آج اپنے دعووں کی وکالتِ نو کی خاطر کوئی مزید "دراز دستی" کرنے کے لئے دوبارہ اُبھرنے کو تیار نہیں۔

سرمایہ دارانہ جمہوری معاشروں میں تمام باہم متصادم فکری تحریکوں کی طرح ادب برائے زندگی کے نظریہ پر مبنی تحریک (انجمن ترقی پسند مصنفین) اور اس کے مقابل ادب برائے ادب کے نظریہ پر مبنی تحریک (حلقۂ اربابِ ذوق، بزمِ سرگودھا وغیرہ) دونو نظریوں میں ابتدا ہی سے کافی پیکار اور زور آزمائی رہی جو آج تک جاری ہے لیکن احترام و بقائے باہمی کے لئے ہر دوسرے سماجی اختلاف و جدل کی طرح اس پیکار اور زور آزمائی کا بھی کوئی ضابطۂ اخلاق ہونا نہایت ضروری ہے۔ شعرا و ادبا میں اَنا پرستی اور خود پسندی اتنی شدید بھی نہیں ہونی چاہئے کہ اپنے سوا سب کو نفرت، دھتکار اور گالی گلوج کا نشانہ بنایا جانے لگے۔ مخالف اور ناپسندیدہ شعرا و ادبا پر شخصی نفرت اور استہزا کی رنگ باری افسوسناک ہے۔ اگر کسی نارمل انسان، ادیب یا غیر ادیب کے خون میں جمہوریت اور عصرِ حاضر کی سماجی اخلاقیات و رواداری کا کچھ اثر موجود ہو تو وہ اپنے نطق و نقد میں دوسروں کے شخصی احترام و حق کو یوں ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دے گا۔

ساقی فاروقی صاحب کی اَنا اپنے "کامیاب" ہم عصر (اور ماضی قریب کے) شعرا و ادبا، خاص طور پر ترقی پسندوں کے خلاف بہت مدت سے مچلتی نظر آتی ہے۔ اُن میں سے اپنے ہم عصروں، احمد فراز اور افتخار عارف، کو تو وہ اصیل Original سمجھنے سے بھی انکاری ہیں۔ ان کا یہ رویہ بجا ہی ہے اور داستان سے زیادہ زیبِ داستان کا ہے۔ میں افتخار عارف کے بارے میں اپنی طرف سے اس احتیاط کا ذکر

---

[1] جمال احسانی کی کتاب "رات کے جاگے ہوئے" کا دیباچہ۔

[2] یکسانیت میرے نزدیک ایک اضافی چیز ہے اور اس کی فردِ جرم اور تاویلیں فرد سے فرد تک مختلف ہیں، مثلاً ساحر لدھیانوی فنی اور فکری لحاظ سے فیض سے یقیناً کم سہی لیکن کچھ مخصوص معنوں میں فیض کے لہجے یعنی انداز کی ایک سی تکرار اور یک سی مٹھاس (اس صورت میں کہ آپ کلیاتِ فیض یا اُن کا کوئی ایک مجموعہ ایک نشست میں پڑھتے جائیں) ساحر کے بیباک اور منفی دھوپ زندگی جیسے تلخ و کشیدہ مگر زندہ، اور ہر صورتِ حال کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتے ہوئے انداز کے مقابلے میں یکساں اور بے اثر حتیٰ کہ بور کر دینے والی لگتی ہے۔

ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ تاحال، اپنی کتاب "عہد ونیم" پر فیض کے پُرمحکم دیباچے کے جائز بجواز اور بدرجۂ اتم مستحق ہونے کے باوجود ادبی دائروں مباحثوں اور اُن میں ادیب شاعر کی فکری پوزیشن، اور فنی سطح کے حوالے سے اپنا آپ پوری طرح ثابت نہیں کر سکے ہیں لیکن احمد فراز اب تک ہم عصر شاعری میں ایک معروف و معتبر نام بن چکے ہیں۔ سو جہاں تک احمد فراز کے بارے میں اُن کی تنقیدیا "نثری ہجویات" کا تعلق ہے، اس کے جواب دو پہلوؤں سے اہم ہیں (۱) بطور شاعر احمد فراز کی ذات کے حوالے سے (۲) شاعری میں مقبولیت، نظریہ، ابلاغ اور فنی سطح کے حوالے سے۔

احمد فراز کا نام ابتدا میں محبت کی جوان، تازہ، پُراثر اور نئے لہجے کی شاعری کے حوالے سے اُبھرا اور نوجوان دلوں پر چھا گیا۔ اس میدان میں اُن کا لہجہ اس قدر نیا، اصیل، صاف، شگفتہ اور سیدھا دل سے نکلنے اور دل میں اترنے والا تھا کہ کم ہی عرصے میں اُن کی کتنی ہی پوری پوری غزلیں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نوجوانوں اور ادیبوں میں زبان زد ہو گئیں۔ کون سا دل تھا جسے اُن کے خود سے اور محبوب سے اور بیداد زمانہ کے بارے میں جذباتی کاٹ اور شگفتگی اور ادبی چاشنی سے بھرپور، سیدھے مکالمے کے انداز نے گھائل نہیں کیا ہوگا جلد ہی اُن کی ایک سے زیادہ کتابیں پورے ملک میں مقبول و معروف ہو گئیں۔

فراز کی ان کتابوں میں کئی جگہوں پر (غزل و نظم دونوں) فیض کی لغت من و عن دکھائی دیتی تھی جو کہ بہت کھٹکتی تھی لیکن فراز کی مقبولیت اُن کے فیضیت زدہ شعروں کی وجہ سے نہیں بلکہ خاص الخاص انہی اشعار کی وجہ سے ہوئی جو فراز کے اپنے خاص انداز کے شعر تھے۔ اور پھر یوں بھی یہ "متاثرہ" اشعار یہ احساس نہیں دیتے تھے جیسے کوئی شخص اپنا قد بڑھانے کے لئے اس میں کسی سرو قامت کی لمبائی شامل کر رہا ہو۔ بلکہ یہ اشعار فیض کے ساتھ فراز کی پُرخلوص اور والہانہ عقیدت کا تاثر دیتے ہیں۔ فراز کی فیض سے براہِ راست اثر پذیری، فیض کے تاثر کو اپنے تخلیقی اور وارداتی سانچے میں ڈھالے بغیر فیض کی لغت کا من و عن استعمال (عام شہرت کے حوالے سے) فراز کے خلاف جاتا ہے، حق میں نہیں۔ پھر اگر منصفانہ طور پر دیکھیں تو یہ کھلی، بے ریا اثر پذیری اُس منافقت اور ادبی بددیانتی سے بدرجہا بہتر ہے کہ آدمی شعر کہتے یا بناتے وقت اپنی خلوت میں نہ جانے کتنے بڑے اور کامیاب شاعروں کے شعروں کا خارجی و باطنی طواف کرتا رہے اور جلوت میں آکر اپنی ذات کے جھوٹے راج محل کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دے۔ میری انتہائی ذاتی رائے میں فراز کی فیض سے یگانگت کی یہ والہانہ کوشش فیض اور فیض کے اندازِ شاعری کے لئے اُن کے اندر ایک معصوم، طفلانہ، دیوانگی کی حد کو چھوتی ہوئی بے پناہ محبت و عقیدت لگتی ہے۔ کاش وہ اپنے اندر خود کو فیض سے علیحدہ سمجھنے اور کرنے کی نفسیاتی قوت پیدا کرتے اور اپنے آپ کو اس عجیب و غریب محتاج کیفیت سے باہر نکال سکتے۔

اب کئی برسوں سے ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ فراز کی فکر و طبع سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف رواں ہے۔ اس کی نشان دہی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان پر اپنے ملک میں ۷۷ء کے مارشل لا کا واقعی بہت شدید ردعمل ہوا (اور اس سلسلے میں عوام کی کم از کم سیاسی آزادی کے حق میں اپنے کھلے موقف کا اظہار کیا) حتیٰ کہ ناراض ہو کر کئی برس تک انھوں نے اپنا ملک ہی چھوڑ دیا۔ یعنی اردگرد کے حالات میں تبدیلی اور بڑھتی ہوئی سختی کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ جوان دلوں کی محبتوں کے گیت گانے والا شاعر اپنے دامنِ سخن کو بھی بہ قدر تابِ دستِ جنوں وسعت دیتا گیا۔

۱۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے وہ نک چڑھے ادیب جو مقبولیت و عظمتِ شعر کو باہم برعکس کہتے ہیں، ان کے پاس اس بات کا معیار اور اس کی وجہ جواز کیا ہے؟ ایسا کونسا قابلِ ذکر شاعر ہے جو کسی موضوع یا خیال پر شعر کہتے ہوئے یہ کوشش نہیں کرتا کہ اس کا شعر اس موضوع یا خیال کو روح سمیت، اس کے تمام ممکنہ پہلوؤں کے ساتھ اپنے اندر سمیٹتا ہو اور طرزِ بیان میں پُرکشش ہو۔ پھر ایسا ہونے کا یقین و اطمینان اسے محض اپنی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے وہ معروضی ثبوت یا تصدیق چاہتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ اسے اس کے اردگرد

کے دوسرے لوگ، اس کے حصولِ کمال کا یقین دلائیں۔ اسی تصدیق اور تحسین کے لئے وہ شعر سناتا یا چھپواتا ہے۔ اگر یہ تصدیق و تحسین حاصل ہو جائے تو شاعر خود کو کامیاب سمجھتا ہے، نہ ہو تو ناکام (اور اس کامیابی یا ناکامی کے لئے وہ ووٹ صرف لیتا ہی نہیں بلکہ دیگر شعرا پر اپنی رائے کی صورت میں دیتا بھی ہے۔ نہ صرف دیتا بلکہ اپنی اس رائے یا ووٹ کو کم و بیش بنیادی اہمیت کا سمجھتا ہے!) لیکن ظاہر ہے کہ جب رائے میں تمام لوگ شامل ہو جائیں تو محض یہ بات اہم اور متعلق نہیں رہتی کہ شعر کا روپ سروپ کیسا ہے یعنی کسی موضوع یا خیال کو شعر میں کیسے نبھایا گیا ہے بلکہ اب رائے میں یہ بات بھی شامل ہو جاتی ہے کہ خود موضوع یا خیال سے قاری یا سامع، لوگ یا اُن کی اکثریت خود کو متعلق یا اُسے کسی لائق سمجھتی ہے یا نہیں کیونکہ موضوع یا خیال جب شعر کی صورت میں نازل ہوا تو وہ محض شاعر کا خیال تھا اور شعر سننے یا پڑھنے والے اُسے محض ایک فرد کی ذہنی کیفیت کہہ کر رد بھی کر سکتے ہیں۔ سو اگر موضوع یا خیال لوگوں کے دلوں کو لگا اور شعر میں قابلِ پسند طریقے سے ڈھالا گیا تو وہ اپنی تصدیق و تحسین کا اظہار واہ سے کرتے ہیں اور شعر و شاعر دونوں کو پسند کرتے ہیں۔ اسی کیفیت کی مجموعی حالت کو "مقبولیت" کہتے ہیں۔ اور اگر شاعر کے موضوع یا خیال نے انھیں نہیں کھینچا بلکہ شعر کی طرف بھی متوجہ نہیں ہونے دیا یا پھر موضوع یا خیال تو ٹھیک تھا مگر اس کی شعری ہیئت ڈھیلی یا غیر مربوط اور بے کشش تھی تو وہ شعر و شاعر سے اپنی بے تعلقی، علیحدگی حتیٰ کہ بیزاری تک کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم اسے "منفی مقبولیت" کہہ سکتے ہیں۔ اپنے بارے میں لوگوں کے اس ثانی الذکر رویّے کا بعض متاثرہ شاعروں کو کچھ زیادہ ہی دکھ ہوتا ہے اور وہ شدید ردِّ عمل کے طور پر اس مقبولیت ہی کے دشمن بن جاتے ہیں اور اسے نیچا دکھانا شروع کر دیتے ہیں جس میں ناکامی نے انھیں یہ دکھ، یہ صدمہ پہنچایا۔

لیکن اس سارے تناظر میں ہمیں کہیں بھی یہ نکتہ اُبھرتا نظر نہیں آتا کہ شعر کی مقبولیت عظمتِ شعر کی نفی کرتی ہے یا یہ کہ شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) نیتاً اپنے طور پر حصولِ مقبولیت کے لئے لکھنے والے۔ (۲) نیتاً، اپنے طور پر مقبولیت کو ناپسند کرنے اور اسے اور اس کے تصور کو خراب شعر سمجھ کر لکھنے والے۔ بلکہ اس سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ "مقبولیت" یا "منفی مقبولیت" کسی شاعر کے "اندر" کا وصف نہیں بلکہ یہ تو اس کے شعروں کو پسند یا ناپسند کرنے کی صورت میں سامعین یا قارئین کی طرف سے ملنے والی ایک تحسینی کیفیت ہے۔ سو اس طرح اس ضمن میں، تمام شاعر ہمیں ایک ہی لائن میں کھڑے نظر آتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا رخ کامیابی کی طرف ہے اور کسی کا ناکامی کی جانب۔ تمام شاعر ایک ہی سورج (یعنی حسنِ تخلیق) کے گرد طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کے چہرۂ سرافراز پر مستقل روشن دن کا نور ہے اور کسی سرِ بگریباں پر کبھی ختم نہ ہونے والی رات کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ نیز نہ ہی ہمیں یہ نظر آیا کہ مقبول شاعر ہونے کا مطلب بلند شعری درجہ کھو دینا ہے۔ اگرچہ ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ گھٹیا یا کم درجے کی شاعری بھی مقبول رہتی ہے مگر یہ مقبولیت بہت عارضی ہوتی ہے لیکن یہ بحث مختلف ہے اور ادبی سے زیادہ سماجی ہے۔ سو اسے ہم کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ ہاں ہمیں اپنی اس بحث میں یہ بات ضرور نظر آتی ہے کہ مقبولیت منفی مقبولیت کے بالعکس ہوتی ہے یعنی اگر آپ کے شعر و موضوعِ شعر لوگوں کے لئے اپیل نہیں رکھتے تو آپ مقبول نہیں بلکہ منفی مقبول ہوں گے کتنی عجیب بات ہے کہ حصولِ منزل کی ناکامی میں آدمی خود کو اور اپنی مساعی کو درست کرنے کی بجائے منزل ہی کو کوسنا شروع کر دے۔

اس ضمن میں دو نکتے قابلِ غور ہیں۔ پہلا یہ کہ شاعر شعر کہتا ہے تو انھیں چھپواتا یا سناتا ہے۔ اگر اس کے شعر کو اچھا کہا جائے تو اس پر خوش اور تسکین یاب ہوتا ہے۔ اور اگر شعر سناتے وقت اس کے کسی شعر کو پسند کیا اور "مکرر" سنانے کو کہا جائے تو وہ دوبارہ (قدرے زیادہ جوش کے ساتھ) سناتا ہے۔ لیکن اگر یہی پسند اور تحسین کسی دوسرے کو ذرا بڑے پیمانے پر حاصل ہو جائے تو اس کے مخالف کھڑا ہو جاتا ہے اور مقبولیت کو بطور ایک کمتر قدر کے ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے یعنی جتنی پسند اور مقبولیت اُسے حاصل ہو، اُس کی فکری سطح کو بلند بتا کر اسے تو عظمتِ شعر کے مترادف گردانتا ہے (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ حلقہ جو کسی "منفی مقبول" شاعر کو پسند کرے، اُسے اُس شاعر نے کم یا بے معیار یا کم معیار کہا ہو بلکہ اپنی برتری کے ساتھ ساتھ اُس حلقے کی فکری و تنقیدی منزلت کو بھی خوب بلند کر کے ظاہر کیا جاتا ہے)

اور جتنی مقبولیت اُسے حاصل نہیں ہوتی اور اس کے مقابلے میں دوسروں کو حاصل ہوتی ہے اُس کے لئے بقول شاعر:

تمہارے بعد نہ دیکھا گیا کسی کا ملاپ
اُڑا دیئے ہیں پرندے شجر میں بیٹھے ہوئے (علیم ہاشمی)

کا وتیرہ اپنایا جاتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کوئی بھی تخلیقی ذہنی سرگرمی انسانی ذات کے دو گوشوں سے پھوٹتی ہے یعنی فکر اور جذبے سے۔ یہ دونو باہم متاثر کرتے اور ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں حاصل تخلیق بھی تغیر پذیر رہتا ہے۔ ذاتِ انسانی کے یہ دونو گوشے اپنی فطرت ہی میں زندہ، بیدار اور صاحبِ نطق ہیں یعنی ذہن جب افکار بُنتا ہے یا دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ذہن و دل میں کسی پُر معنی اور قابلِ فہم زبان میں رواں ہوتے ہیں اور زبان بات چیت اور باہم کہنے سننے کا دوسرا نام ہے یعنی جب آپ فکر و جذبہ کو اپنے دماغ و دل میں بُن رہے ہوتے ہیں تب بھی آپ محوِ گفتگو ہوتے ہیں اور یہ گفتگو صدفی صد تخاطب کے انداز میں ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ کہ اُس وقت اپنے مخاطب آپ خود ہوتے ہیں۔ مگر یہ اہم نہیں کہ مخاطب کون ہے (خود آپ یا دوسرا) بلکہ یہ نتیجہ اہم ہے کہ خود تخلیقِ شعر کی روح ہی تخاطبی ہے یعنی دوسرا سننے والا وجود اس کے خمیر از رے ہی میں شامل ہے۔ سو جب دوسرا شامل ہے تو مقبولیت (کامیابی) اور منفی مقبولیت (ناکامی!) شاعری کے لازمی فطری پہلو ہیں۔

مقبولیت کے بارے میں ہمارا مندرجہ بالا استدلال جھوٹا اور فریقِ مخالف کا رویہ سچا محض ایک صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ فریقِ مخالف (ہماری اصطلاح میں "منفی مقبول" شاعر) اپنے دعویٰ کی استواری اور درستی کے لئے شعر سنانا، نشر کروانا اور اس سلسلے میں لوگوں میں آنا ہی چھوڑ دیں۔ اور یوں بھی اس جھگڑے کو چکانے کی یہ آسان ترین اور تیز ترین شکل ہے لیکن ہمارے ناراض اور غصہ ور بھائی ایسا بھی تو نہیں کر سکیں گے۔ اگر وہ اتنے ہی اصول پسند ہوتے تو بحث جھگڑا کیوں بنتی۔

خیر چلیں ہم بحث کو پھر ساقی فاروقی اور احمد فراز پر لاتے ہیں۔ ساقی فاروقی کے بارے میں ایک بات طے ہے کہ انھوں نے فکری کرب بالخصوص کائنات اور باطنِ ذات کے بارے میں وسیع داخلی سوالوں میں مستقل سر کھپایا ہوا ہے لیکن ابھی وہ جواب تو کجا اپنے سوالوں کی تشکیل میں بھی درمیانی مرحلوں میں ہیں۔ پھر اُن میں، اِن کیفیات کے حامل اشعار میں اظہار کا یہ حال ہے کہ اُن کے الفاظ و لغتِ خیال کو گرفت میں لانے میں اُسی طرح تشنہ اور نامکمل رہتے ہیں۔ جس طرح ابھی تک خود اُن کا خیال اپنی نمائندہ، ہم عصر فکر کو پوری گہرائی، ہم آہنگی اور ہمہ گیر دردمندی سے سمجھنے میں کہیں شروعاتی راستوں میں بھٹکا ہوا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

صدا لگاؤں تو آواز میں گرہ پڑ جائے
مگر سوال کی تقدیس میں کلام نہیں (ساقی فاروقی)

(یہ اچھی بات ہے کہ انہیں خود بھی اپنی اس حالت کا احساس ہے لیکن نہ جانے کب تک وہ اس کی "تقدیس" کا شکار رہیں گے کیونکہ ذہن میں سوال تقدیس کے لئے یا اپنی پوجا کے لئے نہیں ابھرتا بلکہ جواب چاہتا ہے اور انسانی ذہن سے سماجی جواب کا طلبگار ہوتا ہے)

اتنی مدت کی اس وحشت کی سیاحی کے بعد بھی ساقی فاروقی صاحب کی مذکورہ بالا ذہنی صورتِ حال جہاں شاعر کی نامکمل و نارسا فکری و ادبی تربیت کی غمازی کرتی ہے وہاں وہ اس میں شعری موزونیِ طبع کی کوتاہی اور Pick-up کی قوت کا بھی اظہار کرتی ہے جس سے شاعر کی Range متعین ہوتی ہے۔ بہر حال اس سطح پر اُن کے بارے میں کوئی منفی رائے قائم کرنے کے لئے بھی لازمی آخری وجہ موجود نہیں بلکہ میری ذاتی رائے میں اگر ساقی فاروقی نے ٹھوس، سنجیدہ اور گہری فکری و ادبی ریاضت و محنت اختیار کی تو ہم مستقبل میں

ان سے بہت توانا، جاندار، پُرجوش، بلند آہنگ اور تیز دھار شاعری کی بجا طور پر توقع رکھ سکتے ہیں کیونکہ غزل میں اُن کے خیالات اور ڈکشن اصیل، سب سے علیحدہ اور بہت پُر قوت ہیں (ابھی تک میں نے اُن کی کوئی اہم نظم نہیں پڑھی لیکن نظم کے حوالے سے اُن کا یہ پہلو بہت روشن، خوش آئند اور بڑا امید افزا ہے کہ وہ ن۔م۔ راشد کے پرستار اور اُن کے اعلیٰ شعری محاسن کے پُرجوش علمبردار ہیں۔ کاش ہمارا عہد اپنی شاعری میں ن۔م۔ راشد کی آزاد نظم کی بے پناہ ادبی قوت اور گہرے مگر بہرحال براہِ راست انداز سے صحیح اور کما حقہٗ اکتساب کر سکے اور نتیجتاً اپنے تخلیقی سرچشموں سے کچھ نئے بڑے شاہکار ہمیں عطا کر سکے۔ کیونکہ دو بڑوں میں سے جہاں تک ن۔م۔ راشد کے مقابلے میں فیض احمد فیض کی بات ہے تو اس ضمن میں فیض احمد فیض کی ترقی پسندی، اُن کے نظریہ، راست روی اور عوام دوستی کا احترام تو خاص اُن ہی کی چیز ہے۔ لیکن جیسے شعر کو دو پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے۔ (۱) شعر میں کیا کہا گیا۔ (۲) اور کیسے کہا گیا، اسی طرح شعر کی اثریت کو بھی انہی دو پہلوؤں سے پرکھا جا سکتا ہے۔ سو جہاں تک شعر کی اثریت کے پہلے تقاضے کا تعلق ہے تو اس کا جواب تو واضح ہے کہ فیض نے جو سوشلسٹ ترقی پسند شاعر تھے، ترقی پسندانہ افکار اور سوشلسٹ انقلاب کے ٹھوس نظریہ کو پوری علمی تصریح اور فنی جاذبیت کے ساتھ اپنی شاعری میں سمویا ہے لیکن اثریت کے دوسرے تقاضے یعنی شعر کیسے کہا گیا کے ضمن میں عرض ہے کہ فیض کا خاص رومانوی اور (محدود) جمالیاتی انداز کوئی ایسی شے نہیں جو ان افکار و نظریات کی لازم و ملزوم ہیئتِ اظہار ہو۔ بلکہ میں اسے یوں کہتا ہوں کہ یہ ہیئتِ اظہار فیض کی ذات خاص، ان کی طبقاتی اور خاندانی حیثیت اور ان کی شخصیت کی خاص خود مستی، تن آسانی سستی اور (شاید) مرنجاں مرنج طبیعت سے شکل پذیر ہوئی۔ اس لئے ان کی شاعری میں (اُن کی جیل کے اندر کی شاعری کے سوا اور چند دیگر مستثنیات کو چھوڑ کر) محنت۔ برکھپائی، شدت، قوت، روانیٔ طبع، مضامین و بیان کا وفور اور کامل گہرائی اور اُن کی کیفیتی برتری کے عناصر بجھے بجھے اور اُکھڑے اُکھڑے نظر آتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کے یہ پہلو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے عروج کے خاتمے کے بعد شاعری میں عملی اور فنی، ہر دو لحاظ سے بہت کھل کر سامنے آئے۔ اسی لئے اس دور میں وہ حلقے جو فیض کو پوجا کرنے کی حد تک چاہتے تھے، اکثر خود اُنہی کی طرح، اُن لوگوں پر مشتمل ہیں جو آسودہ حال، خوش روزگار اور مطمئن و سہل رہتے ہوئے محض اپنی پرانی محبتوں، وابستگیوں اور جوشِ جوانی کی یادگار اپنے انقلابی نظریوں کے رومانی خوابوں اور خلشوں کے لئے اکتساب تسکین و مستی یا کفارے کی خاطر دربارِ فیض میں آ جاتے ہیں یا پھر وہ لوگ۔ جو ادب میں نظریہ و فنی محاسن وغیرہ کی بحث میں اُلجھے بغیر ادب میں محض معمول کے اکتسابِ لذت و لطف پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ صاف ظاہر ہے فیض کی شاعری کے عظیم، عہد ساز اور اپنے عہد کی اعلیٰ ترین شاعری ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنے والا کوئی بھی عہد، اگر اُسے عظیم اور عہد ساز ادب تخلیق کرنا ہے، وہ فیض کی کم کلامی اور سستیٔ طبعی کا "بارِ گراں" زیادہ دیر تک نہیں اُٹھا سکتا۔

فکری لحاظ سے ادب میں بھی ہمیں فلسفے، نظریے اور سماجی رویے کی طرح دو گروہ نظر آتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ جو انسانی معاشرہ اور اس کے مادی، معاشرتی اور سیاسی، انفرادی اور اجتماعی مسائل سے منہ موڑے محض اپنی پہنائیٔ ذات اور (یا) وسعت و بسیطیت کائنات اور انسانی "فرد" کی کائناتی تنہائی (اسی گروہ کی طرف سے موجودہ صنعتی، طبقاتی معاشرے میں فرد کی تنہائی یعنی سماجی علیحدگی اور اجنبیت کو جب موضوع بنایا جاتا ہے تو یہ تنہائی، اور اس پر خیال آرائی بھی، یا تو پہنائیٔ ذات کے گہرے، پتھریلے گڑھے میں جا گرتی ہے یا پھر معاشرتی مسائل پر بحث سے پرہیز کا شکار ہو کر نیم جاں رہ جاتی ہے) اور انہی مدوں سے متعلق دوسرے مسائل پر دماغ سوزی کرتا رہتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو کائنات، انسانی زندگی اور انسان کو حقیقت مان کر متضاد سماجی پرتوں سے مرکب معاشرے میں انسان کو درپیش انفرادی و اجتماعی، سماجی، سیاسی، فکری، نفسیاتی اور جذباتی مسائل پر قلم اٹھاتا ہے۔ حالاتِ معاشرہ کے شکار مظلوم

انسانوں کے حق میں ان مسائل کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور ان مسائل کو ختم کرنے اور اس کے لئے معاشرے کی ساخت کو بدلنے کے فکر و عمل میں تمام انسانوں کے ساتھ آواز بہ آواز، قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ، غرض کسی بھی شکل میں شریک رہتا ہے۔ یہ گروہ اگر کائنات کی ابتدا، انتہا، ماہیت یا انسانی زندگی کے فانی اور موت کے جابر مطلق ہونے کے بارے میں بات کرتا ہے تو انسان کی بطور اجتماعی نسل کے بارے میں مثبت سائنسی سوچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

ان دونوں ادبی گروہوں کے موضوعات اور ذہنی رخ میں فرق کی وجہ سے ان کے مضامین اور انداز میں بھی فرق رہتا ہے۔ اول الذکر کا موضوع چونکہ قطعی ذاتی، نیم فلسفیانہ، قیاسیاتی، بے نشانہ تفتیش و تحقیقِ ذات (جس کی علت و حاصل ستائش ذات ہی ہوتی ہے)، نفیِ جذبات خیال بندی وغیرہ ہوتا ہے اس لئے اس کا انداز بھی کڑا، انا پرستانہ، خود پسندانہ، پیچیدہ، قیاسیانہ گہرائیوں سے اٹا، یاسیت زدہ، ٹیڑھا، اکھڑا اکھڑا، بھول بھلیاں، اچانک دھماکہ خیز، ناراض، مغرور، مریضانہ اور جذبات کی لوچ اور آنچ سے عاری ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کا موضوع چونکہ حقیقی زندگی کے مسائل و آلام کی نشاندہی، دل پر بیتنے والے روزمرہ کے غم، سینہ چیر کر گزرنے والے خونریز واقعات، زندگی کا دم گھٹ کر چلنے والی گردشِ ایام، عہد جوانی میں محبت کی گرمی و لطف و سرمستی، اس محبت کا خون کرنے والے سماج کے ظالم ہاتھ کے خلاف بغاوت، کمزور اور کچلے ہوئے انسانوں کو مجبور و محکوم رکھنے ان کے معاشی و سماجی استحصال کو جاری و ساری رکھنے کے لئے قدیم جدید اخلاقیات و نظریات اور افکار و مذاہب کو اپنے مذموم و سفاکانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے بالادست گروہوں کی چیرہ دستیاں اور ان چیرہ دستیوں کے خلاف زیر دست انسانوں کی پُرعزم و پُرمقصد فعال جدوجہد اور اُن کا فتح و آزادی کا مل پر مکمل یقین، ملک کی مفلس و زبوں حال آبادی کی حالتِ زار اور اُسے پیدا کرنے والی معاشرتی طاقتوں کے خلاف غم و غصہ، نفرت، احتجاج اور عمل و اقتضائے عمل کا اظہار ہوتا ہے۔ سو ان کے انداز اور لب و لہجہ میں رنج و الم، تلخی، تیزی، شکار آلام جذبات کا دردمندانہ، قابلِ فہم اور دل پر فوراً اثر کرنے والا سیدھا اظہار، احتجاج کی کاٹ، انقلاب کی گونج اور انسانوں سے براہ راست تخاطب خاص طور پر نمایاں رہتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کی اکثریت کو درپیش مسائل اور ان مسائل کی ویسی ہی تشکیل و ترتیبِ اظہار جیسی ان کے ذہنوں میں ہے یعنی اُن کی اور اُن کے جیسے بات کرنے، اُن کے غموں، اُن کی تشویش میں واقعہ بہ واقعہ، قدم بہ قدم شریک ہونے کی وجہ سے ان فنکاروں، شاعروں اور [illegible]ں کو انسانوں کی اکثریت میں مقبولیت حاصل رہتی ہے اور وہ بھی خود کو اور اپنے فن کو عوام کے سامنے جواب دہ محسوس کرتے ہیں جبکہ پہلے گروہ کے شاعروں، ادیبوں کو اُن کی معاشرہ بیزاری کے باعث، ماسوا اُن لوگوں کے جنہیں موجودہ معاشرے میں کوئی قلبی و فکری مسئلہ یا کوئی مصائب درپیش نہیں، یا اگر ہیں تو انھوں نے اُس کا کوئی ابنارمل، خود پرستانہ، انفرادی راستہ ڈھونڈ لیا ہے، کہیں بھی کوئی خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ اپنی اس "ناپذیرائی" کو اس طرح سیدھا تسلیم نہیں کرتے، نہ ہی کر سکتے ہیں کیونکہ مقبولیت یا پذیرائی عام اپنے اندر ایک پہلو شہرت کا بھی رکھتی ہے۔ اور چونکہ یہ شہرت ایک خاص ذاتی چیز بن کر ابھرتی ہے، سو ان ذات پرست اور خود پسند ادیبوں کو طبعاً فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ساتھ ہی اُن کی انسان بیزاری اور مقبولیت دشمنی انھیں کھولاتی ہے کہ شہرت جیسی ذاتی سنہری چیز جو خاص ان کا "استحقاق" ہے، دشمنوں یعنی سیدھی بات کرنے والے انسان دوست اور مقبول شاعروں، ادیبوں کے پاس کیوں ہے سو اس شہرت کو ان سے چھیننے اور اس پر خود قبضہ کرنے کا ان کا شوق جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہیں مقبولیت اور شہرت کو جو دراصل ایک ہی اکائی کے دو پہلو ہیں، باہم علیحدہ و مخالف لا کھڑا کرنے کا تضاد، اور اُسے حل کرنے یعنی مقبولیت کو رد کرتے ہوئے شہرت کو حاصل کرنے میں مسلسل ناکامی، انھیں مزید لاینحل ذہنی مخمصوں اور انا کے الجھاؤوں کا شکار کر دیتی ہے۔ اور آخر تھک ہار کر وہ اپنی

حصولِ شہرت کے پیکرِ تمنا ہی کو اُلٹا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مشہور ہونے کے لئے مقبول ہونا شرط ہے تو شہرت اعلیٰ ذاتی وصف نہیں بلکہ ایک عامیانہ چیز ہے اور بے نامی اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ گراں مایہ ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
(غالب)

تاریخی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے کہ وہ بلند صفت اور اعلیٰ کردار مفکر یا فنکار جو اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ہم قدم چلے، تکالیف و مصائب میں انھوں نے اُن کی آواز کے ساتھ آواز ملائی۔ اُن کے جذبات و خیالات کی رہنمایانہ ترجمانی کی، عوام نے انھیں بے پناہ چاہا، انھیں عظیم جانا، انھیں بے حد عزت و مقبولیت دی، انھیں اپنا ہیرو مانا جبکہ اس کے برعکس اگر کوئی شاعر یا مفکر اپنی انفرادی ذہنی تلاش میں جیتے جی اپنے اندر اُتر گیا یا اکیلا کائنات کے فکری بکھیڑوں میں کھو گیا اور اسی عمل میں سارے کا سارا صرف ہو گیا تو لوگوں نے اس پر افسوس اور اس کے کارناموں اور کمالات پر تحیر و استحسان کا اظہار تو کیا مگر اس سے زیادہ اُسے اپنے دل و دماغ میں جگہ نہیں دی۔

سو اگر لوگوں کے فکری و جذباتی مسائل و مصائب اور ان کے خلاف اُن کی جدوجہد میں شریک شاعروں، ادیبوں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ اُن ادیبوں کا اور عوام کا فنی و فکری عامیانہ پن اور کمتری نہیں کیونکہ اگر انسان دوست مقبول شاعروں، ادیبوں کے زبان و بیان یا نفسِ مضمون میں سادگی، سلاست اور آسانی نظر آتی ہے تو وہ اُن کی کم گہرائی، کم سنجیدگی یا کم درجے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اُن کے موضوعات کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اُن کا کلام یوں سہل، رسا اور قابلِ فہم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ساحر لدھیانوی، ساقی فاروقی اور دیگر مقبولیت دشمن یا "منفی مقبول" شاعروں، ادیبوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں، اگر ترقی پسند شاعر نہ ہوتے بلکہ چلئے بعض مفروضہ ابنارمل وجوہات کی بنا پر پہلے گروہ کے مرونا مدار (برائے نام) ہوتے تو جو ذہنی قوت، جذباتی شدت، صفائیِ قلب اور اپنے موضوع تک واضح اور براہِ راست تخلیقی، وجدانی رسائی کے اوصاف اُن میں تھے، وہ مقبولیت دشمن گروہ کے ہم عصروں سے (اُن کے میدان و مضامین میں) بدرجہا بلند تر شعر کہہ سکتے تھے (یہ دعویٰ احمد فراز کے لئے بھی پوری طرح صحیح ہے) یا چلئے اس کے بالعکس میرا چیلنج ہے کہ وہ شعرا جو کئی سالوں سے مقبولیت وغیرہ کے خلاف پتا مار کر بیٹھے ہیں، وہ ترقی پسندوں کی کم عیاری کے بارے میں اپنے بیان کو سچا ثابت کرنے کی خاطر محض ایک سال کے لئے ساحر لدھیانوی یا احمد فراز (افتخار عارف جونیئر سہی) کی طرح فکری و جذباتی راستی و شدت، ادبی قوت اور واردات سے پُر کچھ چیزیں، بادلِ نخواستہ ہی سہی، لکھ کر دکھا دیں، ہم مان لیں گے کہ وہ واقعی مقابلتاً ان سے بڑے شاعر ہیں اور یہ کہ "مقبولیت" کے دامن میں محض عامیانہ اور کم درجے کے شاعروں کا ڈھیر رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ متعلقہ شعرا میرے اس چیلنج کو نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنی ان معروضات کو ختم کرتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ ہمارے پُر جوش شعرا "حق بیانی" میں ہر انسان پر عاید اور واجب معاشرتی فرائض اور ضابطوں کو نظر انداز نہیں کریں گے اور خود کو بلند کریں گے تو اپنی اعلیٰ شاعری کی اٹھان ہی سے بلند کریں گے نہ کہ مقابل کے شعرا پر نیم وحشیانہ سواری سے۔

انڈالوجی — ۴ (اساطیر — ۲)

رشید ملک

"کسی اور مذہب یا ثقافت میں اساطیر اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی کہ ہندو مذہب اور ثقافت میں"۔ (وان بیوٹینن : ۹۲۷) اور ہندوؤں نے "اپنی صنمیات، دیوی دیوتاؤں اور ہیروز کے ذریعے اپنے آدرشوں عقیدوں اور روایات کا کہیں زیادہ پر زور اظہار کیا ہے۔ (ڈائنڈیکر ۲۰۲: ۲۳۳)

"یونان میں کائنات سے متعلق مسائل کے حل منطق اور ابھرتے ہوئے نئے علوم —— ریاضیات، فزکس اور فلکیات سے حاصل کئے جاتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں اساطیر فلسفے کی اعانت سے کبھی دست بردار نہیں ہوئیں۔ ایپک روایات کی زرخیزی اور دیوتاؤں کے خد و خال جن کا تنائج، بروز اور کارہائے نمایاں اساطیر کا موضوع ہیں، عوام اور خواص کی مذہبی علامات بن جاتی ہیں اور بار بار گرؤوں اور پنڈتوں کے زیر استعمال رہتی ہیں۔ یہ سچائی کو بار بار تازہ کرنے والے تجربات کا حصہ اور ان کے ابلاغ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اساطیر اور فلسفے میں دوستی نے قدیم و جدید، اعلیٰ ترین اور ادنیٰ ترین میں باہمی تعاون قائم کیا جس کے نتیجے میں ہندو تہذیب میں روحانی معنویت رچ بس گئی۔" (زمر: ۲۶) اور یہ خیال اس وقت مزید واضح ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ "اپنشدوں میں اساطیری عناصر مجموعی طور پر اپنشدوں کے فلسفیانہ تعلیمات کے تحت ہو جاتے ہیں۔" (ڈانڈیکر: ۲۴۲)

کچھ حکما کا یہ خیال ہے کہ رگ وید کے حامل قبائل نے ہندوستان کے قدیم تر قبائل کے مذہبی عقائد کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اساطیر میں بھی خصوصاً تخلیق اور کونیات کے متعلق اساطیر میں یہی صورت پیش آئی (چٹرجی : ۱۵۱) ہندو مذہب میں تو بہت سارے ایسے عناصر ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قدیم قوموں کی میراث کی باقیات ہیں لیکن ہندو اساطیر کے بارے میں ایسا کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہندو اساطیر ساز نسل در نسل ان اساطیر میں اضافے کرتے چلے گئے۔ ان کو انتخابات کے عملوں سے گزارتے رہے، انھیں بناتے سنوارتے رہے اور ان کو مسلسل نئی صورتیں دیتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا بنیادی مواد جس کا تعلق ہندوستان کے اصلی باشندوں سے تھا، یا ان قدیم نسلوں سے جو زمانہ قبل از تاریخ سے یہاں آباد تھیں، اس انضمام، اعادہ، تکرار اور نظر ثانی کی پے بہ پے عمل میں کہیں دب کر رہ گیا۔ اب اس کا سراغ لگانا ماہرین کے بس کی بات نہیں۔ اساطیر کے ماہرین کے جدید طریقہ ہائے کار کا ہندو اساطیر پر اطلاق کوئی صحیح نتائج مرتب کرنے سے قاصر ہے اور یہ طریقہ ہائے کار اس وقت ہی صحیح طور پر بار آور ہو سکتے ہیں جب ہندوستان میں بسنے والے قدیم باشندوں کی نسلوں، ان نسلوں کے ادغام اور ان کے عقاید مذاہب، ثقافت اور تمدن کی آمیزش پر گہرے اور مکمل مطالعات مرتب ہوں گے۔ (بھٹا چارجی : ۱)

اور ہندوستان میں علم کا یہ شعبہ ابھی اپنی طفولیت ہی سے گزر رہا ہے اور اس کے پھلنے پھولنے کے راستے میں مشکلات حائل ہیں۔ اول مذہب اور نسل کے رشتوں کے مطالعہ کو ثقہ اہل علم اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور دوم جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے اساطیر میں قدیم نسلوں کے عناصر ماضی کی ایک دبیز گرد کے نیچے دب کر نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اب ان تک پہونچنا ناممکن ہے۔

ہندوستان پچھلی دو صدیوں سے ماہرین کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اساطیر کے مطالعہ کے حوالے سے اس زمانے میں دو رجحانات سامنے

آتے ہیں۔ علم الانسان کے شعبے میں اے۔ بی۔ ٹائلر، ہربرٹ سپنسر، لیوی بروہل، اینڈریو لینگ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے وحشی قبائل کا مطالعہ کیا اور ان کی اساطیر کے ان مناہج تک پہونچے جن میں مظاہر پرستی، ٹوٹم ازم، مردہ پرستی، اشیا پرستی، سورج اور چاند کی پرستش، ارواح اور اجرام فلکی پرستی جیسے موضوعات ہیں۔ دوسرا رجحان ماہرین انڈالوجی کا تھا۔ انھوں نے لسانیات کو بنیاد بنایا۔ ان میں میکس میولر، بجے بجے میئر، سرمونیئر مونیئر ولیمز اور برگین شامل ہیں۔ ان ماہرین نے مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی ایک سے متعلق ہوکر لسانی مطالعات کے ذریعے اکٹھی کی ہوئی شہادت کی بنا پر اساطیر کے بارے میں نظریہ سازی کی۔

انیسویں صدی میں کچھ نئے ماہرین جیسے فرائڈ، ژونگ، فریزر، جین ہیریسن اور ہک نے بھی نئے سرے سے وحشی قبائل کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے مرتب کردہ نظریات کا ہندوستان کی صورت حال پر اطلاق کیا۔ حکما کے ایک اور مکتب میں ڈیموزل، رینو، گونڈا، زمر اور کمارا سوامی ہیں جو بنیادی طور پر انڈالوجسٹ ہیں لیکن اپنے اپنے مطالعات کے علاوہ، انڈالوجی کے دوسرے شعبوں میں جو کام ہو رہا ہے، اس پر بھی وہ نظر رکھتے ہیں۔ ژونگ کے کام کی بنیاد فرائڈ کے نظریات پر ہے۔ وہ فرائڈ کا شاگرد بھی ہے اور ناقد بھی۔ فرائڈ سے ہٹ کر اس نے آرکی ٹائپس کا خیال پیش کیا۔ ژونگ کا کہنا تھا کہ انسان آرکی ٹائپس میں سوچتا ہے جو اس کے سماجی لاشعور میں پیوست ہیں۔ اساطیر انھی آرکی ٹائپس کا مظہر ہیں۔ نئے نظریات کی طرح یہ نظریہ بھی کافی مقبول رہا لیکن چونکہ ژونگ نے اساطیر کی تاویل کرتے وقت صرف نظر کر دیا وہ یہ تھا کہ اساطیر کی سوچ کے ساتھ ساتھ انسان کی منطقی سوچ بھی چلتی رہی ہے اور اساطیر کی تعبیر کرنے میں اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوم ہم اوپر پہلی قسط میں مذہبی عقائد اور رسومات کا اساطیر سے گہرا رشتہ دیکھ آئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سب اساطیر مذہبی اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں لیکن یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر تمام کی تمام نہیں تو بیشتر اساطیر مذہب، عقائد اور مذہبی رسومات سے متعلق ہیں اور منطقی طور پر باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ادھر فریزر نے اپنے کام میں مختلف وحشی معاشروں میں جغرافیائی بعد و قرب کو بڑی اہمیت دی اور جادو اور مذہب کو آپس میں خلط ملط کر دیا۔ کیمبرج مکتب فکر سے متعلق مذہبی رسوم کا مطالعہ کرنے والی جین ہیریسن اور اس کے رفقائے کار گلبرٹ مرے اور ہک نے اپنے آپ کو سوشل سائنس کے فرانسیسی مفکر ایمل ڈرخائم سے متعلق کرکے اساطیر اور مذہبی رسومات کے تعلق پر نظر ثانی کی اور اساطیر کی تاویل و تعبیر مذہبی رسومات سے کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

ان موضوعات پر تحقیق سے مختلف علوم کے افق وسیع ہوئے۔ ان میں پیش پیش علم الاساطیر تھا لیکن سماجی علم الانسان کے ماہرین نے اپنے نتائج کا انطباق ہندوؤں کی اساطیر پر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اول ہندوستان ان کی تحقیقات کے مراکز سے دور تھا اور دوم علم الآثار ابھی وہ ڈھانچہ مرتب نہیں کر پایا تھا جس کی روشنی میں عقائد و رسومات پر نظر ڈالی جا سکے۔ یوں ہندوستان کے اساطیر کو بطور امثال ان مطالعات میں جگہ تو ضرور ملی لیکن ان کا منظم مطالعہ گہری نظر سے نہ ہو سکا۔ موجودہ دور میں ہندوستان کی اسطور پر کام کرنے والوں میں زمر اور جوزف کیمبل آتے ہیں۔

لسانیات کے شعبے پر میکس میولر سایہ فگن رہا اور اساطیر کے شعبے میں بھی اس کا سکہ چلتا رہا۔ موجودہ دور میں ڈیموزل، گونڈا اور رینو نے اساطیر کے مطالعہ کے خطوط مختلف سمتوں میں متعین کئے۔ کمارا سوامی اور زمر کے اساطیری مطالعہ پر فلسفیانہ رنگ زیادہ غالب ہے۔ وہ اساطیر میں علامتی عناصر کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ جوزف کیمبل نے جو زمر کا فرزند معنوی ہے، زمر کے بہت سارے کام کو اس کی وفات کے بعد اڈیٹ کرکے شائع کیا۔ وہ زمر سے بہت متاثر ہے اور انھیں خطوط پر کام کر رہا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے (فنون محولہ بالا) موجودہ دور میں اساطیر کے مطالعہ میں مرسیا ایلیڈ ایک اہم نام ہے۔ اس عالم نے اساطیر کے علوم کے مختلف مکاتب کے تمام نتائج سے استفادہ کیا اور اس عمل میں علامتی، تاریخی، فلسفیانہ مکاتب کے انتہا پسندانہ اور سماجی علم الانسان کے مکتب جس سے ٹائلر وابستہ تھا کے خشک اور غیر حقیقت پسندانہ نتائج صرف نظر کرکے ایک نئی راہ نکالی۔ اس نے ان اساطیر کے مختلف نظاموں میں مشترک نمونے تلاش کرنے کے بعد ان نمونوں کی جڑوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس روش کو لیوی سٹراس کے اندرونی ساختیاتی "نظریات

سے پرزور تائید حاصل ہوئی۔ ان کی مدد سے اس نے اساطیر کی نشوونما، ارتقاء، تغیر اور ان کے مختلف ابعاد کا مطالعہ کیا۔ اس کے خیال میں اساطیر عوام کے مرکزی اور ناگزیر تجربات کا خارجی مظہر ہیں لیکن وہ اساطیر میں ما لی ہو سکتی ہے بھی زیادہ گہرا اترتا ہے اور ان تجربات کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کرتا جن کا اساطیر ایک خارجی اظہار ہیں۔ یہ روش بہت زیادہ زرخیز نظر آتی ہے اور حالیہ دور کے ماہرین ہندوستانی (بھٹا چارجی) اور دوسری اقوام کی اساطیر پر (کرک) اس روش کے اطلاق کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں اساطیر کی تاریخ تین ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے، گو "یونانی طرز کی اساطیر رگ وید میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں" (زہنر: ۲۲) لیکن کئی دیگر علوم کی طرح ہمارے علم کا نقطۂ آغاز رگ وید ہی ہے۔

ہندو اساطیر کوئی جامد موضوع نہیں۔ اس میں اتھل پتھل کی صورت میں حرکت موجود رہی ہے۔ اس حرکت کے پیش نظر ہندو اساطیر کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور رگ وید سے قبل کا ہے۔ اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب یہ قبائل ترکی، شام، عراق اور مصر میں مقیم تھے اور ابھی انھوں نے ہندوستان کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس زمانے کے اہم ترین دیوتا وہ تھے جن کے ناموں کا تو ہمیں پتہ ہے لیکن ان کی اہمیت رگ وید میں غیر واضح ہے بوغاز کوئی کے عہد نامے میں ورون، مترا، اندر اور نساتیہ کے نام آئے ہیں۔ یہ نکتہ اندر کی اسطور کی تحلیل کے لئے بہت اہم ہے۔

ہندو اساطیر کا دوسرا دور رگ وید سے شروع ہو کر اس سے ملحق براہمنوں تک آتا ہے۔ یہ دور چند صدیوں پر محیط ہے۔ اسی زمانے کی بالخصوص رگ وید کی اساطیر ان سطور کا موضوع ہیں۔

پرانوں اور مہابھارت اور رامائن کے ساتھ ہم ان اساطیر کے تیسرے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس دور میں بھی سابقہ عمل جاری رہا۔ نئے دیوتا ـــــ رام، کرشن، وشنو، گنیش، شو، ہنومان وغیرہ نظر آنے لگتے ہیں، بیشتر ویدک دیوتا غائب ہو جاتے ہیں یا نئے دیوتاؤں کے روپ میں نظر آنا شروع کر دیتے ہیں جیسے ایک رائے کے مطابق اندر، کرشن کا روپ اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے کرشن کا پیشرو سمجھا جاتا ہے (زہنر: ۲۳، ۲۴) ہمارا تعلق صرف رگ وید کی اساطیر تک ہے اس لئے اس مرحلے کی ہمارے لئے صرف اتنی اہمیت ہے کہ رگ وید کی اساطیر کو پرانوں، مہابھارت اور رامائن کی اساطیر کی مدد سے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ اوفلے ہارٹی اور اس علم کی اور متخصص بھٹا چارجی نے اپنایا ہے اور بہتر نتائج مرتب کئے ہیں۔

اپنی ضخامت کے لحاظ سے رگ وید ہند یورپی اقوام کی اساطیر کا بہت بڑا خزانہ ہے جس کا موازنہ صرف یونانی اساطیر سے کیا جا سکتا ہے" (آپٹے: ۲۶۱) ہندو مذہب دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے "اس کی داستانوں اور اساطیر کا مجموعہ دنیا بھر میں سب سے بڑا ہے، جو ارفع ترین سے لے کر بیہودہ اور کبھی کبھی مکروہ (بشمول) کہانیوں پر مشتمل ہے" (باشم (مرتب) ۱۹۷۵: ۸۰) "گو یونانی طرز کی اساطیر رگ وید میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں" (زہنر: ۳۳) لیکن کئی دیگر علوم کی طرح ہمارے علم کا نقطۂ آغاز رگ وید ہی ہے۔ اس میں مذکور دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ بنتی ہے (رگ وید اول ۱۳۹ ـــ ۱۱، ہشتم ۲۸ ـــ ۱ اور ۳۰ ـــ ۳) ان دیوتاؤں کو یاسک نے مندرجہ ذیل تین زمروں میں تقسیم کیا تھا۔

سماوی دیوتا: سوریہ، دیاؤس، ورون، مترا، ساوتر، پوشن، وشنو، وشاوت، آدتیہ، اوشا، اشونی۔

ہوائی دیوتا: ۔ ۔ ۔ ۔ اندر، ترتت، آپت، اپام نپات، متر شون، آہی، بدہنی، اجاکپاد، رودر، ماروت، واتو وات، پرجانیا، اپا۔

ارضی دیوتا: ـــ سرسوتی، پرتھوی، اگنی، برہسپتی، سوم اور چند دریا۔

یہ تقسیم معاشرے کی تقسیم پر مبنی تھی جس میں برہمن، کشتری اور ویش تین بڑے طبقے موجود تھے "دیوتاؤں کے معاشرے کے تین طبقوں میں تقسیم معقول ہے لیکن جیسا کہ مذاہب میں اکثر ہوتا ہے، یہاں یا ناں کا سوال نہیں بلکہ یہ مطابقت، مشابہت اور باہمی ربط کا سوال ہے۔ رگ وید کے ہندوستانیوں

نے خود ہی اعلان کر دیا تھا کہ براہمنوں، کشتریوں اور کسانوں کے تین بڑے طبقوں کی آگ کے دیوتا اگنی، جنگجو دیوتا اندر اور وشو دیوا (سب دیوتا) سے مماثلت ہے اور دیولوک کے لوگوں کی عام لوگوں سے مطابقت ہے۔" (وزیر آغا: ۱۸)

ویدک دیوتاؤں کے ہر طبقے کی نمائندگی ایک۔ دیوتا کے سپرد تھی۔ ارضی طبقہ اگنی کے سپرد تھا، ہوائی اندر کے اور سماوی سوریہ یعنی سورج کے، ہر دیوتا کے دائرہ ہائے کار بدلتے رہتے تھے، اس طرح ان کے خطابات بھی بدلتے رہتے تھے۔ کئی دیوتا ایسے بھی تھے جن کے دائرہ ہائے کار ایک سے زیادہ تھے۔ دیوتاؤں کی یہ تقسیم حتمی نہیں تھی اور دیوتا اپنے طبقے بدلتے رہتے تھے۔ پرتھوی تینوں طبقوں میں نظر آتا ہے اور اگنی ارضی ہونے کے باوجود سماوی اور ہوائی طبقے میں بھی نظر آتا ہے۔

ہندو اساطیر میں کوئی ایک دیوتا دیگر دیوتاؤں کا سردار یا سربراہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کوئی دیوتا نہیں تھا جو باقی دیوتاؤں پر حکمرانی کرتا یا جس کے تابع باقی دیوتا ہوتے۔ دعا کے وقت جس دیوتا کو مخاطب کیا جاتا تھا اس وقت وہی سب سے بڑا دیوتا ہوتا تھا۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے کیونکہ اس مسئلے کو وحدت کے تصور سے جوڑا جاتا ہے۔ کئی مقامات پر دیوتاؤں کا مشترک دائرۂ عمل یا دائرہ اختیار رگ وید کی اساطیر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ایک مخصوص دائرے میں سب سے بڑا دیوتا بدلتا رہتا ہے۔ اس عمل کو میکس میولر نے ہینوتھی ازم یا کینوتھی ازم کا نام دیا۔

رگ وید کے دیوتا انسانوں جیسے تھے۔ وہ انسانوں کی طرح پیدا ہوتے تھے انہی کی طرح کھاتے تھے، پیتے تھے، سوتے تھے، شادیاں کر کے بچے پیدا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں انسانوں جیسی تمام خوبیاں اور کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔ وہ قربانیوں میں شریک ہوتے تھے۔ انسانوں کے پیش کیے ہوئے نذرانے قبول کرتے تھے، وہ انسانوں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ انسان نے انھیں اپنے ہی روپ میں ڈھالا تھا۔ انسانوں اور دیوتاؤں میں وہی فرق تھا جو بادشاہ اور رعایا میں ہوتا ہے ؛

تراشیدم صنم برصورتِ خویش ۔۔۔ بشکلِ خود خدا را نقش بستم (اقبال)

رگ وید میں مذکور دیوتاؤں کا تشخص اور سراپا دھندلا دھندلا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ان تفصیلات سے ـــــ ناک نقشہ، آنکھ، کان بازو، ہاتھ، ہونٹ، رنگت، ـــــ جو رگ وید مہیا کرتا ہے۔ ان دیوتاؤں کی اپنے ذہنوں میں کوئی تجسیم کر سکیں۔ بقول میکڈانل یاسک نے بھی اپنی کتاب نیرکتا (۷،۴) میں اس مشکل کا اظہار کیا ہے کہ جو کچھ ان کے بارے میں ملتا ہے ان کے تشخص کے لئے ناکافی ہے جیسے سوریہ اور پرتھوی (میکڈانل: ۱۵) تاریخ میں ویدک زمانے کے قبائل میں بت پرستی نہ ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان دیوتاؤں کا سراپا مبہم تھا اور یہ کہنا کہ "قدیم آریا بت پرستی کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے" (وزیر آغا: ۶۶) تاریخی لحاظ سے قطعاً بے بنیاد ہے کیونکہ متانیوں اور ایرانیوں میں جو اپنے آپ کو آریا کہتے تھے، بت موجود تھے۔ بوغاز کوئی کی کھدائی میں کافی بت برآمد ہوئے ہیں اور کتابوں میں ان کی تصاویر بھی چھپ چکی ہیں۔ ایران میں پیرپولس بتوں سے اٹا ہوا تھا۔ سائرس کے بت بھی موجود ہیں۔

ان دیوتاؤں کے دھندلے سراپے کی وجوہات میکڈانل یہ بتاتا ہے کہ رگ وید کے یہ دیوتا باقی دوسرے ہند یورپی اقوام کے دیوتاؤں کے مقابلے میں فطرت کے ان مظاہر کے زیادہ قریب تھے جن کی وہ نمائندگی کرتے تھے۔ میکڈانل نے رگ وید کے دیوتاؤں کے دھندلے تشخص کی کئی اور وجوہات بھی بتائی ہیں۔

(۱) اشتراکِ صفات۔ کئی دیوتاؤں کی صفات مشترک ہیں جیسے سوریہ، اگنی اور اوشا میں درخشندگی۔

(۲) اشتراکِ عمل۔ رگ وید کے دیوتاؤں کے وظائف علیحدہ علیحدہ بیان نہیں کیے گئے۔ ایک دیوتا کسی دوسرے دیوتا کا فرض ادا کر دیتا ہے۔ بارہ دیوتا مل کر سورج بناتے ہیں اور اسے آسمان میں قائم کرتے ہیں۔ اگنی اپنی روشنی سے تاریکی کو بھگاتا ہے تو ہوا کا دیوتا اندر آسمانی بجلی سے تاریکی کو تباہ کر دیتا ہے۔ یوں آگ کے دیوتا کے فرائض میں ہوا کے دیوتا کے فرائض شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ رشی اپنے پسندیدہ دیوتا کی ثنا خوانی کرتے

وقت دیوتاؤں کی صفات بھی ان کے اوصاف میں شامل کر دیتے ہیں اور کسی خاص دیوتا کو بزرگ ترین بنانے کے عمل میں وہ دیگر دیوتاؤں کے شعار اس دیوتا کو ودیعت کر دیتے تھے۔ اس روش سے خاصا انتشار پیدا ہوا۔ مثلاً رگ وید کہتا ہے، جو صرف ایک ہے، اسے عقلمند کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔ وہ اسے اگنی، یم اور متر شون کہتے ہیں، (رگ وید ۱-۱۶۴-۴۶ اور زہنر: ۶)

(۳) مشترکہ نمائندگی۔ فطرت کے کسی مظہر کے کسی ایک پہلو کی نمائندگی کے لئے کئی ایک دیوتا مامور کر دیئے جاتے ہیں۔

(۴) طرزِ تحریر۔ کتاب کا اپنا طرزِ تحریر بھی دیوتاؤں کے تشخص کے بارے میں ابہام کا موجب ہے۔ مثال: "اے اگنی پیدائش کے وقت تم ورون ہو، جب تم روشن ہو جاتے ہو تو تم متر بن جاتے ہو اور اے دیوتا ژں کے بیٹے تم میں سب دیوتا موجود ہیں"۔ (رگ وید: ۵-۲-۱)

(۵) رگ وید کے مطالعہ سے ایک اور لیکن مختلف روش سامنے آتی ہے۔ اس کتاب میں کئی مقامات پر دو دو دیوتاؤں کو مناجات میں اکٹھے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ایسے بارہ دیوتا ہیں جن کے ناموں کو دوسرے دیوتاؤں کے ناموں سے ملا کر پکارا گیا ہے جیسے اے متر ورون، اے اندر اگنی وغیرہ۔ اندر کا نام سات مرتبہ اس طرح پکارا گیا ہے۔ ۲۲ مناجاتوں میں متر اور ورون کو، گیارہ میں اندر اور اگنی کو، نو میں اندر اور ورون، سات میں اندر وایو، چھ میں اندر پرتھوی، دو میں اندر اور سوم، مزید دو میں اندر برہسپتی اور ایک ایک میں اندر پوشن، سوم پوشن، سوم اور ردر اور اگنی سوم کو اکٹھا کر کے پکارا گیا ہے۔ ان بڑے دیوتاؤں کے علاوہ بھی کئی غیر معروف دیوتاؤں کو ایسے ہی پکارا گیا ہے مثلاً اندر، نساتیہ، اندر بروتا، اندر ماروت، اگنی، برجانیہ، سوریہ ماسہ اور سوریہ چندماسہ۔

رگ وید کا یہ اسلوب دیوتاؤں کے بارے میں اس ابہام کو مزید گہرا کرتا ہے۔ ایک عرصہ سے یہ مسئلہ حکما کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ جو اس کی مختلف تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ ان تاویلوں میں سچائی کا عنصر ہے۔ حال (۱۹۷۲) ہی میں ہالینڈ کے مشہور و معروف انڈالوجسٹ پروفیسر (ایمیریٹس) جے گونڈا نے اپنی کتاب The Dual Dieties in the Religion of the Veda میں رگ وید کی مندرجہ بالا روش پر اپنی کتاب کے پہلے ۹۳ صفحات میں نئی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں یہ روش ویدوں کے حامل ان قبائل کے ہاں کائنات میں ثنویت کے اصول کا عکس ہے۔ اپنی باقی ماندہ کتاب میں دیوتاؤں کے مندرجہ بالا جوڑوں میں سے ۱۴ کی انھوں نے تشریح کی ہے۔ اپنے اس نظریہ کے حق میں دیگر حکماء کے علاوہ وہ دوسرے مذاہب، ثقافتوں اور روایات سے شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

(۶) ان دیوتاؤں کے بارے میں ابہام کی ایک اچھی توضیح اور ہے۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ ان قبائل کی اساطیر تین مختلف مراحل سے گزری ہیں اور ہر مرحلے میں دیویوں دیوتاؤں کے تشخص، کردار اور دائرۂ عمل میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ پہلا مرحلہ رگ وید کی تدوین سے پہلے کا ہے جب یہ قبائل ترکی، مصر، شام اور عراق میں مقیم تھے۔"

بوغاز کوئی میں یہ چاروں دیوتا یعنی اندر، ورون، اگنی اور نساتیہ اسی زمانے کے دیوتا ہیں۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان قبائل کی روحانی، نفسیاتی اور جسمانی ضروریات کے پیش نظر ان دیوتاؤں کی اور رگ وید میں مذکور کئی دیگر دیوتاؤں کی جیسے دیاؤس، ورون، متر، ساوتر، پوشن وغیرہ کی اہمیت بدلتی رہی۔ جب ان قبائل کا ہندوستان میں وارد ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس زمانے میں جو ایک لمبے عرصہ پر محیط تھا، ان دیوتاؤں کی اہمیت میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کئی مذکورہ دیوتا پس منظر میں چلے گئے اور کچھ اندر کی طرح زیادہ طاقتور ہو کر سامنے آ گئے۔ اندر کا وقار اتنا بڑھا کہ رگ وید کے اختتام سے پہلے وہ دیوتاؤں کا دیوتا بن گیا لیکن اس کے مقابلے میں دوسرے تمام دیوتاؤں کا اندر کے مقابلے میں تشخص دھندلا گیا ہے اور ان کے بارے میں اتنی تفصیلات نہیں ملتیں کہ ان کا ایک جسمانی تصور قائم کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ دیوتا جو رگ وید کے حامل قبائل کے ہندوستان میں داخلے سے پہلے اقتدار میں تھے رگ وید میں دھندلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دھندلے پن کے اس معمے کی یہ بہتر تشریح ہے کہ رگ میں مذکور دیوتا ان ہند یورپی قبائل کے ہندوستان میں داخلے سے پہلے کے دیوتاؤں کی باقیات ہیں۔ (ایضاً جارجی: ۵)

یہ اپنی جگہ درست ہے کہ رگ وید ہندو اساطیر کا سرچشمہ ہے لیکن غور سے مطالعہ کرنے والا قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ رگ وید میں کوئی اسطور بھی اپنی مربوط صورت میں موجود نہیں اور کوئی کہانی یا داستان شروع سے لے کر آخر تک مکمل صورت میں بیان نہیں کی گئی۔ جو ہے وہ مختلف دیوتاؤں مثلاً اندر، اگنی، سوم وغیرہ کے کارناموں کے بارے میں تلمیحات ہیں یا استعارے ہیں۔ (او فلے ہارٹی ۱۹۷۸، ۱۷-۵۱)
اگر ایک مناجات میں اندر کے ورتر کے قتل کی طرف اشارہ ہے تو کہیں دور جا کر کسی دوسری مناجات میں اس کے مویشیوں کو دشمنوں سے چھڑانے کی طرف کوئی تلمیح مل جاتی ہے۔ کسی تیسری مناجات میں اندر کے ۹۹ قلعوں کو فتح کرنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ رگ وید اگر اساطیر کا مجموعہ ہے تو اس میں ایک بھی اسطور مکمل صورت میں نہیں ملتی۔ اندر اس امر کی خوبصورت ترین مثال ہے جس کی تاریخی سوانح مرتب کرنا اس لیے ناممکن ہے کہ ان پُراسرار تلمیحات سے کسی اسطور کی تعمیرِ نو کرنا محال ہے" (باشم، ۲۳۴)۔ اگرچہ یہ ملاحظہ اندر کے سیاق و سباق میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس کا اطلاق پورے رگ وید پر ہوتا ہے۔ ہم مزید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تلمیحات اور استعاروں کی بھرمار سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تلمیحات جن دیوتاؤں سے متعلق ہیں وہ رگ وید کی مناجات کی تصنیف و تدوین سے بہت پہلے وجود میں آ چکے ہوں گے۔ ہم اگر اس نتیجے کو قبول نہ کریں تو پورا رگ وید معنویت سے بالکل عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی معنویت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ نتیجہ قبول کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ رگ وید میں مذکور دیوتا ـــــ درون، اندر، اگنی، سوم وغیرہ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ـــــ اس کتاب کے حامل قبائل کے ہندوستان میں داخلے سے بہت پہلے بلکہ صدیوں پہلے وجود میں آ چکے تھے اور ان قبائل کی عبودیت کا مرکز تھے۔ اس نتیجے کے حق میں شہادت بوغاز کوئی کے عہد نامے اور یونانی اور رومن اساطیر سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ ان قبائل کے ہندوستان میں داخلے کی کسی تاریخ کا تعین نہیں اور نہ ہی داخلے کا یہ عمل چند سالوں میں مکمل ہوا۔ اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر اور تاریخ کی روشنی میں دوسرے دیگر قبائل کی نقل مکانی کا جائزہ لیں تو ان لوگوں کے ہندوستان میں داخلے کا یہ عمل صدیوں پر محیط نظر آتا ہے۔ مورخین نے اپنی سہولت کے لیے موجودہ توقیت مرتب کی ہوئی ہے۔ حال ہی میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر سمندر کے نیچے کھدائی کے دوران دوارکا شہر کے آثار کے انکشافات نے اس توقیت کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب مہابھارت کی تاریخوں اور رگ وید کی تاریخوں اور ان قبائل کے ہندوستان میں داخلے کی تاریخوں پر بھرپور نظرِ ثانی کرنی ہو گی اور تین سو سال سے لے کر پانچ سو تک یا اس سے بھی زیادہ پیچھے جانا ہو گا۔ اور اگر ہم ایسا کریں تو ہماری دو سو سالوں پر محیط ساری تحقیق بے معنی قرار پاتی ہے۔ علمی دنیا میں زلزلہ تو آ چکا ہے لیکن اس کے نقصانات کے اندازوں کا ابھی باضابطہ آغاز نہیں ہوا۔

دیوتاؤں اور راکشسوں کے درمیان جنگ ہندو اساطیر کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ میدانِ جنگ ہے جس میں تمام دیوتا اور مختلف راکشس اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کونیاتی سطح پر یہ جنگیں حق و باطل کی علامات سمجھی جا سکتی ہیں جن میں دیوتا جو خیر کی علامت ہیں فتح یاب ہوتے ہیں لیکن حق یا خیر کے تصور اور اس کے حصول کے طریق کار ان اساطیر کے تینوں ادوار میں بہت تبدیل ہو گئے۔ ویدک زمانے کے شجاعت پر مبنی قابلِ احترام ذرائع کی جگہ مہابھارت اور رامائن میں دھوکے اور فریب نے لے لی اور ہر مکروہ ذریعے کو جسے ویدوں کے زمانے میں راکشسوں سے منسوب کیا جاتا تھا پرانوں میں دیوتاؤں نے اپنا لیا۔ (او فلے ہارٹی ۱۹۷۸: ۷۰-۲)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عظیم اسطور ایک زندہ عضویہ کی طرح ہر دور میں تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس کے معانی میں بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اس امر کی بہترین مثال اندر اور ورتر کی آویزش کی داستان ہے جو رگ وید میں بیان کی گئی ہے اور کئی صدیوں بعد مہابھارت میں پھر دہرائی گئی ہے۔ اس اسطور کے جو معانی رگ وید میں ہیں وہ مہابھارت میں نہیں۔ مہابھارت میں یہ معانی تبدیل ہو چکے ہیں۔ ایک معروضی تغیر بھی اساطیر میں نظر آتا ہے جس کا تعلق اسطور کو پڑھنے یا سننے والے سے ہے۔ ایک اسطور سے جو معنی آپ آج اخذ کرتے ہیں کچھ سالوں کے بعد

آپ کو وہ معانی اس اسطور میں نظر نہیں آتے۔ اس کی جگہ کچھ اور معانی دکھائی دیں گے۔ اسطور کی یہ کیفیت غزل کے شعر کی سی ہے جس کو ہر دفعہ پڑھنے پر اس میں نئے اور مختلف معانی نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ہر اسطور کے ایک ہی معانی نہیں ہوتے اور اس کے معانی اس میں تہ در تہ مخفی ہوتے ہیں گو یہ قاری کی اپنی استعداد پر منحصر ہے کہ ایک اسطور سے وہ کیا برآمد کرتا ہے۔

اپنے پلاٹ کی سادگی اور اپنی معصومیت کے باوجود نظرِ اسطور کی مثال ایک مثنوی کی سی ہے جس میں کسی اسطور میں پیدا ہونے والے سوالات بیک وقت منعکس ہوتے ہیں۔ اپنے معانی اور مفہوم کی بنا پر اسطور کی کئی جہتیں ہیں۔ اس کی پہلی جہت تو واضح طور پر بیانیہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک اچھی کہانی ہوتی ہے گو اس کا انجام اس کے اختتام سے پہلے ہی نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے بلند تر سطح پر اسطور ایک علامتی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں اس میں ایک مابعدالطبیعیاتی بُعد در آتا ہے اور اس مقام پر ایک اچھی اسطور مابعدالطبیعیاتی عناصر اور قوتوں کی کشمکش کا آماجگاہ بن جاتی ہے۔ کلاسیکی ادب کے علماء کی نظر میں اسطور کا اصلی اور مخصوص مقام یہی ہے۔ ایک اور لیکن مختلف یا بلند تر سطح پر اسطور ایک کونیاتی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں یہ کونیاتی اعمال اور اصولوں کا کونیاتی اظہار بن جاتی ہے۔ ان سب سے الگ اسطور کی ایک اور حیثیت ہے، اس حیثیت میں یہ لوک ادب کا ایک جزو بن جاتی ہے اور زندگی کی معنویت کی تلاش میں مصروف نظر آتی ہے۔ (اوفلیہارڈی ۱۹۷۸: ۲۲ اور ۱۹۸۲: ۲)

ایک اچھے شعر کی طرح ابہام کا وافر عنصر اچھی اسطور کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسی ابہام کی وجہ سے اسطور میں بیانیہ، مابعدالطبیعیاتی، کونیاتی اور ادبی ابعاد پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

گو مندرجہ بالا ملاحظات ہندو اساطیر کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں، ان کا اطلاق تمام اساطیر پر ہو سکتا ہے۔ اگر اساطیر کو ہم اس تناظر میں دیکھیں تو شاید ان کی تفہیم سہل ہو جائے۔

اساطیر کی پچھلی قسط میں اساطیر کی تحلیل کے مختلف طریقوں کا ذکر آچکا ہے ان میں سے ایک تقابلی طریق کار ہے۔ اسے انیسویں صدی کی رومانویت کی تحریکوں نے جنم دیا مذاہب اور لسانیات میں تقابلی طریقے سے یہ اساطیر کے مطالعے میں نفوذ کر گیا۔ اساطیر کے تقابلی مطالعہ کی رہنمائی کے درج ذیل اصول تھے:

۱۔ مختلف اساطیری نظاموں میں دیوتاؤں کے ناموں کے مادوں کی کھوج اور ان کا باہمی تقابل۔

۲۔ دیوتاؤں کے ناموں میں صوتی مماثلتوں کی تلاش اور ان کا تقابل۔

۳۔ مختلف نظاموں کے دیوتاؤں کے وظائف اور دائرۂ کار کا تقابل۔

سب سے زیادہ اہمیت لسانیات کو دی گئی۔ اس کے بعد دیوی دیوتاؤں کے ناموں کو اچھالا گیا اور ان کے ذریعے دیوتاؤں کے کرداروں کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس مقصد کے لئے جرمن، یونانی یا کسی اور یورپی زبان کی بجائے سنسکرت اور خصوصاً رگ وید کی زبان سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور معاملہ یہاں تک پہونچا کہ میکس میولر کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ وہ خود منو (ہندوؤں کے نزدیک انسانیت کا آدم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن سکیں گے۔ چنانچہ اس عمل سے رومن، یونانی اور ایڈا کی اساطیر کے دیوی دیوتاؤں کے ناموں کے طلسمات کا سنسکرت الفاظ کے مادوں سے پتہ چلانا بہت سہل نظر آنے لگا۔ یہ طریقہ چند ناموں کی تلاش میں بہت مفید ثابت ہوا اور کچھ ایسے ناموں کا پتہ چلا جو آج بھی درست خیال کئے جاتے ہیں لیکن اس گرمجوشی کی وجہ سے جو اس کی دریافت کے پیچھے کارفرما تھی، اکثر جگہ غلط نتائج مرتب ہوئے۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ ایسا بھی مل جاتا تھا جس کی شاید اس نام کی مماثلت یونانی میں ہو لیکن سنسکرت میں وہ شاذ ہی واقع ہوتا ہو یا اگر کسی دیوتا کا نام ویدک میں نہیں ملتا تھا تو یہ محقق صرف اس صفت پر قانع ہو جاتے تھے جو اس دیوتا کی فطرت یا کردار کی طرف اشارہ کرتی تھی اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر یونانی دیوتا کا مقابل ویدوں میں نہیں ملتا تھا تو وہ گھڑ لیا جاتا تھا۔ مثال یہ ہے کہ رگ وید میں ایک دیوی سرنجس[۱] کا نام آتا ہے لیکن رگ وید اس کے کردار پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

۱۔ باوجود کوشش کے یہ نام گریفتھ کے رگ وید، میکڈونل کی ویدک متھالوجی اور میکڈونل کیتھ کے ویدک انڈکس میں نہیں ملا۔ ورنہ اولڈن برگ خود اتنی بڑی سند ہے کہ انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اس کو فوراً یونانی دیوی ایرائنس (Erinyes) کے مقابل کھڑا کر دیا گیا کیونکہ سرنجس کا سنسکرت میں مادہ س رمعنی جلدی کرنا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ سرنجس طوفانی بادلوں کی دیوی ہے اور اس حیثیت میں وہ کہر میں چلنے والی یونانی دیوی ایرائنس کے برابر ہے۔ رگ میں سرام یا سارام کا ذکر آتا ہے جو دیوتاؤں کی مسروقہ گائیں تلاش کرتی ہے۔ اس کے بیٹوں کے نام اس کے نام پر سرنجار کھے گئے ہیں۔ محققوں نے فوراً فتویٰ صادر کر دیا کہ انھوں نے ویدوں میں یونان کے دیوتا ہرمیز کا سراغ لگا لیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ معاملہ پرومیتھیس (Prometheus) سے متعلق ہے۔ ویدوں میں اس لکڑی کو جسے دوسری لکڑی پر گھما گھما کر آگ پیدا کی جاتی ہے، پرمنتھا کہا گیا ہے۔ چنانچہ محققین نے فوراً یہ دعویٰ کیا کہ پرمنتھا پرومیتھیس ہی کی ویدک شکل ہے جو یونانی اساطیر میں انسانوں کے لئے آگ چرا کر لایا تھا۔ (اولڈن برگ: ۵۱-۵۳)

تقابلی اساطیری مطالعوں میں صرف "الفاظ پر غور" کر کے بہت آسانی سے بہت جلدی بہت کچھ حاصل کرنے کا رجحان ایک طریق کار بن گیا۔ اس کے پیشِ نظر مختلف زبانوں کے کچھ الفاظ کا ہم مادہ ہونا، الفاظ کے ہجوں کی مماثلت، ان کی صوتی ہم آہنگی وہ حربے تھے جن کی بنا پر اساطیر، اعتقادات اور رسومات میں مماثلتیں تلاش کی جاتی تھیں اور دھڑا دھڑ ایسے سلسلے مرتب ہو گئے جو مجہول تھے مثلاً پرومیتھیس سے پرمنتھا کی مماثلت، ہرمیز کی سرام سے، اور ایرائنس کی سرنجس سے مماثلت۔

ان بوالعجبیوں سے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ لفظ کے مادے، اس کی صوتی مماثلت یا کرداروں کے وظائف کی مماثلت کی بنا پر صحیح نتائج مرتب نہیں ہو رہے اور وہ جذباتی اور ہیجانی کیفیت جو لسانی مماثلتوں سے پیدا ہوئی تھی جلد ہی ٹھنڈی پڑنے لگی۔ حکما نے اساطیر کی تحلیل کے دوسرے طریقے اپنانے شروع کر دیے۔

ہم یورپ کے علمی طریقوں کو اپنانے میں بہت مشاق ہیں۔ سیاق و سباق دیکھے بغیر ہم بھی ہجوں اور صوتی مماثلتوں کے پیچھے لگ گئے۔ ابراہیم میں ہمیں برہما نظر آنے لگا، شیطان میں شو، ہیرہ میں یونانی ہیرا اور منات میں سومناتھ۔

صحافت سے وابستہ ایک فاضل کو تقابلی لسانیات سے بڑی دلچسپی ہے۔ حال ہی میں جب لاہور کے انگریزی اخبارات میں منات اور سومناتھ پر بحث چلی تو انھوں نے یہ بات واضح طور پر کہی کہ عرب کی دیوی منات دراصل سومناتھ دیوتا ہی ہے جو شاید عرب سے ہند کے ساحلی شہر دوارکا پہنچا اور جسے محمود غزنوی نے توڑا۔ منات بھی عرب کے ساحل پر تھی اور سومناتھ بھی ساحل پر ہی تھا۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ عربوں کے بتوں کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے بت محض ناتراشیدہ پتھر، پہاڑ کی چوٹی یا درخت ہوتے تھے۔ اس معاملے میں ابن کلبی کی کتاب الاصنام ہماری راہنمائی کر سکتی ہے۔

ایک اور دلچسپ انکشاف ہندوستان کے ڈاکٹر گوتم نے کیا ہے۔ سام وید کے سلسلے میں لفظ سام کا تجزیہ کرتے وقت فرماتے ہیں کہ انگریزی کا لفظ Psalm، عبرانی اور عربی لفظ السماع اور لاطینی اور یونانی کا لفظ سام تمام ہم معنی ہیں اور ان سب کی Connotation ایک ہی ہے، یعنی مذہبی موسیقی! (گوتم: ۱)

دوسری مثال مصر کے بادشاہ مینیز، کریٹ کے بادشاہ مائنوس کے ساتھ صوتی تقابل کرنے کے بعد اور ان دونوں کی ہندوؤں کے منو مہاراج کے نام کے ساتھ صوتی مماثلت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہمارے ایک دانشور یہ فتویٰ دیتے ہیں:

ان تینوں ناموں کی مماثلت افریشیا کی مشترکہ تہذیب پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے ساتھ جب اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ بابل اور عشتار کی دیومالا میں طوفان نوح کا ذکر ہے۔ ہندوستان کی دیومالا میں اس کی صورت منو کے طوفان سے مماثل ہے (منو اور نوح کی صوتی

ہم آہنگی قابلِ غور ہے کہ ان میں صرف م کی آواز فاضل ہے،نیز جب ان مختلف تہذیبوں کی بعض دیومالائی کہانیوں میں ایک انوکھی مماثلت نظر آتی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ اور کرشن اوتار میں کہ دونوں کا رنگ سیاہ تھا اور دونوں نے اپنے اپنے دشمن کے گھر میں پرورش پائی تھی تو ذہن میں ایک ایسے مشترکہ تہذیبی نظام کا تصور ابھرتا ہے جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ افریشیا کے مختلف حصوں میں ہزارہا برس قائم رہا (وزیر آغا:۲۹)
یہ بیان دیتے وقت شاید موصوف کے علم میں ناموں کے ہجوں اور اصوات کے متعلق مندرجہ بالا بحث نہیں تھی اور شاید انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مختلف ثقافتوں کی اساطیر میں مشترک موضوعات دانشوروں کے زیرِ مطالعہ رہ چکے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں: اسطور دو طریقوں سے پھیلتی ہے، پہلا طریقہ انتشار کا ہے اور دوسرا ذہن کی آزاد تخیل آرائی کا ہے۔ یوزنر (Usner) کی تحقیق نے یہ واضح کیا ہے کہ طوفان کی اسطور دنیا کے ہر خطے میں ملتی ہے۔ دجلہ و فرات کے علاقے میں طوفان کے اسطور کی پیدائش ان دریاؤں میں وقفے وقفے سے طغیانی کا آنا تھا لیکن جب اس اسطور کو ان علاقوں میں موجود پاتے ہیں جہاں طغیانی نہیں آتی جیسے یونان اور کنعان تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس اسطور کو باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ گو اس کو درآمد کرنے کے طریقے کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اسطور کے سفر کرنے کے طریقوں کی مصر میں دریافت شدہ خطِ میخی کی وہ تختی ہے جس پر اڈاپا کی متھ درج ہے اور گمان غالب ہے کہ اسے مصری کاتبوں نے خطِ میخی سیکھنے کے لئے استعمال کیا۔ مجیڈو میں امریکیوں کی کھدائی کے دوران گلگامش کی اسطور کا ایک حصہ ملا۔ کیڈمس کی داستان سے واضح ہے کہ فونیشیا کے حروفِ تہجی کیسے یونان پہنچے اور تمام یورپ کے حروفِ تہجی کے جدِ امجد بن گئے۔ چنانچہ تجارت، سیاحت، نقلِ مکانی اور بیرونی حملے وہ راستے ہیں جن پر چل کر ایک اسطور ایک ثقافت سے دوسری ثقافت منتقل ہوتی ہے۔

یہ بھی ملاحظہ کیا گیا ہے کہ تہذیبوں کے خاتمے کے بعد ان کی رسومات معدوم ہو گئیں۔ اور ان سے متعلقہ اسطور ان رسومات سے علیحدہ ہو کر ادبی اصناف میں تبدیل ہو گئیں اور دوسری اقوام کی تہذیبوں میں نفوذ کر گئیں۔ تخلیق سے متعلق بابلی اسطور جس میں ڈریگن کو قتل کیا جاتا ہے پرسیس (Persesus) اور اینڈرومیڈا (Andromeda)، ہرکیولیس اور ہائیڈرا، زیگفرڈ اور فافنر، بیوولف اور گرینڈل کی اساطیر کی بنیاد بنی اور آج بھی سینٹ جارج اور ڈریگن کی داستان میں جلوہ افروز ہے (ہک: ۱۶ و ۱۷)۔ ویسے بھی ہندو اساطیر پر میسوپوٹیمیا کی اساطیر کا اثر واضح طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور "وہاں کی کئی اساطیر اب ہندو اساطیر میں ملتی ہیں" (واکر ۲: ۷۴) اور ایرانی اور ہندوستانی شاخوں میں بٹنے سے پہلے اور میلادِ مسیح سے ۲ اور ۳ ہزار سال قبل ان قبائل کا مذہب اور اساطیر میسوپوٹیمیا کے تصورات سے بہت متاثر ہوئے" (کرک: ۲۰۹)

عیسیٰ، بدھ، رام، کرشن، اپالو اور مغرب کے کئی ہیروز/دیوتاؤں کی پیدائش معجزاتی تھی۔ اکثر دیوتاؤں کی زندگی کو طفولیت میں خطرہ ہوتا ہے۔ مسیح کے لئے ہیروڈ، موسیٰ کے لئے فرعون، کرشن کے لئے کنس اور کیلٹک شمسی ہیرو لغ کے لئے بالور۔ شاید اندھیری رات کی کوکھ سے سورج کے اچانک طلوع ہونے کو معجزہ اور پُر اسرار تخلیق خیال کیا جاتا ہے جس کا ترجمہ دیوتاؤں کی اس قسم کی پُر اسرار ولادت میں نظر آتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد ان ہیروز کو پھینک دیا جاتا ہے، بھیشم کو گنگا کے کنارے، موسیٰ کو نیل کے کنارے سرکنڈوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کرشن گوالوں کے ہاں اور کرن ایک رتھ بان آدھی رتھ کے ہاں پرورش پاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے استدلال کے پیشِ نظر ان سب کو ایک ہی تہذیب سے متعلق ہونا چاہیے لیکن تاریخ میں ایسا نظر نہیں آتا۔ ان کا استدلال بڑی کمزور بنیادوں پر مبنی ہے۔

ہندو اساطیر کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ لندن کی سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز کی اوفلے ہارٹی نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ان میں سے چند کی تلخیص درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہندو اساطیر کی کوئی مخصوص فارم نہیں۔ اور یہی ان اساطیر کا امتیاز ہے۔ ہر اسطور کا خاکہ بدلتا رہتا ہے اور اسطور کا مقصد اس بدلتے ہوئے خاکے میں کہیں مضمر ہوتا ہے۔ اس کی مثال فزکس کے اس نظریے جیسی ہے جس کے مطابق جو نظر آرہا ہے اصل حقیقت نہیں

بلکہ حقیقت کے امکانات میں سے محض ایک امکان ہے جو شماریات کے ایک مخصوص احاطے کے اندر نظر آسکتا ہے یہی صورت ہندو اساطیر کی ہے، فارم کے معاملے میں بہت سے امکانات میں سے وہ محض ایک امکانی صورت ہے۔

۲۔ ہندو اساطیر کا تخیل کو چکرا دینے والا تنوع صرف فنی اعتبار سے نہیں بلکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ کہانی کے وہ مقامات جو اکثر بدلتے رہتے ہیں، جن کی تفصیل بڑی باریکی سے بیان کی جاتی ہے یا جن کی غلط تعبیریں کی جاتی ہیں، اسطور میں یہ ایسے مقامات ہیں جن پر غور کرنے سے ہندو اساطیر کی دشواریوں کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ اسطور کے خدوخال کی تبدیلیوں کا یہ عمل ایک مخصوص کہانی کو غیر متعلق کہانیوں سے اس طرح ملا دیتا ہے کہ اصل کہانی کی منطق برباد ہو جاتی ہے۔ ان نقاط کا بار بار واقع ہونا۔ اس پر نظرثانی یا ان کی تنقیح کا اعادہ گو کسی حد تک ایک زبانی روایت کے ساختیاتی اور تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے لیکن بڑی حد تک یہ ایک مخصوص ذہنی افتاد کا غماز ہے، ہندو اپنی اساطیر کے کچھ پہلوؤں سے اپنا دامن کبھی نہیں چھڑا سکے۔

۳۔ تفصیلات کا استعمال بھی اساطیر سے متعلق فلسفیانہ مضمرات کا حامل ہے۔ ہندو ادب ــــ کلاسیکی ڈرامہ اور شاعری ــــ پرانوں اور رزمیہ شاعری کا مقبول ادب ایسی تفصیلات سے پُر ہے جو ریاضیاتی تفصیلات اور جزویات میں اترنے کے ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔ جنگ کو بیان کرتے وقت اسلحہ کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل، قتل و غارت گری کی ذرا ذراسی جزویات کا بیان جمالیاتی طور پر پرکشش نظر آتا ہے۔ ایسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جہاں چاول کے چند دانوں سے ایک عورت لاتعداد عجیب و غریب کھانے تیار کر سکتی ہے۔ سائنس کی کتابوں میں ہاتھیوں کو پرکھنے اور سدھانے کی تفصیلات، سماجی اور مابعد الطبیعیاتی قوانین کی ترتیب و تدوین میں تبدیلیوں کی تفصیلات جنسی اختلاط کی ممکنہ اور غیر ممکنہ آسنوں کا بیان۔ مندروں کے ریاضیاتی تناسبات کی تفصیلات۔ یہ سب تفصیلات کے لئے بیماری کی حد تک بڑھے ہوئے خبط کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف امکانات کے تجربوں سے گزرنے کے لئے قدیم ہندو ذہن بے قرار دکھائی دیتا ہے۔ بدھ نے تو اس قسم کی خواہش کو دکھوں کا منبع قرار دیا لیکن ہندوؤں نے اسے نظرانداز نہیں کیا۔ ہندوؤں نے تمام امکانی تجربات سے گزرنے یا لطف اندوز ہونے کے لئے بے قراری اور عملی طور پر صرف ایک ہی تجربے تک محدود ہونے کے امکان کے درمیان ایک کھنچاؤ یا تناؤ محسوس کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ ہندو کے لئے ان خواہشات میں سے صرف ایک کو انتخاب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باقی امکانات سے دستبردار ہو گیا ہے، زندگی میں ہر انتخاب کے ساتھ ایک احساس زیاں وابستہ ہے جو ممکنہ تجربات کے پورے سلسلے سے نہ گزر سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ دوسرے الفاظ میں یہ درست ہے کہ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" لیکن خواہشات کے اس طویل سلسلے میں سے انسان کسی ایک خواہش کا ہی انتخاب کر سکتا ہے اور باقی ۹۹۹ خواہشوں سے اسے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی احساس محرومی کو ہندوؤں کے ذات پات کے نظام نے اور شدید کر دیا ہے کیونکہ سوادھرم کے اصولوں کے تحت تو ایک انسان ہزاروں لاکھوں ممکنہ کرداروں میں سے صرف ایک کردار ہی ادا کر سکتا ہے اور باقیوں سے اسے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کا احساس زیاں یا احساس محرومی کسی حد تک صرف اساطیر سے ہی زائل ہو سکتا ہے، کیونکہ ان میں ہمیں شو جیسے کردار ملتے ہیں جو ایک ہی لمحے میں زندگی کے ہر ممکنہ تجربے سے گزرنے پر قادر ہیں، وہ انسانی زندگی کا پورا سفر ایک لمحے میں طے کر سکتے ہیں۔ ایسے کردار ہی انتخاب کرنے کی اذیت سے ماورا ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کھنچاؤ یا تناؤ زائل ہوتے ہیں۔ چونکہ اساطیر بھی اس احساس سے مکمل طور پر چھٹکارا نہیں دلا سکتیں اور خواہش کی شدت کو کم نہیں کر سکتیں اس لئے ہر اسطور نئی تفصیلات کے ساتھ بار بار دہرائی جاتی ہے۔ ہر دفعہ کہانی میں کوئی نیا واقعہ یا کوئی نیا کردار داخل ہو کر تفصیلات کو اور زیادہ پھیلا دیتا ہے۔ چونکہ کوئی ایک اسطور زندگی کے ممکنہ تجربات کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتی اس لئے ہر اسطور محض ایک استعارہ، ایک امید، ایک

علامت ہے ان امکانات کی جو زندگی میں موجود ہیں —— یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

۵۔ عالم اکبر اور عالم اصغر میں باہمی ربط ایک اور ساختیاتی عنصر ہے۔ جو فلسفیانہ استفہام سے پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کونیاتی اور مابعد الطبیعیاتی بُعد انسان کے سامنے ہوں تو وہ گریزپا لمحوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں جیسے بچے کی معصوم مسکراہٹ، پھولوں کی خوشبو اور ڈوبتے سورج میں شفق کے رنگوں کے منظر سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے؟ ستاروں کے بے اندازہ فاصلے، کہکشاؤں کا وسیع پھیلاؤ، اور مرگ ناگہاں کا ہر وقت گھات میں رہنا ان بیش قیمت لمحات کو قطعاً بے معنی بنا دیتا ہے۔ یہ سوال ہندو اساطیر کے پورے نظام پر محیط ہے، یہ اساطیر کبھی سطح زمین سے متعلق ہوتی ہیں اور کبھی غیر متوقع طور پر انفنیٹی تک پھیل جاتی ہیں اور پھر دوبارہ پیش پا افتادہ سطح پر اتر آتی ہیں۔ ہمہ گیر عالمی قوت کے حامل دیوتا یکدم انسانی سطح پر آ جاتے ہیں اور انسان کی طرح پریشان اور بدحال نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس بے بس انسان الوہی غم و غصے یا کریمی کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اندر اپنی طاقت پر غرور کرتا ہے لیکن وہ ایسا نظارہ بھی دیکھتا ہے جہاں لاتعداد چیونٹیوں کی لمبی قطار میں وہ محض ایک چیونٹی ہے۔ کرشن کی ماں اسے مٹی کھانے پر سرزنش کرتی ہے اور اس کا منہ کھول کر دیکھتی ہے تو اسے کرشن کے حلق میں پوری کائنات، کرشن اور خود اپنا آپ بھی نظر آتا ہے۔ پاک کا ناپاک میں ظہور ایک ایسا دہرا تناظر ہے۔ جو ہندو اساطیر کی ایک خصوصیت ہے اور شو سے متعلق اساطیر میں بہت نمایاں ہے۔ گناہوں کی پاداش میں وہ اپنی تیسری آنکھ سے کل عالم کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے لیکن جوا کھیلتے وقت اپنی بیوی پاربتی کو دھوکہ دینے سے گریز نہیں کرتا۔ اس طرح اساطیر ان پیمانوں کے درمیان اس کشمکش کو ظاہر کرتی ہیں جن پر انسانی زندگی کو ناپا تولا جاتا ہے۔

۶۔ تکرار، تنوع، تفصیلات اور پیمانوں سے متعلق نقاط اساطیر کے نفس مضمون کا ایک بُعد بن جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے لئے اساطیر کی اس قسم کی ساخت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ جمالیاتی سطح پر ان تضادات کا حل پیش کر دیتی ہیں جو منطقی طور پر لاینحل نظر آتے ہیں۔ شو سے متعلق اساطیر بار بار اس قدیم کشمکش کی طرف لوٹتی ہیں کہ دنیا میں انسان کیسے زندگی گزارے —— زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا اور پھر روح کو ان سے آزاد کرنے کے لئے دنیا کو تیاگ دینا۔ اس کے برعکس دوسری ثقافتوں میں روح اور بدن، دین اور دنیا، آخرت اور دنیاوی آویزشوں کو اقدار کی کشمکش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۷۔ ہندوؤں کے مذہبی قیاسات کے اس کشمکش کے عمل میں ایک قسم کا تغیر پیدا کرنے کے لئے پچھلے تین ہزار برسوں میں کئی اساطیری ہستیاں وجود میں آئیں۔ چنانچہ مرکزی اساطیر میں یہ تبدیلیاں ایک قسم کا معیار بہم پہونچاتی ہیں جن پر ہم اس زمانے کی مابعد الطبیعیاتی فکر کو پرکھ سکتے ہیں۔ رودر، اندر اور اگنی رگ وید کے دیوتا ہیں۔ یہ تخلیق اور تباہی کا ایک خاکہ فراہم کرتے ہیں۔ برہما اور پرجاپتی براہمنوں (۹۰۰ ق م) کے زمانے کے دیوتا ہیں، یہ تخلیق میں متضاد نمونوں کا فلسفیانہ رخ پیش کرتے ہیں۔ مہابھارت کے زمانے (۳۰۰ ق م) میں اگنی اور کئی رشی ایک شادی شدہ زاہد کی زندگی میں پیچیدگیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ پرانوں کے زمانے (۳۰۰ ق م — ۱۰۰۰ ع) میں شو اور کام دیوتا باہمی عمل اور ردعمل میں مصروف ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مقام پر ایسے طریقے سے قابض ہو جاتے ہیں جو اس ذہنی لچک کا آئینہ دار ہے۔ جو اساطیر نے زندگی کے چیستان کا حل تلاش کرنے کے لئے بالآخر اپنے آپ میں پیدا کر لی۔

کائنات کے مختلف پہلوؤں کو کھلے دیکھنا اکثر اور بیشتر ان علامتوں کے ذریعے ممکن ہوا جو اساطیر میں بار بار واقع ہوتی ہیں اس مخصوص عمل کو ہندوانہ طرز فکر سے بڑی مدد ملی۔ دوسری ثقافتوں میں قدرتی طاقتوں کی سرگرمیوں کو فلسفے یا اخلاقیات کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے لیکن ہندوؤں کے ہاں یہ فطری طاقتیں غصہ، ہیجان، اپنے آپ پر کنٹرول، خواہش، زہد وغیرہ کی شکلیں اختیار کر کے انسانوں اور دیوتاؤں کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ ہر وقت ہیجانی کیفیت میں رہتی ہیں۔ ان طاقتوں کی تقلیب کو کائنات کی سطح پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں قدرتی عناصر مسلسل

عمل اور ردِعمل کائنات کے اندر موجود حیات کی قوتوں کو تروتازہ رکھتا ہے۔ یہاں ہر طاقت کو اپنی انتہا تک پہونچنے کی اجازت ہے۔ جب وہ ایک انتہا تک پہونچ جاتی ہے تو اس کا توازن کسی اور طاقت کی تقلیب سے کیا جاتا ہے۔ یوں کائنات ایک پینڈولم کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا تک حرکت کرتی ہے۔ چونکہ ایک مکمل مثالی توازن کا حصول ناممکن ہے اس لئے یہ کائنات مسلسل حرکت میں ہے۔ اس میں سکون نہیں۔ جب حرکت ایک سطح سے دوسری سطح کی طرف رخ کرتی ہے تو وقتی طور پر کشمکش سے مبرا سکون کے گریز پا لمحات آتے ہیں۔ علامتی طور پر اس وقت آگ اور پانی بیک وقت موجود ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو تباہ نہیں کر سکتے۔ الوہی سطح پر یہ لمحات وہ ہیں جب تخلیق اور تباہی کے دیوتا دست وگریباں ہونے کی بجائے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ انسانی سطح پر ان لمحات میں شہوت اور زہد کی تشویق ایک ہی فرد میں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور مخالف قوتوں سے کشمکش میں مبتلا ہوئے بغیر ہر نہج کو اپنی اپنی طاقت کے اظہار کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔ توازن کے یہ گریز پا لمحات اسطوری آویزش کا کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ ہندو اساطیر خود ہی کسی حل کی تلاش نہیں کرتیں۔ مغربی فکر ان تضادات کو آمیزش میں تبدیل کرنے پر اصرار کرتا ہے لیکن ہندو ذہن ان تضادات کو جوں کا توں ہی قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ جمالیاتی تسکین اس وقت میسر آتی ہے جب کوئی دیوتا یا اساطیری ہستی دونوں انتہاؤں سے لذت یاب ہوتا ہے۔ انسان ان لمحات کو منجمد کر دینا چاہتا ہے تاکہ کاملیت کے وہ لمحات اس کی گرفت میں آسکیں۔ (اوفلے ہارٹی: ۱۹۷۵: ۳۱۸،۳۱۴)

ویدک زمانے کی اساطیر میں مرکزی حیثیت اندر کی اسطور کو ہی حاصل ہے۔ ہمارے لئے یہ اس لئے اہم ہے کہ ہمارے دانشور اسی سے استنباط کر کے اس خطے کی پری ہسٹری مرتب کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اساطیر کے متبادل طریقوں کو جن کا ذکر اساطیر کی پہلی قسط میں آچکا ہے، یا تو اپنے طے شدہ مقاصد کے تحت دانستہ طور پر یا عدم واقفیت کی بنا پر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی آئندہ اقساط میں اس اسطور پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہاں یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ ایک ہندو اپنی زندگی میں بڑے تواتر سے اساطیر سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ پیدائش پر اس کا پہلا واسطہ اپنے خاندان کے دیوی دیوتاؤں سے پڑتا ہے۔ ذرا بڑا ہونے پر وہ اپنے گاؤں کے دیوتاؤں سے متعارف ہوتا ہے جن میں وہ اپنا دیوتا بھی داخل کر دیتا ہے۔ روزمرہ کی عبادت اور اس سے متعلق رسومات بھی اسے ان اساطیر سے مسلسل منسلک رکھتی ہیں۔ جب وہ اپنے رنگا رنگ تہواروں پر جن میں وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ شرکت کرتا ہے اور جن میں الوہی اور کونیاتی واقعات کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ خود بھی متاثر ہوتا ہے۔ جب وہ مذہبی یاترا پر نکلتا ہے تو اس کا واسطہ دوسرے علاقوں کے دیوتاؤں سے پڑتا ہے جن میں اسے اپنے ہی دیوتاؤں کی بدلی ہوئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ ان دیوتاؤں کو بھی پوجتا ہے۔ تہواروں پر وہ پیشہ ور لوگوں کی زبانی ان اساطیر کی دوسری اور بدلی ہوئی صورتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ انہی تہواروں کے دوران جب جب وہ ڈرامہ دیکھتا ہے یا سنگیت سبھا میں موسیقی سنتا ہے یا رقص دیکھتا ہے یا بھجن منڈلی میں جاتا ہے یا کیرتن سنتا ہے تو ان اساطیر کا فنکارانہ اظہار اسے پھر متاثر کرتا ہے اور اسے پھر اپنی اساطیر سے آگاہی کا موقع ملتا ہے۔

ہندو مذہب، ادب، شاعری، ڈرامہ، موسیقی، مصوری، تھیٹر، بت تراشی، اور غیرہ کے فنون کا سرچشمہ یہی اساطیر ہیں۔ ادنیٰ کے ساتھ ارفع، درشتناک کے ساتھ کریم النفس، اور حسن کے ساتھ قبحہ کو قبول کر کے یہ اساطیر ہندو مذہب کی پوری ہمہ گیری کو منعکس کرتی ہیں۔ یہ اساطیر انتہائی زرخیز اور متنوع ہیں۔ قوانینِ قدرت اور اس کی طاقتوں کی دھندلی دھندلی تجسیم سے شروع ہو کر زمان و مکان کی پیچ در پیچ اساطیری تعبیروں پر ختم ہوتی ہیں۔ کائنات، اس کا آغاز اور اس میں انسان کے مقام سے لے کر دریا کسی پتی کی موجودگی کی تشریح [illegible] سادہ سی کہانی میں مل جاتی ہے" (ڈان ہوپکینز: ۱۹۷۰)، زندگی کے بحرانوں اور مصائب کی طغیانی میں اساطیر ہی ایک ہندو کی دست گیری کرتی ہیں اور وہ اپنے مسائل کا حل انہی میں تلاش کرتا ہے۔

ویدوں کی تشریح اور تفہیم کے لئے اساطیری نقطۂ نظر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے اکھیانک مکتبِ فکر کہا جاتا ہے۔

BIBLIOGRAPHY

1. Apte, V.M., *Religion and Philosophy*, Mujamdar, R.C., (ed.), The History and Culture Of The Indien People, vol. I Vedic Age, Allen and Unwin, 3rd imp., 1957.

2. Basham, A.L. The Wonder That Was India, Sidgwick and Jackson, London, 1954.

3 _____ (ed.) The Cultural Heritage Of India, O.U.P., 1975

4. Bhattacharjee, S., The Indian Theogony, Cambridge, 1970.

5. Chatterjee, S. K., *Race Movements and Prehistoric Culture*, Mujamdar, (ed.) op. cit.

6. Dandekar, R.N., *Indian Mythology*, Cultural Heritage Of India, Ramakrishana Mission, Calcutta, vol. II., rep. 1982

7. Gautam, Dr. M.R., The Musical Heritage Of India, Abhinav Publications, New Delhi, 1980

8. Hooke, S.H., Middle Eastern Mythology, Harmondsworth, 1963.

9. Kirk, G. S., Myth —Its Meaning and Function in Ancient and Other Culture, Cambridge, 1970.

10 Macdonell, A. A., Vedic Mythology, Strausberg, 1897

11. O' Flaherty, W. D., Ascetism And Eroticsm In The Mythology Of Siva, O.U.P. 1973

12. _________, Hindu Myths, Harmondsworth, 1978

13. Oldenberg, H., Ancient India, Its Language and Religion, Punthi Pustaks, Calcutta, rep. 1964,

14. Butanin, van J. A. B., *Hindu Mythology*, Encyclopaedia Britannica, vol. 8. 1983,

15. Walker, Benjamin., The Hindu World, Allen and Unwin, 1968, vol.I.

16. Wazir Agha, Dr., Urdu Shairi Ka Mizaj. (Urdu), Lahore, 1965

17. Zaehener, R. C., Hiduism, O.U.P., rep. 1957

18. Zimmer, H., Philosophies Of India, Bollingen Foundation, N. Y., 2end rep. 1953

پوٹھوہار کی وادی اور اس کی ثقافت

امین راحت چغتائی

ابوالفضل کی حد بندی کے مطابق پوٹھوہار کی وادی، سندھ ساگر دوآب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ سندھ کی بہ نسبت جہلم کی جانب زیادہ جھکا ہوا ہے۔ اور دارالحکومت اسلام آباد کا تعلق پوٹھوہار کے اُس اہم حصے سے ہے جس کی تہذیب و ثقافت کے ڈانڈے قدیم حجری عہد سے جا ملتے ہیں۔

"پوٹھوہار" کا تلفظ کئی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اسے "پٹھوار"، "پوٹھ وار"، "پوٹھوہار" اور توزک جہانگیری کے مطابق "پوٹھوہار"[1] بھی کہتے ہیں۔ یہ صحیح تلفظ "پٹھ وار" ہے جو مورد ہوکر "پوٹھوہار" بن گیا۔ پٹھ بمعنی "پیٹھ" اور "وار" بمعنی مشل ہے۔ پورے لفظ کا مفہوم پیٹھ کی طرح اونچا، ناہموار یا سطح مرتفع ہے لیکن "پوٹھوہار" بھی بامعنی لفظ ہے۔ پوٹھ، جو پیٹھ ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ نئی پھوٹنے والی نرم نرم گھاس کو کہتے ہیں اور "ہار" چراگاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ پوٹھوہار کی وادی میں اب سبزے کی وہ کیفیت نہیں لیکن تاریخ سے اس بات کی پوری نشاندہی ہوتی ہے کہ کئی سو سال پہلے یہ فی الواقع ایک سرسبز وادی تھی اور شاید اسی لئے "پٹھ" بمعنی خزانہ یا گنجینۂ پنہاں بھی استعمال ہوا ہے۔[2]

"پوٹھوہار" کی تہذیب، تاریخ سے پہلے کے قدیم عہد کا احاطہ کرتی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں راولپنڈی کے نزدیک "سواں ندی" کے کنارے طبقات الارض کی کھدائی کے دوران قدیم حجری عہد کے آلات برآمد ہوئے تھے۔ اس کے بعد پوٹھوہار کے ایک اور علاقے پنڈی گھیپ کے نزدیک بھی کھدائی کے وقت قدیم حجری عہد کے طبقات دریافت ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوٹھوہار کی تہذیب و ثقافت دو سے چار لاکھ سال پرانی ہے۔[3] ۱۹۳۵ء میں مذکورہ تحقیق کی بنا پر طبقات الارض کے ایک برطانوی ماہر ڈی ٹیرا (De-Terra) کی قیادت میں اس علاقے کی قدامت کا سائنسی تجزیہ کرنے کے بعد جو رپورٹ مرتب کی گئی تھی، اس میں یہاں کی تہذیب تین لاکھ سال قدیم قرار دی گئی تھی۔ راولپنڈی کے جنوب مشرق میں روات کے قریب جو کھدائی ہوئی تھی اس کے دوران وہاں سے نو حجری عہد کی انسانی کھوپڑی برآمد ہوئی تھی۔ سواں کے علاقے سے برآمد ہونے والے حجری عہد کے آلات یورپ میں حجری عہد کے برآمد شدہ آلات کے مشابہ ہیں۔ بہر حال وقت گزرتا گیا اور قدیم حجری تہذیب، فروغ پاتی ہوئی نو حجری عہد میں داخل ہو گئی۔ یہ عہد دس ہزار سال سے سات ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں انسان نے پہلے کی بہ نسبت قدرے نفاست سے آلات بنائے۔

راولپنڈی، عہد قدیم سے پوٹھوہاری تہذیب و تمدن کا ایک اہم شہر رہا ہے شمال مغرب سے ہندوستان پہنچنے کے راستے پر واقع ہونے کے باعث اسے پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ قدیم یونانی، تورانی، ایرانی، کشان اور ہن حملہ آوروں کے

---

[1] اس علاقے کو جو اٹک سے مارگلہ تک پھیلا ہوا ہے، پوٹھوہار کہتے ہیں۔ "توزک جہانگیری"۔ اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۲۳

[2] طبقات ناصری، مؤلف منہاج سراج، مترجم غلام رسول مہر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔ جلد دوم۔ طبع اول، جنوری ۱۹۷۵ء، صفحہ ۳۷۹

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ طبع اول ۱۹۷۱ء۔ جلد ۵، صفحہ ۲۵۰

علاوہ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، تیمور اور بابر، سب راولپنڈی ہی سے گزر کر برصغیر کے قلب تک پہنچے ——— آثارِ قدیمہ کی تاریخ کے بعض علما اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ پاکستان کا پہلا آدمی اسی خطے میں آباد تھا[1] جسے دریائے ہرو اور دریائے سواں سیراب کرتے ہیں، اور یہ خطہ راولپنڈی اور اٹک کے اضلاع کا دیہاتی علاقہ ہے۔ انہی علما کی تحقیق کے مطابق پوٹھوہار کی سطح مرتفع تیسرے برفانی عہد کے دوران اٹھنے والی آندھیوں، طوفانوں اور ان کے ساتھ آنے والی مٹی اور پتھروں کے باعث معرضِ وجود میں آئی۔ شاید اس وادی کی قدامت کے باعث ہی علمائے تاریخ و آثارِ قدیمہ نے یہاں سے برآمد ہونے والے قدیم حجری عہد کے اوزاروں کو تحقیق کے لحاظ سے فوقیت دی ہے۔ اگرچہ بعض محققین کے مطابق انسانوں کی پہلی بستی جنوبی ہند میں آباد ہوئی، پھر بھی ان کا خیال ہے کہ وادیٔ سواں کا پہلا آبادکار جنوبی ہند کے پہلے آبادکار سے قدیم ہے۔ یہ بات بھی دھیان[2] میں رکھنی چاہیئے کہ قدیم حجری عہد کی طوالت، پانچ لاکھ پچاس ہزار سال سے لے کر پانچ لاکھ سال تک بیان کی جاتی ہے۔ اسی کو پہلا برفانی عہد بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے برفانی عہد کی طوالت، بالترتیب چار لاکھ، ڈیڑھ لاکھ اور پچاس ہزار سال تک بتائی جاتی ہے۔

بہرکیف اس خطے کی معلوم قدیم تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے آریائی باشندے آئے۔ ان کے بعد "ٹک" قوم وارد ہوئی۔ الیگزینڈر کننگھم کی تحقیق کے مطابق ٹک دراصل قدیم تورانی تھے جنہیں سکندر کے حملے سے قبل گکھڑوں نے اس علاقے سے مار بھگایا تھا۔ تاہم "ٹک" قوم وادیٔ سندھ کے وسیع علاقے پر ایک عرصہ تک حکمراں رہی۔ اس کا ثبوت، مغربی پاکستان کے بعض شہروں کے ناموں اور ٹکاری (ٹنڈی) رسم الخط سے بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اٹک، ٹیکسلا اور بنوں ٹک۔ ٹکاری رسم الخط ہندو بنیوں میں آج بھی مروج ہے۔ علاوہ ازیں سندھ اور جموں کی "ٹک" آبادی بھی "ٹک" تہذیب و تمدن کی یاد دلاتی ہے۔ اس سے پاکستان کے نامور محقق اور آثارِ قدیمہ کی تاریخ کے ممتاز عالم محمد ولی اللہ خاں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "ٹک" حکمران ایک زمانے میں کشمیر سمیت وادیٔ سندھ کے ایک بڑے علاقے پر قابض تھے اور وہ ناگ[3] کی پوجا کرتے تھے۔ یہ غیر آریائی تھے لیکن وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے۔

راولپنڈی کا قدیم نام گاجی پور یا گجنی پور تھا۔[4] پرانا شہر چھاؤنی کے علاقے میں چھ سو سال قبل مسیح راجہ گج یا گجپت نے آباد کیا تھا۔ مگر اس راجہ کا نام محض قدیم منظوم داستانوں اور نسب ناموں ہی میں ملتا ہے۔ تاریخی شواہد راہنمائی نہیں کرتے۔ جہانگیر اسے راول نام کے ایک ہندو کا آباد کیا ہوا شہر قرار دیتا ہے۔ تاہم یہاں کی تاریخ کا آغاز ۵۱۶ ق م سے ہوتا ہے جبکہ دارا (Deryavush Vishtaspa) نے ٹیکسلا اور اس کے نواحی علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اہلِ فارس کے زیرنگیں آنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ یہاں تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور ملک میں پہلی بار چاندی کا سکہ سگلوس (Siglos) جاری ہوا۔[5] شاید اسی عہد میں یہاں خروشتی رسم الخط جاری ہوا جو ایک عرصے تک اس علاقے کی تحریروں میں استعمال ہوتا رہا۔ اہلِ فارس نے یہاں آرامی زبان کو بھی فروغ دیا اور سونے کا سکہ (Daric) بھی جاری کیا۔

قدیم ایرانی اثرات ۳۲۶ قبل مسیح تک برقرار رہے۔ سکندرِ اعظم کا دور بہت مختصر تھا۔ اس نے جہلم کے پار راجہ پورس کو شکست دی۔ اسے اپنا حلیف بنایا اور اگلے سال لوٹ گیا۔ ان دنوں ٹیکسلا کے راجہ امبھی کی سلطنت، سندھ سے جہلم تک پھیلی ہوئی تھی۔ پوٹھوہار کا علاقہ بھی راجہ امبھی کی عملداری میں تھا۔ لہٰذا وہ پہلا مقامی حکمران ہے جس سے تاریخ آشنا ہوئی۔ یونانی مورخین کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ملک خوش حال تھا۔ تعددِ ازدواج اور ستی کی رسم عام تھی۔ غریب دوشیزائیں کھلی منڈی میں فروخت ہوتی تھیں اور مردوں کو دفنانے کے بجائے کھلے میدان میں گِدھوں اور چیلوں کو غذا فراہم کرنے کے لئے پھینک دیا جاتا تھا۔ موخر الذکر رسم پر اہلِ فارس کے اثرات معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم سکندر کے حملے کا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کا موجودہ شمال مغربی

---

[1] Early India and Pakistan by Sir Mortimer Wheeler, London, 1968. P.44

[2] اور مغربی پاکستان کی تاریخ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، مؤلفہ رشید اختر ندوی، جلد اول، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۴

[3] The Imperial Gazetteer of India Vol. XXI, Oxford, 1908. P.272

[4] A Guide to Taxila by Sir John Marshall, Cambridge, 1960. P.58

علاقہ یونانی تہذیب و تمدن کے زیرِ اثر آگیا۔ ۳۲۳ ق م میں باختر کا یونانی حاکم سلیوکس حملہ آور ہوا لیکن اُس نے چندر گپت موریا سے شکست کھائی اور ایشیائے کوچک میں ایک اور مہم سر کرنے کے لئے اپنی تمام سپاہ سمیت وادیٔ سندھ کو خالی کر گیا اور اسی سال یہ علاقہ چندر گپت موریا نے مگدھ کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ چندر گپت کے عہد میں اس علاقے نے خاصی ترقی کی۔ رفاہِ عامہ کے کاموں پر بالخصوص توجہ دی گئی۔ چندر گپت کے دربار سے وابستہ یونانی سفیر میگستھینز، پاٹلی پتر سے ٹیکسلا تک تعمیر شدہ عظیم شاہراہ کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ یہی سڑک پشکلاوتی (چارسدہ) افغانستان تک چلی گئی تھی اور وہاں سے باختر جانے والی سڑک سے جا ملتی تھی۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری اور مغلوں کے عہد میں مزید توسیع دے کر شاہراہِ اعظم کا نام دے دیا گیا تھا۔ چندر گپت ہی کے عہد میں شاہی ٹکسال سے چاندی اور سونے کے روپے جاری ہوئے۔ نقرئی سکے کو روپیہ، روپا یا کرشاپانا اور تانبے کے سکے کو تمر روپا کہا جاتا تھا۔ ان سکوں کو "سگلوس" کا نیا روپ کہا جا سکتا ہے۔

بعد ازاں اشوک کا عہد آیا۔ جب اُس نے کالنگا کی جنگ (۲۶۲ ق م) کے بعد بدھ مت قبول کر لیا اور ساری سلطنت کا یہی مذہب قرار پایا تو یہاں کئی بدھ سٹوپا اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں جن کے آثار آج بھی اسلام آباد کے نواح میں پائے جاتے ہیں۔ راولپنڈی میں دو ٹوپے (ٹیلے) تھے جن میں سے ایک ٹوپ پر ایوب نیشنل پارک تعمیر ہوا۔ یہ پہلے ٹوپی رکھ (ٹیلے پر درختوں کا جھنڈ) یا ٹوپی پارک کہلاتا تھا۔ دوسرا ٹوپ، تھوپی کے نام سے مشہور تھا، جو سڑک پر شہر سے پانچ میل دور واقع تھا۔ کننگھم کی آثاری تحقیق کے دوران صدر بازار کے علاقے سے یونانی عہد کے سکے اور پرانی جیل سے مشرق کی جانب، ایک چراغ (جس پر کوئی تحریر کندہ تھی) اور ایک آج کل کی صابن دانی کی شکل کا چھوٹا سا ڈبہ ملا تھا۔ بعد میں، اس ٹوپ کا ملبہ جیل کی تعمیر میں استعمال ہو گیا۔[۹]

موریائی عہد میں ٹیکسلا سے لے کر اسلام آباد تک کا علاقہ، علم اور صنعت و حرفت کا مرکز تھا۔ یہاں ہیروں کو تراشنے اور انھیں آبدار بنانے کا کام ہونے لگا۔ قیمتی پتھروں سے مختلف نمونے وضع ہونے لگے اور نئے نئے انداز کے جواہرات بننے لگے۔ مانکیالہ کے کھدائی کے دوران جو نگینے ملے ہیں، اُن کی تراش خراش دیکھ کر کاریگروں کے ہنر کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں پر بعض قیمتی اور نیم قیمتی پتھر مختلف جانوروں کی شکل پر تراشے گئے ہیں۔

۱۹۰ قبل مسیح، یہ علاقہ باختری یونانی اثرات سے آشنا ہوتا ہے۔ پھر، تورانی (Scythian) اور پارتھی (Parthian) تہذیب اپنا اثر دکھاتی ہے۔ (سیتھیا بحیرۂ اسود، بحیرۂ خضر اور بحیرۂ ارال کے شمال کا قدیم نام تھا اور پارتھیا، قدیم زمانے میں مغربی ایشیا کی ایرانی سلطنت بھی۔) تورانی عہد میں یہاں پتھر سے مجسمہ سازی کا آغاز ہوا جو بعد میں ہیلینی اثرات کے تحت اعلیٰ فن کی صورت اختیار کر گیا۔ تورانی عہد میں مقامی و ہیلینی ثقافتوں کی ہم آہنگی (۳۸ ق م) کا آغاز ہوا۔ ان دو تہذیبوں کی عجیب و غریب آمیزش کی مظہر، ٹیکسلا میں سرکپ کی وہ زیارت گاہ ہے جس پر دوہرے سر کا عقاب بنا ہوا ہے۔ یہاں کی محرابیں مقامی طرزِ تعمیر کا پتہ دیتی ہیں اور سامنے کی بالائی تکون یونانی انداز کی حامل ہے۔ سرکپ میں پارتھیائی اثرات کے مظاہر بھی ملتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنے سیاسی عقائد اور نسلی میلانات کے باعث کم و بیش ہیلینی تھے۔ اُن کی اپنی زبان پارتھیائی یا قدیم ایرانی تھی لیکن یونانی ان کی سرکاری زبان تھی۔ سرکپ سے اُس عہد کے طبقات کی کھدائی کے دوران جو طلائی زیورات، نیز چاندی اور کانسی کے بنے ہوئے برتن برآمد ہوئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے ہنرمند اور خلاق ذہن کے مالک تھے۔

اِس کے بعد کشان عہد شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں مشہور چینی سیاح فاہیان ٹیکسلا آیا۔ ڈھیر مانکیالہ سے اِس عہد کے بھی طلائی سکے ملے ہیں۔ مگر کشان فرمانرواؤں کے بعد سفید ہنوں کی صورت میں ایک ایسا طوفان آیا جس سے یہاں کی کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکی۔ ہنوں نے

---

۹ Manuscripts of Federal Capital by Muhammad Waliullah Khan, 1959. ط

سب سے زیادہ نقصان بدھ خانقاہوں کو پہنچایا۔ یہ تباہی اتنی زبردست تھی کہ ملک کئی صدیوں تک سنبھل نہ سکا۔

ایک طویل عرصے تک برصغیر کی حالت ناگفتہ بہ رہی۔ بعدازاں مسلمان حملہ آوروں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ مسلمان فرمانرواؤں کے حملوں کے ساتھ پہلی بار تاریخ میں پوٹھوہار کی وادی کے اصل باشندوں یعنی گکھڑوں کا باقاعدہ ذکر ملتا ہے۔ گکھڑوں نے پہلا مقابلہ سلطان محمود غزنوی سے اس وقت کیا جب وہ راجہ آنند پال پر حملہ آور ہوا۔ دوسرا مقابلہ محمد غوری کے حملے کے وقت ہوا، جبکہ ایک گکھڑ سردار ملک ہیتھی، پرتھوی راج سے جا ملا۔ گکھڑ عقائد کے اعتبار سے ہندو تھے۔ لیکن ۱۲۰۵ء میں شہاب الدین غوری کے حملے کے دوران مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان کے سب سے بڑے سردار کا نام سارنگ تھا جو بظاہر ہندوانہ ہے لیکن اُن کی اپنی داستانوں اور نسب نامے کے مطابق وہ ساسانی خاندان کے ایک فرد سلطان کیگوہر کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو کیانی کہتے ہیں۔ انہی داستانوں کے مطابق، سلطان محمود غزنوی نے (۱۰۳۰ء میں) گکھڑوں کے سردار گکھڑ شاہ المعروف کیگوہر کو سندھ ساگر دوآب کا علاقہ بخش دیا تھا۔ لیکن اس روایت میں اشتباہ ہے۔ ایک یونانی مورخ آریان نے جو ہندوستان پر سکندر کے حملے کا صحیح حال بیان کرنے میں شہرت رکھتا ہے، ابھی اور پورس کے علاوہ ایک اور راجہ ابھیسار کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اُس کی سلطنت ٹیکسلا کے شمال مشرق سے لے کر جہلم کے مشرق اور شمال مشرق تک بیان کی جاتی ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں آج بھی گکھڑ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سنسکرت میں ابھیسار کا مفہوم پہاڑی علاقے کے بے خوف لوگ ہے۔ قیاس غالب ہے کہ گکھڑوں کا اصل نام یہی ہوگا اور یہ قدیم ابھیساریوں ہی کی اولاد ہیں، اور پوٹھوہار کی تمامتر تہذیب و ثقافت، شجاعت اور دلیری کے اصل وارث یہی ہیں۔ ان کے پرانے مشاغل، شکار، شہسواری، عقاب اور شکاری کتے پالنا ہے۔ یہ لوگ صدیوں تک اپنے علاقے کے خود مختار حکمران رہے ہیں۔ برصغیر کا جو بھی بادشاہ بنتا تھا، اُس کا گکھڑوں پر غلبہ برائے نام ہوتا تھا۔ سلطان سارنگ خان کا شمار گکھڑوں کے عظیم سرداروں میں ہوتا ہے۔ وہ مغل شہنشاہ ہمایوں کا گہرا دوست اور اتحادی تھا۔ بلکہ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جنہوں نے مغلیہ سلطنت کو مستحکم بنانے میں مدد دی۔ اور محض ہمایوں سے دوستی کے باعث شیر شاہ کی مخالفت کی اور انجام کار شکست کھائی۔ وہ ۱۵۴۶ء میں شیر شاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سارنگ خاں ہی نے ہمایوں کو یہاں آنے کی دعوت دی اور اُسے دلی کا تخت واپس دلانے میں مدد کی۔ گکھڑوں اور مغلوں کی دوستی کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان سارنگ کے بیٹے سعید خاں کی بیٹی کی شادی جہانگیر سے ہوئی (اس شادی سے ایک بچی عفت بانو بیگم پیدا ہوئی جو تین سال کی عمر میں مر گئی)، اور اللہ قلی خاں کی دختر کا بیاہ اورنگ زیب کے چوتھے بیٹے شہزادہ محمد اکبر سے ہوا، اور یہ دونوں حوالے بالترتیب اکبر نامہ، تزک جہانگیری اور مآثر عالمگیری میں ملتے ہیں۔

گکھڑوں کے سر اس بات کا سہرا بھی بندھتا ہے کہ وہ پہلے حکمران تھے۔ جنہوں نے راولپنڈی کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ یہ ملک پلو تھا جس نے ۱۴۹۳ء میں راولپنڈی کو صدر مقام قرار دیا۔ اور جھنڈا خاں پہلا گکھڑ سردار ہے جس نے ۱۴ویں صدی کے منگول حملوں کے بعد اس شہر کو بحال کیا اور اسے موجودہ نام دیا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد سے یہاں کے قدیم عقائد اور دیگر تہذیبی و ثقافتی اقدار بھی متاثر ہوئیں۔ اسلام کے فلسفہ حیات نے عوام کی مذہبی و تمدنی زندگی پر گہرا اثر ڈالا حتیٰ کہ ہندو فلسفیوں اور مذہبی رہنماؤں نے بھی ان تبدیلیوں کے زیر اثر اپنے عقائد میں اصلاح کی کوشش کی۔ جونہی یہ خطہ اسلام کی روشنی سے آشنا ہوا یہاں تصوف نے بھی فروغ پایا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ برصغیر پر اسلامی تصوف کے

Kaigoharnama by Raezadeh Diwan Duni Chand, edited by Dr. Muhammad Baqir, Lahore. 1965, English portion, P.21.

Kaigoharnama, English portion. P.39.

The Imperial Gazetteer of India. Vol. XXI, Oxford, 1908. P.272

اثرات بہت گہرے ہیں۔ ہاں کئی ممتاز صوفیا اور علمائے دین آئے اور انھوں نے اسلام کی تبلیغ اس مؤثر انداز میں کی کہ ہزاروں ہندو برضا و رغبت مسلمان ہو گئے۔ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں حضرت داتا گنج بخشؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نام سرِ فہرست ہے۔ تاہم پوٹھوہار کا علاقہ، ہندوستان وارد ہونے والے صوفیا و علما میں سے حضرت قطب شاہؒ کے فیوض و برکات کا مرہونِ منت ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں آئے اور سکیسر کے سلسلۂ کوہ میں انگہ (ضلع خوشاب) میں اقامت گزیں ہوئے۔ اُن کے روحانی فیوض سے پوٹھوہار کے بیشتر ہندو، اللہؐ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لے آئے۔

یہ علاقہ صوفیائے کرام سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے۔ یہاں صوفیا نے عشقِ حقیقی اور عالمی بھائی چارے کا درس جس طریق سے دیا اُس سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ راولپنڈی سے تقریباً بارہ میل دور اور اسلام آباد میں شاہراہ دستور کے عقب میں نور پور شاہاں کا پرانا گاؤں آباد ہے۔ پوٹھوہار کے مشہور بزرگ، حضرت شاہ لطیف بریؒ یہیں آسودہ خاک ہیں۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہاں آئے تھے۔ اُن کے مزار پر ہر سال اپریل کے مہینے میں شمالی پاکستان کا سب سے بڑا میلہ لگتا ہے اور ہزاروں لوگ دور دراز سے اظہار عقیدت کیلئے آتے ہیں۔ ایک اور روحانی پیشوا حضرت پیر مہر علی شاہؒ ہیں۔ اُن کا مزار راولپنڈی کے مغرب میں گولڑہ نامی گاؤں میں واقع ہے۔ یہ گاؤں اب ضلع اسلام آباد کا حصہ بن چکا ہے۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ صرف و نحو اور علمِ کلام کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ پوٹھوہار کی مجلسی و مذہبی زندگی پر ان دونوں بزرگانِ دین کی تعلیمات کا گہرا اثر ہے۔ راولپنڈی سے پشاور تک کے عقیدت مند آج بھی جب اپنی روحانی وابستگی کے بے ساختہ اظہار پر مجبور ہوتے ہیں تو جوش میں آکر "بریؒ" کا نعرہ لگاتے ہیں۔

پوٹھوہار کی وادی، حملہ آوروں کی گزرگاہ ہونے کے باعث نیز اپنے مخصوص جغرافیائی حالات کے سبب، علم و ادب میں کوئی بہت بڑا نام تو پیدا نہ کر سکی، تاہم یہاں کے باشندوں کو جفاکشی اور عسکری زندگی کا درس ضرور دیتی رہی۔ اس علاقے نے گکھڑوں میں جو شجاعت بھر دی تھی اُس میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ گکھڑ سرداروں کی باہمی رقابتیں اس قدر شدید ہوتی گئیں کہ آئے دن ایک دوسرے پر حملے کی تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس روش نے بھی اُنھیں چوکس رہنا سکھا دیا تھا۔ یہ اُن کی شجاعت و مستعدی کا ثبوت ہے کہ آج بھی دفاعی افواج میں چکوال، جہلم، راولپنڈی اور اٹک (کیمبل پور) کے لوگ سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ تاہم جہانگیر گکھڑوں کی انہی رقابتوں کے باعث ان سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کی باہمی مخالفت اور دشمنی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔[1]

لیکن ان جنگجو گکھڑوں کو رقص و نغمہ سے بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی فوجی زندگی سے۔ مختلف تہواروں اور فتح کے موقعوں پر جوشن برپا ہوتے تھے۔ اُن میں مردانہ وجاہت کے حامل ناچ اور گیت دونوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ لوگ ابتدائی ویدک عہد میں بھی کوئی معبد بنا کر پرستش کی رسم ادا کرنے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ اُن دنوں بھی اپنی مسرتوں کا اظہار، والہانہ انداز میں کھلے آسمان تلے گیت گا کر کرتے تھے۔ ابھی لکھنے کے فن نے فروغ نہیں پایا تھا۔ لہٰذا تمام گیت زبانی یاد رکھے جاتے تھے۔ برصغیر میں تحریر کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح ہوا۔ اور اس کا سہرا اہلِ فارس کے سر ہے جنہوں نے خروشتی اور آرامی رسم الخط سے متعارف کرایا۔ تقریباً اسی عہد میں سنسکرت رسم الخط نے رواج پایا۔ اب طویل نظمیں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھیں، قلمبند کی جانے لگیں۔ چنانچہ بعد کے ویدک عہد میں تمام بڑی بڑی آریائی کتب مرتب ہو گئیں۔

ویدک عہد میں پوٹھوہار کا علاقہ خاصا ترقی و تہذیب یافتہ تھا۔ پاکستان کی شمال مغربی پہاڑیوں اور دریائے جہلم کے درمیان کا علاقہ "گندھارا" کہلاتا تھا جس میں کئی بارونق شہر تھے۔ ان میں سے پشکلاوتی اور ٹیکسلا کا ذکر اکثر آتا ہے۔ ٹیکسلا علم و فن کا مرکز تھا۔ ویدوں اور "علم کی اٹھارہ شاخوں" کی

---

[1] تزکِ جہانگیری، مترجم سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۲۴

تعلیمات حاصل کرنے کے لئے لوگ گروہوں کی صورت میں یہاں ہمہ وقت موجود رہتے تھے اور مختلف روایات سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ مہابھارت کی عظیم رزمیہ نظم سب سے پہلے اسی شہر میں پڑھ کر سنائی گئی۔[لے]

۵۱۸ قبل مسیح، وادیٔ سندھ پر دارا اول کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہاں اہلِ فارس کی عملداری دو سو سال تک رہی۔ لیکن ان کا نظم و نسق اتنا کمزور تھا کہ سارا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ تاہم یہ انہی کے اثرات تھے کہ یہاں آرامی اور خروشتی رسم الخط رائج ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ادب پر قدیم ایرانی و یونانی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان کے مظاہر ہندوستان کے قدیم سکوں اور مجسموں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یونانی مورخ کرائی سوٹو (Chrysoto) تو یہاں تک بتاتا ہے کہ ہندوستان کے باذوق لوگ یہاں ہومر کی رزمیہ پڑھتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ اور جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے، اب بھی ناقدین کی رائے میں اس نے یونانی اثرات کے تحت گپت عہد میں اپنا بام عروج دیکھا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ چندر گپت موریا کا مشیرِ اعلیٰ اور شاطرانہ سیاست کا ماہر چانکیہ جسے کوتلیا بھی کہا جاتا ہے، ٹیکسلا ہی کا شہری تھا۔

بہرکیف، پوٹھوہار کی عملداری کا یہی حال بعد میں مسلمان سلاطین کے عہد میں بھی ہوا۔ وہ بنگال، اڑیسہ، گجرات اور دکن کی مہمات میں مصروف رہے اور اس علاقے پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ گکھڑ سرداروں کی آپس میں لڑائیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ بعد میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تو اس علاقے کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پوٹھوہار کا علاقہ کابل اور کشمیر کو جاتے ہوئے راستے میں آتا تھا اور یہاں مغل شہنشاہ پڑاؤ ڈالتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں علم و فضل کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا پوٹھوہار کا علاقہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ مساجد میں قائم شدہ مدرسوں میں عام لوگوں کو عربی و فارسی کی بنیادی تعلیم دی جانے لگی۔ سعدی کی "کریما" سے تعلیم کا آغاز ہوتا اور نظامی گنجوی کے "سکندر نامے" پر تعلیم مکمل ہوتی۔

مغلیہ عہد میں پوٹھوہار کے دو فارسی شعراء سلطان شادمان اور شاہ مراد، یہاں کے ادبی و ثقافتی حلقوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اول الذکر شاہجہان اور موخرالذکر اورنگ زیب کے عہد کے شاعر تھے۔ شاہ مراد نے فارسی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں اشعار کہے۔ ان پر وحدۃ الوجود کا غلبہ ہے۔ ان کا کلام عشق و مستی، سوز و گداز، سادگی، پرکاری اور علامتی اسلوب سے عبارت ہے۔ شاہ مراد قصبہ خان پور ضلع جہلم کے اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے جو پنجاب میں "دھنی" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا کلام ۱۹۰۸ء میں پہلی بار راولپنڈی سے طبع ہوا تھا حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" میں ان کی ایک ریختہ غزل کا نمونہ درج ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اردو مجلس چکوال نے شاہ مراد کا کلام مناسب ترتیب و تدوین کے بعد از سرِ نو شائع کیا تھا اور اسی سال جشن شاہ مراد بھی منایا گیا تھا۔ اس تقریب کی اہم بات یہ تھی کہ مضامین پڑھنے والے ادباء نے دعویٰ کیا کہ شاہ مراد، ولی دکنی سے پہلے کے شاعر ہیں اور اس لحاظ سے ریختہ غزل بھی سب سے پہلے انہی نے کہی ہے۔ جمیل ہاشمی نے اپنے مضمون "شاہ مراد اور ولی دکنی — ایک تقابلی مطالعہ" میں جو کلام شاہ مراد کے پیش لفظ کے طور پر چھاپا گیا ہے، بتایا ہے کہ شاہ مراد کا سالِ وفات ۱۷۰۲ء اور ولی دکنی کا ۱۷۴۳ء ہے اور یہ کہ ولی دکنی ۱۷۰۲ء میں بیدل سے ملنے دلی آئے تھے۔ اگرچہ تاریخ پیدائش دونوں شعراء کی تحقیق طلب ہے۔ تاہم شاہ مراد کا کلام ریختہ، ولی دکنی سے زیادہ صاف، رواں اور مطالب و معانی کے اعتبار سے زیادہ گہرا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ شاہ مراد، ولی دکنی سے اکتالیس سال پہلے فوت ہوئے۔

سلطان شادمان، سلطان سارنگ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام ۱۸۹۹ء میں پہلی بار لاہور سے طبع ہوا تھا وہ نہایت حسین و جمیل غزل کہتے تھے۔ خوبصورت الفاظ اور نادر تشبیہات پر خاص توجہ تھی اور حافظ کا اتباع کرتے تھے۔

[لے] Report of Federal Commission on History, Achicture and Archaeology Committee No.X.P.180.

پوٹھوہار کا ایک ناقابلِ فراموش، تاریخی و ادبی کام "کیگوہر نامہ" ہے۔ یہ گکھڑوں کی منظوم تاریخ ہے جسے رائے زادہ دیوان دنی چند نے اکبر آباد تخت پڑی، اور پھروالا کے گکھڑ حکمرانوں سلطان مبارز الدین اور سلطان دلاور خاں کے احکام کی تعمیل میں ۲۵، ۱ء میں تالیف کیا تھا۔ پوٹھوہار کے علاقے میں گکھڑوں کا قبیلہ تاریخ، تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قبیلہ وادیٔ نیلاب (سندھ) چناب تک کے علاقے پر سات سو باون سال (۱۰۲۱ء تا ۱۷۷۳ء) حکمران رہا۔ اس کا پہلا جامع تذکرہ ۱۲۱۷ء میں جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں جے جی ڈل میرک (J.G. Delmerick) کے مضمون میں ملتا ہے۔ لیکن اس کی معلومات بھی زیادہ تر تاریخ فرشتہ اور جوہر آفتابچی کی تالیف "تذکرۃ الواقعات" پر مبنی ہیں جو محققین کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتماد ذرائع معلومات نہیں ہیں۔ تاہم راولپنڈی سے تقریباً بارہ میل مشرق میں پھروالا قلعہ کے آثار اب بھی گکھڑوں کی عظمتِ رفتہ کے غماز ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر نے ۱۹۶۵ء میں انتشاراتِ پنجابی ادبی اکادمی لاہور کے زیرِ اہتمام "کیگوہر نامہ" کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ، بڑی عرق ریزی سے مدون کر کے شائع کیا تھا جس کا پیش لفظ، حواشی اور حوالہ جات معلومات سے پُر ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر کی تدوین کے بغیر گکھڑوں کی تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ گکھڑ اپنا نسبی تعلق اصفہان کے ایک حکمراں سلطان کیگوہر سے قائم کرتے ہیں اور دعویٰ رکھتے ہیں کہ کیگوہر، فارس (ایران قدیم کا وہ علاقہ جو شیراز، اصفہان، کرمان اور یزد کے شہروں پر مشتمل تھا) کے کیانی حکمرانوں کیقباد اور کیکاؤس کا معاصر تھا۔ لیکن تاریخ کیگوہر کے بارے میں کوئی راہنمائی نہیں کرتی اور کم و بیش سبھی محققین کو کیگوہر نامہ کے تمام منظوم مندرجات کی تصدیق کے بارے میں تامل ہے۔ پھر یوں بھی دیکھیے کہ تزکِ بابری سے قبل تاریخ میں گکھڑوں کا ذکر نہیں ملتا۔ بابر نیلاب اور بھیرہ کے درمیان پہاڑی علاقے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں ایک گکھڑ حاکم کے تحت جاٹ گوجر اور متعدد دوسرے چھوٹے قبیلے آباد ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہتھی یا ہاتھی خاں (اصل نام حمد خان) گکھڑوں کا سردار تھا اور گکھڑوں کی حدود سے ملحقہ علاقہ جنجوعہ سرداروں کی عملداری میں تھا۔ چنانچہ دونوں قبیلے آپس میں نبرد آزما رہتے تھے۔ جی دنوں بابر بھیرہ میں مقیم تھا، اُسے اطلاع ملی کہ ہاتھی خاں گکھڑ نے اپنے ہی متحارب قبیلے کے ایک اور سردار تاتار خاں گکھڑ کو جو پھروالا کا حکمراں تھا، حملہ کر کے ہلاک کر ڈالا ہے اور اس کا خزانہ اور دیگر قیمتی سامان لوٹ لیا ہے۔ تاتار خاں کا داماد منوچہر خاں، بابر کے وفاداروں میں سے تھا۔ اور در اصل یہ اطلاع اُسی نے بہم پہنچائی تھی۔ بعد ازاں جنجوعہ سرداروں نے بھی ہاتھی خاں کے ظلم و ستم کے خلاف بابر سے شکایت کی۔ چنانچہ بابر اُس کی گوشمالی پر آمادہ ہو گیا۔ آخر ایک مختصر سی لڑائی کے بعد ہاتھی خاں کو شکست دی، وہ فرار ہو گیا اور بابر نے اُس کے علاقے ڈنگلی (Dangali) پر قبضہ کر لیا۔

تزکِ بابری میں اس واقعے کا ذکر کم و بیش تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے[۱]۔ اس میں پھروالہ جسے تزکِ بابری میں "پرہالہ شہر" کا نام دیا گیا ہے، کی سیر، تاتار خاں کے محلات میں قیام اور سوان ندی کے کنارے اندرانہ (اڈرانہ، تحصیل فتح جنگ) کے مقام پر لشکر ٹھہرانے کا بھی ذکر موجود ہے۔ بہر حال تزکِ بابری، ہی وہ پہلی مغل تاریخ ہے جس میں پوٹھوہار کے اس مشہور قبیلے کا تذکرہ قدرے تفصیل سے ملتا ہے۔ بعد ازاں مغلیہ دور کی دیگر کتب تاریخ، اکبر نامہ، آئینِ اکبری، طبقاتِ اکبری، منتخب التواریخ اور تزکِ جہانگیری میں بھی کچھ سرسری سے حوالے ملتے ہیں۔

مجموعی طور پر مغلیہ دورِ حکومت، غیر محسوس طور پر مقامی طرزِ سیاست پر ہی نہیں یہاں کے تہذیب و تمدن پر بھی اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ نئے نظام تمدن کا ایک قابلِ اعتنا پہلو یہ تھا کہ اس نے "کچھ دو اور کچھ لو" کے مقولے میں مضمر توازن کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ انجام کار اردو نے اپنا مقام پیدا کر لیا جو برج بھاشا ہی کی ایک مفرس صورت ہے۔ فارسی بولنے والوں اور پوٹھوہار کے پراکرت بولنے والوں کے میل جول سے ایک نئی بولی "پوٹھوہاری" پیدا ہو گئی۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ برصغیر میں مسلمان فرمانرواؤں کی آمد کے وقت پوٹھوہار میں کون سی پراکرت بولی جاتی

---

[۱] تزکِ بابری، اردو ترجمہ رشید اختر ندوی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، باردوم جنوری ۱۹۶۶ء، صفحات ۱۵۵ تا ۱۵۷۔

تھی لیکن یہ طے ہے کہ وہ سنسکرت کی ہی کوئی صورت ہوگی جس میں کرخت لہجے سے ادا ہونے والے الفاظ بھی ہوں گے اور ناک سے نکلنے والی آواز ایسے لہجے بھی۔ مثال کے طور پر "پھڑ کہن" (پکڑ لے) "کے کرنا ایں" (کیا کر رہے ہو) یا پھر "شوڑ دو، نسکانی تیئے اے" (چھوڑ دے، چھوڑ دے، نقصان کی چیز ہے)۔ ان جملوں میں استعمال ہونے والے الفاظ اور ان کو ادا کرنے کی آوازیں، پوٹھوہاری زبان میں بکثرت ملتی ہیں۔ مگر ان جملوں کا لب و لہجہ، اردو بولنے والوں کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اس لئے کہ پوٹھوہاری میں سنسکرت، ترکی اور فارسی کے متعدد الفاظ، لہجے یا تلفظ کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اب تک موجود ہیں۔ سنسکرت کا لب ولہجہ تو اوپر کی سطور میں بیان ہو چکا اب ترکی اور فارسی الفاظ کی مثالیں بھی دیکھ لیجیے۔ "قاشق" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا معنیٰ ہے چمچہ۔ یہ لفظ، اسی املا اور تلفظ کے ساتھ پوٹھوہاری میں چمچے ہی کی جگہ بولا جاتا ہے۔ بلکہ دیہات میں تو چمچے کا لفظ مستعمل ہی نہیں۔ مثلاً کسی چھوٹے لڑکے کو چمچہ لانے کے لئے کہنا مقصود ہو تو آپ کہیں گے "بچتا! قاشق کہن آ"۔ اسی طرح فارسی میں عصر کی نماز کو "نماز دیگر" اور عشا کی نماز کو "نماز خفتن" کہا جاتا ہے جیسا کہ خود بابر نامہ میں یہ جملہ موجود ہے کہ "نماز دیگر فرود آمدہ، اسپاں را دانہ دادہ، نماز خفتن از آنجا سوار شدیم"۔ اب دیکھیے کہ راولپنڈی اور اس کے مضافات میں بسنے والے تمام پوٹھوہاری لوگ عصر کی نماز کو "دیگراں نی نماز" اور عشا کی نماز کو "کفتاں (خفتاں) نی نماز" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کے راستے ہندوستان وارد ہونے والے حملہ آور اپنی زبان کے اثرات مقامی بولیوں پر ڈالتے رہے اور ان کے اثرات خود بھی قبول کرتے رہے۔

شاید اسی لئے پوٹھوہاری یہاں کے جنگجو افراد کی زبان ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک عسکری نغمگی، مقصد کا خلوص، اظہار کا بے ساختہ پن، اور ظاہری رکھ رکھاؤ بدرجۂ اتم رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ پوٹھوہاری بولی نے ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے کس عہد میں اپنی موجودہ صورت اختیار کی کیونکہ بابر کی آمد سے قبل کے پنجابی ادب کی مختلف کڑیاں، تاریخ کے اوراق میں گم ہو چکی ہیں۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں یہ اپنی ترقی یافتہ صورت میں بولی جاتی تھی۔ مغل شہنشاہ نے اپنی توزک میں اسے "گکھڑوں کی زبان" لکھا ہے۔[۱]

لوک گیت

پوٹھوہاری شعر و ادب کا آغاز بھی لوک گیتوں اور نغموں سے ہوا۔ ان میں وہ تمام انسانی جذبات موجود ہیں جو کسی بھی دوسری شاعری کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ لوک گیت پوٹھوہار کے ہوں یا کسی اور خطے کے، ان میں جذبے اور مشاہدے مشترک ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ شادی بیاہ، فصلوں کی کٹائی یا مختلف تہواروں کے موقعوں پر ہر جگہ گائے جاتے ہیں۔ البتہ بولی اور لب و لہجہ کا فرق، ہر علاقے کے مخصوص جغرافیائی پس منظر میں سامعین کو زیادہ لطف دیتا ہے۔ لوگ ان گیتوں کو الفاظ کا جامہ پہنانے والوں سے آشنا نہیں ہیں لیکن جانے کب سے یہ گیت، یونہی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری لوک شاعری محاکات سے بھری ہوئی ہے۔ شاعر کا خیال، جذبات کی تہ در تہ گہرائیوں میں اتر کر گوہر مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کا اظہار اتنے آسان اور بیساختہ پن سے کرتا ہے کہ وہی دقیق بات جسے کہنے کے لئے فلسفی کو متعدد غیر معروف تراکیب و الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے، لوک گیت میں ڈھل کر سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس بے ساختہ اظہار کے لئے پوٹھوہار سمیت پورے پنجاب میں "ماہیا" کی صنف بہت مقبول ہے۔ مثال کے طور پر اس کا حسب ذیل پوٹھوہاری روپ دیکھیے ؎

جوڑا دنداں نا
مڈھ نوں نپیئے
کوئی اعتبار نہ پانداں نا

(ترجمہ: بیلوں کا جوڑا ہے جب بھی کوئی چیز پکڑیں نیچے یعنی جڑ سے پکڑیں، کیونکہ کمزور بالائی شاخوں یا پھننگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ جانے کب ٹوٹ جائیں۔)

---

[۱] توزک جہانگیری، اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۲۳

اب ایک مشہور ترین پوٹھوہاری ماہیا ملاحظہ کیجیے:

کھو وگنا کھل ویسی
ہَلی ہَلی تجھی آں
کدے بھانبڑ بل ویسی

(ترجمہ: چلتا ہوا رہٹ رک جائے گا۔ ابھی تیری محبت میں ہلکی ہلکی سلگ رہی ہوں، مگر وہ وقت آئے گا کہ میں ساری کی ساری جل جاؤں گی۔)

"ماہیے" کی پنجاب گیر مقبولیت کے برعکس "ڈھولا" پوٹھوہار کی وادی سے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ عوامی گیت ہونے کے باعث مختلف جگہوں پر اسے بھی گایا جاتا ہے لیکن اس کے اصل مزاج شناس پوٹھوہار کے دیہات ہیں۔ "ڈھولا" میں ہر تین مصرعوں کے بعد "جی او ڈھولا" کے بول بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

بازار وکندی برفی
می کی (مینوں) لے دے نکی جیہی چرخی
دکھاں جیاں (دیاں) پونیاں —— جی او ڈھولا

(ترجمہ: "بازار میں برفی بک رہی ہے، مجھے ایک چھوٹا سا چرخہ لے دو جس پر میں اپنے دکھوں کی روئی (پونیاں) کاتا کروں گی (اور اس مصروفیت کے باعث تیری یاد کی اذیت سے بچی رہوں گی)، اے محبوب! تو سلامت رہ۔")

لیکن ایک "ڈھولا" اور ہے، جو راجہ ڈھولا اور رانی شمس کی رومانی داستان کے پس منظر میں گایا جاتا ہے۔ اس ڈھولے کے بول یہ ہیں:

نیوں نہ لائیے نال فقیراں —— ڈھولا!
منگن ٹکڑے ماہی دے نے اکن پیراں —— ڈھولا!

(ترجمہ: کنگال (بے ذوق) لوگوں کے ساتھ محبت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ طلبگار تو ہوتے ہیں دل ایسی چیز کے لیے لیکن خود اس کے اہل نہیں ہوتے، اے میرے محبوب!")

پوٹھوہار کے دیگر لوک گیتوں میں ٹپہ اور جگنی زیادہ مقبول و معروف ہیں۔ "ٹپے" کو پوٹھوہار کے لوک گیتوں کی روح[۵] قرار دیا گیا ہے۔ مگر ٹپہ تنہا گانے کی چیز نہیں ہے۔ عام طور پر لڑکیاں دو گروہوں میں بٹ کر گاتی ہیں۔ ایک گروہ ٹپے کے بول اٹھاتا ہے، دوسرا گروہ ٹپے کے دوسرے مصرعے میں اٹھائے گئے سوال کا جواب دے کر تیسرا مصرع دہراتا ہے۔ اس طرح سوال و جواب کی صورت میں گانے والی لڑکیوں اور سامعین دونوں میں "حریفانہ گرم جوشی" پیدا ہو جاتی ہے جس سے ٹپہ لوگوں کی توجہ کو بٹنے نہیں دیتا۔ ٹپہ واحد لوک گیت ہے جس میں تحرک، جذبہ، فعالیت اور حسِ مزاح بڑے لطیف انداز میں اجاگر ہوتے ہیں اور پوری محفل میں "گرمی گفتار" پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر لڑکیوں کی ایک ٹولی ٹپے کے یہ بول اٹھاتی ہے:

کچے نی ونگ ماہیا
او کے کر سن
ٹٹے جنھاں نے سنگ ماہیا

دوسری ٹولی جواب میں کہتی ہے:

او پے مر دسن
ٹٹے جنھاں نے سنگ ماہیا

---

۵ پنجابی زبان و ادب، مؤلفہ حمید اللہ ہاشمی، انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی، پہلی اشاعت ۱۹۸۷ء، صفحہ ۳۲۸

"جگنی" کے لفظی معنی کے بارے میں محققین کے ہاں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ ماتھے کا چھوٹا سا "ٹکا" ہے اور بعض اسے لفظ جوگن کی بگڑی ہوئی صورت قرار دیتے ہیں۔ موخرالذکر تحقیق زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ "جگنی" کے بولوں پر صوفیانہ شاعری کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ اور یہ اپنے متصوفانہ رنگ کے باعث ہی پوٹھوہار کے دیہات میں زیادہ مقبول ہے۔ مثلاً

"جگنی نا (دا) حال نماتا
ایہہ دنیا جھوٹ ٹھکانا
سائیں میریا جگنی اڈے پئی
دن چڑھے تے کلمہ پڑھے پئی

یہی "جگنی" معمولی سے ردوبدل کے ساتھ پوٹھوہار میں یوں بھی گائی جاتی ہے:

"جگنی" نا حال نماتا
ایہہ دنیا جھوٹ ٹھکانا
جھٹ آجاسی پروانا
سائیں مہاڑیا جگنی رُڑے پئی
ڈیہوں چڑھے تے کلمہ پڑھے پئی

(ترجمہ: اے محبوب! تیری جوگن (محبوبہ) کی حالت خراب ہو چکی ہے۔ اس کے لئے یہ دنیا مقام فانی ہے۔ اے محبوب! تیری جوگن کا وقتِ رخصت اب قریب ہے۔ سحر ہونے والی ہے (یعنی مجاز کا پردہ اٹھنے والا ہے) اور وہ کلمہ کا ورد کرتی (اپنے ایمان کی گواہی دیتی) رخصت ہو رہی ہے۔ ڈیہوں، سورج کو کہتے ہیں۔ رُڑے پئی کا لفظی معنیٰ بے آب و گیا میدان میں پڑی ہے۔ لیکن مفہوم یہ ہے کہ کھلے آسمان تلے بے سہارا بیٹھی ہے۔)

یہاں کے لوک گیتوں میں "وار" کا شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ "وار" بنیادی طور پر تو ایک رزمیہ نظم ہے۔ جس میں مختلف قبیلوں کے شعرا اپنے زورِ بیان کے بل بوتے پر شجاعت کے قصوں کو منظوم کر کے قبیلے کے اجتماع میں مخصوص لَے کے ساتھ خود پڑھتے یا انہیں اپنے گاؤں کے مراسیوں کے ذریعے سنتے تھے۔ اس کے دو بڑے فائدے ہوتے۔ ایک تو ہر قبیلہ اپنی تاریخ یا اپنے عقائد سے متعلق واقعات اور شجاعت کے کارناموں کو ذہن نشین کر لیتا اور دوسرا تفریح طبع کا ایک بہانہ مل جاتا جو بلاشبہ نہایت پاکیزہ اور بامقصد ہوتا۔

"پنجابی زبان و ادب" کے مؤلف حمید اللہ ہاشمی اس صنفِ سخن کی تعریف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رزمیہ نظموں کو پنجابی میں وار کہا جاتا ہے۔ اس طویل نظم میں کسی قوم، قبیلہ یا شخص کے جنگی کارناموں کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں لوک واریں عام ملتی ہیں جن کا زمانہ آٹھویں یا دسویں عیسوی بتایا جاتا ہے۔"[1]

چونکہ پوٹھوہار کا پورا علاقہ بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ بنا رہا اور مقامی قبیلے اور ان کے سردار ان حملہ آوروں سے برسرِ پیکار رہے اس لئے رزمیہ نظمیں ان کی عسکری ضرورت بن گئی تھیں اور یہ مسلسل آبرو آزمائی ہی کا نتیجہ تھا کہ پوٹھوہار کے لوگوں کی طبیعت میں سختی سی پیدا ہو گئی تھی اور مہ و سال کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پوٹھوہاری مزاج کا حصہ بن گئی۔

"لوک واریں" اگرچہ پورے پنجاب کے دورِ ابتلا کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کسی مرحلے پر بھی یہ مرثیے میں

---

[1] پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۷۰

تبدیل نہیں ہوتیں۔ پوٹھوہار میں "وار" پڑھنے (گانے) کا انداز بڑا منفرد ہے۔ ہر شعر شجاعت کے جذبات کو مہمیز دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والا اپنے سینے کا سارا زور صرف کر دیتا ہے۔ قدیم ترین واروں میں (جن کا پوٹھوہار سے کوئی تعلق نہیں) سکندر ابراہیم ٹنڈے سپاج اور رائے کمال کی واریں[۵۱] زیادہ مشہور ہیں۔

خود امیر خسروؒ کے بارے میں یہ اندراج موجود ہے کہ انھوں نے "تغلق شاہ دی وار" پنجابی میں لکھی تھی۔[۵۲] "وار" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ گرنتھ میں بائیس واریں شامل ہیں جن میں سے تین خود گورو نانک کی منظوم کردہ ہیں۔[۵۳] مجموعی طور پر پنجابی ادب میں لوک واروں کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن اس میں پوٹھوہار کے قبائل کی شجاعت کے کارنامے کم کم ہیں۔ شاید اس لئے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات اتنے جاذبِ نظر اور دلآویز تھے کہ نسبتاً چھوٹے واقعات پر نظر ہی نہیں ٹھہری۔ مثال کے طور پر امام حسینؑ دی وار، تغلق دی وار، نادر شاہ دی وار، غازی علم دین دی وار، مرزا صاحباں دی وار اور دُلا بھٹی دی وار کی موجودگی میں گکھڑ سرداروں کی واروں کی اہمیت کا کم ہو جانا قرین قیاس ہے۔ تاہم اول الذکر وار (امام حسینؑ) سے قطع نظر، باقی سبھی واریں ماضی قریب سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ گکھڑوں کی تاریخ اس سے پرانی ہے۔

البتہ کیگوہرنامہ کے تتمہ کے طور پر رایزادہ دنی چند کے خاندان کے شاید آخری تاریخ داں رایزادہ عزت رائے کی ایک وار کا اندراج ان الفاظ میں ملتا ہے "تمام شد وار جنگ از لشکر کشی گکھڑاں، بر دھن ملوکی و گرفتن رئیسان آں ملک و تاخت و تاراج کردن گکھڑاں آں ملک را، فقط"[۵۴]

رقص و موسیقی

مذکورہ بالا سطور میں پوٹھوہاری لوک گیتوں کی اہم اقسام اجمالاً بیان کر دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں مہندی، شادی بیاہ، رخصتی اور ڈولی کے بھی گیت گائے جاتے ہیں جن کے جذبات سارے پنجاب میں یکساں ہیں۔ صرف لہجہ اور روزمرہ مقامی ہو جاتا ہے جس کے سبب علاقائی رنگ ابھرتے ہیں اور لوگ انہی رنگوں کا بے ساختہ اظہار رقص کے ذریعے کرتے ہیں۔ لڈی، گدا، کِکلی، بھنگڑا اور جھومر تو پنجاب کے سبھی علاقوں میں مقبول ہیں۔ البتہ "سمّی" ایک ایسا لوک ناچ ہے جس کے بارے میں پوٹھوہار کو بجا طور پر ناز ہے کہ یہ اُس کی تہذیب و ثقافت میں رچ بس چکا ہے۔ حالانکہ یہی ناچ حرکات و سکنات کی چند تبدیلیوں کے ساتھ جھنگ اور ملتان کے علاقوں میں بھی مقبول ہے۔[۵۵] بہرحال یہ ناچ بھی راجہ ڈھولا اور رانی سمّی کے رومان ہی کی داستان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق سمّی سے اُس کے محبوب نے بے وفائی کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی قلبی کیفیت کا اظہار رقص سے کرتی ہے اور اس اظہار میں دوسری جوان لڑکیاں بھی اُس کا ساتھ دیتی ہیں۔ ناچ کے وقت ڈھول بجتا ہے۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے دوپٹے کمر کے گرد کس لیتی ہیں۔ اور دائرے کی شکل میں گھومتی ہیں۔ کمر کو ذرا سا خم دے کر تھرکتی ہیں، ایک پاؤں اوپر اٹھا کر دوسرا زمین پر تھاپ کے طور پر مارتی ہیں۔ اپنے چہرے کے مقابل بازو لہراتی، تالیاں بجاتی والہانہ انداز میں ناچتی ہیں اور پاؤں سے تھاپ دیتے ہوئے بار بار یہ بول گاتی ہیں:

"سمّی میری ون (ون بمعنی "لڑکی" کا تلفظ پوٹھوہار میں بروزن "وان" کیا جاتا ہے)

مَیں واری

مَیں واری آں نی سمّیے"

---

۵۱ پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۸۲ ۵۲ ایضاً صفحہ ۸۲ ۵۳ ایضاً صفحہ ۸۳

۵۴ کیگوہرنامہ، صفحہ ۲۱۹ ۵۵ پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۳۳۸

اصل ناچ تو غمگین کیفیات کا مظہر تھا لیکن اب یہ خوشی کے موقعوں پر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ناچ کے ساتھ جو گیت گایا جاتا ہے اس کی لَے فی نفسہ اداسی کی غماز ہے۔ "سمی" کا ایک اور انداز وہ ہے جس میں سب رقاص مل کر گاتے اور رقص کرتے ہیں۔ اس رقص میں گائے جانے والے بول بالعموم یہ ہوتے ہیں (اور ان کی لَے بھی اداس ہے):۔

موڑ وے
گڈی نیاں واگاں موڑ
مونہے توں مٹھڑا بول
گڈی نیاں واگاں پوڑ
بول پیپے رانگلے
بول سجن نے کول
گڈی نیاں واگاں موڑ

سمی ناچ کے پوٹھوہاری روپ کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ روائتی طور پر تو یہ عورتوں ہی کا رقص ہے لیکن جوں جوں حالات بدلتے گئے یہ مردوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسرا لوک ناچ "جھمر" ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ ناچ بنیادی طور پر وسطی پنجاب کا ہے جسے چاندنی راتوں میں دیہات کے گبھرو بڑے جوش اور ولولے سے پیش کرتے ہیں لیکن پوٹھوہار میں اسے بھی شادی بیاہ کے موقعوں عورتیں پیش کرتی ہیں۔ یہ رقص بھی ڈھول کی تھاپ پر دائرے کی شکل میں شروع ہوتا ہے۔ ہم رقص لڑکیاں گھیرے میں گھومتی ہیں اور جسم کو جھٹکا دے کر ڈھول کی تھاپ سے اپنی حرکات کو ہم آہنگ کرتی ہیں۔ ڈھول نہ ہو تو تالی سے تال دیتی ہیں اور خالص پوٹھوہاری لہجے میں یہ گیت گاتی ہیں:

بھاویں جانے تے بھاویں نہ جانے
تہاڑا ڈھول جوانیاں مانے
میں پانی بھرینیاں پتنوں
ایہہ نین نہ رہندے تکنوں
بھاویں جانے تے بھاویں نہ جانے
اُس ایتھے تے ڈھول مانسہے
مرگئیاں، تے خون متھے تیرے
بھاویں جانے تے بھاویں نہ جانے
تہاڑا ڈھول جوانیاں مانے

یوں تو پوٹھوہار کے رقص و نغمہ میں وہ تمام ساز حسب ضرورت استعمال ہوتے ہیں جو پاکستان کے دوسرے حصوں میں مستعمل ہیں تاہم طبلہ، ہارمونیم اور ستار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ طبل، سُرنا، بانسری، الغوزہ، اِکتارا اور جھنکارا (چکارا) سے بھی حسب موقع کام لیا جاتا ہے۔ مگر جس طرح پوٹھوہار کی تہذیب کے خدوخال بیرونی حملہ آوروں کے ورود سے نمایاں ہونے، اسی طرح یہاں کی موسیقی کے مخصوص مزاج کا بھی غیر ملکیوں کی آمد ہی سے پتہ چلا۔ سکندر ۳۲۶ قبل مسیح پوٹھوہار پر حملہ آور ہوا تھا۔ ان دنوں ٹیکسلا کے

دربار سے سنسکرت کا ممتاز عالم بینی وابستہ تھا۔ وہ موسیقی کا بھی مزاج داں تھا اور اس کا مسلمہ نقاد بھی۔ علم موسیقی پر اس کی بعض دستیاب تحریروں سے اس عہد کے موسیقی سے لوگوں کے شغف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پرانے شہر کی کھدائی کے دوران بھی کچھ آثار[1] ملے ہیں جو اب ٹیکسلا کے عجائب گھر کی زینت ہیں۔ ان سے اُس عہد کے مروجہ ناچوں اور کھیلوں کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ محو خواب رقاص (Sleeping Dancer) ہاتھوں میں موسیقی کا جو ساز پکڑے ہوئے ہے وہ ہمارے چھنکارا سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اس مجسمے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پوٹھوہاری ساز سے پھوٹنے والے نغمے کی روح لازوال ہے۔ چینی مؤرخ ہیون سانگ (۷ویں صدی عیسوی) نے اپنی رپورٹ میں جن علاقائی سازوں کے نام دیئے ہیں۔ اُن میں سنکھ، ڈھنڈھولی، مرجا، دینو اور جھلاریکا کے نام شامل ہیں۔ بہرحال یہ چند عناصر ہیں جن سے اُس عہد کی موسیقی کا ایک دھندلا سا تصور ضرور قائم ہو جاتا ہے۔

بعد ازاں موسیقی نے کس انداز میں فروغ پایا، اُس کے آثار ہنوں کی غارت گری نے مٹا ڈالے۔ چھٹی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ افراتفری کا شکار رہا۔ دسویں صدی میں یہاں ہندومت کے احیا کے آثار ملتے ہیں۔ لیکن اس کے فوراً بعد سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہو گئے اور پھر بیرونی حملوں کا سلسلہ مغلیہ سلطنت کے زوال تک قائم رہا۔ مغلیہ عہد میں دیگر فنون کے ساتھ موسیقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ خصوصاً اکبر کے عہد میں تو یہ اپنے عروج پر تھی۔ برصغیر کے تمام راگوں کی درجہ بندی کی گئی، انہیں معیاری سطح پر لایا گیا اور یہ اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں رایزادہ دیوان دنی چند ایسا ماہر موسیقی پیدا ہوا۔ اُن دنوں یہ سارا علاقہ گکھڑوں کی عملداری میں تھا۔ رایزادہ دُنی چند نے اپنی تالیف کیگوہر نامہ (۱۷۲۵) میں سرود، طنبورہ اور رباب ایسے سازوں کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وہ انہیں نہایت مہارت سے بجا سکتا ہے۔ دُنی چند نے پندرہ سال کی عمر میں فن موسیقی میں دسترس پیدا کی تھی[1]۔ دُنی چند کا ایک شاگرد میر گل مراسی تھا جو گکھڑوں کو اپنے استاد کا منظوم کردہ کرسی نامہ گا کر سنایا کرتا تھا۔ میر گل کا پوٹھوہار کی موسیقی میں کیا مقام تھا تاہم اس خطے میں موسیقی کے ارتقا کی داستان بیان کرتے ہوئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ راولپنڈی میں "خانقاہ دربار شاہ چن چراغ" سے وابستہ تھا اور یہیں دیگر گلوکاروں کے ہمراہ سماع کی محفلوں میں اپنی خدمات سرانجام دیتا تھا۔

سیف الملوک کا مؤلف میاں محمد بخش بھی اپنی طویل نظم میں پوٹھوہار کے کئی مروجہ راگوں کا ذکر کرتا ہے اور بعض راگوں کے نام بھی بتاتا ہے۔ ان میں قانون، مسکر، مشتک، مقوم اور رجبتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بظاہر یہ تمام ساز مصری یا عرب سازوں کی شکل پر بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سیف الملوک میں جن راگوں کا حوالہ ملتا ہے اُن میں بھیرویں، رام کلی، بمپاس، دیو قندھاری، اساوری، بھنراڑی، ناریز اور طہار، ٹوڈی، ہنڈولا، بہاگ، سوہنی، کونسلیا، بوگ، براج، مالکونس، دھرپد، خیال، ہمیر، شام کلیان، درباری، نٹ کلیان، لاہوری اور بجے بجے ونتی شامل ہیں۔ ان ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ہندوستان ہی کے ایجاد کردہ راگ تھے اور پوٹھوہار کا علاقہ میاں محمد بخش کے عہد میں ان تمام راگوں سے پوری طرح واقف تھا۔ واضح رہے کہ سیف الملوک (۱۲۷۹ھ) کی تالیف کو ایک سو تیس سال بیت چکے ہیں۔

پوٹھوہار کے لوک گیتوں اور موسیقی کے سلسلے میں ہمارے ہاں ایک اور بے حد قابلِ قدر کام یہ ہوا ہے کہ افضل پرویز اور اُن کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر اکمل پرویز نے بیشتر گیتوں کی دھنیں بھی تحریر کر دی ہیں[2]۔ میری دانست میں اس سے پہلے کسی اور ادیب و شاعر نے لوک گیتوں اور لوک موسیقی

---

[1] کیگوہر نامہ، دیباچہ (فارسی)، صفحہ ۵

[2] بن پھلواری، مؤلف افضل پرویز، ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم ۱۹۸۴ء، صفحات ۲۲۵ تا ۲۸۷

سے اس قدر محبت و رغبت کا ثبوت نہیں دیا۔ جن لوک گیتوں کی موسیقی مقامی و مغربی اوزان کے مطابق قلمبند کی گئی ہے، ان میں ماہیا، لوریاں، شادیانے، وچھوڑا، فصلوں کے پکنے پر گائے جانے والے گیت، ساونی اور رومانی گیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لوک ادب پر یہ انوکھا کام ہوا ہے لیکن حیرت ہے کہ اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں گئی۔ افضل پرویز نے اپنی تالیف "بن پھلواری" میں پوٹھوہار کے لوک گیتوں کو یہاں کی اصلی پوٹھوہاری بولی میں قلمبند کر کے علاقے کے مخصوص لب و لہجہ کو بھی محفوظ کر لیا ہے۔ جو کسی علاقے کے مزاج کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔

پوٹھوہاری شاعری

لوک گیتوں اور لوک موسیقی کی طرح پوٹھوہاری شاعری بھی ایک جداگانہ مزاج رکھتی ہے۔ اس میں عسکریت بھی ہے اور لطافت بھی۔ تصوف پوری پنجابی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ لہذا پوٹھوہار کا خطہ بھی اس سے براہ راست مستفیض ہوا ہے۔ لیکن معلوم و معروف شاعری کا عہد بہت پرانا نہیں ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کو پوٹھوہاری شاعری کے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ ابتدا میں رومانی شاعری کا چلن مقبول ہوا۔ پوٹھوہار کی عشقیہ شاعری میں پہلا بڑا نام پیلو (۱۵۰۶ء تا ۱۶۰۵ء) کا ہے۔ پھر ایک طویل خلا کے بعد یہاں کی شعری فضا میں صوفیانہ و عشقیہ میلانات پہلو بہ پہلو پیدا ہوتے ہیں، اور میاں محمد بخش (۱۸۳۰ء تا ۱۹۰۷ء) اور مولوی الٰہی بخش کنڈل (م ۱۹۰۸ء) اپنے اپنے کلام کا جادو جگاتے ہیں۔

پیلو چکوال کے گاؤں مہرو پیلو (علاقہ دھنی) کا رہنے والا تھا۔ بعض تذکروں میں اُس کی تاریخِ وفات ۱۶۷۵ء تحریر ہے۔ وہ بے حد رواں شعر کہتا تھا۔ اُس کے ہاں عشقِ مجازی بھی ہے اور عشقِ حقیقی بھی۔ "پیلو پہلا شخص ہے جس نے پنجابی کا مشہور لوک رومان "مرزا صاحباں" کو پنجابی نظم کے روپ میں پیش کیا۔"[۱] پیلو ٹکسالی پنجابی میں شعر کہتا ہے۔ وہ اپنے اسلوبِ بیان میں مقامی بولی سے متاثر نہیں ہوا۔ اُس کے بعد آنے والے سبھی شعرا نے اس کی شعری و فنی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

میاں محمد بخش (میرپور، آزاد کشمیر) کی طویل نظم "سفر العشق" المعروف بہ سیف الملوک، پوٹھوہار کی مقبول ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ راولپنڈی جہلم اور چکوال کے اضلاع، ہزارہ کے مشرقی حصوں اور آزاد کشمیر کا شاید ہی کوئی پرانا گھرانا ایسا ہو جہاں سیف الملوک کا نسخہ موجود نہ ہو۔ پوٹھوہار کے کئی دیہات میں تو اب بھی لوگ رات کے وقت سیف الملوک سننے کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔

مولوی الٰہی بخش کنڈل (پنڈ دادن خاں، جہلم) نے سسی پنوں کی مشہور رومانی داستان منظوم کی اور یہی داستان اُن کی وجہ شہرت بھی بنی مگر اس کا اصل نسخہ اب ناپید ہے۔ ویسے سسی پنوں کے قصے کی مقبولیت کے پیشِ نظر کم و بیش اسے دو درجن شعرا نے منظوم کیا۔

میاں بروے خاں پشاوری (۱۸۲۰ء تا ۱۸۹۷ء) کو بھی راولپنڈی کے پرانے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس نے راولپنڈی جیل میں قید کے دوران اپنی "سی حرفی" لکھی۔ مادری زبان پشتو ہونے کے باوجود وسطی پنجاب کے رواں لہجے میں شاعری کی اور اپنے عہد کے ناقدین اور سخن وروں سے اپنی بیت گوئی کا لوہا منوایا۔ اُس کے کلام میں وہ تمام عصری میلانات موجود ہیں جو اُس عہد کی شاعری پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ یہ میلانات سماجی گھٹن، تنگ و دکھ کے باوجود ناکامی، سرمایہ دارانہ استحصال، غریب کی بے بسی اور عشق و محبت کی گھاتوں سے متعلق ہیں۔ بروے دہ نے جیل کی ہوا بھی انہی گھاتوں کے باعث کھائی تھی۔

بروے کے برعکس پنجاب کے ایک عظیم شاعر شاہ حسین کے بارے میں ناقدینِ فن کی رائے ہے کہ اُن کے کلام میں کہیں کہیں پوٹھوہار کا جہلمی لب و لہجہ جھلکتا ہے۔[۲]

---

[۱] پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۱۲۱

[۲] پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۱۰۹ کا حاشیہ جس میں انور بیگ اعوان کی تالیف دھنی ادب و ثقافت، صفحہ ۹۰ کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "شاہ حسین بھی ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن کے علاقے میں واقع وضع ڈھڈی کے رہنے والے تھے۔" حالانکہ پنڈ دادن خاں دگاؤں بگہ میں شاہ حسین کے استاد حافظ ابوبکر رہتے تھے۔ غالباً یہ اشتباہ انہی کے سبب پیدا ہوا۔

پوٹھوہار کے ایک اور قابلِ ذکر شاعر شاہ چراغ چوہان بھی ہیں۔ ان کا اصل وطن تو ضلع گجرات تھا مگر ترک سکونت کر کے پوٹھوہار کے علاقے میں آ بسے تھے۔ چونکہ دھنی کے موضع چوہان یا چہان میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی، اس لئے پوٹھوہاری شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا سنِ وفات ۱۸۵۷ء ہے۔ رزمیہ شاعری کی صورت میں "امام حسینؓ کی وار" ان سے منسوب ہے۔

اسی خطے کے ایک اور شاعر شاہ شریف مریدوی (سنِ پیدائش ۱۸۵۷ء) تھے۔ مرید، ضلع چکوال کا ایک پرانا گاؤں ہے۔ انھوں نے ہیر رانجھا کے قصے کو بھی منظوم کیا تھا جس کے ہر بند کا چوتھا مصرع قرآن مجید کی کسی آیت یا حدیث نبویؐ سے آراستہ تھا۔ اس سے ان کے دینی علوم سے گہری وابستگی کا بھی پتہ چلتا ہے اور اُن کے قادر الکلام ہونے کا بھی۔ اگرچہ شاہ مریدوی کا شمار بڑے پُرگو شعرا میں ہوتا ہے لیکن اُن کا بیشتر کلام محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ چنانچہ اب مختلف تذکروں میں اُن کے بعض دوہڑوں اور "مناظرہ رنجھا اور سانگ" کے سوا اور کسی کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں دھنی لہجہ صاف جھلکتا ہے۔

اسی سلسلے کے بعد کے شعرا میں دو اور قابلِ ذکر نام پیر نیک عالم اور عبدالرحمٰن درد کے ہیں۔ پیر نیک عالم (پ ۱۸۵۷ء) یوں تو کلاچور، ضلع گجرات کے رہنے والے تھے لیکن درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی کے باعث ان کا بیشتر وقت جہلم ہی میں گزرا اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے کلام میں عربی و فارسی کا آمیزہ ہے۔ قصہ "صغرو صغری" ان کی مقبول تصنیف ہے۔ ساری عمر وارث شاہ کو اپنے سے کمتر گردانتے رہے۔

عبدالرحمٰن درد بھی ضلع جہلم کے رہنے والے تھے مگر اُن کے کلام میں سے "قصص المحسنین" اور "شیریں فرہاد" کے سوا اور کسی تصنیف و تالیف کا حوالہ نہیں ملتا۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔

تاہم احمد علی سائیں (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۹ء) اس لحاظ سے خوش نصیب شاعر ہیں کہ اُن کے کلام سے راولپنڈی اور پشاور دونوں مقامات پر اعتنا برتا گیا۔ افضل پرویز اور رضا ہمدانی دونوں نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا اور سائیں کا کلام محفوظ ہو گیا جو سی حرفیوں اور بیتوں پر مشتمل تھا۔ سائیں مجموعی طور پر مشکل پسند شاعر تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی پدری زبان فارسی اور مادری زبان پشتو تھی۔ تاہم وہ خواص و عوام دونوں میں یکساں پسند کئے گئے۔ اگرچہ ان کا راولپنڈی میں قیام مختصر رہا مگر اس علاقے نے انھیں اپنا ہی شاعر جانا۔ وہ پشاور کے قریب ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

بیسویں صدی کے پوٹھوہاری شعرا میں پروفیسر موہن سنگھ ماہر (پ ۱۹۰۵ء) اور درشن سنگھ آوارہ (پ ۱۹۰۶ء) بھی دو بڑے نام ہیں۔ اول الذکر کا تعلق دھمیال (راولپنڈی) سے ہے۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "ساوے پتر" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کلام کے کم و بیش سات مجموعے اور شائع ہوئے۔ ثانی الذکر کا تعلق کالا گوجراں (ضلع جہلم) سے ہے۔ اُنھوں نے "باغیانہ شاعری" میں بڑا نام پیدا کیا۔ اُن کا ایک مجموعہ "بجلی دی کڑک" ۱۹۳۴ء میں ضبط ہوا۔ درشن سنگھ آوارہ نے شاعری کے علاوہ افسانے اور ناول میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔

پوٹھوہاری شاعری، عام پنجابی شاعری کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں داخل ہو کر ہی متنوع موضوعات اور افکار کی وسعت سے آشنا ہوئی۔ ورنہ مذکورہ بالا شعرا کی اکثریت کربلا، یوسف زلیخا، سسی پنوں، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور سوہنی مہینوال کی منظوم داستانوں سے آگے نہیں بڑھی۔ البتہ داستانوں کے پردے میں صوفیانہ موضوعات بالخصوص وحدت الوجود پر بہت زور دیا گیا اور علامتی طرز اظہار کے باوجود شاعری کا بیشتر حصہ شرک کی نذر ہو گیا حتیٰ کہ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو پوری پنجابی شاعری پر آج تک اس زاویے

---

[۱] پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۱۹۵

سے کچھ نہیں لکھا گیا۔

تمام تر شاعری کا اسلوب کلاسیکی رہا۔ پوٹھوہار کے شعرا میں ایک خامی یہ بھی رہی کہ انھوں نے پوٹھوہاری زبان میں کم اور وسطی پنجاب یا پھر مشرقی پنجاب کے ودالے کی زبان میں زیادہ شاعری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعرا کو پڑھتے وقت پوٹھوہاری زبان کے نشوونما کے بارے میں کوئی بہت واضح تصور قائم نہیں ہوتا۔ اور پوٹھوہاری نثر تو بالکل ناپید رہی۔ نظم کی بہ نسبت نثر کا میدان، خیالات کے اظہار کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے لیکن صاحبِ قلم نگینہ ساز ہو تو وہ یہاں بھی نگینے تراشتا چلا جاتا ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انیسویں صدی، مجموعی طور پر منظوم داستانوں کی مقبولیت کی صدی تھی اور عوامی سطح پر رومانی کہانیوں ہی کو قبولِ عام کی سند حاصل تھی۔

اگرچہ پنجابی شعر و ادب کے بعض ناقدین پوٹھوہاری اور سرائیکی کو پنجابی سے الگ زبانیں قرار دینے پر مصر ہیں۔[5] لیکن اصولاً اسے مقامی لب و لہجہ کے فرق کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی پوٹھوہار کی زبان اور شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام بول چال میں جو پوٹھوہاری زبان استعمال ہوتی ہے اور سماعت پر جو ایک جداگانہ تاثر چھوڑتی ہے، وہ انیسویں صدی کی پوٹھوہاری شاعری میں نہیں ملتا۔ اس کے اسباب زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ جن شعرا کے کلام کو بڑی شاعری کا درجہ دیا گیا وہ فی الواقع پوٹھوہار کی وادی کے رہنے والے نہیں تھے۔ اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے قسمت راولپنڈی بذات خود راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک اور میانوالی پر مشتمل تھی[6] لیکن اصل پوٹھوہار کا علاقہ چکوال، جہلم، راولپنڈی اور اٹک تک پھیلی ہوئی سطح مرتفع سے عبارت تھا۔ یہاں جو شعرا مقبول ہوئے، وہ اس علاقے کے باہر کے شہروں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً میاں محمد بخش میرپور، شاہ حسین لاہور، حافظ برخوردار موضع مسلمانی پرگنہ لاہور، شاہ چراغ چوہانوی موضع سوک ضلع گجرات، پیر نیک عالم گجرات، بردہ پشاور اور احمد علی سائیں پشاور کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے بعض شعرا کا قیام راولپنڈی میں بھی رہا لیکن انھوں نے پوٹھوہاری رنگ میں شعر نہیں کہا۔ بلکہ ٹکسالی پنجابی کو ترجیح دی جو دراصل ماجھی اور ملتانی بولیوں کا آمیزہ ہے۔ حتیٰ کہ متاخرین میں سے حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی (۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۷ء) کے ہاں بھی شاعری کی زبان پوٹھوہاری نہیں ہے بلکہ ہندکو اور سرائیکی کی آمیزش سے تشکیل پانے والی کوئی زبان معلوم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے ہاں تو شعری اوزان سے بھی کچھ زیادہ اعتنا نہیں برتا گیا۔

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جدید عہد کے پوٹھوہاری شعرا باقی صدیقی (مرحوم) اکرم حیدری، افضل پرویز، احمد ظفر اور جمیل ملک تک پہنچتے پہنچتے پوٹھوہاری شاعری کی زبان اپنے روزمرہ سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ اور اس نے ٹکسالی پنجابی کا اثر کم قبول کیا ہے۔ ان شعرا میں ایک اور نام منظور عارف (مرحوم) کا بھی ہے۔ وہ خود چھاچھی تھا لیکن مؤخر الذکر شعرا کے حلقے سے وابستگی اور راولپنڈی میں قیام کی طوالت کے باعث اسے یہاں کے مقامی شعرا ہی میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن چھاچھی زبان کو وہ بہرحال، فراموش نہیں کر سکا جس کی وجہ سے اس کے کلام میں کہیں کہیں چھاچھی الفاظ اور لب و لہجہ بے حد لطف دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس جدید عہد کے گلدستے کا گلِ سرسبد باقی صدیقی (۱۹۰۸ء تا ۱۹۷۲ء) ہی ہے۔ اُس نے خالص پوٹھوہاری زبان میں شاعری کی ہے اور بلاشبہ پوٹھوہاری شاعری اور زبان کو فروغ دینے میں اُس کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔

یہ پوٹھوہار کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ اگرچہ شہروں میں صنعتی ترقی، کھیتوں میں نئی بستیوں کی آبادی اور دیہات کی شہروں کی قربت کے باعث یہاں کی تہذیبی قدریں بڑی سرعت سے بدلتی جا رہی ہیں، تاہم جو دیہات آج بھی شہری زندگی سے مناسب فاصلے پر واقع ہیں، وہ اپنی ثقافت کی بہرحال نمائندگی کر رہے ہیں۔ بارانی زمینوں کے باعث

---

[5] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۵، صفحہ ۷۰۹

[6] ایضاً، صفحہ ۷۵۰

یہاں فصلیں دیر سے پکتی ہیں، چنانچہ اپریل اور مئی کے اوائل میں جب فصلیں کٹتی ہیں تو پوٹھوہاری تہذیب و تمدن کی وہ جھلک اب بھی نظر آجاتی ہے جس کا ذکر محض تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں کے تمدن نے کئی رنگ دیکھے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں سرزمین پنجاب کا پہلا انسان آباد ہوا اور یہاں کی وادئ سواں کو پہلی انسانی آبادی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ اُن قدیم باشندوں کا خطہ ہے جنہیں "رگ وید" میں اشوریہ (مہذب ترین) کا لقب ملا۔ اسی علاقے کے شہر ٹیکسلا میں گندھارا کے ناگا بادشاہوں کا دارالسلطنت بنا جو چھ سو سال قبل مسیح تک قائم رہا۔ پوٹھوہار "رگ وید" کے جغرافیائی حدود کا حصہ بنا اور یہی علاقہ اُس آبادی کا حصہ ہے جہاں ٹیکسلا کا سب سے پہلا عظیم عالم اور نحوی پینینی رہتا تھا جسے سنسکرت زبان کے واضعین میں شمار کیا جاتا ہے۔

کتابیات

۱۔ "اُس علاقے کو جو مارگلہ سے لے کر رہتاس تک پھیلا ہوا ہے، پوٹھوہار کہتے ہیں"۔ تزک جہانگیری، اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۲۳۔

۲۔ طبقات ناصری، مؤلف منہاج سراج، مترجم غلام رسول مہر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، جلد دوم، طبع اول، جنوری ۱۹۷۵ء، صفحہ ۳۷۹

۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول ۱۹۷۱ء، جلد ۵، صفحہ ۲۵۰

۴۔ Early India and Pakistan by Sir Mortimer Wheeler, London. 1968 Page 44

اور مغربی پاکستان کی تاریخ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، مولفہ رشید اختر ندوی، جلد اول ۱۹۶۵ء، صفحہ ۶۰

۵۔ The Imperial Gazetteer of India. Vol. XXI, Oxford. 1908. Page 272

۶۔ A Guide to Taxila by Sir John Marshal, Cambridge, 1960. Page 58

۷۔ Manuscripts of Federal Capital by Muhammad Waliullah Khan, 1959.

۸۔ Kaigoharnama by Raezadeh Diwan Duni Chand, edited by Dr. Muhammad Baqir, Lahore, 1965 (English portion), Page 21

۹۔ Ibid. Page 39

۱۰۔ The Imperial Gazetteer of India, Vol. XXI, Oxford, 1908. Page 272

۱۱۔ تزک جہانگیری، اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۲۴

۱۲۔ Report of Federal Commission on History, Architecture and Archaeology Committee No. X. Page 180

۱۳۔ تزک بابری، اردو ترجمہ رشید اختر ندوی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم، جنوری ۱۹۶۶ء، صفحات ۱۵۵ تا ۱۵۶

۱۴۔ تزک جہانگیری، صفحہ ۱۲۳

ٹ عاشور (آشور) قدیم عراق کا ایک بڑا تہذیبی مرکز تھا جہاں سے عاشوری (آشوری) اِدھر اُدھر پھیلتے چلے گئے۔ آشور، دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک بے حد اہم قدیم شہر تھا۔ سوگی آبی سیر اس کا پہلا بادشاہ تھا جو دو ہزار چار سو سال قبل مسیح تخت نشین ہوا تھا۔

۱۵- پنجابی زبان و ادب، مؤلفہ حمید اللہ ہاشمی، انجمن ترقی اردو، کراچی، پہلی اشاعت ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۲۸

۱۶- ایضاً، صفحہ ۷۰

۱۷- ایضاً، صفحہ ۸۲

۱۸- ایضاً، صفحہ ۸۲

۱۹- ایضاً، صفحہ ۸۳

۲۰- گنگو ہرنامہ، صفحہ ۲۱۹

۲۱- پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۳۳۸

۲۲- گنگو ہرنامہ، دیباچہ فارسی، صفحہ ۵

۲۳- بن پھلواری، مؤلفہ فضل پرویز، ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم ۱۹۸۴ء صفحات ۲۴۵ تا ۲۸۷

۲۴- پنجابی زبان و ادب، صفحہ ۱۲۱

۲۵- ایضاً، صفحہ ۱۰۹ کا حاشیہ جس میں انور بیگ اعوان کی تالیف دھنی ادب و ثقافت، صفحہ ۲۶۰ کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "شاہ حسین بھی ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خاں کے علاقے میں واقع موضع ڈھڈی کے رہنے والے تھے۔" حالانکہ پنڈ دادن خاں (گاؤں بگہ) میں شاہ حسین کے استاد حافظ ابوبکر رہتے تھے۔ غالباً یہ اشتباہ انہی کے سبب پیدا ہوا۔

۲۶- ایضاً، صفحہ ۱۹۵

۲۷- ایضاً، صفحہ ۱۹۵

۲۸- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد ۵، صفحہ ۶۷۹

۲۹- ایضاً، صفحہ ۶۵۰

۳۰- عاشور (آشور) قدیم عراق کا ایک بڑا تہذیبی مرکز تھا جہاں سے عاشوری (آشوری) ادھر ادھر پھیلتے چلے گئے۔ آشور، دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک بے حد اہم قدیم شہر تھا۔ سومی آبی سیرا اس کا پہلا بادشاہ تھا جو دو ہزار چار سو سال قبل مسیح تخت نشیں ہوا تھا۔

سوویٹ انڈالوجی

رسول طاؤس

اگر موہنجو دڑو اور ہڑپہ کی قدیم تحریروں کو پڑھنے میں کامیابی حاصل ہو جائے تو کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ اگر ماقبل تاریخ کے اُس دور کے متعلق، جسے پتھر کا زمانہ کہا جاتا ہے، راولپنڈی اور اسلام آباد کے علاقے میں پائے جانے والے آثار اُسی زمانے کے وسطی ایشیا میں پائے جانے والے آثار سے مشابہت رکھتے ہوں، تو اس سے کیا ثابت ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس قسم کے سوالات پوچھنے والوں اور جواب دینے والوں کی تعداد ہمارے ہاں انگلیوں پر گنی جا رہی ہے۔ یوں بھی یہ سوالات کسی فوری اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان سے متعلق ان موضوعات پر جس قدر سُرعت اور تن دہی سے ہمسایہ ممالک بھارت اور روس میں کام ہو رہا ہے، اُسے دیکھ کر شاید پاکستان کا ایک عام شہری بھی اس معاملے میں دلچسپی کا اظہار کرے گا۔

اگرچہ اس موضوع پر پچھلے دس بارہ برس کے دوران بھارت اور روس میں چھپی ہوئی بہت کم کتابیں ہمیں دیکھنے کو ملی ہیں تاہم کئی برس پہلے اسلام آباد میں بھارتی کتابوں کی ایک نمائش میں دو جلدوں پر مشتمل ایک بھارتی آرکیالوجسٹ کی کتاب کا عنوان آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے "آرکیالوجی آف سوویٹ سنٹرل ایشیا اینڈ انڈین بورڈر لینڈز"—— "ہندوستان کے سرحدی علاقے اور روسی وسط ایشیا کے قدیم آثار" کا یہ نظر فریب عنوان یوں تو ہم جیسے لاُابالی لوگوں کو گمراہ کرنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اگر اس بات پر زور دیا جائے کہ ہندوستانی سرحدی علاقوں سے مراد پاکستان اور خاص طور پر پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے ہیں تو شاید کسی حد تک ہم اس مضمون میں دلچسپی لینا شروع کر دیں۔ مثال کے طور پر کسی اخبار کی یہ خبر ہماری دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے کہ موہنجو دڑو اور ہڑپہ کے رسم الخط یا اشکال کو سمجھنے کی سب سے زیادہ کوشش روس یا بھارت میں ہو رہی ہے۔ اسی طرح وسطی ایشیا میں پانچ چھ ہزار سال پُرانے ایسے آثار دریافت ہونے کی خبر بھی ہمارے لئے دلچسپ ہو سکتی ہے، جو ہڑپہ کے آثار سے ملتے جلتے ہوں۔ اس تمہید کے بعد یہ بات بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی کہ قوموں اور ملکوں کا تشخص ایسے ہی آثار و شواہد اور پُرانے افسانوں پر مبنی ہوتا ہے۔

اسی تاثر کے تحت شاید یہ سطور بھی لکھی جا رہی ہیں، ہر چند کہ اس تحریر کی اصل محرک "تصویرِ ہند" نامی وہ کتاب ہے جسے دو روسی عالموں نے تحریر کیا ہے۔ THE IMAGE OF INDIA نام کی یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں ماسکو سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنفین A-VIGASIN اور G-BONGARD LEVIN ہیں۔ کتاب کا موضوع ہے "سوویت یونین میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کا مطالعہ"۔ ان دو روسی عالموں میں سے ایک کے نام اور کام سے مجھے یوں آشنائی تھی کہ کوئی پندرہ برس پہلے مایۂ ناز پاکستانی سکالر پروفیسر احمد حسن دانی کے درِ دولت سے ایک آدھ کتاب دیکھنے کو ملی تھی۔

جولیون صاحب نے بڑی عقیدت سے دانی صاحب کی نذر کی تھی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب پاکستان کی ثقافتی اور تہذیبی جڑوں کی تلاش کو شجرِ ممنوعہ سے نسبت نہیں تھی اور سوویت سنٹرل ایشیا کے باباجان غفاروو جیسے عالم فاضل لوگ ڈاکٹر دانی کو "محترم حریف" کہہ کر پکارتے تھے تو دانی صاحب سیخ پا ہو کر جواب دیتے تھے کہ "جناب یہ خاکسار آپ کا حریف یا حریف محترم ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ناچیز تاریخ کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہے۔ جس نے بشریات اور عمرانیاتی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مارکسی نظریہ بھی دیکھ رکھا ہے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے آثارِ قدیمہ پر گفتگو کر رہا ہے۔"

(روزنامہ پاکستان ٹائمز ۸ جون ۱۹۷۵ء)

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ مقصود صرف یہ کہنا تھا کہ سن ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں اس ملک کے انڈر گریجویٹ طالب علموں کے لئے پروفیسر دانی نے قدیم پاکستان کے موضوع پر ایک درسی کتاب لکھی تھی (جیسے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی تدوین نے "ثقافت کہتر" کے پردے میں کچھ زیادہ ہی مدون کیا تھا) اُس وقت بھی یہ روایت ابھی باقی تھی کہ طالب علموں کے ذہنوں میں کچھ بنیادی باتیں بٹھادی جائیں۔ چنانچہ دانی صاحب کی اس ننھی سی انگریزی کتاب میں طالب علموں کو بتایا گیا تھا۔

"پاکستان کسی طرح بھی اپنے خول میں دبکنے کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی کا رُخ اس ملک کی سرحدوں کے اُن کھلے دروازوں سے متعین ہو چکا ہے جہاں سے ایشیا میں قبائل کے نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ ایشیا میں انسانی قافلوں کی آمد و رفت سے جو اثرات مرتب ہو سکتے تھے انہوں نے پاکستان کے لوگوں کی زندگی کا ایک چلن طے کر دیا ہے . . . . اس طرزِ حیات سے جغرافیہ کے متعلق وہ دو قدیم نظریے بھی واضح ہوتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنائے . . . . مسلمانوں کا جغرافیائی تصور اُن چلتے پھرتے لوگوں سے پھوٹا ہے جو یورپ اور ایشیا میں سرگرمِ سفر رہے اور اسی تصور کی چھاپ مسلمانوں کی معاشرت اور طرزِ حکومت پر بھی ہے۔ ابن بطوطہ جیسے مہم جُو سیاح اور یاقوت جیسے جغرافیہ دان ہمیشہ اسلام کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔"

(ترجمہ مصنف)

(A Short History of Pakistan (Book I) By A.H. Dani)

آثارِ قدیمہ کے روسی ماہرین نے وسطی ایشیا اور ہڑپہ کی قدیم تہذیب کے باسیوں کے درمیان اُن قریبی ثقافتی تعلقات کے قطعی ثبوت فراہم کئے ہیں جو بعد کے زمانوں میں بھی جاری رہے ہیں۔ قدیم روسی ادب میں بھی برصغیر ہند کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اُس میں ہندوستان کو دولت، حکمت اور عجائبات کی سرزمین بتایا گیا ہے اور لوک ادب میں یہ تصویر اور بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی کوہ قاف کے لوگوں کا بھی ہندوستان کے لوگوں سے تعلق رہا ہے اور ہندوستان میں نہ صرف آرمینیا کے تاجروں کی منڈیوں کا تذکرہ موجود ہے بلکہ قدیم جارجیا میں ہندوستانی قصّے کہانیوں کے مجموعہ "پنچ تنتر" کی دھوم کے بھی تذکرے ہیں۔ موجودہ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو کے قریب ایک ایسے مندر کی تعمیر کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں ہر وقت ہندوستان سے آنے والے لوگوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔

اور تو اور کوہ قاف میں بسنے والی ایک قومیت اوسیشین OSSETIANS کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان

اپنی قدیم آریوں کی زبان سے مشابہ ہے جس زبان میں رگ وید لکھی گئی ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے وسطی ایشیا کے ایک فرزند ابو ریحان البیرونی کی "کتاب الہند" آج بھی ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ جو اس کے سائنسی ذہن کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان میں اس کی مہارت کا بھی زندہ ثبوت ہے۔ آج بھی روس کے لوگ بریاتیہ کی تہذیب کو ہندوستان کی بدھ تہذیب سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے اور کلمیکیہ تک بدھ مت کے پہنچنے کی مدت بھی کوئی چار سو سال بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح دونگا علاقے کے لوگ ایک طویل عرصے سے روس اور ہندوستان کے درمیان تجارتی رابطے کا کام دیتے رہے ہیں۔ سترہویں صدی اور انیسویں صدی عیسوی کے درمیان استرخان میں باقاعدہ ہندوستان کے تاجروں کی ایک بستی آباد تھی۔ بحرِ اسود کے شمالی علاقے میں آثارِ قدیمہ اور لسانیات کے ماہرین کو نہ صرف ہند ایرانی آریوں کے آثار ملے ہیں بلکہ ایسے قبیلوں کے شواہد بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کی اولاد بعد میں ہندوستان آئی اور یہی انڈو آرین لوگ ہندوستان آکر "آریہ" کہلائے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں روسی رسالے برطانیہ کی ہندوستانی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے اور ایک ممتاز روسی انقلابی انگیز لیڈر رادشچیف RODISHCHEV نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا۔ اُس زمانے میں ترقی پسند روسی تحریروں میں ہندوستانی عوام سے ہمدردی اور برطانیہ کی نوآبادیاتی پالیسی کے خلاف نفرت کا اظہار ایک معمول بن گیا تھا۔ جنوبی ترکمانیہ میں جو قدیم آثار ملے ہیں اُن کے مطابق تین ہزار سال قبل مسیح میں وسطی ایشیا اور شمال مغربی ہند کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعلقات مستحکم تھے۔ پتھر اور کانسی کے زمانوں سے تعلق رکھنے والے قدیم آثار اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ دو ہزار سال قبل مسیح کے دوران میں آریائی قبیلے مختلف قافلوں کی صورت میں شمالی ہند میں پھیل کر مقامی آبادی میں گھل مل رہے تھے۔ یہ ہند آریائی قبیلے اُن ایرانی زبان بولنے والے قبائل سے قریبی رشتے رکھتے تھے جو خاص ایران اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں آباد تھے۔

آثارِ قدیمہ کے روسی ماہرین کی جدید تحقیق سے آریوں کے اصل وطن اور ابتدائی نقل و حرکت کے بارے میں دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس تحقیق کے مطابق وسطی ایشیا میں آباد ایرانی زبان بولنے والے یہ لوگ جن میں خوارزمی، باختری اور سریانوی بہت عرصے تک اپنی مادی اور روحانی تہذیب میں اُن عناصر کو سموتے رہے جو انہیں آریوں سے ملے تھے اور جو ہندوستان جا کر آباد ہونے والے آریائی قبائل سے اُن کے قدیم رشتوں کی شہادت دیتے تھے۔ ویدوں کے زمانے سے تعلق رکھنے والے آریوں کا مطالعہ کرنے کے لئے ان ایرانی اور وسطی ایشیائی شہادتوں کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

تاریخ کے وسطی دور میں وسطی ایشیا عظیم تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ جہاں ایک طرف مذہب اسلام کی وسیع اشاعت عمل میں آئی اور دوسری طرف ایرانی زبان بولنے والی آبادی ترکی بولنے والوں کی یلغار میں کسی حد تک بہہ نکلی۔ لیکن وسطی ایشیا کے مسلمان اور ترکی بولنے والی یہ آبادی بھی، اپنے ماضی کو یکسر فراموش نہیں کر سکی۔ خوارزم میں خاص طور پر ایسے قدیم رسوم اور روایات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے جنہیں قدیم ہندوستان کے رسم و رواج سے بہت قریب کہا جا سکتا ہے۔ ان قدیم رسموں کو ہم بجا طور پر خوارزم کے ایرانی بولنے والے قدیم باشندوں کی باقیات کا نام دے سکتے ہیں اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نسلی اور مذہبی تبدیلیوں کے باوجود وسطی ایشیا کے لوگوں نے بڑی دیر تک قدیم آریاؤں کی روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔

ایک ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں جو بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اُن کے تحت شمال مغربی ہند اور وسطی ایشیا کے اکثر علاقے ایک ہی مملکت کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وسطی ایشیا کے باختر، سوغدیانہ اور خوارزم کے علاقے گندھارا

اور سندھ (سرحد اور سندھ) ایران کی ہخامنشی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاسی اتحاد سے اقتصادی رشتے اور تہذیبی رشتے بھی محکم ہوتے رہے۔ اسی طرح یونانی اثرات کے تحت پہلے سکندر اعظم اور پھر سلیوکیہ یا یونانی باختری سلطنت کے قیام سے پہلی مرتبہ شمالی ہندوستان اور خاص طور پر شمال مغربی ہندوستان کو بیرونی دنیا سے ایک بار پھر رابطہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دور میں افغانستان اور وسطی ایشیا کے ساتھ شمال مغربی ہند کی یک جہتی کا تصور کرنا کوئی مشکل معاملہ نہیں ہے اور موریہ خاندان کے عظیم حکمران اشوک اعظم کے تحت یہ سیاسی اتحاد بہت ہی نمایاں رہا ہوگا۔

موریہ خاندان کے زوال کے دور میں وسطی ایشیا کے بہت سے باشندے شمال مغربی علاقے میں آباد ہو گئے تھے اور اس کے بعد وسطی ایشیا کے سیتھین اور شاکا قبیلوں نے ہندوستان میں کئی ریاستوں پر حکمرانی کی۔ پہلی صدی عیسوی تک آتے آتے کشان خاندان کے دور میں یہ تعلقات بہت ہی قریب ہوتے گئے جب وسطی ایشیا افغانستان اور شمالی ہندوستان کے اکثر علاقے ایک مملکت کی صورت میں ابھرے۔ پہلی صدی عیسوی کی اس قدیم کشان مملکت کے بارے میں ابھی تک کما حقہ کام نہیں ہوا ہے اور پچھلے بیس تیس برس سے مورخوں کی نظریں تاریخ کے اس اہم موڑ کی تحقیق پر مرکوز ہیں۔ لسانیات، تاریخ، آرٹ اور قدیم آثار کے ماہرین کی اس دلچسپی کے نتیجے میں بیس بائیس سال پہلے روسی تاجکستان کے دار الحکومت دوشنبہ کے مقام پر ایک عظیم بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں کشان خاندان کو تاریخ اور آثارِ قدیم کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوششیں صرف کشان خاندان یا صرف اس خطے کی دلچسپی تک محدود نہیں ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی افادیت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ عالمی تاریخ کے کچھ اہم اوراق کشان دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کا زمانہ یا کشان حکومت کا دور بین الاقوامی تعلقات کی سرگرمیوں اور باہمی تعلقات کا وہ اہم زمانہ تھا جب کئی تہذیبی قدروں کا لین دین اور ملاپ اپنے عروج پر تھا۔ ان میں خاص طور پر ایرانی یونانی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کا میل جول بہت ہی زیادہ عالمی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ دور بھی تھا جب ہندوستان سے نکلا ہوا مذہب بدھ مت ایک عالمی مذہب بن کر پھیل رہا تھا اور گندھارا (سرحد بشمول وادیٔ کشمیر) سے بدھ مذہب وسطی ایشیا اور چین تک پھیل گیا تھا جو سات آٹھ سو برس سے زیادہ عرصہ (اسلام کی اشاعت کے دور تک) وسطی ایشیا پر چھایا رہا۔

وسطی ایشیا میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد یہ علاقہ اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گیا اور یہاں کا ادب زیادہ تر فارسی اور عربی زبانوں میں ہی لکھا جانے لگا۔ یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ "عرب خلافت" کے دور میں مجموعی طور پر ہندوستان کے ادبی اثرات اسلامی دنیا میں دور دور تک پھیل گئے۔ ایک طرف تو ہندوستان کی وہ روایتی تصویر تھی جو سینہ بسینہ روایات کے ذریعہ ایک عجیب و غریب افسانوی حد تک دولت مند ملک کا نقشہ پیش کرتی تھی اور دوسری جانب علمی سطح پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات، تجارت اور تجارتی راستوں کی معلومات کی صورت میں عربی زبان میں تحریر ہو رہی تھی۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں خاص طور ہند عرب تعلقات بہت اچھے ہو رہے تھے۔ جب خلیفہ منصور اور ہارون الرشید کے درباروں میں ہندوستان سے سفارتی وفود پہنچنے لگے، خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی نے نہ صرف ادویہ اور پودوں کے بارے میں تحقیق کے لئے اپنے وفود ہندوستان بھیجے بلکہ مختلف موضوعات کی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کرنے والے لوگوں کی بھی بہت حوصلہ افزائی کی۔ کہا جاتا ہے کہ عربی کی الف لیلہ ہندوستانی پنچ تنتر (کلیلہ و دمنہ) کی داستان در داستان والی تکنیک ہی کا ایک عکس ہے۔ تراجم کے اس کام میں وسطی ایشیا کے ان عالموں کا بہت دخل رہا ہے جو ہندوستان کے علوم و فنون سے واقف ہو چکے تھے، خلیفہ

ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ برمکی کی ذاتی دلچسپی کی ایک بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اُس کے اجداد بدھ مت کے اُن مذہبی عالموں سے تعلق رکھتے تھے جو بلخ (بخارا) کے مرکزی بدھ وہار کے نَوبَہار (برمک) تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ خاندان آلِ برامکہ کے نام سے مشہور ہوا۔

موسیٰ خوارزمی نے فلکیات کی سنسکرت کتاب سدھانت کا عربی ترجمہ کرنے کے علاوہ ریاضی کا ایک رسالہ بھی ترجمہ کیا جو عربوں کے علاوہ بعد میں بارہویں صدی کے لاطینی ترجموں کی صورت میں یورپ تک پہنچ گیا۔ یہ وہ دور تھا جب بغداد اور دمشق وسطی ایشیا اور ہند کے عالموں کی موجودگی سے جگمگا رہا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی تک عربی زبان میں ہندوستان کے سائنسی علوم بڑی حد تک منتقل ہو چکے تھے اور مشرقِ وسطیٰ میں رہنے والے سائنس دانوں میں ابن سینا جیسے قدآور لوگ شامل تھے جو چارک سمہتا، جیسی حکمت کی اُن کتابوں سے واقف تھے جو سنسکرت سے عربی زبان میں آٹھویں صدی عیسوی میں ہی منتقل ہو چکی تھیں۔ یہ ثقافتی تعلقات البیرونی کے دور میں اوجِ کمال کو پہنچے۔ حکیم ابوریحان البیرونی (۹۷۳ء - ۱۰۴۸ء) خوارزم کے شہر 'قیات' کے رہنے والے تھے جو ساری عمر خود کو عربی اور فارسی زبانوں سے "اجنبی" ہی قرار دیتے رہے اور ساری عمر علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ ان کی ہمہ جہتی تصانیف میں مختلف زبانوں کے ادب سے واقفیت ہر قدم پر جھلکتی ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ عبرانی، سریانی، سنسکرت اور سوغدیانہ کی زبان کے ساتھ ساتھ یونانی زبان سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ اس بات سے ان کی وسیع المشربی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی ایک زبان، ایک علاقے یا ایک مذہب کے اسیر نہیں تھے۔

۱۰۱۷ء میں سلطان محمود غزنوی کی افواج نے خوارزم کو فتح کر لیا تو البیرونی کو بھی فاتحین اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ البیرونی بھی شاہی افواج کے ساتھ کابل اور پنجاب تک ہمرکاب رہے ہوں گے۔ اسی دور میں البیرونی نے سنسکرت کے عالموں تک رسائی حاصل کر کے اس زبان اور اس کے علوم میں کمال مہارت حاصل کر لی۔ اس دور کا حاصل البیرونی کی وہ لافانی کتاب ہے جسے کتاب الہند کہا جاتا ہے اور جو روس کے ایک مشہور مستشرق وکٹر روزین کے الفاظ میں "ازمنۂ وسطیٰ اور قدیم دونوں میں مشرق اور مغرب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے، جس میں تہذیب، فلسفہ، سائنس، ادب، رسوم و عادات غرض تمدنِ ہند کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔

وسطی ایشیا اور ہندوستان کے تعلقات تیرہویں چودھویں صدی تک آتے آتے اپنے عروج کو پہنچ گئے تھے لیکن البیرونی جیسا دوسرا نمائندہ اس سارے دور میں کوئی اور پیدا نہ ہو سکا۔ ہر چند کہ البیرونی کے وطن خوارزم کا آخری بادشاہ، شاہ جلال الدین خوارزمی جب ۱۲۲۱ء میں منگولوں سے جان بچا کر بھاگا تو اُس نے ہندوستان ہی کی راہ لی اور چودھویں صدی میں خاندانِ تغلق کی حکمرانی تک آتے آتے وسطی ایشیا سے آتے ہوئے کتنے ہی اُمراء ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے اپنا وطن بنا چکے تھے لیکن اس سے پہلے بھی تمدنِ ہند کے آسمان پر چمکنے والے کتنے ہی ستارے ہندوستان کی نمائندگی کا حق ادا کر چکے تھے۔ ان میں بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے مشہور اہلِ قلم محمد عوفی جیسے لوگ بھی شامل تھے جو یوں تو بخارا میں پیدا ہوئے لیکن ساری عمر دہلی میں گزار دی اور یہیں کی خاک میں پیوست ہو گئے۔

محمد عوفی نے ماوراء النہر اور ہند کے بارے میں اساطیر اور رسائل کے علاوہ فارسی شعراء کی ایک یادگار بیاض بھی مرتب

کی جس میں وسطی ایشیا، ایران، افغانستان اور ہند کے فارسی شعراء کی غزلوں کا عمدہ انتخاب کیا گیا تھا۔ جو اس پورے خطّے کی تہذیبی اکائی کا ایک منہ بولتا شاہکار تھا۔ طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کے والد کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ وسطی ایشیا کے شہرِ سبز سے آ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے اور اُن کے فرزند اگر ایک طرف طوطیٔ ہند بن کر سلطنت دہلی میں اپنی شیریں بیانی کا لوہا منوا رہے تھے تو دوسری طرف ازبکستان تک شاعری کے میدان میں ان کا شہرہ تھا۔ جہاں ازبک شاعر علی شیر نوائی انہی کی شاعری کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کر رہا تھا۔ چودھویں صدی ہی میں مشہور شاعر بدرالدین چاچی نے تاشقند سے دہلی آ کر اپنا نام روشن کیا۔ امیر تیمور کے دور میں یہ عالم تھا کہ دہلی کے معمار سمرقند جا کر بی بی خانم کی مسجد تعمیر کرتے تھے اور آج بھی وسطی ایشیا میں ایسی بستیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے جن کے نام کے ساتھ ہند یا ہندوان کا لاحقہ موجود ہے جو ان بستیوں میں بسنے والے لوگوں کے قدیم وطن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آلِ تیموریہ کے چشم و چراغ بابر نے خاندان مغلیہ کی بنیاد رکھی تو سولہویں صدی کی ابتداء سے انیسویں صدی کے ابتدائی ایام تک وسطی ایشیا اور ہند کا تہذیبی لین دین برابر قائم رہا تا آنکہ انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا لبادہ اُتار کر سیدھے سبھاؤ ہندوستان کی حکومت سنبھال لی اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی یا 'غدر' کی ناکامی کے بعد انگریز حکمرانوں نے اس فطری تعلق کے خاتمے کی سازشوں کا ایک نیا جال بچھایا حالانکہ اس خطّے کے تعلقات کی قدامت تاریخ کا ایک حصہ بن چکی تھی اور یونانی جغرافیہ دان سٹرابو کے بقول کوہِ قاف کا راستہ قدیم زمانے سے ہی تاجروں کے لئے ایک جانا پہچانا راستہ تھا اور ہندوستان کا مال اسی کوہ قاف اور البانیہ سے ہوتا ہوا بحرِ اسود تک جا پہنچتا تھا۔ اسی کوہِ قاف کے مشرق میں آباد آرمینیائی لوگوں کی اساطیر اور لوک کہانیوں کا آج بھی مطالعہ کیجئے تو آپ کو ان میں ہندی اثرات اور مشترکہ علامات واضح طور پہ نظر آئیں گے جو آرمینیا میں عیسائیت کے فروغ کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہے ہیں۔ ان مشترکہ اثرات کو محض ہند کے قدیم ویدوں اور آرمینیا کے قدیم باشندوں کی دیرینہ ہند یورپی اساطیر کا شاخسانہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا بلکہ یہ آرمینیا پہ قدیم ایران کے اثرات کا واضح پَرتو دکھائی دیتے ہیں۔ (مسلسل)

شبنم رومانی ——— ایک منفرد شاعر

ممتاز حسین

رومانیت سے حقیقت پسندی کی جانب سفر میں شبنم رومانی رومانیت سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ اب انہیں رومانی کہنا انہیں پشیمان کرنے کے مترادف ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب یہ قبا ان پر چست نہیں اترتی ہے، لیکن وہ سائے کی طرح ان کے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے۔ رومانیت کیا ہے؟ اس کی تعریف خاصی مشکل ہے۔ کیونکہ ہر تعریف کے بعد اس کی حاجت تعریف باقی رہ جاتی ہے۔ وہ ایک مرض بھی ہے اور صحت بھی۔ بہر حال ایک رومانیت وہ ہے جو اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ میرا اشارہ یورپ کی رومانی تحریک کی طرف ہے جو ایک مختصر سا موسم بہار ہمارے ادب میں بھی، دوسری جنگِ عظیم کے بعد، لائی تھی۔ آج وہ رومانیت کسی غالب رجحان یا تحریک کی صورت میں زندہ نہیں ہے۔ لیکن اپنے پیچھے کچھ ایسے نقوش یا چنگاریاں چھوڑ گئی ہے جو مستقل رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کا ایک مستقل رجحان اس رومانی بغاوت کا ہے جو روسو کے اس جملے سے وجود میں آیا۔

آزادی ہی ہماری روح ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی کچھ بے محل نہ ہوگا کہ رومانی تحریک کا باوا آدم روسو ہی تھا۔ بہر حال اس رومانی بغاوت کا اظہار ہر اس دور میں ہوتا ہے جب زندگی ہو یا کہ شاعری وہ روایتی بن جاتی ہے، تخلیق کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے یا جب انسانی فکر پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں اور زندگی چند رسوم و رواج میں مقید ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت روسو کا وہ نعرہ انگڑائی لیتا ہے اور اس عقلِ عافیت کوش سے بھی مخالفت مول لیتا ہے جو تغیر کی مخالفت کرتی ہے۔ جب یہ باغیانہ جذبہ مستقبل آفرینی کا ہوتا ہے تو اسے رومانی انقلابیت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس صدائے حریت کے ساتھ ساتھ کہ "آزادی ہی ہماری روح ہے" فردِ آزاد کا تصور بھی روسو ہی کا دیا ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ روسو کے اس جملے نے کچھ غلط فہمی بھی پیدا کی ہے۔ آزادی انسان کی معاشرتی زندگی کی رہینِ منت ہے۔ یہ اس کے سماجی وجود کا ایک ثمر ہے نہ کہ عطیۂ فطرت۔ مگر روسو کے جملے سے کچھ اس طرح کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان عالمِ فطرت میں آزاد تھا اور معاشرے میں مقید ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روسو کا مقصد یہ نہ تھا اور وہ اپنے اس نعرے سے پرانے معاشرے کی بنیاد کو ہلانا چاہتا تھا اور ایک نئے تصورِ حکومت کو جنم دینا چاہتا تھا جس کی بنیاد رائے عامہ پر ہو، اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوا، لیکن اس سے ایک قسم کی جو انفرادیت پرستی پیدا ہوئی وہ آج بھی قائم ہے۔ ہر فرد یکتائیت کا حامل ہوتا ہے اور اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی یکتائیت کا تحفظ کرے، اپنے کو دوسروں سے مختلف کر سکے۔ اسے اس بات کا بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں سے بلند تر بھی ہو سکے۔ لیکن جب وہ اپنی انائے کا ذبہ

سے یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں دوسروں سے اتنا ہی مختلف ہوں جتنا ایک انسان حیوان سے۔ جیسا کہ نطشے کا خیال تھا، تو پھر وہ اپنی اُس یکتائیت کی نفی کرنے لگتا ہے اور ہر قسم کی انفرادی آزادی کی بھی نفی کرتا ہے۔ جو بات کہ اس سیاق میں سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد اُس تنوع کے باوجود جس کی طرف اشارہ کیا گیا دوسرے سے بہت ہی کم مختلف ہے۔

رومانیت کا تیسرا رجحان اظہاریت کا ہے۔ جسے اظہارِ ذات کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ادب کے طالب علم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ رومانی فن میں شخصیت کا اظہار یا ذاتی تجربے اور جذبات کا اظہار اہم ہوا کرتا ہے۔ اس کے برعکس کلاسیکیت میں نہ تو شخصیت کے اظہار پر زور دیا جاتا ہے اور نہ اس بات پر کہ ادبی تخلیق شاعر یا مصنف کی شخصیات کا کوئی ضمیمہ ہے۔ کلاسیکیت میں خیال کے ابلاغ پر یا یوں کہیئے کو تخیل اور تعقل کے اتحاد، خیال اور امیج کے اتحاد پر زور دیا جاتا ہے۔ خیال غیر شخصی اور تخیل شخصی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رومانیت میں بالعموم جذبے اور تخیل کا اظہار ملتا ہے اور رومانی فن میں فکر کا عنصر قدرے کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر گوئٹے نے بائرن کی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ جب وہ سوچنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک نابالغ لڑکے کے ذہن سے سوچتا ہے۔ بہر حال میں یہاں فکر کے عنصر پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا، جو بات کہ سامنے لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رومانی شاعری، جیسا کہ ورڈزورتھ نے کہا تھا، کسی قوی جذبے کے بے اختیارانہ ابل پڑنے یا اظہار پانے کا نام ہے۔ برجستگی کا یہ عنصر رومانی شاعری میں بہت اہم ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کثرتِ الفاظ، مبالغہ آرائی اور تشبیہ آرائی یہ چیزیں بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُس اظہاریت نے بیسویں صدی کے اوائل میں اُس وقت ایک خاص اہمیت اختیار کر لی جبکہ فرائڈ نے لاشعور کی دنیا دریافت کی۔ فرائڈ کی یہ دریافت بالکل نئی نہ تھی۔ لاشعور کا تصور پہلے بھی تھا لیکن وہ اس قدر پُر جبلت نہ تھا۔ وہ خاصا پُر اسرار تھا بقول کولرج: فکری عمل کا ایک گہرا کنواں، جس کا ہمیں کوئی شعور نہیں ہوتا، بقول ورڈزورتھ: ایک ایسی گہری کھائی جس کی کوئی تہہ نہ ہو اور بقول غالب: ایک عالمِ غیب جس کا ہمیں علم نہ ہو۔ لیکن یہ سارے اشارے اُس وقت غیر اہم سے ہو گئے جب فرائڈ نے لاشعور کی دنیا دریافت کی اور اس سے حشرات الارض کی طرح ہماری فطرت دُوں کے پرندے چاروں طرف اڑنے لگے۔ اس وقت سے اظہاریت نے ایک نئی قوت اختیار کر لی۔ اگر ایک طرف سُرریلیزم، ڈاڈا ازم وغیرہ نے جنم لیا تو دوسری طرف اجتماعی لاشعور اور جرمن اظہاریت نے فروغ پایا۔ جس میں شاعری کا تصور مکمل طور سے اظہارِ ذات کا ہے یعنی موضوعی تصور ہے۔ جرمن اظہاریت کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم خارج کی کسی شئے کو بیان نہیں کرتے اور نہ ہم خارج کا کوئی ایسا علم استعمال کرتے ہیں جو بہت ہی عام ہو۔ ہم اپنی ذات سے خیال پیدا کرتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں، وژن دیکھتے ہیں اور اس کو معرضِ اظہار میں لاتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اس حقیقتِ زمانہ کے ردِ عمل میں ہے جس کو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی وجود اس لئے نہیں ہے کہ وہ صرف مادی آسائش کی چیزیں تخلیق کرتا ہے ———— بلکہ اس لئے بھی ہے کہ وہ انسانوں کو نئے خواب سے آشنا کرے، نئی روحانی قدریں تخلیق کرے اور مستقبل کا کوئی نیا وژن پیش کرے۔ ان کی یہ شاعری موضوعی یقیناً ہے لیکن اپنی موضوعیت کا بڑا ٹھوس جواز رکھتی ہے۔

شبنم رومانی کے ہاں یہ تینوں رجحانات ملتے ہیں لیکن ان کا فن رومانیت سے دُور اور کلاسیکیت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ شبنم اپنے کو کارواں سے جُدا نہیں سمجھتے لیکن بھیڑ میں گم کر دینا بھی نہیں چاہتے۔ اس جدائی کے باوجود وہ ایک اختلاط یا ربط باہمی دوسرے جزیروں کے ساتھ بھی رکھتے ہیں۔ وہ کسی گنبد بے در میں اسیر نہیں ہیں بلکہ ان کے جزیرے کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوتی ہیں جہاں سے باہر کی دنیا مکمل طور سے نظر آتی ہے۔ ہاں ان کی گفتگو یقیناً نیم باز در یچوں سے ہے اور وہ اخارول

میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا فن مستور بھی ہے اور عریاں بھی۔ ایک سے کیفیتِ جمال اور دوسرے سے کیفیتِ جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ خوابوں اور روشن کے شاعر ہیں۔ وہ روایت کی اسیری سے انسان کی رہائی کا خواب، فرد سے گزر کر اجتماعیت میں جذبِ باہم کا خواب، سبز پتوں کی اوٹ سے کسی خوش رنگ پھول کے کھلنے کا خواب دیکھتے ہیں۔

شبنم غزلیں بہت اچھی کہتے ہیں۔ نئے آہنگ کی غزلیں کہتے ہیں لیکن بنیادی حیثیت سے وہ نظم آزاد کے شاعر ہیں۔ اور اس صنفِ سخن میں وہ اپنے پیشرو شعراء سے بھی بالکل مختلف ہیں۔ ان کی یہ انفرادیت حیرت انگیز ہے۔ ان کی نظم آزاد پر سایہ نہ توفیق کا ہے نہ راشد کا اور نہ میراجی کا اور نہ کسی مغربی شاعر کا۔ وہ خود ہی اپنی ان نظموں کے طرز کے خالق ہیں۔ اُن کی شاعری میں ایک خواب سفرِ وحشت اثر کا بھی ہے۔ ان کا گزر ایک ایسے آسیب زدہ شہر سے ہوتا ہے۔ جس میں لوگوں کے پیر پیچھے کی طرف پھیرے ہوئے ہیں۔ وہ بظاہر آگے کو چلتے ہیں لیکن پیچھے ہی سرکتے جاتے ہیں۔ شبنم رومانی ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ وہ پوری انسانیت کے دکھ درد کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "الاؤ" ہے جو بڑی منفرد اور پُراثر ہے۔ نفرتوں کا ایک الاؤ پورے ایشیا میں جل رہا ہے۔ اس الاؤ کو جلانے والا کوئی اور ہے لیکن اس کو خوراک ہمارا اپنا خون مہیا کر رہا ہے۔ وہ اس نفرت اور الاؤ کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں اور ایک مختصر سے فقرے میں پوری نظم کا تاثر ادا کر دیتے ہیں کہ آخر وہ کون ہے جس نے یہ آگ لگائی ہے:

مجھے اُس کا گھر بتاؤ
کہیں اس کا گھر بھی ہوگا

شبنم نے اب یہ محسوس کر لیا ہے اور یہی احساس ان کے نئے سفر کی نشاندہی کرتا ہے کہ "زندگی خواب دیکھتی ہے مگر: زندگی زندگی ہے خواب نہیں"۔ شبنم رومانی کا مجموعۂ کلام "جزیرہ" جو اندر سے ایک بڑا عظم کے ساتھ مربوط ہے، ہماری جدید شاعری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور ایک نیا رنگِ سخن اپنے ساتھ لایا ہے۔

محسن بھوپالی کی شاعری

احمد ہمدانی

یہ بات بالکل وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ محسن بھوپالی خواہ کچھ بھی ہو، خالص رومانی شاعر ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی یہ خصوصیت اس کی شاعری کے حق میں ایک نیک شگون ہے۔ "رومانس" لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ادنیٰ لوگوں کی زبان یا ایسے قصے کہانیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو مذاقِ سلیم سے گرے ہوئے ہوتے تھے۔ اس لفظ کو جب ادب میں داخل کیا گیا اور اس کے نام سے ایک ادبی تحریک چلائی گئی تو اسے اس کے لغوی معنی سے ہٹ کر ایک مخصوص طرزِ احساس سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ طرزِ احساس حقیقی دنیا سے آنکھیں چرا کر خیالی دنیا میں پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح رومانی رویہ کے حامل ادیب اور شعراء بالعموم تخیل اور خواب کو حقیقی دنیا اور عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ حقیقی دنیا سے آنکھیں چراتے کے سبب وہ اطراف کے حالات کے بجائے ماضی کو زیادہ سے زیادہ نکھار سنوار اور چمکا کر پیش کرتے ہیں یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ خود کو خالص فطرت کی وسعتوں میں گم کر دیتے ہیں۔ الغرض ان کا مطمحِ نظر حقیقی زندگی سے فرار ہوتا ہے۔ رومانیت ہی کے بطن سے جدیدیت نے جنم لیا ہے۔ جذبات کی فراوانی اور عقل سے قطع تعلق کا عمل، رومانیت اور جدیدیت دونوں میں مشترک ہے۔ جدیدیت سے ہماری مراد صحت مند جدت طرازی، ایجاد یا INNOVATION نہیں ہے بلکہ فنونِ لطیفہ کا وہ دبستان ہے جو معاشرہ کو ایک جبر اور بوجھ تصور کرتا ہے اور ہر طرح کی معاشرتی پابندیوں سے آزاد زندگی کو اصل زندگی سمجھتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ معاشرہ سے بالکل آزاد زندگی ممکن ہے بھی یا نہیں۔

یورپ کے مخصوص حالات میں رومانیت اور جدیدیت دونوں تحریکیں خاصی پروان چڑھیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حقیقت پسندی، معقولیت اور کلاسکیت نے بالکل ہی دم توڑ دیا ہو۔ عقل، ادراک، استدلال اور تجربات کے خلاف بڑے زور شور سے آوازیں بلند کی گئیں لیکن انسان بہرحال انسان ہے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ عقل و شعور ہی تو اس کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو اسے تمام دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کی عقل ہی اس کا سب سے بڑا شرف ہے۔ آخر وہ اپنے اس شرف سے دستبردار کیوں ہو۔ اب رہی یہ بات کہ تخیل کو عقل پر فوقیت ہے تو فنونِ لطیفہ کے حوالے سے یہ بالکل درست ہے۔ اس پر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اگر تخیل عقل کی ضد یا بے عقلی یعنی IRRATIONALITY سے تعبیر کیا جائے تو مکمل اختلاف کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم تخیل کو عقل کی ایک اعلیٰ سطح تو تسلیم کر سکتے ہیں لیکن اسے بے عقلی نہیں ٹھہرا سکتے۔ تخیل کی بنیاد حقیقت پر ہے جس کا ادراک یکسر عقل کا کام ہے۔ البتہ ایسی خیال آرائی جو توہم یا غیر حقیقی تخیل پر قائم ہو۔ اسے عقل کی ضد ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں یہ تخیل نہیں بلکہ غیر حقیقی تخیل یا "فینسی" سے منسوب کیا جائے گا۔ بہرحال یہ ایک طویل بحث ہے جسے فی الحال نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس وقت میرا مقصد محسن بھوپالی کی شاعری

پر گفتگو کرنا ہے

جیسا کہ کہا گیا ہے محسن بھوپالی حقیقت نگار شاعر ہے۔ وہ ہمہ وقت سماجی حقیقت پر نظر رکھتا ہے اور سماجی حقیقت ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ شاعری میں سماجی حقیقت نگاری اخباری رپورٹ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ شاعر حقیقت کو اس طرح نہیں پیش کرتا جیسی وہ نظر آتی ہے بلکہ اپنے تخیل کی مدد اور جذبات و احساس کے امتزاج سے حقیقت کی وہ صورت سامنے لاتا ہے جو بالعموم لوگوں کی نظر سے اوجھل ہوتی ہے۔ اس مخفی صورت کو منظر عام پر لانے ہی کا نام تخلیق ہے۔ محسن بھوپالی ساری عمر حقائق زندگی کے رُخ پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانے میں معروف رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کے بجائے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیئتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ اس لئے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں متحرک عوامل کا مظہر ہیں ـــ" اس اقتباس سے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ محسن ذاتی جذبات و احساس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ان کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ خارجی حقائق ان کو زیادہ متحرک کرتے ہیں۔ یہ اقتباس دراصل ان کے مزاج کا پوری طرح مظہر ہے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ لوگ خارجی دنیا کو خالص داخلیت کی عینک سے دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ خارجی دنیا سے اثر قبول کر کے اپنے احساس کی صورت گری کرتے ہیں یعنی کچھ لوگ دروں بینی اور کچھ لوگ جہاں بینی کے سہارے فنی تخلیق کا سفر طے کرتے ہیں۔ محسن یہ سفر جہاں بینی کے سہارے طے کرتے ہیں۔ جب ہم کسی فن کار کا زادِ راہ اس کی جہاں بینی کو ٹھہراتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ تخیل، احساس یا جذبہ سے خالی ہوتا ہے، کیونکہ یہ عناصر تو فنی تخلیق کے لازمی اجزا ہیں، سوال ان لازمی اجزاء کی تشکیل و تعمیر اور صورت گری کا ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں محسن اپنے جذبہ کی تعمیر و تشکیل جہاں بینی کی مدد سے کرتے ہیں، یعنی ان کے احساس کا سفر خارج سے داخلیت کی طرف ہے نہ کہ داخلیت سے خارج کی طرف۔ ان کے سفر کا یہ انداز ان کے پورے کلام میں نظر آتا ہے جو ان کی شخصیت کی وحدت کا واضح ثبوت ہے۔

شاعری ایک پُر اسرار عمل ہے چنانچہ سچی شاعری کا کوئی ایک حتمی معیار تلاش کرنا ممکن نہیں۔ البتہ کسی شاعر کے پورے کلام میں کسی ایک ہی شخصیت کے محوِ گفتگو رہنے کا احساس ایک ایسا معیار ہے جس کی بنا پر کسی شاعر کو سچا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ہمیں نہ تو ٹی ایس ایلیٹ کے شخصیت سے فرار والے نظریے سے کوئی سروکار ہے اور نہ ساختیات کے حامیوں سے کوئی بحث ہے جو شاعر کو شعر سے خارج کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ہمیں یہ سارے نظریے اپنے اپنے طور پر حقیقت سے فرار اور محسوس و مانوس زندگی سے آنکھیں چرانے کی کوشش معلوم ہوتے ہیں جبکہ مثبت انسانی فکر و احساس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے وجود کا جواز مہیا کرے۔ محسن کی ساری زندگی کچھ اسی طرح اپنے وجود کا جواز مہیا کرتے گزری ہے۔ چنانچہ وہ اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں "ماحول کے دلآویز رنگین پردوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا اظہار میرا مسلک رہا ہے اور پستی کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دینا میرا نظریۂ فن" محسن بھوپالی کے اس نظریۂ فن کو ہم ان کی مثبت سوچ اور تعمیری رویہ کا عطیہ کہہ سکتے ہیں۔ ماحول کے دلآویز پردوں میں پوشیدہ تلخ حقائق کا سراغ لگانا اور پھر ان کا موثر اظہار ہی دراصل تخلیقی عمل ہے۔ موثر اظہار کے لئے جذبات و احساس کی صداقت اور متخیلہ کی کارفرمائی کے ساتھ فنی تقاضوں سے سرخرو گزرنا شاعری کی لازمی شرط ہے اور محسن پوری پوری کوشش

کرتے ہیں کہ وہ یہ شرط پوری کریں۔

محسن بھوپالی نے ۱۹۴۸ء سے شعر کہنے شروع کئے۔ ان کا شمار ان چند خوش نصیب شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے ہی میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی۔ مثلاً ان کا ۱۹۵۴ء کا یہ شعر:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھئے — منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اسی وقت مقبولِ عام کے اعزاز سے نواز دیا گیا تھا اور آج تک نہ صرف زبان زدِ خاص و عام ہے بلکہ ہماری جدوجہد آزادی اور اس کے بعد مصلحتوں اور سازشوں کے دور کی تاریخ کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اس طرح ان کے بہت سے دوسرے اشعار ہیں جو ہمارے پورے معاشرہ کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ انہوں نے آئینہ دکھانے کا کام احساس سے خالی ہو کر یا اپنی ذات کو منہا کر کے کبھی نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری نری خطابت اور رپورٹنگ کے زمرے سے ہمیشہ باہر رہی۔ وہ احساس کے تاروں کو مرتعش کر کے ذہنوں میں روشنیاں بکھیرتے ہیں۔ انہیں خیال کو احساس اور احساس کو خیال بنانے کا فن خوب آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرگی سے نہ کیجئے اندازہ — کچھ گھروں میں دیئے نہیں ہوتے

اس کو فرصت ہی نہ تھی نازِ مسیحائی سے — اپنے بیمار کی وہ خیر خبر کیا لیتا

اس شعر کی ایک عام سطح تو روایتی عشق سے تعلق رکھتی نظر آتی ہے لیکن محسن کے مزاج اور طرزِ احساس کے پیشِ نظر ہم "نازِ مسیحائی" کی ترکیب کو اپنے ان قومی رہنماؤں کے عام رویہ سے جوڑ سکتے ہیں جو قومی بھلائی کے بڑے بڑے دعوے کرنے کے بعد جب اقتدار کی کرسی تک پہنچ جاتے ہیں تو قوم کو بالکل بھلا دیتے ہیں یا نشۂ اقتدار انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتا کہ وہ قوم کے بارے میں بھی کچھ سوچ سکیں۔ شعر کی یہ دوسری جہت ہمارے حالات کے عین مطابق ہے لیکن اس کا طرزِ اظہار اور اسلوبِ تغزل میں رچا کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کی تمام تر معروضیت پُرکشش موضوعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے یا پھر ان کے یہ اشعار

غمِ حیات نے فرصت نہ دی ٹھہرنے کی — پکارتی ہی رہیں مجھ کو بے صدا آنکھیں

روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو روکو — کچی مٹی تو مہکے گی، مٹی کی مجبوری!

کیا کیا نہ اعتبار دیا اک سراب نے — ہر چند تشنہ لب تھے مگر دیکھتے رہے

سورج چڑھا تو پھر بھی وہی لوگ زد میں تھے — شب بھر جو انتظارِ سحر دیکھتے رہے

ان تمام اشعار میں تراکیب اور استعاروں کی تہہ داری اور اپنائیت کے ساتھ ہمیں اپنی مخصوص تہذیب کے رچاؤ کا جو احساس ہوتا ہے وہی چیز محسن کی شاعری کو ہمارے لئے بامعنی بناتی ہے۔ یہ اشعار ہماری سیاسی و معاشرتی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ہماری جمالیاتی قدروں سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ یہ بات مثبت رویہ اور صحت مند

فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

ہر چند محسن بھوپالی کی نظر ہمہ وقت اپنے اطراف کے حالات پر رہتی ہے اور وہ ان حالات کی خرابی پر مسلسل کڑھتے بھی رہتے ہیں لیکن مایوس کبھی نہیں ہوتے۔ اپنے اس صحت مند رویہ کے ساتھ ان پر ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب وہ لطیف و نازک احساسات کے تناظر میں خود اپنے آپ کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج کل اپنی ذات کے حوالے سے احساسِ بیگانگی اور اجنبیت کے شکوے بہت عام ہیں۔ یوں تو یہ شکوے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ہر زمانے کے شاعر ان کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن روایتی شعراء کے ہاں اس کا رُخ مابعد الطبیعاتی تھا۔ اب عہدِ جدید میں یہ ایک خالص مادی اور ذہنی حقیقت بن گیا ہے۔ مثلاً رامبو کا یہ فقرہ I IS THE OTHER پورے معاشرہ کو ایک ایسا بوجھ بنا کر پیش کرتا ہے جس میں اس کا پورا وجود غائب ہو جاتا ہے۔ محسن کا احساسِ بیگانگی بھی یکسر ذہنی ہے۔ وہ اپنے دکھ کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

عمر مصروف! کوئی لمحۂ فرصت ہو عطا — میں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پاتا

اپنا آپ تماشا کر کے دیکھوں گا — خود سے خود کو منہا کر کے دیکھوں گا

اس احساسِ تنہائی کے علاوہ محبت کی سرشاریوں کا حال بھی محسن نے کچھ عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً:

ابھی تو خود ہی سے فارغ نہیں ہیں اہلِ جمال — ابھی کہاں دلِ اُمید وار کا موسم

نہ دیکھا جان کے اس نے، کوئی سبب ہو گا — اسی خیال سے ہم دل بُرا نہیں کرتے

وہ مل گیا ہے تو کیا قصۂ فراق کہیں — خوشی کے لمحوں کو یوں بے مزا نہیں کرتے

بچھڑ کے تجھ سے میسر ہوئے وصال کے دن — ہیں تیرے خواب کی راتیں ترے خیال کے دن

شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت — گزر نہ جائیں یونہی عہدِ بے مثال کے دن

نظر ملا کے ذرا دیکھ، مت جھکا آنکھیں — بڑھا رہی ہیں نگاہوں کا حوصلہ آنکھیں

کسی دن دیکھنا، وہ آ کے میری کشتِ ویراں میں — اچٹتی سی نظر ڈالے گا اور شاداب کر دے گا

آپ نے دیکھا کہ وہ احساسِ تنہائی ہو یا سرشاریٔ عشق کا جذبہ محسن کبھی بھی منفی رویہ کا اظہار نہیں کرتے۔ ان کے ہاں معاشرہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کہیں نہیں ملتی۔ تاہم معاشرہ کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ان کا رُخ خود اپنی طرف بھی ہو جاتا ہے لیکن ایسے لمحوں میں جب وہ خود اپنے اندر سفر کرتے ہیں تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ باقی ساری دنیا

سے اپنا تعلق منقطع کر لیں۔ وہ اپنے نازک ترین جذبات و احساسات کو بھی خارج سے ربط دے کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اس مثبت رویہ کے عکاس چند شعر:

آنے دن آہن و آتش سے گزرتا ہے مگر — دل وہ کافر ہے کہ پتھر نہیں ہونے پاتا

رات بھر جلنے سے کیا شمعِ شبستاں کی طرح — ایک لمحہ ہے بہت شعلۂ رقصاں کی طرح

تمہیں آسائشِ منزل مبارک — ہمیں گردِ مسافت بھی بہت ہے

جہاں گرے گا لہو، پھول بھی کھلیں گے وہیں — کسی کے بس میں نہیں ہے بہار کا موسم

یہ اور ایسے ہی بہت سے اشعار محسن کی صحت مند فکر اور مثبت رویہ کے عکاس ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے عہد کے دکھوں اور سکھوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جس میں محسن کے اپنے لہو کے رنگ بھرے نظر آتے ہیں۔ اب تک محسن کے پانچ مجموعے "شکستِ شب"، "جستہ جستہ"، "ماجرا"، "نظمانے" اور "گردِ مسافت" شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں، قطعات، نظمانے، ہائیکو، غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان اصناف میں "نظمانے" تو خود ان کی اپنی ایجاد کردہ صنف ہے۔ ان کے تمام کلام کو پڑھ کر ایک ہی طرزِ احساس، ایک ہی طرزِ فکر اور ایک ہی ۔۔۔ ادو کا احساس شدت سے ہوتا ہے جو بلاشبہ ان کی انفرادیت کا بین ثبوت ہیں۔

موسمِ صلیب کا شاعر — رام ریاض

صلاح الدین حیدر

میرے لئے یہ اطلاع انتہائی اذیت کا باعث تھی کہ خوبصورت اور درد بھرے احساسات کی تصویروں کے خالق شاعر رام ریاض کی زندگی مسلسل حوادث کی زد میں ہے۔ پہلے اُسے ملازمت سے نکال کر کسی مہربان نے اپنا نام تاریخِ ادب میں محفوظ کرا لیا۔ اور اب قوت کی اپاہج کر دینے والی اندھی فالج کی بیماری کے حملے سے اُس کی ہستی کے دلفریب رنگ کجلا کر رہ گئے ہیں۔ یہ سنہ ۵۸ء کا زمانہ تھا جب میں خانیوال میں ایک مقامی انجمن کی انتظامیہ کے کالج میں بطور لیکچرار تعینات ہو کر پہنچا تھا۔ انجمن کے کرتا دھرتا اکثر زمیندار تھے جو اتنے پڑھے لکھے تھے کہ اُن میں سے بعض کاغذ پر انگوٹھا لگاتے تو آدھا پون گھنٹے تک انگوٹھا ہی کپکپاتا رہتا تھا۔ اور بعض ایسے تھے کہ مسلسل آرام کرنے کی کاہلی کی وجہ سے ان کے پورے وجود پر رعشہ طاری رہتا تھا۔ اسی انجمن کے ایک مقامی ہائی سکول میں رام ریاض بھی معلمی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہاں ان کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ کبیر والا سے وفا حجازی مرحوم اور جناب بیدل حیدری بھی تشریف لے آتے تھے۔ اکثر شام کو رام ریاض ان دوستوں کے ساتھ حافظ عبداللہ کے ہوٹل میں میرے پاس تشریف لاتے اور ہم قافلہ بنا کر سول لائینز کی سیر کرتے ہوئے ادب اور شاعری کے مسائل زیرِ بحث لاتے۔ علاوہ ازیں گلستان یوسف یا کسی ہوٹل میں بیٹھ کر مشاعرے کی محفل بھی برپا کر لیتے۔ ان دنوں رام ریاض کی اس غزل کا بہت چرچا تھا۔

جانے کس رات کی راہ تکتی رہی — سرد راتوں میں پہروں کھڑی چاندنی

اس دَور کی آزاد منشی کی وجہ سے سرد راتوں میں چاندنی گلے ملتی اور رگوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ اسی طرح کے اشعار کی ترنگ میں ہم لوگ، یونانی ٹریجڈی کے ہیرو کی طرح خانیوال میں انجمن کی ملازمت کو اپنی بدنصیبی کی بنیادی وجہ قرار دیتے ہوئے، مستقبل کے کسی خواب کی تکمیل کی جستجو میں مگن رہا کرتے تھے۔ اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ غزل کا شاعر بھی بنیادی طور پر ٹریجڈی کا ہیرو ہوتا ہے۔ کوئی بہت بڑا المیہ اس کی روح کو الجھائے رکھتا ہے۔ رام صاحب سکول میں پڑھانے کے علاوہ ملکیتی معاشرے کی قدروں پر سکتے اور اس عمل میں کبھی کبھار مدرسے کے امور سے وقت نکال کر ایک جُو سے دل بہلاتے: جس سے ان کی ناآسودگی میں غنایت کو مزید تحریک ملتی۔ وہ بچوں کی طرح ہر چیز اور ہر منظر کو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھتے۔ اور غم کی دائمی لہر میں رہنے کے باوجود مجلسِ احباب میں قہقہے بھی لگاتے۔ جس مدرسے میں وہ پڑھاتے تھے وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب انجمن نوازی کی وجہ سے معروف تھے۔ کام کرنے والے لوگ انہیں اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتے تھے، لیکن رام صاحب انہیں اپنا محسن سمجھتے تھے' اور کوئی بات ان کے خلاف اپنے مُنہ سے نہیں نکالتے تھے۔ دراصل رام صاحب اس دَور میں دنیاداری کی لڑائیوں سے خاصے دور تھے۔ وہ ملکیت اور مفادات کی جنگ اور جبر کے متحارب کیمپ میں اپنے سندر خوابوں کے سہارے رہتے تھے۔ چاند کی چاندنی کو اپنی شاعری میں پکارتے تھے۔ غم کی پُرکشش تصویروں کو اپنی شاعری کے جہان میں آباد رکھتے تھے۔ اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی رزقِ حلال سے وابستگی رنگ لائے گی۔ بہرحال اس زمانے میں ان کے مخلص دوستوں

کی خواہش تھی کہ وہ خانیوال میں انجمن کی ملازمت ترک کرکے کوئی بہتر روزگار تلاش کر سکیں۔

اتفاق سے انہی دنوں محمد حنیف رامے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔ رام صاحب کی اُن سے شناسائی تھی۔ دوستوں نے رام صاحب کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ رامے صاحب کو خط لکھ کر انہیں اپنے ملازمت کے مسئلے سے آگاہ کریں، چنانچہ انھوں نے خط لکھا اور رامے صاحب کی توجہ اور التفات کے باعث رام ریاض خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے سے منسلک ہوئے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے کے طفیل شاید رام صاحب کو اپنی منصوبہ بندی کا بھی خیال آیا۔ اور یوں وہ برسرِ روزگار ہونے کے بعد اس راستے پر چل نکلے جس کے نتیجے میں صاحبِ اولاد ہونا یقینی تھا۔ میں خانیوال سے ملتان چلا آیا۔ اور پھر رام صاحب سے طویل عرصے تک ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم اطمینان تھا کہ وہ مناسب طور پر برسرِ روزگار ہیں اور اپنے گھر کا نظم چلا رہے ہیں۔ لیکن فلک کج رفتار کو ان کی آسودگی گوارا نہ ہوئی۔ ازل سے ادب، شاعری اور آرٹ کے دشمن ناصحوں اور پند گروں اور واعظوں کی کم نظری رنگ لائی اور وہ فیملی پلاننگ کے محکمے سے بھی نکالے گئے۔ ایک روشن آنکھوں والے شاعر کے ساتھ ہوس پرست اداروں کا یہ سلوک خلافِ توقع نہیں تھا۔

اب محسوس ہوتا ہے کہ خانیوال کے روز و شب رام ریاض کے لئے نسبتاً زیادہ سکون بخش تھے۔ رام صاحب کے لئے معلمی کا سہارا موجود تھا اور وہ اپنا بہت سا وقت ادبی محفلوں کے علاوہ تخلیقی کاموں کے لئے بھی نکال لیتے تھے۔ ملکی سطح کے مشاعروں میں بھی شرکت کر لیتے تھے اور ادبی حلقوں میں بھی اُن کے منفرد اسلوب کا تذکرہ رہتا تھا۔ ان اوصاف کے صلہ میں اگر انہیں بے روزگاری ملی تو وجہ یہ بھی ہے کہ سارے معاشرے میں الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ ذاتی صلاحیتیں اجاگر کرنے کی بجائے فی زمانہ آدمی کسی قبر کے متولی، مجاور یا وارث کے گھر پیدا ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ لاٹری نکل آئی۔ مستقبل خود بخود سنور گیا۔ لیکن رام جیسے لوگ تو اپنی نارسائی کے المیے کو محسوس کر کے ملکیت کی دیواروں سے سر ٹکراتے ہیں۔ صوفیا، اہل درد اور شاعروں نے ملکیت کے مقابل داخلی آسودگی کا پیغام دیتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے لیکن رام ریاض تک پہنچتے پہنچتے غزل عظیم جنگوں کا بحران اور انقلابی تحریکوں کے خدوخال بھی دیکھ چکی تھی۔ اس لئے رام کی غزل کلاسیکی اسلوبیات کا رنگ و آہنگ رکھنے کے باوجود ہمعصر زندگی کے زہر کو شدت سے محسوس کراتی ہے اور اپنے مسلک پر حوصلہ مندی سے چلنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ رام اپنے وجود میں زخموں کی آگ سے کھیلتا ہے۔ وہ چراغِ دار کو جلتے دیکھتا ہے اور موسمِ صلیب کی آمد کو محسوس کرتا ہے۔ ہوا میں زہر اور پانیوں میں آگ اس کے تجربے کا حصہ ہے۔ ہجر کی رات چاند کی روشنی میں اندھیرے اوڑھ زمین پر آگ کو پھیلتے دیکھ کر سمندر میں بسیرا کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ اپنے خون کو لاوا اور دل کو پتھر کہنے کے باوجود آنکھ میں آنسوؤں کے امڈ آنے کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ستاروں کے جلنے بجھنے کے عمل کو محسوس کرتا ہے۔ جام میں رس گھول کر عہدِ حاضر کے سقراط کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یادوں کے دریچے کھولتا ہے۔ زنداں میں بھی لب و رخسار کی جنتیں دیکھتا ہے۔ غرض اس کی غزل کا ہر شعر ایک دن کی طرح طلوع ہوتا ہے۔ اور آسمان کے دوسری سمت شام سیاہ قبا میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کا ہر شعر عصری تضادات کو محسوس کراتا ہے۔ وہ لفظوں کے پیکر تراش کر متضاد کیفیتوں سے تصویریں بناتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کے اسلوب کی گونج ایک ایسی موسیقیت کا رس گھولتی ہے جس کی وجہ سے بقول ندیمؔ اس کا اسلوب سینکڑوں، ہزاروں غزل گو شعراء کے ہجوم میں ایک ایک شعر کے حوالے سے منفرد نظر آتا ہے۔ دراصل رام کے اسلوب کی انفرادیت کا راز اس منفرد صوتی آہنگ سے پیوستہ ہے جسے وہ دل کے

گداز میں اتار کر شعری تصویریں بناتا ہے۔ میر و غالب کی انفرادیت بھی اسی نوعیت کے صوتی آہنگ سے عبارت ہے۔ اور فیض کی شاعری کا جادو بھی اسی نوعیت کے آہنگ کا کمال ہے۔ رام ریاض کہتا ہے۔

کسی کو اب نہ ستائے گی مرگِ نامعلوم　　چراغِ دار جلے، موسمِ صلیب آیا:

اور میر کا شعر ہے:

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میر　　سرِ منصور ہی کا بار آیا

اسی طرح: تیرے عشق کی چتا میں جلے تو جل گئے ہم　　پسِ خاک پھر نہ سوچا، تہہِ آب پھر نہ دیکھا　(رام ریاض)

اور: وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے　　وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے　(فیض)

ایک اور مثال: سولیوں کو میرے اشکوں سے اجالا جائے　　داغ مقتل کے میرے خون سے دھوئے جائیں　(رام ریاض)

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے　　شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد　(غالب)

ان چند اشعار کے مطالعے سے ہر شاعر کے اسلوب کا جادو ایک مخصوص صوتی و لفظی آہنگ کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلوں کی دنیاؤں کا طلسم کدہ حیاتِ انسانی کی کشمکش میں اپنے دلفریب اور انوکھے رنگ سامنے لاتا ہے۔ رام ریاض نے جبر اور ویرانیِ حیات کے روبرو اپنے شکوے کے اسلوب میں مزاحمت کی تصویروں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کا کلام اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ پسماندگی، جبر اور غلامی کے ساتھ تصادم میں شاعر کے اسلوب کی کاٹ کس تیکھے انداز سے وار کرتی ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نانِ جویں کے لئے زندگی کی کشمکش اور حالات کے روبرو شکستِ زندگی کے عمل میں کیا وہ اپنے اسلوب اور وجود کو زندہ رکھ سکے گا؟ جاگیرداری قدروں کا نظام جو میر و غالب کے عہد میں نزع کے عالم میں تھا، عالمی سطح پر استعماریت سے وابستگی کے عمل میں، جانکنی میں مبتلا ہے اور رچی بھی رہا ہے۔ اس کا جینا مرنے سے زیادہ اذیت ناک اور ہولناک ہے۔ اور شاید اسی لئے رام نے اپنے مجموعۂ کلام کا انتساب اس "محسن" کے نام کیا ہے جس نے اسے "بیروزگار" کر کے عمر بھر کے لئے اپاہج زندگی کے حوالے کر دیا۔

گاہے گاہے باز خواں (انتخابِ کلام)

اکبر الہ آبادی

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

غمِ دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا
مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا

جان اللہ نے لی جسم ہوا داخلِ گور
ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا

آپ کی یاد کو اللہ سلامت رکھے
مجھ پہ احسان ہے اس مونسِ تنہائی کا

خاکِ قدم اس نے مری آنکھوں میں لگا دی
اب اور مصیبت ہے کہ رو بھی نہیں سکتا

ہمی بنے تھے زیادہ گناہِ اکبر پر
ہمی کو اب ہے یہ حسرت ہمی نے کیوں نہ کیا

ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں
اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہوا

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا
خدا کی یاد میں محویتِ دل بادشاہی ہے
مگر آساں نہیں ہے ساری دنیا کو بھلا دینا

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبرؔ
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

دونوں کا ارتباط خدا ہی کے ہاتھ ہے
دانہ تو زیرِ خاک ہے، ابر آسمان پر

دنیا کی غفلتوں کی تصویریں بگولے
بنیاد ہے ہوا پر، سر آسمان پر ہیں

تمام عمر یہاں خاک اُڑا کے دیکھ لیا
اب آسمان کو دیکھوں، زمیں تو کچھ بھی نہیں

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر — ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

بچاتا ہے ہزاروں کفر سے اے واعظِ ناداں — بلائے دامِ گیسوئے بتاں میں مبتلا ہونا

ایمان کے دشمن ہیں جلوے بتِ کافر کے — فتنے تو ذرا دیکھو ترکیبِ عناصر کے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے — ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی — دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

آئینے سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس — شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے
حضرت منصورؒ "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ — دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

نام یوسفؑ سے ہوا یعقوبؑ کا — یوں تو حضرت کے بہت بیٹے ہوئے

اللہ کا حال کچھ نہ پوچھو — دیکھا نہیں، نام رکھ لیا ہے

زوالِ جاہ و دولت میں بس اتنی بات ہے اچھی — کہ دنیا کو بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو — یہی ذرے ابھرتے ہیں، یہی مٹی سنورتی ہے

مجھ کو نہ کبھی اس بتِ دلخواہ نے چاہا — اب میں بھی نہ چاہوں گا جو اللہ نے چاہا

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا — طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

غرورا نہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر — سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

مرا محتاج ہونا تو مری حالت سے ظاہر ہے
مگر ہاں دیکھنا ہے آپ کا حاجت روا ہونا
صفاتِ حق تعالیٰ فہمِ منکر میں نہیں آتے
وہ کہتا ہے کہ گویا کچھ نہ ہونا ہے خدا ہونا

آرزو ہے مجھے اس شخص سے ملنے کی بہت
نام کیا لوں، کوئی اللہ کا بندا ہوگا
وہ موسیٰ ہوا جو طالبِ دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا

کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں
ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب رخصت ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کر دیا

دنیا کے مباحث یہ مری نظروں میں ہیں کیا
اتنا تو کوئی پہلے بتائے مجھے، میں کیا

فرحت انگیز تو ہے ولولہ انگیز نہیں
نکہتِ گل بھی نہیں ہے تری خوشبو کی طرح

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

میں تم سے کیا بتاؤں کہ اس وقت ہوں کہاں
جب تم ہو پیشِ چشم تو پھر میں کہیں نہیں

یہ تماشے ہیں یہیں، زیرِ زمیں تو کچھ نہیں
زندگی جب تک ہے سب کچھ ہے، نہیں تو کچھ نہیں

اس زمانے میں مرے قصۂ غم سے واقف
اس کا باعث جو ہے، شاید وہی آگاہ نہ ہو

کچھ طرزِ ستم بھی ہے، کچھ اندازِ وفا بھی
کھلتا نہیں حال اُن کی طبیعت کا ذرا بھی

ہمیں بھی آتشِ الفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار ہم پر بھی

آئی ہوگی کسی کو ہجر میں موت
مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی
عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی

کہہ چکا اس قدر، اور پھر وہی الجھن دل کی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجھے کہنا کیا ہے

بیتابیاں نصیب میں تھیں، ورنہ ہمنشیں
یہ کیا ضرور تھا کہ انہی پر نظر پڑے

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

مل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ
آدمی کا آدمی شیطان ہے

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

فلک نے کیوں شبِ فرقت مجھے ہلاک کیا
جمالِ یار نہیں تھا تو کیا سحر بھی نہ تھی

سنتے ہیں کہ اکبرؔ نے کیا عشقِ بتاں ترک
اس بات سے تو خوش نہ ہوا ہوگا خدا بھی

طنز و مزاح

بازارِ مغربی کی ہوا سے خدا بچائے
میں کیا، مہاجنوں کا دیوالا نکل گیا

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پر
خیریت گزری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

نام اللہ رسول اب تو میں کم سنتا ہوں
پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

خط میں کیا لکھا ہے، قاصد کو خبر کیا اس کی
پوچھتا ہے، مجھے انعام ملے گا کہ نہیں

کچھ مزا گیہوں کا، کچھ حوا کے کہنے کا خیال
آپ ہی کہیے کہ اس موقع پر آدم کیا کریں

اِدھر آتا ہے چہرہ کوہکن کا کوہ پر چڑھ کر
اُدھر کب تخت پر سے حضرت پرویز اترے ہیں

حسنِ مس پر کر نظر، مذہب اگر جاتا ہے جائے
قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبرؔ مال دیکھ

جب کہتا ہوں مرتا ہوں مری جان میں تم پر
فرماتے ہیں، مرتے ہو تو مر کیوں نہیں جاتے

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں مارا، چوری تو نہیں کی ہے

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے
مزا تو بے حد آتا ہے مگر ایمان جاتا ہے

حکمِ انگلش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

یہ صندوقِ کتب بھاری ہے مجھ سے اُٹھ نہیں سکتا
یہ ہے مذہب، تو مجھ سے بارِ مذہب اُٹھ نہیں سکتا

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزورِ تیغ
یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزورِ موت

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جُمّن

یہ نہ پوچھو مجھ سے یہ کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں
شیخ: یہ سوچو، تمہارے پاس پیسا کیوں نہیں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مے بھی ہوٹل میں پیو، چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں، شیطان بھی بیزار نہ ہو

پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

ہم کیا کہیں، احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے — بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

شیعہ و سنی میں جنگ اک دھوم دھامی ہو گئی — چار یار اور پنجتن کی نیک نامی ہو گئی

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے — یاں دھرا کیا ہے بجز اکبرؔ کے اور امرود کے

نہ مانا شیخ جی نے، چکھ گئے دس پانچ یہ کہہ کر — اگر قابض ہیں یہ بسکٹ تو ہوں، اللہ مالک ہے

لگی لپٹی ہر اک سے، یہ بری عادت تمہاری ہے — مری جاں! اس میں اک دن احتمالِ فوجداری ہے

شیخ بھی ہیں دیر کے سائل، بس اتنا فرق ہے — مجھ کو بوسا چاہیئے، ان کو سموسا چاہیئے

اکبرؔ دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے — لیکن شہید ہو گئے بیگم کی "نوج" سے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہو گا — پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہو گا

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر — فضلِ خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

اصل مقصود ہے خالق کی پرستش لیکن — صورت اچھی ہو تو انساں پرستی ہی سہی

گلِ تصویر کس خوبی سے گلشن میں لگایا ہے — مرے صیاد نے بلبل کو بھی الو بنایا ہے

ہم اظہارِ خودی سے کوئی دم ساکت نہیں ہوتے — مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے

پیش تو میں نے بھی دل کو کر دیا بہرِ کباب — تھا عدو چالاک تر، بالکل ہی قیمہ ہو گیا

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ — تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے — اسے کشتی نہیں ملتی، اسے ساحل نہیں ملتا

اس نے پوچھا، ہو گیا آسودہ بوسے لے کے تو؟ — میں نے ناحق کہہ دیا جلدی میں، جی ہاں ہو گیا
سر بھی کھا جائے گا ظالم، جان بھی کھا جائے گا — سخت مشکل ہے کہ ناصح میرا مہماں ہو گیا

نہ خوشی ہوتی ہے دل کو، نہ طبیعت کو ابھار — پھر بھی سالانہ کیے جاتے ہیں ہم عید ہنوز

چلا ہے فلسفہ لے کر ہمیں سوئے ظلمات — بہت ہی تنگ ہیں اس اسپِ بے لگام سے ہم

ہیں کلکٹر نزع میں، علمے کھڑے ہیں دم بخود — جب خدا ہی ہو گیا حاضر، تو ناظر کیا کریں

ان مدعیوں کا طرزِ عمل اکبرؔ یہ شہادت دیتا ہے — پڑھنے کو کتابیں پڑھ لی ہیں، سمجھے یہ مگر کچھ خاک نہیں

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں — مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

موسیقی و شراب و جوانی و حُسنِ ناز — بچتا ہے کون، اور خدا بھی بچائے کیوں

سب ہو چلے ہیں اس بتِ کافر ادا کے ساتھ — رہ جائیں گے رسولؐ ہی بس اب خدا کے ساتھ

شاخونِ جگر کھاتا ہے اکبرؔ — مبارک یہ غذائے عاشقانہ

عاشقوں میں رسمِ عیشِ دنیوی رائج نہیں — قیس کب دولہا بنا، لیلیٰ کہاں بیاہی گئی

موقعِ بحث نہیں، صاحبِ اقبال ہیں آپ — میری ہر بات بُری، آپ کی ہر بات اچھی

تو خوشامد کا ہے اور میں ہوں قناعت کا مرید — میری اکسیر پرانی، تری اکسیر نئی

اب تو نقدی سے کوئی صاحب مرا دل خوش کرے — سُن چکا ہوں مرحبا بھی، آفریں بھی، واہ بھی

تمہاری پالسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب ہماری پالسی تو صاف ہے ایمان فروشی کی

ضروری کام نیچر کا جو ہے کرنا ہی پڑتا ہے نہیں جی چاہتا مطلق مگر مرنا ہی پڑتا ہے

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

واعظ تو بناتے ہیں مسلمان کو کافر افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے

ہوں میں وہ رند اگر حشر میں ملزم ٹھہروں فیصلے کے لیے حوروں کا کمیشن بیٹھے

سدھاریں شیخ کعبہ کو، ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

کھلی جو آنکھ جواتی ہیں، عشق آ پہنچا جو گرمیوں میں کھلیں در تو کیوں نہ لو آئے

ناز سے اس نے جو دیکھا شیخ کو ان کی دین داری ہی رخصت ہو گئی

کہو جو چاہو سن لیں گے مگر مطلق نہ سمجھیں گے طبیعت تو خدا جانے کہاں ہیں کہاں حاضر ہے

جدت ہو فکر میں تو توارد کبھی نہ ہو مضمون کیوں لڑیں جو طبیعت لڑی رہے

کعبے سے بت نکال دئے تھے رسولؐ نے اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

کامل کم ہیں اور اہل ارشاد بہت ساحر کم ہیں ملیں گے صیاد بہت
ہے بزم سخن کا حال یہ اے اکبرؔ شاعر کم ہیں مگر ہیں استاد بہت

شاید کہ یہی ترقیِ قومی ہے ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن اک شور مچا، خلافِ تہذیب ہے یہ

میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی پر ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا شیریں کے لئے کرنا شپاتی کے لئے

بے علم بھی ہم لوگ ہیں، غفلت بھی ہے طاری افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

فرق کیا عاشق و واعظ میں بتائیں تم سے اس کی حجت میں کٹی، اس کی محبت میں کٹی

میں نے اکبر سا بھی وہمی نہیں دیکھا کوئی کہتا ہے "ان کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے!

میں نے کہا کہ اپنا سمجھیئے مجھے غلام بولا وہ بت یہ ہنس کے، فرنگی نہیں ہوں میں

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے

دیکھیئے قوال بے چارے کا اب کیا حشر ہو شیخ صاحب کو تو لکچر پر بھی وجد آنے لگا

پکالیں پیس کر دو روٹیاں، تھوڑے سے جَو لانا ہماری کیا ہے اے بھائی، نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

آپ کی فرقت میں میں کل رات بھر سویا نہیں لیکن اتنی بات تھی، اگا تار رویا نہیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیئے اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجیئے

کچھ شک نہیں کہ حضرتِ واعظ ہیں خوب شخص یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہوں

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث اب "اُف" کیجئے اور نہ "بٹ" کیجئے

سینڈور پتوفی

انگریزی: گریس گرین وڈ

اردو: اختر شیرانی

ہنگری کے معروف شاعر پتوفی (۱۸۲۳ - ۱۸۴۹ء) کی ایک مختصر نظم نے ہر زبان میں بہت شہرت پائی۔ گریس گرین وُڈ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔ شاید اسی انگریزی ترجمے کو شاعرِ رومان اختر شیرانی نے اردو شعر میں منتقل کیا۔ پتوفی کی اس نظم کے انگریزی اور اردو تراجم نذرِ قارئینِ فنون ہیں:

LOVE AND LIBERTY

By Sandor Petofi/1823-1849/

To Love and Liberty
My songs as incense rise-*
For Love, divinest Love,
My life I'd sacrifice.

But august Liberty-
Thou God-Life, high above
All earth-born beings
-unto thee
I'd sacrifice my love.

/GRACE GREENWOOD/

عشق و آزادی

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

عزیز حامد مدنی

گواہ

کیا یہ خاموشی مری جاں، اک ہراساں سی گواہ
سر بہ سر نا مستعد لگتی نہیں خود آپ ہی
ہر سوالِ وقت پر کاذب جوابوں کی پناہ
منحرف ہے اک غم و غصّے کی رَو میں رُوحِ حال
آدمی کی نیند میں گھلتی ہوئی تاریکیاں
خوف کا زہر ہلاہل، دُزدِ پیماں سے سوال

رُو برو جھلسی ہوئی فصلیں ہیں بیماری کے سائے
ایشیا کی خاکِ پارینہ ابھی ہے سرنگوں
قحط کا گہوارۂ جنباں، اجل کی اک سرائے
غیر کی تدبیر ہے ردِّ بلا ایام کی
بنجروں کی سی گرہ بے آبِ ذہنوں میں لیے
ڈھونڈتے ہیں ہم، کٹیلی جھاڑیاں اوہام کی

تیرگی کے دائرے، اقوالِ کہنہ کے حصار
شپّرہ چشموں میں وارث وارداتِ نو کے ہیں
اک ملامت کا ہدف آئینِ آگاہی سے خوار
رُخِ تباہی کا لیے اک علم ہے، آگاہ ہے
تنگ بازاروں میں ہے آتش زدہ چہروں پہ خاک
اِک لغت دشنام کی، دیوارِ دانش گاہ ہے

دانشِ حاضر سے عاری نطق ہے بے آبرو
مجلسوں میں یوں تو ازبر ہے حدیثِ خیر و شر
کمتری کے غم سے لکنت ہے زباں کی بے نمو
طاقتوں کی دوڑ میں کیا کاغذی ہوش و حواس
حرفِ پیچیدہ کے جادو سے سیاست کا طلسم
رد کیے دیتا ہے خود اپنی ضرورت کا بھی پاس

وہ خدا صنعت کے تازہ رُخ کا سودائی ہوا
روز و شب زرخ گراں ہیں ایک نادیدہ سا ہاتھ
کس ہُنر سے کاربندِ عالم آرائی ہوا
ہم وہ اندھے ہیں کہ آئینے سے شرماتے نہیں
انجم و خورشید پر تشکیک کے شب خون ہیں
اپنی ڈیوڑھی پر تغیّر کی ہوا پاتے نہیں

نیم جاں، آہستہ رو تہذیب کے حلقے ہیں ہم
دورِ نو کی آگہی کو مسخ تر کرتے ہوئے
آ چکے ہیں آتشِ تادیب کے حلقے ہیں ہم
مغزِ کہنہ کے برادے سے غذا چھنتی نہیں
پارہ پارہ ذہن کی اک جانکنی کی جست و خیز
تازہ فکری کا کوئی خطِ اُفق بنتی نہیں

قافلے ہیں جستجو کے بحر و بر کے درمیاں
دانشِ حاضر کی محرم کامگارِ روحِ عصر
تازہ نسلیں آ رہی ہیں توڑ کر حد بندیاں
یہ غمِ حرف و سخن کی سہل انگاری ہے اور
تربیت گاہوں کی ابجد اور، نقشے اور ہیں
اور کچھ بنیادِ جاں ہے، روحِ بیداری ہے اور

ظرفِ آبا میں سموتا ہے تغیّر کو، کمال
علمِ نو کے بطن سے تخلیق کا جوہر لیے
پاتے ہیں صلبِ پدر سے ربطِ معنی خد و خال
نُو ہے صدیوں کی کڑی کی، شعلۂ بیباک میں
ایک نو پیدا فضا، تاریخ کا اک سلسلہ
منکشف ہوتا ہے ذہنوں کی حدِ ادراک میں

سیّد منیر

یادِ شہرِ جاناں

(لندن میں بے وطنی کی ایک شام)

(۱)

تجھے معلوم بھی ہے
چاہنے والے ترے
کتنے متوالے ترے
تجھے ملنے کو ترستے ہوں گے
تری دُوری سے پریشاں ہو کر
مضمحل وقت کی
بے ساختہ ویرانی میں
جگمگاتے ہوئے شہروں کی بیابانی میں
تجھے ملنے کے لیے
پھُول کھلتے ہیں شجر جھُومتے ہیں
اجنبی حسن کی بے رنگ
فراوانی میں ،

(۲)

"تجھے معلوم بھی ہے ؟
کیسے بجھتی ہوئی یادوں کا لبادہ اوڑھے
کفِ تنہائی سے ڈھانپے ہوئے دُوری کے چراغ
کتنے متوالے ترے
چاہنے والے ترے
تُجھے ملنے کو ترستے ہوں گے
تری خوشبو سے مہکتے ہوئے ماضی کے پراسرار شبستانوں میں
وقت کے گم شدہ ایوانوں میں
چند لمحے تری دلداری کے
پھول بن بن کے برستے ہوں گے
تجھے ملنے کو ترستے ہوں گے
تجھے معلوم بھی ہے !

(۳)

اپنی یادوں کے حسیں آنگن میں
ان گنت لوگوں نے چوما ہے ترے ہاتھوں کو
ان گنت آنکھوں نے
بند آنکھوں سے تجھے دیکھا ہے
ان گنت پیاروں نے
تجھے پیاروں کی طرح چاہا ہے
جن کے مذہب ہیں جدا ، جن کی سیاست ہے جدا

جن کے تہذیب و تمدن میں تفاوت ،
کئی فرسنگ ، کئی صدیوں کا
تری کلیوں کے پجاری
ترے پابندِ وفا
کسی محفل میں ہوں ، میخانے میں
کسی زنداں میں ہوں ، ویرانے میں
جب کوئی نام ترا لیتا ہے
کیسے ہنستی ہوئی آنکھوں میں نمی آتی ہے
کیسے بجھتی ہوئی آنکھوں کے دیے جلتے ہیں

(۴)

تجھے معلوم بھی ہے ؟
ترے گلشن کے گلاب اور سمن
خشک پتّوں کی طرح
عہدِ آوارگیٔ ہجر سے وابستہ ہوئے جاتے ہیں
ایک ادبار ہے
اک حکمِ خداوندی ہے
تجھ سے دوری کے مقامات کی پابندی ہے
کیا ترے چاہنے والوں کا مقدر ہے گریز
جس میں لکھی ہوئی رستوں کی پریشانی ہے
وقت کے گرتے ہوئے پتّوں میں
زیست کی اُلجھی ہوئی شاخوں میں
چند پھولوں کی نگہبانی ہے ،

(۵)

کتنی صدیوں سے ترے چاہنے والوں نے
تجھے پوجا ہے
ترے سورج کی پرستش کی ہے
ترے گہنائے ہوئے چاند سے افسردہ ہوئے ہیں یہ لوگ
تری مٹی سے بنائے معبد
ترے دریاؤں کے پانی پہ بکھیری ہے کبھی راکھ اپنی ،
پھر بھی
یہ لوگ ترے وصل سے محروم ہیں کیوں
تُو نے
کس عہدِ دلآزار کی ڈالی ہے اساس
جس میں اک ہجرِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

(۶)

چاہنے والے ترے
ارضِ مشرق سے چلے
تھام کے پرچم تیرے
اپنی آزاد تمنّاؤں کی شہراہوں پر ——
اُن کا ماضی
تری تاریخ کا پابند نہ تھا
پھر بھی
بے واسطۂ سود و زیاں
کس قدر ناز اٹھائے تیرے
ترے ہر جبر کو تسلیم کیا ——

تری حکمت کے سرسبز گلستانوں میں
تجھ سے پیمانِ وفا باندھنے والے یہ سافر تیرے
کیوں بھٹکتے رہے ویرانوں میں ——
ان کی تاریخ کے آئینے میں
آدمیت کے حسیں سینے میں
تو نے کچھ زخم لگائے ایسے
کہ ترے چاہنے والوں کا جو تھا
رنگِ وفا
ظلم کے رنگ سے وابستہ ہوا

تجھے کچھ یاد بھی ہے
جو لہو تیرے لیے اُن کا بہا
پھر بھی بے وجہ انھیں
ظلم کی راہ پہ کھینچا تُو نے
جو لہو تیرے لیے حاضر تھا
اُس لہو سے اُنھیں سینچا تو نے ——

(۷)

تجھے معلوم بھی ہے
اپنے افسردہ مراحل سے گزرتی ہوئی تاریخ تری
ایک ہی جبرِ مسلسل کی تماشائی ہے
ایک ہی بات کئی صدیوں سے
تری تاریخ نے دُہرائی ہے
ترے خوش خال سپوت اور تنومند جواں
منتخب سرو و سمن تیرے گلستانوں کے
خوگرِ مہر و وفا تیرے شبستانوں کے
محتسب فکر کے مے خانوں کے
منتظم درد کے زندانوں کے
ہر نئے عہد کی تاریکی میں
دعویٰ حقِ امامت کا اُٹھائے پرچم
مستحق تیرے محلّات کے،
ایوانوں کے،
ترے خوش فہم مفکّر
ترے خوش لحن ادیب
حاشیہ گر ترے رُومانوں کے
ترے شاعر
جہدِ فکر سے فارغ ہو کر
غمِ انساں سے بچا کر دامن
دِل کے دُکھتے ہوئے تاروں سے ہٹا کر مضراب
ظلِّ شاہی کے لیے
جاں پناہی کے لیے
صرف قدروں کی تباہی کے لیے
دف قصیدوں کے بجاتے ہیں شب و روز و سحر
اور ——
کچھ ہیں کہ تمنّاؤں کی محرومی میں
جال پر جال بُنے جاتے ہیں
کچھ تصوّف کے، کچھ ابہام کے جال

حرف در حرف بچھائے ہوئے ابہام کے جال
یعنی ابہام کے جال
ہر حقیقت سے نمٹنے کے پرانے حیلے،
کہنہ صدیوں کی جلی روح کا مایوس جمال ــــ

تری مجلس کے مقرر، ترے سجّادہ نشیں
رات بھر بانٹنے والے تہی پیمانوں کے
قافلے تیرے ثنا خوانوں کے
غول در غول، بھٹکتے ہوئے انسانوں کے ــــ
ترے عادل، ترے دربار کی زینت
کہ جنھیں
منصفی جبہ و عمامہ کی پابندی ہے
آب کی سطح پہ اک عکسِ رواں
کسی دنیا میں جہاں عدل ہوا کرتا ہے
اس کی نایاب روایات کی ہمرنگی ہے
اپنے لفظوں کی حسیں شبنم سے
عدل کے سوکھے ہوئے پتوں کی
ایک بیکار حنا بندی ہے ــــ
کتنی صدیوں کے تقدّس کا لبادہ اوڑھے
کیسے آزادیٔ انساں کے محافظ نظر آتے ہیں مگر
وقت کا ساتھ دیئے جاتے ہیں
جب بھی ہو
کاوشِ تبادل کی سرگرمی سے
جبر کو شاملِ انصاف کیے جاتے ہیں

تری آزادیٔ تحریر کے ضامن
یہ صحافی تیرے:
جن کی قسمت میں اندھیروں کا مقدّر ہے لکھا
رات بھر لکھتے چلے جاتے ہیں
اور ہراساں ہیں
سویرا نہ کہیں ہو جائے
شب کا مانوس اندھیرا نہ کہیں کھو جائے

(۸)

مدّتوں سے یہ ستارے تیرے
رات ہوتے ہی چمک اُٹھتے ہیں قریہ قریہ
جب تلک رات رہے
اپنی کرنوں کو اُجاگر ہی کیے جاتے ہیں
صبح کے نام سے آزردہ ہیں، افسردہ ہیں
ایک ہی رات کے ہیں لختِ جگر
ایک ہی جبر کے پروردہ ہیں

یہ ستارے تیرے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں
شہر یاروں کے جلوس
جن کے پرچم پہ چمکنا ہے تقاضائے حیات ان کے لیے
شہر یاروں کے علم دیکھتے ہی

ہاتھ بڑھتے ہیں
قدم دوڑتے ہیں
جگمگا اُٹھتا ہے ہر ذہن کا گوشہ گوشہ
ہر جری تیرا، ہر اک دانشمند
ہر صحافی ترا، ہر واقفِ راز
ایک ہی بات کہے جاتا ہے
"جان حاضر ہے
بدن حاضر ہے
ذہن حاضر ہے
قلم حاضر ہے
آپ کے پاؤں پہ ساری خوشیاں
اور سب کے لیے غم حاضر ہے"

(۹)

تُونے، اے ارضِ حسیں
وہ بھی علم دیکھے ہیں
جو صداقت کے علم تھے
پہ فتحیاب نہ تھے
پاؤں تیرے کبھی اُٹھے کہ چلیں اُن کے ساتھ
ہاتھ ترے
کبھی بیتاب ہوئے
اُن کے لیے؟

(۱۰)

یہ ستارے ترے اب صبح نہ ہونے دیں گے
تجھے ملنے کی تمنا
تجھے چھُونے کی طلب
غم کی تاریک فضاؤں میں بکھر جائے گی
یہ ستارے ترے اب صبح نہ ہونے دیں گے
وہ گیا وقت کہ جب رات کے ہمراہی تھے
اب جو نکلے ہیں
تو جانے کی کوئی بات نہیں
رات کو
خود ہی جنم
ان ہی ستاروں نے دیا ہے اس بار
رات ان کی ہے
یہ چاہیں جب تک
رات موجود رہے گی
انھیں روشن ہی کیے جائے گی
جس قدر اپنی جلو چاہیں گے
اُس قدر تیز اندھیرا ہوگا
اپنے تاروں کے تحفّظ کے لیے رات آخر
خود ہی سورج کو نگل جائے گی
یوں
اندھیرے کا بسیرا ہوگا
پھر
سویرا
نہ ہی تیرا
نہ ہی میرا
ہوگا —!

احمد ظفر

گوری چکی پیس رہی ہے

گوری چکی پیس رہی ہے
اندر ہے اندھیارا
کہتے ہیں وہ مر جاتا ہے
جس نے ہاتھ پسارا

گوری چکی پیس رہی ہے
روتے ہوئے ہولے
چکی کے چکر میں دکھ ہیں
بولے یا ناں بولے

گوری چکی پیس رہی ہے
پستے کیسے فاقے
دروازے کی اوٹ میں بنیا
ایک ہی آنکھ سے تاکے

گوری چکی پیس رہی ہے
دریاؤں میں پانی
نادانی میں پیس دیے ہیں
بچپن اور جوانی

گوری چکی پیس رہی ہے
سوتے ہیں ہمسائے
دودھ کو پانی ہوتے دیکھا
پیتل کی تھی گائے

گوری چکی پیس رہی ہے
پس پس جائیں دانے
عقل کو بھینس سمجھ کر باندھا
پاگل ہوئے سیانے

گوری چکی پیس رہی ہے
دشمن سارا گاؤں
روپ کی دھوپ میں جلتی جائے
پیڑ کہیں ناں چھاؤں

ترجمہ: محمد صفدر خاں

چار نظمیں

سچائی

میرے باغ میں حقیقی چیز خوشبو ہے
ہری بھری ڈالیاں، کانٹے اور رنگ برنگے پھول
یہ سب محض علامتیں ہیں!
میرے گوشت پوست میں کوئی سچائی نہیں
اور نہ ہی میرے کام، بول چال اور ملکیت میں کوئی حقیقت ہے
یہ سب کچھ میری ذات کی علامتیں ہیں
جذبہ، سوچ اور خواہش
میرے فطری رنگ ہیں
اور یہ پھولوں کی خوشبو سے مشابہ ہیں
کیا یہ سجا ہوا ہیٹ فرمان کی علامت نہیں ہے؟
اور کیا دولت نارسائی کی علامت نہیں ہے؟
میری حیثیت ایک بازی گر کی سی ہے
میں اپنی ذات علامتیں اچھالتی ہوں
اور پھر انھیں ترتیب دے لیتی ہوں
دنیا میں واحد سچائی ذات ہے
اور میں اسے خوشبو سے مشابہ سمجھتی ہوں!

(اینا وکہام)

طلب

میں ہمیشہ تمہارے بائیں جانب چلوں گی
اور میرا دایاں ہاتھ
تمہارے دل کے قریب رہے گا
تمہاری محبت سے میں یہ جاننا چاہتی ہوں
کہ مجھ میں یہ کھیل رچانے کی کتنی سکت ہے
تنہائی کے لمحوں میں کھوج لگاؤ
کہ تمہیں میرے وجود کی کس قدر ضرورت ہے
تم میرے ہاتھ کا کھیل ہو
اور میرے قابو میں ہو
میں بہت خوش قسمت ہوں!

(اینا وکہام)

آزادی

ضمیر کی آزادی سے محروم شخص
جاہ و حشمت کی محبت میں الجھ جاتا ہے
جیسے رقص اور نغمے کی لذت چھن جائے
اور عورتیں سارا دن
ناکارہ برتنوں کو مانجھتی رہیں
جنگ اور آگ کے لئے خدا کا شکر ہے ——
کہ انسان جن فضول چیزوں کے حصول کی خاطر
مارا مارا پھرتا ہے،
وہ بھسم ہو جاتی ہیں!

(اینا وکہام)

جنگل میں راہگزر

ستر برس قبل
اُنھوں نے جنگل میں موجود راستے کو بند کر دیا تھا
ناخوشگوار موسم اور بارش نے وقتاً فوقتاً
اسے مزید خراب کیا
اور اب آپ کو یہ بالکل پتہ نہیں چل سکے گا
کہ شجرکاری سے پہلے
یہاں سے ایک راستہ گزرتا تھا
یہ راستہ اب جھاڑیوں اور سدابہار درختوں کے نیچے
دبا ہوا ہے

صرف محافظ کو علم ہے کہ
جہاں جنگلی کبوتر استغراق میں محو ہے
اور بجو آرام سے اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں
یہاں درختوں کے درمیان میں
کبھی ایک راستہ گزرتا تھا
اگر آپ گرمیوں کی کسی ملگجی شام کے وقت
اس جنگل میں سے گزریں

جس وقت کہ رات درختوں میں گھرے ہوئے تالابوں میں
اپنی خنکی گھول رہی ہوتی ہے
جہاں اود بلاؤ اپنی شریک حیات کو
سیٹی بجا کر بلاتا ہے
(وہ دونو جنگل میں آدمیوں کی موجودگی سے خوفزدہ نہیں
ہوتے کہ وہ انھیں یہاں کم کم ہی دیکھتے ہیں)
آپ یہاں گھوڑوں کی چاپ بھی سنیں گے
وہ نہایت استقلال سے
کہر آلود تنہائیوں میں
درختوں کے درمیان میں سے گزرتے ہیں
جیسے انھیں جنگل میں گمشدہ پرانے راستے کا
مکمل طور پر علم ہے......
مگر یہاں اب درختوں کے درمیان
بظاہر کوئی راہگزر موجود نہیں ہے
ہر سو سدابہار اشجار
اور نازک جھاڑیاں جھوم رہی ہیں!

(رڈیارڈ کپلنگ)

جمیل ملک

خدا — یا خدا —!

یہ جادو ہے کس سامری کا
کہ کچھ آدمی دیکھتے دیکھتے
شیر اور بھیڑیئے بن گئے ہیں
وہ حیواں ہیں لیکن
سروں پر رعونت کے وہ تاج پہنے ہوئے ہیں
کہ جنگل کے سب بے زباں، نرم دل جانور
ان کی ہیبت سے یوں کانپتے ہیں
کہ خود ان کے قدموں میں آ آ کے گرتے ہوئے
لقمۂ تر بنے جا رہے ہیں
— عجب خوف و دہشت کی تاریکیوں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی
یہ فضا ہے
کہ آج ان کی خاموش فریاد بھی
ان کے دل کی دعا کی طرح
سارے جنگل میں اک گونج بن کر اُبھرتی چلی آ رہی ہے
— نہ جانے ستم کی سیہ رات کب ختم ہوگی
خدا — یا خدا —!
بے زبانوں کو بھی آج اس اسمِ اعظم کا حرف آشنا کر
جو ہم سب کے سینوں سے باہر نکل کر
اسی سامری کی کھلی ساحری کو
بس اک پھونک سے راکھ کر دے
جو کڑوے سمندر کے اُس پار بیٹھا ہوا
انگلیوں کے اشاروں پہ ہم کو نچاتا ہے
لیکن ہمارے ہی خوں پر وہ خود پل رہا ہے
جو کچھ شیر اور بھیڑیئے ہر طرف چھوڑ کر

ہم کو جنگل میں رہنے کی اور اپنے ہونے کی
نارِ مسلسل میں یوں جھونکتا جا رہا ہے
کہ تیرے جہنم بھی اس کے مقابلے میں سب ہیچ ہیں
— یا خدا، بھیج پھر کوئی موسیٰ
ہمیں وہ عصا اور وہ دستِ بیضا عطا کر
کہ جو زر کے پانی سے دھوئے ہوتے زرد چہروں پہ چپکی
ہوئی سرد آنکھوں میں
سونے کا، چاندی کا پگھلا ہوا گرم زہراب بھر دے
جو اس عہد کے سامری کو
اسی کی ہوس کے اُبلتے چھلکتے سمندر میں غرقاب کر دے
— خدا — یا خدا —!
ہم کو کھوئی ہوئی اپنی شکلوں میں واپس بلا
ہم کو توفیق دے
پھر سے ہم سبز جنگل، ہری وادیوں اور کھلے گلستانوں سے
ہوتے ہوئے
اُس بڑے راستے پر چلیں
کتنی صدیوں سے جو نسلِ آدم کی پہچان کا راستہ ہے
جو اپنی زمینوں کی زرخیز قوسوں
خلا کے دھنک زاویوں سے گزرتا ہوا
نیلے گنبد کے روشن، چمکتے دمکتے ہوئے کہکشاں راستے
کی طرف جا رہا ہے!

جمیل ملک

کھلونے، ایٹم اور پھول

مَیں کیا تم سے نہ کہتا تھا
نہ کھیلو ان کھلونوں سے
کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں
مگر تم مانتے کب تھے!
جو لمحہ آنے والا تھا
اُسے تم جانتے کب تھے!
تمھیں تو عمرِ رفتہ سے بھی بڑھ کر
پیار تھا اپنے کھلونوں سے
تم ان سے کھیلتے تھے یوں کہ جیسے تم بھی بچے ہو
تمھیں بچوں میں ہنستا کھیلتا جب دیکھتا تھا میں
تو یوں لگتا تھا جیسے تم زمانے بھر کے داناؤں سے سچّے ہو
مگر اُس آنے والے ایک لمحے کو
تم اپنی ساری سچائی سے بھی
کب تک، کہاں تک روک سکتے تھے!
اُس اک لمحے کے اک ذرے میں ایٹم کا دھماکا تھا
دھماکا ہو گیا آخر
اُس ایٹم کے دہلنے پر
جو سب سے خوبصورت ایک بچہ، ایک نازک سا کھلونا تھا
اڑا وہ سب سے پہلے
اور اس کے بعد آنے والی سب نسلیں
اسی آتش فشاں لمحے، اسی ایٹم کی زد میں ہیں
یہ سب زندہ ہیں لیکن یوں کہ جیسے سب لحد میں ہیں
— تم ان بچوں کے خالق ہو، تم ان بچوں کے مالک ہو
کھلونوں کو تو آخر ٹوٹ جانا تھا
مگر یہ کیا خبر تھی، تم بھی ان کے ساتھ ہی ایسے گروگے
ٹوٹ جاؤ گے
— اٹھو، اب خواب سے جاگو
اٹھو، ٹوٹے ہوئے ریزوں کو جوڑو
پھر سے آئینہ بناؤ
اپنے گھر کو پھر کھلونوں سے سجاؤ
سب نئے بچے، نئے چہرے، نئی نسلیں تمھارے ساتھ ہیں
تم کو بلاتی ہیں
یہ کہتی ہیں
کہ آؤ ۔ یہ سچ کا سچا کھیل کھیلیں
اور اب کی بار ایٹم کے دہلنے پر
محبت کا وہ پیارا پھول رکھ دیں
جس کی خوشبو جاودانی ہے
جو ہم سب کی زبانِ بے زبانی ہے

علامہ طالب جوہری

قصیدہ

(حکیم سنائیؒ اور شاعرِ مشرق کی نذر)

تعقل کا سفینہ بحرِ طوفاں خیز میں تنہا
رواں ہوتا ہے بسم اللہ مجریہا و مرساہا

اٹھا لنگر تو پھر کیا فکرِ طوفاں ہو سفینے کو
قدم بڑھ جائیں رہرو کے تو کیا کہسار، کیا صحرا

سبک سارانِ ساحل اس سے گھبرائیں تو گھبرائیں
جو طوفاں خود سہارا دے تو گردابوں کی کیا پروا

ہوا شوخی کناں ہے آگہی کے بادبانوں سے
مسافر سے تمسخر کر رہا ہے ہونکتا دریا

تحیر کیوں ہو میرے اس سفر پہ اہلِ دانش کو
کہ ایسے مرحلوں سے بھی گزر جاتا ہوں بے پروا

جہاں موجوں کو دکھ ہو ساحلوں کی بے نیازی پر
جہاں قدموں کو شکوہ ہو کہ ناہموار ہے صحرا

بدلتے جا رہے ہیں پے بہ پے منظر علاقوں کے
بڑی حیرت سے ان کو تک رہا ہے دیدۂ بینا

حیاتِ انساں کی تشکیل پاتی ہے جن اجزا سے
زوالِ آدمی کی خشتِ اول ہیں وہی اجزا

تمدن کیا! پرانی نیو پر اس دور کی اینٹیں
ثقافت کیا؟ کفِ ماضی پہ عہدِ حال کا سانچا

نسب کیا، اک تعلّی بے نسب لوگوں کی فطرت کی
ادب کیا، ایک ورثہ بے ادب لوگوں کے جذبوں کا

خطابت کیا، نئے لفظوں میں دہرائی ہوئی باتیں
کتابت کیا، نئے ساغر میں اگلے وقت کی صہبا

قیادت کا تقاضا کیا، دلِ فرعون کی دھڑکن
امارت کی تمنا کیا، سرِ ابلیس کا سودا

جوانی کیا، رگِ امروز سے کھینچی ہوئی طاقت
بڑھاپا کیا، دلِ امروز کا اندیشۂ فردا

محبت کیا، دلوں کی بے ارادہ گرم بازاری
عداوت کیا، دلوں کی گرم بازاری پہ استہزا

یہ انساں کیا ہے اک سوچی ہوئی شے ذہنِ انساں کی
یہ دنیا کیا ہے، دشتِ واہمہ میں سایۂ عنقا

اگر دامن میں لے لیتی نہ جذب و دفع کی طاقت
یہ ذرہ دشت کی پہنائیوں میں کھو کے رہ جاتا

ہر اک انساں فن کی موج پہ بہتا ہوا تنکا
کوئی جمشید و کیخسرو کوئی اسکندر و دارا

یہ دنیا بے حقیقت، بے بضاعت، بے ثمر دنیا — جہاں تشنہ لبی کو آب مہنگا ہے، لہو سستا
جہاں نوبت زناں ہیں بوم، اپنی کامیابی پر — جہاں عزلت نشیں ہے کنجِ غم میں بلبلِ شیدا
جہاں ہر دور میں دیکھی گئی جنسِ وفا ارزاں — جہاں ہر عہد میں پایا گیا نرخِ حسد بالا
جہاں ذلت کا پیرایہ شکوہِ فکرِ فارابی — جہاں اک جنسِ بے مایہ، دلیلِ بوعلی سینا
نگاہِ فلسفہ اس راز تک پہنچے تو کیا پہنچے — یہ عالم نقشِ کن ہے یا جدل ہے مادیت کا
مسلط کیوں ہیں ذہنوں پہ وجودیت کے اندھیارے — حقیقت ہیں کہ ہیں اوہام یہ دنیا و مافیہا
تصادم کیوں ہے یہ نفی و ثبوت لا و الا میں — سرِ انسانیت میں کیوں ہے یہ تشکیک کا سودا
جہاں ہونا نہ ہونا ایک ہو میزانِ خلقت میں — تو پھر کیسے وجودِ خارجی پاتی ہیں کل اشیاء
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگار کے پیچھے — کہ یہ ہنگامۂ تخلیق بے علت نہیں برپا
یکایک ذہن کی خوابیدہ وادی میں صدا گونجی — کہ کوئی نور ہے اس بزمِ کن کی علتِ کبریٰ
یہ سنتے ہی تعقل نے پکارا، اے شہ اسریٰ — نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور ہوا جب کچھ تو وہ تو تھا

○

زمیں جب بانجھ ہو اور حبس طاری ہو فضاؤں پر — کریں جب لوگ سیم و زر سے عقل و فہم کا سودا
زمیں کے بطنِ خیر آثار سے پھوٹے نہ جب کونپل — شجر کی شاخِ سایہ دار سے ٹوٹے نہ جب پتا
رکے جب چند لقموں کے عوض گفتارِ واعظ کی — بکے جب چند سکوں کے عوض دربار میں فتویٰ
زمیں جب آدمی کے ہاضمے پر قحط برسائے — فلک جب ڈال دے نطقِ بشر پر خوف کا تالا
چلیں اور حالِ دل اپنا شہ لولاک سے کہہ دیں — وہی ہے آخری حل دہر کے سارے مسائل کا
وہ درس آموزِ حق، مشکل کشائے عالمِ امکاں — سفیرِ امرِ رب، سایہ نشینِ گنبدِ خضرا
وہ آغازِ عدد، روحِ ابد، امرِ صمد جس نے — خود اپنی ذات سے توڑا عدم کا گھور سناٹا
وہ دارائے خبر، خیر البشر، صاحب نظر جس نے — بشر کی خود نگر فطرت کو بخشا دیدۂ بینا
وہ مولائے زمیں، میرِ یقیں، نورِ مبیں جس نے — دیا انسانیت کو دشتِ لا میں سایۂ الا

(جاری)

حسن اختر جلیل

کہانی ایک قوم کی

دلِ رمز آشنا!
شاید ہمیں وہ راہ گم کردہ قبیلہ ہیں
جو سینائے ہوس میں دشت گرداں تھا
جسے چالیس سالوں تک
ہوائے منّ و سلویٰ نے
سراغِ قریۂ موعود سے
نا آشنا رکھّا!

ہمیں وہ راہ گم کردہ قبیلہ ہیں
کہ جس نے راہ بر کی پیٹھ پھرتے ہی
طلسمِ سامری کو مان کر
گوسالۂ زر کی پرستش کی
یہ بچھڑا اب مقدس ہے
کہ اس میں آسمانی روح کے قدموں کی مٹّی
ہم نے ڈالی ہے

دلوں کے نرم گوشوں میں
اسی بچھڑے کی مورت ہے
طلسمِ سامری کو آفریں کہیے
کہ جس نے سوچ کے دھارے بدل ڈالے

بیابانِ ہوس کی گرم شاموں میں
کبھی جب دور سے گرد و غبار اُٹھّے
تو لرزیدہ دلوں کی تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ
بچھڑے کے پجاری چیخ اُٹھتے ہیں:
"ذرا ہشیار رہنا!
کوئی موسیٰ پھر کہیں میقات سے
واپس نہ آجائے"

حسن اختر جلیل

مراجعت

چلو اک بار پھر
اپنی انھی قبروں کی جانب
لوٹ جائیں ہم
جہاں اِس حشرِ بے داور سے پہلے
نیند کی صدیاں گزاری تھیں
چلو پھر اپنے کفنوں میں لپٹ جائیں
لحد کی خاک چہروں پر بکھیریں
اور سو جائیں

سوا نیزے پہ سُورج ہے
مگر اب تک ہماری تشنہ کامی نے
میانِ عرصۂ محشر
کہیں بھی چشمۂ کوثر نہیں دیکھا
کسی ظالم، کسی جابر کے بائیں ہات میں
اعمال کا دفتر نہیں دیکھا
کہیں میزان کی تنصیب کا منظر نہیں دیکھا
سوا نیزے پہ سُورج ہے
مگر وہ عدل کا دن، دادخواہی کی گھڑی
اب تک نہیں آئی

چلو اک بار پھر
اپنی انھی قبروں کی جانب لوٹ جائیں ہم
کہ وہ اک کاروبارِ خسروی تھا، اور ہم اس کو
کسی کے عہدِ یوم الدّین کی تکمیل سمجھے تھے
وہ اِک دجّال کی آواز تھی — جس کو
ہم اپنی سادگی سے، صورِ اسرافیل سمجھے تھے

ادیب سہیل

دائرے

زندگی اک دائرہ ہے
دائرے میں رقص کرنے کا عمل ہے
دائرے میں زندگی کو رقص کرنا ہی اگر ٹھہرا
تو اندر کیوں گریں
دائرہ در دائرہ اندر سفر سمٹاؤ ہے
اس سمٹنے کے سفر میں ہے مسلسل انقباض
لحظہ لحظہ تنگ تر ہوتے ہوئے رستے کا حبس
کیوں سفر کی یہ اذیت ہم سہیں ؟
تنگ تر ہوتی مسافت کو کریں کیوں منتخب
نقطۂ موہوم پر جو ختم ہے
دائرے میں رقص کرنے کے عمل کا تجربہ
کیوں نہ ہم باہر کریں
جس کا لمحہ لمحہ وسعت گیر ہے
نو بہ نو منظر نئے عالم کا وا کرتا ہے در
ہے فضا جس کی طلسم اندر طلسم
اور اک ہے جو سراسر
تجربے کے باب میں ہے یہ سفر
نا مختتم اک سلسلہ !

محمود رحیم

انتفاضہ [1]

(فلسطین کے نہتے حریت پسندوں کے لیے)

در حصارِ عدو پا پیادہ چلے
آج یارانِ عزم و ارادہ چلے —— مرحبا! مرحبا!
باپ جو انگلیوں سے ہواؤں میں بھی آیتِ فتح لکھتے رہے —— مرحبا!
دخترانِ جواں
چوڑیوں کی جگہ جن کے ہاتھوں میں پتھر رہے —— مرحبا!
بچّہ ہائے مدارس
جو قاتل کے آگے بھی آزادیاں رقص کرتے ہوئے اُس کی بندوق کی زد میں آئے
نشانِ ستمگر بنے —— مرحبا!
جیبِ فلسطین میں
دستِ سفاک نے حرمتوں کے لیے بے لباسی لکھی
قصرِ سلطاں نے بھی حرفِ نامعتبر کے حوالے بُننے ناسپاسی لکھی
بے ردا ہی پھر انبوہِ جمہور کا خانوادہ چلے
مرحبا! مرحبا!
شورشِ کوچہ و در زیادہ چلے
انتفاضہ چلے

(راس تنورہ ۔ سعودی عرب)

[1] UPRISING

محمود علی محمود

ایک لمحے کی بادشاہی

یرا باپ بڑا مفلس تھا
پیاسی، پپڑی زدہ ہنڈیا کو چائے کا شربت تیسرے۔ چوتھے دن ملتا تھا
اور — اس ہوت نہ ہوت نے۔ میرے باپ کو طیش کی ایسی "شام جڑی" لاٹھی بخشی تھی
دمڑی جتنی بات پہ بھی، مجھ کو، مری ماں کو، دُھن کر رکھ دیتا تھا
آنگن کی مہمان ہوا کو بھی سُن کر دیتا تھا
— ایک بسنتی شام کو، جبکہ رنگ برنگے کاغذی پیراہن میں — اک پریوں کا جھرمٹ
میرے سر سے چند گز اوپر، سرّاٹے فرّاٹے بھرتا گزر رہا تھا
میرا پیر اک کیڑے جتنی، جر ثومے جتنی نالی نے۔ موڑ دیا — اور
دودھ کی گڑوی لڑھکتی، اک ٹھیلی والے کی ٹانگ سے ٹکرا کر گھومی تو
تیز قدم اور سرخ آنکھوں نے دودھ بکھرتے دیکھ لیا تھا
ں دہشت سے آنکھیں پھاڑے، دونوں ہتھیلیاں آگے کیے اور لہجے کی لنگڑاہٹ سے بے پروا
بول رہا تھا — ڈول رہا تھا

ب..... با.... بابا! میرا قصور نہیں ہے
یہ..... یہ نالی.... اس نالی نے"
ین — ان آنکھوں میں تو — شبنم پہنے ہوئے دو کنول جلے تھے
کھردرے، دہشتناک ہاتھ، کیچڑ میں لت پت پاؤں کو سونت رہے تھے
مرا سر سہلاتے ہوئے سینے سے بھینچ کے بولا:۔
ہاں بیٹے! یہ "نالیاں۔ سالیاں۔ ایسی ہی ہوتی ہیں"
— اس لمحے۔ دھرتی اپنی۔ ساری گولائی سمیت، مری مٹھی میں
جگنو تھی — چہکار تھی — گل کی سرگوشی تھی —
اس شب بھی۔ میں کم ہی ہنسا تھا
لیکن — جی بھر کر رویا تھا.......

عرفانہ عزیز

سخنوری کا عذاب [1]

جہانِ سود و زیاں کے مالک!
مجھے شگوفوں کی اک دکاں مستعار دے دے
مری فلاکت زدہ ذہانت کو سہل سا کاروبار دے دے
میں جورِ خامہ سے تھک چکی ہوں
مجھے عطا ہوں بہار آسا وہ شگفتہ نیم باز غنچے
کہ جن کی خوشبو سے روز مہکیں
مرے وطن کے دمکتے کوچے
وہ زینیا کی گداز رنگت
کہ موتیے کی ہو نرم خوشبو
وہ چشمِ نرگس کا پیرہن ہو
کہ برگِ نیلوفری کا جادو
گلاب یوں میرے شیشہ کیسوں میں آج بھر دے
کہ ننھے بچے دکاں کے آگے سے جب بھی گزریں
تو اُن کے ہونٹوں کی روشنی سے
مہکتا عنبر مرے شگوفوں کی تازگی کا
بہارِ تازہ سے آشنا ہو
مہکتے گیسو سنوار کر ان فسوں گروں کے
جمالِ دوراں کی اس طرح چشمِ نیم وا ہو
کہ تیرے ہونٹوں سے کوئی حرفِ ثنا ادا ہو

جہانِ سود و زیاں کے مالک!
کبھی تو بابِ کرم کھُلے میرے روز و شب پر
گلاب ہاتھوں میں پتھروں کی بجائے میں کوئی رنگ بھر دوں
سنوار دوں چاند جیسے چہرے
مجھے اُجالوں کا گنگناتا ہُوا کوئی آبشار دے دے
مری فلاکت زدہ ذہانت کو سہل سا کاروبار دے دے

مرے دلِ زار پر خدایا
سخنوری ہے عذاب ایسا
جو فہم و ادراک کے لبوں سے
ہر ایک لحظہ ہے نقدِ فکرِ رسا کا طالب
مگر مرا ذہن آج مفلس
تو میرا کشکولِ فن تہی ہے
میں جورِ خامہ سے تھک چکی ہوں
مری فقط التجا یہی ہے
قلم کے بدلے مجھے خیابانِ دار دے دے
مجھے شگوفوں کی اِک دکاں مستعار دے دے

(کینیڈا)

[1] ایذرا پونڈ کی نظم 'دی بیک آئل' کے حوالے سے لکھی گئی۔

سجاد بابر

ٹپّہ°

(۱)

ترے نثار

خبر یہ وادیوں کو دی ہے زلزلوں نے

کہ کوہسار کوئی آہ بھر رہا ہے

(۲)

ترے نثار

تمھاری آنکھ سے جو سوئیاں چُنی تھیں

وہ چند وحشتوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں

(۳)

ترے نثار

خزاں کا دیو جل چکا ہے پچھلی رُت میں

بہار اب بھی مضمحل ہے، یہ ستم ہے

(۴)

ترے نثار

ذرا یہ چھت کی کاغذی سِلیں جمیں تو

نکل کے صحن میں کچھ اپنا آپ دیکھیں

(۵)

ترے نثار

یہ میری سوچ، میرے لفظ، میرے آنسو

بہت سی منزلوں کی گرد کے امیں ہیں

(جدّہ)

° ٹپّہ : پشتو کی ایک صنفِ سخن

حلیم قریشی

گُمنام سے دن

بڑے گُمنام سے دن ہیں

نہ سُورج کے نکلنے سے

کوئی جادُو بکھرتا ہے

نہ اس روشن ستارے کے

اُترنے پر کوئی تصویر بنتی ہے

پہاڑوں کی فلک آسا چٹانوں سے

زمیں کی نرم مٹی تک

کسی بر تاب موسم کی حکومت ہے

پرندے پر سمیٹے بے اماں شاخوں پہ بیٹھے ہیں

میں اپنے گھر کے آنگن میں

بہت مصروف اور بیزار بیٹھا ہوں

بڑے ناکام سے دن ہیں

نہ سورج کے نکلنے سے کوئی جادو بکھرتا ہے

نہ اس روشن ستارے کے اُترنے پر کوئی تصویر بنتی ہے

عبداللہ جاوید

چار مختصر نظمیں

وڈیرا موٹا ہو

ہاڑی فصل اُگائے
وڈیرا موٹا ہو
مولا مینہ برسائے
وڈیرا موٹا ہو

واجا تیری

میرا تن اور میری جان
واجا تیری
میرے پسینے کی پہچان
واجا تیری

خان بڑے

باغ اُگاؤں میں
میوے تیرے
جان کھپاؤں میں
پیسے تیرے

سیلاب

(۱)

جو کچھ بھی تھا، اپنے باہر
ڈوب گیا ۔!
یہ مت پوچھو
کیا کیا، اندر ڈوب گیا !!

(۲)

میرے گھر تک
تیرے گھر تک
پانی

دُکھ تو یہ ہے
اس کے گھر تک
پانی

زمان ملک

کیسے وصل لکھوں

قلم کی نوک سے ٹپکے جدائی نور
مجھ کو وصل لکھنا ہے
مری راتیں، مری باتیں
جدائی نور سے عاری
قلم مجھ سے خفا، میں نور کی باتیں نہیں کرتا
طلسمِ خاک سے آگے نہیں تکتا
ہمارے چشم و لب کی گفتگو
بس اک مسلسل درمیاں رہتی ہوا کی لوح پر مرقوم ہوتی ہے
کنارِ جاں کی حدت، حیرتوں کے منتشر اوقات کی تقدیر بنتی ہے
جدائی نور سے عاری
میں اور اک ہاتھ پر اک ہاتھ کا عہدِ درخشاں ہوں
قلم کی نوک سے ٹپکے جدائی نور
کیسے وصل لکھوں میں!

خالی دن

شب و روز ہائے طلسم اب
مری انگلیوں سے پھسل گئے
مرے خواب سب تری چشمِ دل سے نکل گئے
میں کھڑا ہوں راہ میں منتظر
کسے کیا خبر
کہ وہ کون قافلہ ہے کہاں
مری سمت جو چلا آرہا ہے کشاں کشاں
مجھے لے کے ساتھ ہو پھر رواں
کسی شہرِ نو، کسی دشتِ دور کے درمیاں
کوئی خوابِ خوش مری چشمِ وا کو عطا کرے
کوئی داستاں بنے جسم و جاں
میں کھڑا ہوں راہ میں منتظر
کسے کیا خبر!

احمد لطیف

دُعا کیسی

دعا کیسی
کہ اب تو خون کی حدّت پرکھنے کی گھڑی ہے
بازوؤں سے شعلہ شعلہ اٹھتی بات
اور ہولائے تند خو
اور نیم روشن رخ، جلالی مٹھیاں، ابھری رگیں
اور ارتکاز
ارتکازِ جسم و جاں
منزلوں کو وصول کرنا ہے
ہماری پھڑ پھڑاہٹ!
تتلیوں سا رقص، رنگوں سی مہکتی گفتگو
اور جسم و جاں میں پھول کھلتے ہیں
کہ بچھڑے لوگ ملتے ہیں
دعا کیسی، کہ اب تو خون کی حدت پرکھنے کی گھڑی ہے
اب دعا کیسی!

جلیل عالی

عدم آباد سے ایک پیغام

تم اِس کو
موت کہتے ہو
یہ کیسا
خوف طاری ہے
نکل کر
باغِ دنیا سے بھی
اپنی
سیر جاری ہے

تسلسل

مرے بیٹے
تجھے جب چومتا ہوں میں
تو اپنے گال پر
مرحوم بابا کے
لبوں کا لمس بھی
محسوس کرتا ہوں

احمد لطیف

سُرخ گلاب اور وحشی پاؤں

(اپنے چھوٹے بھائی شبیر احسن[1] کی یاد میں)

چورستے کی دھول
گہرا سُرخ گلاب
سُرخ گلاب!!
کس کے ہاتھ لہو لکھوں میں
کس کے ہاتھ نکھوں
"آنکھیں کالی کنکریاں"[2] اور خون میں سوسو گرہیں
عدل بھی اب اپنی پیشی بھگتائے گا
بازاروں کا روپ سروپ نکھرتا ہے
سرخ گلاب اور وحشی پاؤں
گہرے سرخ گلاب کی خوشبو چلتی پلکیں
وحشی پاؤں
گندی قامت کے سنگ لرزاں
گہری کالی رات وراثت
خوشبو ایسے جیون مٹی
پرکھوں کی ڈھیری دہلیز ہے غیروں کی

کڑیل لاشے،
زینہ زینہ رکھنے خاک ہوئی
عمروں کی پونجی
بیتی، بیتی سرخ گلاب
ہاتھ قلم ہونے کا موسم!!
آنکھیں کالی کنکریاں
کنکریاں ——!!

---

[1] شبیر احسن جسے ۲۰ سال کی عمر میں ۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو کسی نے قتل کر دیا۔ لاش دریائے جہلم سے ملی۔ ۱۰ جنوری کو سول لائن پولیس اسٹیشن جہلم نے نعش لاوارث قرار دے دی اور اسی دن بلدیہ جہلم نے اسے دفن کر دیا۔ ہم نے ۱۷ جنوری کو "شبیری" کے لباس اور تصویر سے اسے شناخت کیا۔

[2] استفادہ۔ اقبال کوثر۔

امجد اسلام امجد

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

ہر طرف دھند ہے
دھند ہی دھند ہے
ایسے لگتا ہے جیسے زمیں آسماں
دھند کے اس اجل خیز سیلاب میں
خار و خس کی طرح
بہتے بہتے کہیں دُور کھو جائیں گے
وہ مناظر جو گنتی میں آتے نہ تھے
ایک ہو جائیں گے

بے یقینی کے رنگوں میں اُلجھی ہوئی
چاندنی درد کی، جگمگاتی نہیں
دھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں
وہ نظر جو ستاروں کی ہمراہ تھی
دس قدم دُور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں
آنکھ کہتی ہے "باہر بہت دھند ہے"
دل یہ کہتا ہے "اندر بھی کم تو نہیں"

اے شعلۂ جاں! دیکھ

کھِلتے تھے جہاں چاند، وہاں گرد جمی ہے
تاروں سے تہی رات کی آنکھوں میں نمی ہے
کم کم ہیں دیئے اور بہت تیز ہوا ہے
ہیں اہلِ ہوس رونقِ ایوانِ تمنّا
کانٹوں کا ہوا رزق خیابانِ تمنّا
غنچے ہیں پریشان، گلوگیر صبا ہے
خُوشبو کی زباں گُنگ ہے، رنگوں کی نوا گُم
منزل تو بڑی بات ہے، رستہ بھی ہوا گُم
آشوب ہے ایسا کہ نہ دیکھا نہ سُنا ہے

ہے دُور بہت دُور کہیں صُبح کا تارا
معدوم سہی، دشتِ شبِ غم کا کنارا
لیکن یہی آشوب تو میزانِ وفا ہے
اے دل! یہ کڑا وقت ہی عرفانِ وفا ہے

اے شمعِ نظر، ضَو پہ تری حرف نہ آئے
اے شعلۂ جاں، دیکھ، تری لَو نہ لرز جائے

مقبول عامر

اپنے ہمزاد سے

میں حیرت کدے میں کھڑا سوچتا ہوں
مجھے کیا طلب ہے!
میں کیا چاہتا ہوں!
کبھی دشت میں جا کے
تپتی ہوئی ریت پر دوڑنا چاہتا ہوں
کبھی موج بن کر
کناروں سے سر پھوڑنا چاہتا ہوں
کبھی شبنمی گھاس پر لیٹ کر
چاندنی اوڑھنا چاہتا ہوں
مجھے کیا طلب ہے!
میں کیا چاہتا ہوں!
کہیں یہ مری مضطرب رُوح کا
بانکپن تو نہیں ہے؟
کہیں دل نئی منزلوں کی طرف
گامزن تو نہیں ہے؟

ملازمت

مجھے اِس بات کا دُکھ ہے
کہ میرا وقت
میرا ذہن
اور میری توانائی
حصولِ رزق کی خاطر
بہت ہی چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر
صَرف ہوتے ہیں

ایوب خاور

یہاں اک نظم رکھی تھی

ابھی کچھ دیر پہلے
صبحِ تازہ کی نسوں میں موبل آئل کا دھواں گھلنے سے
کچھ پہلے یہاں اک نظم رکھی تھی

بہت سے بے سر و پا خوابچوں
بیکار نیندوں، رتجگوں اور وسوسوں اور کارِ دنیا سے
بھرے تکیے کے نیچے نظم رکھی تھی
گلِ رخسارِ جاناں پر مہکتے شبنمی قطروں کی صورت
حرف تھے اُس کے

جمالِ خود نگر کے دودھیا رنگوں میں
اک اک کر کے اس کے لفظ گوندھے تھے
خرامِ دوست کے مانند اس کی ساری سطروں میں روانی تھی
لبِ نم آشنا کی طرح تیکھا اور رسیلا اس کا لہجہ
اور ہر مصرع نزاکت میں مثالِ گردنِ مینا
نگاہِ ساقیٔ رنگیں بدن جیسے اشارے زاویے
دلداریوں کی اوٹ میں بے مہریوں کی سوختہ سامانیاں
جو کچھ دلِ عشاق کو کھڑکی سے ملتا ہے سبھی کچھ اس میں تھا
اک آتشِ کم رو تھی جس کی آنچ پہ
میں نے بہت دن بعد پھر دھڑکنیں پکنے کو رکھی تھیں
عجب جادوگری ہے کارِ دنیا بھی
کوئی لمحہ فراغت کا نہیں ملتا
گزرتے وقت کے پہیے سے
اپنے پاؤں کا چکر ملانے کی عبث خواہش میں جتنی دھول
آنکھوں میں در آتی ہے، بھلا دیتی ہے کس کاغذ پہ کتنی
نظم لکھی تھی، کہاں کس خواب کے ٹکڑے پڑے ہیں،

کون سے کونے میں کس خواہش پہ مکڑی جال بنتی جا
رہی ہے، کون سی دیوار پہ کس آئینے میں بے ضرورت
عکس رکھا ہے

عجب جادوگری ہے کارِ دنیا بھی
کوئی لمحہ فراغت کا نہیں ملتا
بہت دن بعد چھٹی کا یہ دن بھی بس اسی الجھن میں گزرے گا
کہ میں جو نظم کمرے میں پڑے کاغذ کے ٹکڑوں
اور سینے کے خلا میں ڈھونڈتا ہوں
کیا خبر وہ نظم کس لمحے کے دامن کی گرہ میں
باندھ کر اپنی لہو لہروں کی کن گہرائیوں میں
پھینک بیٹھا ہوں
ابھی سر پہ اُمڈتی جھنجھناتی شام آ جائے گی
ماہِ نو کے ماتھے سے سرک کر رات کا آنچل
مری آنکھوں کے اوپر پھیل جائیگا، اسی حالت میں
بیٹھے بیٹھے اگلی صبحِ تازہ کی نسوں میں موبل آئل
کا دھواں گھلنے لگے گا، سارا منظر ہی بدل جائے گا
اور میں اپنی اس اک نظم کو پھر بے سر و پا خوابچوں میں،
رتجگوں میں، وسوسوں اور کارِ دنیا سے بھرے
تکیے کے نیچے دستِ بے مایہ سے دیکھوں گا
در و دیوارِ جاں سے لگ کے بیٹھی زرد تنہائی سے
پوچھوں گا

کہیں تم نے نہ دیکھی ہو
یہاں اک نظم رکھی تھی

ایوب خاور

آخر کس دن!

آخر کس دن
اُس کھڑکی میں
صبحِ بہار کی آنکھ کھُلے گی
کس دن کنجِ خواب سے باہر آکر
درد کا پھُول کھلے گا
اُن آنکھوں کی اوٹ میں چھپ کر
رنگ لباس اُتاریں گے
اور کس دن خوشبو اُن ہونٹوں کے
نرم کنارے چھُو کر اپنے جیسی
مثال بنا پائے گی
اُس آنچل کی چھاؤں میں سمٹی
صبحِ بہار چرا لائے گی!
آخر کس دن؟

انتظارِ شکستہ

اِسی اک آئینے کا عکس ہے
میری محبّت بھی
تمھارے چاہنے والوں کی حیرت بھی
یہ حیرت آئینے کے ٹوٹنے تک ہے
ہمارے ہاتھ سے سانسوں کی ڈوری چھوٹنے تک ہے

ناہید قاسمی

۲۳؍ مارچ ۱۹۹۰ء کے حوالے سے

کون اپنا کون پرایا

اے وطن، تیرا یہ چلن تھا، کہ تو
اشک اپنوں کے پونچھ لیتا رہا
غیر کو بھی پناہ دیتا رہا
تجھ پہ آخر یہ کیا ستم ٹوٹا
دل دھڑکنا ہی جیسے بھول گیا
آنکھ کا نم، نمو سے خالی ہوا
تجھ کو اپنا بھی اپنا ہی نہ لگا
اپنے بیٹوں کی نعشیں دیکھ کے بھی
تو نہ تڑپا، نہ چیخ کر رویا
تیرے تاریخی کیمروں نے مگر
سارے منظر کو عکس بند کیا
تو نے اپنی کروڑوں آنکھوں کو
یوں بجھایا کہ راکھ اڑنے لگی
اپنے پیکر پہ ہی بکھیر دیا
بولتے اور چمکتے خون کو بھی
تو نے غیروں کی خواہشوں کے لئے
اپنا سب کچھ ہی رہن رکھ چھوڑا
یاد رکھ اے وطن، کہ راکھ میں بھی
ایک چنگاری تو دبی ہو گی
اور ہوا جب بہت ہی تیز چلی
تیرے دامن تلک بھی پہنچے گی
اپنی آنکھوں کے نم کو واپس لا
دل کو سینے میں اس طرح تڑپا
کہ دھڑک اٹھے شب کا سناٹا!

اہلِ فن سے

کہاں ہو میرے وطن کے عظیم فنکارو—!
جو مصلحت کی فصیلوں میں چھپ کے بیٹھے ہو
فقط سکوت کو دانائی تو نہیں کہتے
صداقتوں کو اچھالو، بدی کو رد کر دو
اگر تم اپنے خیالات کو چھپاؤ گے
تو یاد رکھو، حقیقت کے چور ٹھہرو گے
اور آنے والے دنوں میں، تمہارے دیس کے لوگ
تمہارا نام بھی لینے سے ہچکچائیں گے
اٹھو، مفاد کے سب خول توڑ کر نکلو
تعصبات کے پردے اتار کر پھینکو
سنہری دھوپ میں آؤ، تپش سہو سچ کی
بھٹکتی بکھری حقیقت کو پارہ پارہ چنو
تم اپنے فن کی صداقت کی بازیافت کرو
کہ اہلِ فن کی یہی — بس یہی دیانت ہے!

شاہین مفتی

(۱)

ہم

ہم تو بس پھول ہیں تاسف کے
رنج کی نوجوان شاخوں پر
خود بخود کِھل کے ٹوٹ جائیں گے

(۲)

تم

تم سے کیا عہد استوار کریں
تم ہوا کا مزاج رکھتے ہو
اور ہوا
کس کے ہاتھ آئی ہے ؟

(۳)

سسّی

ریت پہ پاؤں رکھتی ہوں
تو دل جلتا ہے
صحرا ہنس کر کہتا ہے
جتنی دُور بھی جائے گی
میں اور سُورج
دونوں تیرے ساتھ چلیں گے

(۴)

مشورہ

اپنی آنکھوں کو با خبر کر دو
تھوڑے سے آنسو سنبھال کر رکھیں
خشک موسم میں کام آئیں گے

(۵)

میرِ کارواں

اندھیرا ہے تو کیا ہے
میں تمھارے ساتھ جاؤں گی
تمھیں رستہ دکھاؤں گی
مری مُٹھی میں جگنو ہے

(۶)

یدِ بیضا

بے یقین موسم کی
بد گمان راتوں میں
اس قدر اندھیرا ہے
کچھ نظر نہیں آتا
روشنی سی کچھ میرے
ساتھ ساتھ رہنے دے
میری بند آنکھوں پر
اپنے ہاتھ رہنے دے

ثمینہ راجہ

ان بھیدوں میں

ہم نے رنگ بکھرتے دیکھے دھوپوں میں
اور سائے کی چادر اوڑھے بیٹھ رہے
ذات کے بھید کو پانے کی خاطر ہی کوئی
ایسے ناممکن کی دُوری تھامتا ہے
جیسے ناممکن کو مٹھی میں بھر کر
اُس میرے برتر خالق نے
یہ دونوں جہان تخلیق کیے

ہم نے رنگ بکھرتے دیکھے دھوپوں میں
اور سب رنگوں سے آنکھیں پھیرے بیٹھ رہے
اک اندھے کنوئیں کی تہہ میں جھانکتے جھانکتے اپنی عمر کٹی
اور لاحاصل کی ریت سے جھولی بھر آئے

ہم نے رنگ بکھرتے دیکھے دھوپوں میں
اور اپنے ہونٹوں کو بھینچے بیٹھ رہے
کیسے اندھوں، بہروں، گونگوں کی بستی ہیں
کوئی دھوپ کے رنگوں کی تفسیر بتائے
کون بتائے کیا پایا ہے
ہم نے ان ذاتوں بے ذاتوں کے بھیدوں میں

آنکھیں ڈوب گئی ہیں

آنکھیں ڈوب گئی ہیں گہرے پانی میں
کیا اندیشہ ہے
جو سب کچھ، پاتال میں کھینچے جاتا ہے
تعزیر ہمارے قد سے اونچی ہو جائے
تو کیا شکوہ
جب بینائی کھو دینے کے مجرم ٹھہرے
اب چپ کی پہلی انگلی ہونٹوں پہ رکھیں
ہر موسم کی آواز سنیں
اور پہچانیں
ہر طائر کی پرواز سُنیں
اور پہچانیں
سب چہرے پہلے چہرے ہیں
سب چہرے آخری چہرے ہیں
جب راہِ طلب میں پتھر بن کر گڑ جانا
پھر آتے جاتے لمحوں سے چشمک کیسی
اور کیا اندیشہ
سو عالم دیکھے دل کی حیرانی میں

ثمینہ راجہ

پھر اُسی معبد

پھر اسی معبد کی ویراں سیڑھیوں پر
زندگی، بازو بریدہ
سر برہنہ، آبلہ پا آ گئی ہے، جس جگہ سے
آرزو کے سبزہ زاروں کی طرف
رختِ سفر باندھا
لہو کی تال پر نغمہ سرائی کی

محبت کیا ہے
جس کی آرزو میں لوگ مر جاتے ہیں
شاید ایک رستہ ہے
کہ جس پر چلتے جانا، چلتے جانا
اہم ہے اور سوچنا
منزل کے بارے میں عبث ہے
ایک باغیچہ ہے
جس کے پھول کانٹوں سے بھرے ہیں
اور کسی نے آج تک چکھے نہیں
اس کے ثمر
یا ایک بازیچہ ہے
اور بازیچۂ طفلاں نہیں ہے
لوگ مر جاتے ہیں یہ معلوم ہے، پھر بھی
اُسی معبد کی ویراں سیڑھیوں پر، دل شکستہ
زندگی ہے
اور دل میں آرزو ہے
پھر محبت کی

علی اکبر عباس

پھول

بلبلے بناتی ہیں
سطحِ آب پر بوندیں
جو پلک جھپکتے ہی
ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں

راستوں کی حیرانی
ساتھ ساتھ چلتی ہے
بچپنے کی یادوں کے
چھوٹے چھوٹے پاؤں ہیں
اور گیلی مٹی پر
کچھ نشان بنتے ہیں
پھول بن کے کھلتے ہیں
سوندھی سوندھی خوشبو سے
روح میں اُترتے ہیں

ہم نے اپنی کشتی بھی
نامۂ محبّت سے
تہ بہ تہ بنائی ہے
ساتھ ساتھ پانی کے
اِک لکیر چلتی ہے
نامۂ محبّت کی
روشنائی کچّی ہے
سطحِ آب پر بنتے
بلبلوں کی پیرا کی
پھول بن کے کھلتی ہے
جو پلک جھپکتے ہی
ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں

منصورہ احمد

آشوب

خدایا! میری بستی کے مکینوں کو بشارت دے
یہاں تو رات دن سورج سوا نیزے پہ جلتا ہے

سنا ہے، میری بستی پر کبھی شاہیں اُترتی تھیں
چہکتی بولیوں سے جاگتی صبحیں نکھرتی تھیں
کبھی بوندیں برستی تھیں
تو کلیاں مسکرا کر پھول بنتی تھیں
ہوائیں سوندھی یادوں سے مہکتی تھیں
تو جھولا جھولتی سب لڑکیاں
بے بات پر بھی کھلکھلاتی تھیں

مگر اب رات دن سورج سوا نیزے پہ جلتا ہے

مری بستی کے سب جلتے ہوئے خیموں کے اندر دلہنیں ہیں
جن کے ہاتھوں سے ابھی مہندی نہیں چھوٹی
انھیں تو تتلیوں کے ساتھ شہرِ خواب جانا تھا
کہ اُن کی سیج کی خوشبو کسی نے قتل کر ڈالی!

خدایا! اتنی حدّت ہے کہ بچوں کے کھلونے
ادھ جلے ہیں، آدھے ٹیڑھے ہیں
اور اُن کے زرد چہروں پر جو آنسو سوکھتے ہیں
وہ فقط شہرِ ہزیمت تک کا ہی رستہ بناتے ہیں

تپش وہ ہے کہ ماؤں کی دعائیں اور رستہ دیکھتی آنکھیں
چٹختے خشک ہونٹوں کی دراڑوں میں
اٹک کر رہ گئی ہیں
گھروں میں صرف دہلیزیں بچی ہیں

ہمیں ڈالر کی دہشت نے اپاہج کر دیا ہے
ہمارے سر بریدہ جسم بازاروں میں پھرتے ہیں
ہمارے خواب کے ٹکڑے تو کب سے
شہر کی اُونچی دکانوں کے چمکتے سرد خانوں میں
حنوط جا چکے ہیں!
یہ کس نے، کس لیے، کس کو ہمارے خواب بیچے
اور بدلے میں غلامی لی؟
یہ کس نے لفظ سے گویائی چھینی
اور اُسے محبوس کر ڈالا؟

مرے اخبار کے صفحات پر گھمسان کا رن ہے
سیہ لفظوں کے شانوں پر
سجیلے عہد ناموں کے جنازے ہیں —!
لہو کے سُرخ چھینٹے
ناشتے کی میز پر ہر سمت پھیلے ہیں
دہن کب تک چٹپٹے ذائقوں کا زہر چکھے گا!
سوالِ عدل اب کیسے اُٹھے گا!
صداؤں میں بھنور پڑنے لگے ہیں —!

ہماری بانجھ فریادیں
کئی تاریک صدیوں کی مسافت میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں
اور اُن رستوں پہ، جو انصاف گاہوں کو نکلتے تھے
فقط الزام اور دشنام کی اُونچی مچانیں ہیں
مچانوں کے تلے کاغذ کی لاکھوں فاختائیں ہیں!

خدایا! ہم سبھی آتش بجاں ہیں
پرندے اور ہم سب جل رہے ہیں!
خدایا اس سے پہلے کہ کھلونے اور خیمے
اور سُلگتی ماؤں کی آنکھیں ؎ ہمارے خواب کے ٹکڑے
سبھی کچھ راکھ ہو جائے
خدایا! ایک بارش دے
ہمیں اتنی جسارت دے کہ ہم
پاتال میں جکڑی ہوئی اپنی صدائیں
اہرمن کی قید سے آزاد کر لائیں —!

منصورہ احمد

گواہی

میں کس سے اپنے ہونے کی گواہی لوں!
مری سب آشنا آنکھیں مری تکذیب کرتی ہیں
مرے سب آشنا لہجے تہی لفظوں سے بوجھل ہیں
اب اُن ناموں کی ساری تختیوں پر کچھ ادھورے
حرف باقی ہیں
جو کل تک آرزو کے استعارے تھے — !
وہ رشتے جو دلوں کو گرم رکھتے تھے
میں کیسی برف کی وادی میں چھوڑ آئی
جہاں سورج کی کرنیں بھی اپاہج ہیں — !

مجھے کچھ زخم خوردہ ساعتوں کے پار اُترنا ہے
میں کس سے راستہ پوچھوں
گھروں سے لوگ گلیوں میں نکلتے ہیں
تو چہرے اوڑھ لیتے ہیں!
وہ کچھ چہروں کو جُزدانوں میں رکھتے ہیں
جو سارے موسموں میں کام آتے ہیں — !
گلی میں ہر قدم پر اجنبی چہروں کے لشکر ہیں
میں کس سے اپنے ہونے کی گواہی لوں — !

ہجومِ ناشناساں میں بس اک تم تھے
جو ہونے کی گواہی تھے
سو میں جنموں کی پاگل کھوج کا صندل
سجائے اپنے بالوں میں
تمہارے پاس آ بیٹھی
مگر تم روز و شب کے سرگراں ریشم کے اُلجھے تار بُننے میں
بہت مصروف تھے
میری گواہی دے نہیں پائے!
وہ سیڑھی جو مرے دل سے تمہارے دل کے گنبد پر
اُترتی تھی
شکستہ ہے — !
وہ کھڑکی جو تمہارے گھر میں کھلتی تھی
مری پہچان اور مکڑی کے جالوں سے اَٹی ہے، زنگ خوردہ ہے
گواہی دے نہیں سکتے — نہ دو
لیکن مرا اک کام تو کر دو
مری پہچان میں اُلجھے ہوئے مکڑی کے سب جالے مجھے دے دو!
کوئی تو ہو جو مجھ کو میرے ہونے کی گواہی دے — !

عابد ودود

میری دُنیا

میرے ساتھ چل، میرے ساتھ گا
کل کی فکر کیا! کل کا کیا پتا!
کچھ سنبھل گئے، کچھ سنور گئے
میں وہ پھول تھا، جو بکھر گیا
سادہ دل ہی تھے اس لیے بنے
ہم ہی نارسا، ہم ہی بے وفا
کل کی فکر کر، آج تو گیا
اِس نگر کا کیا، وہ نگر بسا
رہ نوردِ شوق اور بھی تو ہیں
ہم جو تھے تو کیا، ہم نہ ہوں تو کیا!

تیسری دُنیا

ذرا سا میں ہوں آدمی
بے نام اور پھر گُمنسان!
تیسری دُنیا کا اِک باسی
ایک اُجڈ انسان
تیری یہ تخلیق ہے مولا
کس درجہ بے جان
بچا کھُچا انسان!

(بریڈ فورڈ)

جاوید انور

پنس چہ باید کرد

سمندر! میری سمتوں کو رہائی دے
کہ میں ڈوبے جہازوں کا مسافر ہوں

مرا لفظوں سے وعدہ ہے
ارادہ ہے کہ میں پتھر میں شریانیں بناؤں گا
میں کھارے پانیوں پر آگ سے وہ گیت لکھوں گا
جو زیرِ آب ہے اور بلبلوں کے استعارے بھیجتا ہے
—— وہیل!
تیرے غار میں میرا ستارہ جگمگاتا ہے
رہائی دے ——!
مرے سچ کو رہائی دے ——!
کہ یہ پیالہ ——!
کہ یہ سُولی ——!
کہ چوبِ خشک اب دیمک کا گھر ہے، اور
زمیں پر کوڑھ کے ٹالر نے سب سکوں کی قیمت خاک کر دی ہے!

(تماشہ ہو رہا ہے، اور تماشائی
لہو کے داغ پر داد و دہش کے پھول رکھتے ہیں
ہوا تالی بجاتی ہے!)

یہ میرا دوسرا ایں ہے
یہ میرا پہلا سچ اور دوسرا ایں ہے
جو کاغذ پر
سیاہی کی تہوں سے جھانکتا ہے
مسکراتا ہے
کبھی آنسو بہاتا ہے
کہ میرے خواب اکثر مجھ کو مجھ سے چھین لیتے ہیں!

بہت غوغا ہے بازارِ انا الحق میں
بہت چھوٹا مرا پرچم
مرا نعرہ بہت مدھم
میں سچ کہنے سے ڈرتا ہوں
(یہ میرا دُوسرا سچ ہے!)
میں آدھا خواب اپنی آنکھ میں رکھتا ہوں
آدھا آسماں کو بخش دیتا ہوں
مرا یوسف کنویں میں ہے
ابھی مچھلی نے میرا سچ نہیں اُگلا
مرا کشکول خالی ہے
—— سمندر! میری نظموں کو رہائی دے
کہ میں سوڈان میں جاؤں
جہاں انگور کی بیلوں کے پتے زرد ہیں
گاٹے کے تھن سے خون رِستا ہے!
— خودی کا گیت، اے اقبال، اِتنا شور آور ہے
کہ ننگی پسلیاں اپنے دُکھوں کی داستاں کہتے ہوئے ڈرتی ہیں
سو چُپ ہیں!

(ہوا تالی بجاتی ہے)

ہوا تالی بجاتی ہے تو پتّے والہانہ رقص کرتے ہیں
الارم، سائرن، گھنٹی، وِسل، تالی
ہمارے حکمراں ہیں —— ماننا ہوگا
تو یہ بھی ماننا ہوگا
کہ شہرِ خاک پر افلاک سایہ کر نہیں سکتے
فلسطیں! تُو نے کب پیغمبروں پر اپنے دروازے نہیں کھولے
مگر ہم تیری خیمہ بستیوں کے گِدھ ہیں
اور مُردار کھاتے ہیں!
—— سمندر!
مجھ کو اک کشکول بھر تارے عطا کر
مشت بھر مٹی سے میں اپنا علیحدہ آسماں تعمیر کر لوں گا

سرِ پردہ

تماشائی لہو کے داغ پر داد و دہش کے پھول رکھتے ہیں

پسِ پردہ

کوئی ریشم کا کیڑا موت کی دُھن پر لہو ریشم بناتا ہے

سرِ پردہ نہیں آتا

مقیّد یوری ڈِس پتھر

تمنّا کے بھنور میں رقص کرتے سر

شکستہ پا

دریدہ تن

مغنّی اُرفی اُس ڈوبے جہازوں کا مسافر تھا،

سرِ ساحل نہیں آیا

سمندر! یہ جو موتی ہیں،

کبھی یہ اُس کی آنکھیں تھیں!

دُعائے مغفرت کیجے

مرے حق میں دعائے مغفرت کیجے

کہ میں مقتول ہوں اپنا

مجھے کچھ اشک تو دیجے

مجھے کچھ اشک تو دیجے کہ میں روؤں

مگر میں رو نہیں سکتا!

مرے لفظوں کو کندھا دو

میں جھوٹا ہوں

مگر تم تو بہت سچّے ہو

میری نظم کے قاری!

مرے لفظوں کو کندھا دو

کہ یہ وہ بوجھ ہے جس کو

میں تنہا ڈھو نہیں سکتا!

(آسٹریا)

جاوید انور

مستقبل کے نوجوان شاعر بنے

جیکٹ پہنو
جین چڑھاؤ
بوٹوں کے تسمے اچھی طرح کس لو
دروازے پر
کسی بھی لمحے دستک ہو سکتی ہے !

پاگل نہ بنو
اب کوئی نظم سنانے یا سننے نہیں آئے گا!
کاغذ پھاڑ دو
پنسل توڑ دو
رکھ سکتے ہو تو یہ بیچارہ دندان میں رکھ دو
بھوکی چڑیا کے کام آ جائیگا !

ہاں تسمے اچھی طرح کس لو
باہر تار کول پہ
لوہا دوڑ رہا ہے
ایک سو بیس اور اک سو چالیس کی رفتار سے !
اس سے کم پر چلنا
اپنی موت کو دعوت دینا ہے، اور
اپنی موت کو دعوت دینا جرم ہے !

کسی بھی لمحے سائرن ہو سکتا ہے
وقت بہت کم
جنگ بڑی شدت سے جاری ہے، تم
زندہ رہنا
لڑنا چاہتے ہو تو
باہر نکلو
دوڑو
ورنہ اپنی نظم سمیت اِس ڈسٹ بن میں گھس جاؤ !

(آسٹریا)

قائم نقوی

ہوا سرگوشیاں کرتی ہے

ہوا سرگوشیاں کرتی ہے پھر سے کوچۂ جاں میں
کسی کے ہاتھ میں پتھر
کسی کے لب پہ گالی ہے
ہجوم عاشقاں سے کون نکلا ہے
یہ کیسا رقص جاری ہے!

ہوا سرگوشیاں کرتی ہے
پھر سے کوئے مقتل میں
کہیں پر روح گھائل ہے
کہیں پر جسم زخمی ہے
سر مقتل یہ کون آیا
یہ کیسا رقص جاری ہے!!

یہ کیسا رقص جاری ہے
ہمیں تو اپنے ہونے کی گواہی ڈھونڈنی ہوگی
کسی در پر کوئی تختی بھی اپنے نام کی باقی نہیں اب تو
ہوا کے ہاتھ میں اپنا تشخص ہے
کہ ہم حرفوں کی سچائی کے منکر ہوتے جاتے ہیں
ہمارے رابطے اور سلسلے سب ایک جیسے ہیں
یہ کیسا رقص جاری ہے!!!

سحر سے پہلے کی ایک نظم

شام کی رداؤں میں
صبح کی دعاؤں میں
واہموں کے بستر پر
مصلحت کی چادر میں
آنکھ کھول کے دیکھیں
روزنوں میں خوابوں کے
جال بنتے جاتے ہیں

خاور اعجاز

چار نظمیں

امر لمحہ

یاد جھروکے میں
اک لمحہ
جھُول رہا ہے
باقی منظر

دھیرے دھیرے
بھول رہا ہے

آؤ امر ہو جائیں

برق چمکی ہے تو یوں لگتا ہے
آسماں جیسے ہے اک ہالۂ نور
جس سے بارش کی رو پہلی بوندیں
نور کرنوں کی طرح دل کے دریچوں میں اُتر آتی ہیں

آؤ اس موسمِ حیرانی کو
ہاتھ سے چھُو کے امر ہو جائیں

انتخاب

ہمارے فیصلوں کی دھند میں اکثر
بہت ہی خام ترجیحات ہوتی ہیں
مگر اتنا تو تم بھی جانتی ہوگی
کسی کی کاروباری گفتگو
اور سرد ہاتھوں میں دبے ہیرے ——
کسی کی نرم میٹھی بات
اور پھُولوں بھری جھولی میں کتنا فرق ہوتا ہے

ضبط

یوں ہوا پھر کہ جو تھوڑا سا سفر باقی تھا
اُس میں اِک ضبطِ گرانبار کی منزل آئی
اور اظہار کے دریا کی زباں سوکھ گئی

مترجم: اقبال حیدر

جاپانی ہائیکو

پانی جاگا ہے
ایک پرانے جوہڑ میں
مینڈک کودا ہے
(باشو)

چاند اکیلا ہے
میں نے بھی تنہائی کا
ہر دکھ جھیلا ہے
(باشو)

تیز ہواؤں میں
تتلی اُڑ کر گرتی ہے
موت کی بانہوں میں
(شیکی)

اے میرے پیارو
اتنی جرأتمندی سے
مکھی مت مارو
(اسام)

پیڑ ہیں بے سایہ
دھوپ آنگن میں بے پردا
میرا ہمسایہ
(اکیتو)

سبز ہوئی شاخیں
میں خاموشی سے دیکھوں
تیری نم آنکھیں
(باشو)

میں کس سے پوچھوں
سر جوڑے کیوں چپ چپ ہیں
کچھ بھید مجنوں
(کائیورد)

اقبال حیدر

اُردو ہائیکو

ساون میں اس بار
پتّے پیلے ہو گئے
سبز ہوئی دیوار

گریہ کم کم ہے
مدّت سے میرے اندر
ایک ہی موسم ہے

شور سمندر کا
گونج رہا ہے سناٹا
اپنے اندر کا

اُونچے ہوئے مکان
لیکن ہم سے رُوٹھ گئے
آنگن اور دالان

ہوا ہوئی پاگل
طوفانوں میں اُڑتے ہیں
بادل اور آنچل

بند ہُوا دفتر
رستے میں ہنگامے ہیں
کیسے جائیں گھر

جنگ تو کرنا ہے
طاقتور دشمن سے بھی
لڑ کر مرنا ہے

اعجاز رضوی

داستان لاعلم قافلے کی

بہت شدت کی گرمی تھی
نظر کی آخری حد تک فقط اپنا ہی سایہ تھا
جو پیاسے تھے وہ اتنا تیز چلتے تھے کہ ان کے ساتھ کے ناقہ سواروں میں
عجب اک بیکلی سی پھیل جاتی تھی
وہ پیاسے تھے ـــــ مگر خاموش چلتے تھے
وہ نابینا نہیں تھے ـــ پر کسی بھی چیز کی حرکت سے اُن کی آنکھ
میں جنبش نہ آتی تھی
کہ ان کے جسم کی طاقت نگہ کے ساتھ پانی کے تعاقب میں گئی
تو تھی مگر واپس نہیں پلٹی

وہ سب اک قافلے میں تھے
مگر جو فاصلے وہ دل میں رکھتے تھے، وہ ان سے خوب واقف تھے
مگر اس ناگہانی دکھ پہ بھی کوئی کسی سے کچھ نہ کہتا تھا
کہ ان کے قافلے میں جس قدر بھی لوگ شامل تھے
سبھی کے پاس مشکیں تھیں
سبھی کے پاس نقشے تھے
سبھی دل جوئی کا سامان رکھتے تھے
مگر سب میں کوئی اک بھی نہ ایسا تھا جو یہ دعوے
سے کہہ سکتا کہ صحرا اس نے دیکھا ہے
وہاں کی دھوپ چکھی ہے، وہاں کی
چھاؤں برتی ہے
وہاں اک کوزہ پانی کتنا مہنگا ہے
وہ لاعلمی کی انگلی تھام کر صحرا میں آئے تھے
نظر سے دور ان کے ذہن میں اک شہر بستا تھا
جو اس صحرا سے آگے تھا
وہ اپنے شہر کے رستوں سے واقف تھے

مگر صحرا کے خودرو راستوں پر ایسے چلتے تھے
کہ وہ کم وقت میں زیادہ چلیں
اور شہر میں پہلے پہنچ جائیں
اسی تیزی نے ان سے ابتدا ہی میں بہت کچھ لے لیا تھا
پر انہیں اس کی خبر کب تھی
نظر سے دور ان کے ذہن میں جو شہر بستا تھا
وہاں تو شہد بہتا تھا
وہاں تو دودھ کے چشمے اُبلتے تھے
وہاں کی خاک میں سونا چمکتا تھا
وہاں کے چاند پر بڑھیا نہ رہتی تھی
وہاں سورج کی تھالی میں ہزاروں، لاکھوں ہیرے تھے
وہاں کے گھر ہر اک پہلو سے روشن تھے
مگر اب کیا کرے کوئی کہ ان کی جلد بازی نے
انہیں یہ دن دکھایا تھا
کہ مشکیں تھیں، مگر پانی کے بدلے خون اگلتی تھیں
جو زادِ راہ باقی تھا، وہ صحراؤں نے جاں بخشی کے بدلے
رہن رکھا تھا
سروں پر اُڑنے والے گدھ فضا میں موت لکھتے تھے
مگر مجبور تھے یہ قافلے والے
کہ اب وہ ہاتھ ہی باقی نہ تھے جو ان گدھوں پر تیر برساتے
کہ اب وہ لوگ ہی باقی نہ تھے جو مشکیں بھر لاتے

اعجاز رضوی

ننھی مخلوق سُن

ننھی مخلوق سُن! رہگزر چھوڑ دے
بادشہ کی سپہ پیش قدمی کی حالت میں رکنا نہیں جانتی
اس کے قدموں تلے پھول کچلیں کہ سبزے میں
دبکی ہوئی کوئی تتلی مرے
اُن کو چلنا ہے اور بڑھتے جانا ہے ہر حال میں
ایک پل کے لئے اور کسی کے لئے اُن کو رکنا نہیں
ننھی مخلوق سُن! وہ زمانے گئے
جب تری نسل کی ایک چیونٹی نے اپنے قبیلے کو
شاہی سپہ سے ہراساں کیا تھا
تو اس شاہ نے اسکو اپنی ہتھیلی پہ رکھ کر دلاسہ دیا
ننھی مخلوق سن! وہ زمانے گئے
بادشہ کی سپہ پیش قدمی کی حالت میں رکنا نہیں جانتی
وہ اپیلیں نہیں مانتی
رہگزر چھوڑ دے!
رہگزر چھوڑ دے!!

خود کلامی کے جنگل میں

ہلاکت ہی مقدر ہے تو اس صحرا میں چلتے ہیں جہاں آنکھیں
نہیں ہوتیں
جہاں چہرے نہیں رہتے
جہاں پر لاش بے وارث نہیں رہتی
ہلاکت ہی مقدر ہے تو اس شہر ہراساں میں حریم ذات سے
باہر نکل آنا
کہانی کار بن جانا
ادھورے لفظ کو اپنا لہو دے کر کئی معنی عطا کرنا
عذابِ جستجو سہنا
کہاں تک ٹھیک ہے یہ بات سمجھاتا نہیں کوئی
اُلجھتی جا رہی ہے ڈور، سلجھاتا نہیں کوئی

ابرار احمد

مٹّی سے ایک مکالمہ

ماں کہتی ہے :
"جب تم چھوٹے تھے تو ایسے اچھے تھے
سب آباد گھروں کی مائیں
پیشانی پر بوسہ دینے آتی تھیں
اور تمہارے جیسے
بیٹوں کی خواہش سے ان کی
گودیں بھری رہا کرتی تھیں، ہمیشہ
اور میں
تمہارے ہونے کی راحت کے نشے میں
کتنی عمریں، چھوڑ رہی تھی ـــ!"
اک اک لفظ، مری سانسوں میں اٹکا ہے
سب کچھ یاد ہے آج
کہ میں اک عمر نگل کر بیٹھا ہوں
عمر کی آخری سرحد کی بنجر مٹّی
جب سے ماں کے ہونٹوں سے
گرتے لفظوں میں کانپتی ہے
میری سانس تڑپ اٹھتی ہے
چپ میں سمی
میری ہی آواز کی صورت
اُس کے مٹتے نقش
مرے اندر
کہرام سی اک تصویر بنے ہیں
زندگیوں کے کھوکھلے پن پر
آنسوؤں لپٹی ہنسی
مرے ہونٹوں پہ لرزتی رہتی ہے
اچھی ماں ـــ!
عمر کے چلتے سائے کی تذلیل میں
تیرے لہو کے رس کی لذّت
تیرے غرور کی ساری شکلیں
ان رستوں میں، مٹّی مٹّی کر آیا ہوں
پتھریلی سڑکوں پر
اپنے ہی قدموں سے
خود کو روند کے گزرا ہوں
میرے لہو کے شور میں
تیری کوئی بھی پہچان نہیں ہے
تیری اُجلی شبیہہ
کچھ ایسے دھندلائی ہے
تجھ سے وصل کی آنکھ سے
بینائی، زائل ہے
میں تیری دردوں کا مارا
تیری ہی صورت
میں بھی ـــ اک جیون ہارا ـــ!

افتخار بخاری

ہم پیشہ

مجھ کو روز نظر آتی ہے
کچرے کے ڈھیروں سے
اپنے نصیب کے ٹکڑے چننے والی
یہ محنت کش لڑکی
ٹین کے ڈبے، خالی بوتلیں، ٹوٹی چپلیں!
کچھ دن بعد یہ کوڑا کرکٹ
اُجلے رنگ پہن کر
بازاروں کے شوکیسوں میں
سج جائے گا
تب کچرا چننے والے ان دو میلے ہاتھوں کی مشقت
کس کو یاد رہے گی؟
سوچتا ہوں خود میرا کام بھی
ایسا ہی ہے
رنج و مصیبت کے مارے
ان گلے سڑے شہروں میں بکھرے
دُکھ کے منظر چنتا رہتا ہوں
اور نظمیں بنا کر اخباروں میں چھپواتا ہوں
وہ نظمیں جن کے مدّاح کبھی
دُکھ چننے والی آنکھوں کا
اک دُکھ بھی جان نہ پائیں گے!

وابستگی

یوں ہوتا
میں بادل کا اک ٹکڑا ہوتا
سرخ گلابوں والی قبر پہ
سایا کرتا
ساون آتا، میں کھو جاتا
جب گھنگھور گھٹائیں رخصت ہوتیں
میں تنہا رہ جاتا
سرخ گلابوں والی قبر پہ
سایا کرتا ——

نوید جمیل

صبحِ فردا کی اُمید پر

ہم نے اتنے برس قید کاٹی
ہم نے زنداں کی دیوار پر شعر لکھے
ہم نے سچائی کی ہر کہانی رقم کی
ہم نے کالی سلاخوں کا لوہا پیا
اور اینٹیں چبائیں

پھر بھی زندہ رہے
اک فقط
صبحِ فردا کی اُمید پر

جواز

زندگی، صحرا کی جلتی دھوپ میں سایہ ترا
زندگی، جلتے ہوئے زخموں پہ اک بوسہ ترا
زندگی، کالی اماوس رات میں روشن ستاروں سی یہ دو آنکھیں تری
زندگی، نفرت بھرے لوگوں کی دُنیا میں محبت سے بھری باتیں تری
زندگی — تو زندگی، تو زندگی
تیرا ہونا میرے ہونے کا جواز
ہم نہیں سربستہ راز

فیصل محفوظ

ٹین ایجر°

اپنی اپنی ضد کے پکے
اب یہ بچے
جن کے ہاتھوں میں انگارے
جن کے کاندھوں پر بندوقیں
جن کی جیبوں میں بارود
یوں لگتا ہے اب کچھ کرنے والے ہیں
جینے مرنے والے ہیں
لیکن اس سے پہلے کہ یہ ضدی بچے
عمر کے کچے
ذہن کے کچے
ضدی بچے
نادانی میں
بستی بستی آگ لگا دیں
شہر جلا دیں
آؤ ان بچوں کی جیبیں خالی کر دیں
ان کے کاندھوں سے ان بھاری بندوقوں کا بوجھ اتاریں
ان کے ہاتھوں کے انگارے ٹھنڈے کر دیں
ان سے اپنے آنے والے کل کی ہم پہچان بچائیں
جینے کا سامان بچائیں
اپنا پیارا پیارا پاکستان بچائیں

اس کے حوالے سے اپنے آپ سے ایک سوال

کس نے کہا تھا
اپنے آپ ہی
وعدے کر لو
قسمیں ڈالو
اپنے آپ ہی
بندھن باندھو
رشتے جوڑو
اپنے آپ ہی اتنا کچھ اب کر ڈالا ہے
تو اب جھیلو
ہجر کی لمبی راتوں کو
اور ترسو
ان ہونٹوں کی
جھلمل جھلمل
جگمگ جگمگ
میٹھی میٹھی باتوں کو ---!
اس کو کیا ہے
وہ سچا ہے
اُس نے تم سے کوئی عہد نہیں کر رکھا

° TEENAGER

قمر رضا شہزاد

اتمامِ حجّت

خاک میں لتھڑے ہوئے ہاتھ اُٹھا
تاکہ یہ رات ڈھلے دل سے کدورت کا غبار آنکھ سے،
قطرہ قطرہ
ترے رخسار پہ ٹپکے
ترا چہرہ چمکے
بول! اک بار تو لب کھول!
کہ تجھ دل میں جو آواز چھپی ہے، ترے رب تک پہنچے
اور پھر جو ترا انجام ہو، سب تک پہنچے

مراجعت

خلقتِ شہر
کس معجزے کے لیے
آگ کے گرد بیٹھی دعاؤں میں مصروف ہے
جسم کا آئینہ ٹوٹتا جا رہا ہے
مگر کوئی بھی عکس اب تک نہیں بن سکا
کارِ بیکار میں اپنی عمریں گنوانے سے کیا فائدہ
آؤ زنجیر سے بات کرتے ہیں
دروازۂ عافیت گر نہیں کھل سکا تو
کم از کم پلٹنے کا رستہ ہی مل جائے گا

ثمینہ اسلم

بچپن

بچپن کے دُکھ کتنے اچھے ہوتے تھے
تب تو صرف کھلونے ٹوٹا کرتے تھے

وہ خوشیاں بھی جانے کیسی خوشیاں تھیں
تتلی کے پر نوچ کے ناچا کرتے تھے

پاؤں مار کے خود بارش کے پانی میں
اپنی ناؤ آپ ڈبویا کرتے تھے

اب سوچیں تو چوٹ سی پڑتی ہے دل پر
آپ بنا کے آپ گھروندے توڑے تھے

چھوٹے تھے تو مکر و فریب بھی چھوٹے تھے
دانہ ڈال کے چڑیا پکڑا کرتے تھے

اپنے جل جانے کا بھی احساس نہ تھا
بھڑکے ہوئے شعلوں کو چھیڑا کرتے تھے

خوشبو کے اڑتے ہی کیوں مرجھایا پھول
کتنے بھولے پن سے پوچھا کرتے تھے

آج ان کی تعبیریں لہو رلاتی ہیں
بچپن میں جو ہم نے سپنے دیکھے تھے

اب تو ایک بھی آنسو رسوا کر جائے
بچپن میں جی بھر کے رو تو سکتے تھے

اقبال حسین

رُوح کا مقصد

وہ تھا اک عمر کا حصّہ
کہ جب آٹا بھگو کر مختلف شکلیں بناتے تھے
کہ جیسے ہم نے اپنی روح کا مقصد تراشا ہو
تلاش و جستجو واقف بھی حاصل کے ٹھکانے سے
کہ جب مٹی کو پاؤں پر ٹکا کر گھر بناتے تھے
پھر اس کعبے کی رونق کے لیے کچھ بت سجاتے تھے
مگر آوارگی مانع ہے اب تو گھر بنانے میں
کہ اب ہوتی ہے حائل شرم آٹے کو چرانے میں
تمنّا سے خمیر اٹھا، وہ باسی ہو چکی شاید
کہ اب تو حسرتیں ہی ہیں مدارِ زندگی شاید

سیّد یٰسین قدرت

ابھی تو دیکھنا ہے

ابھی تو موسموں کے ہجر کے پیلے سمندر سے
کئی انمول موتی
سیپیوں کے بطن سے باہر اُچھلنے ہیں
ابھی تو وصل کی پیاری زمین کے لاجوردی پھول چُن کر
آنکھ کے گلداں میں رکھنے ہیں
ابھی تو اس سے بھی ملنا ہے
جس کے زرد چہرے پر کسی معصومیت کے چاند
رقصاں ہیں (میں جنکی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں زیست
کرتا ہوں)
ابھی تو رتجگوں کے شہر سے باہر نکل کر
ڈھونڈنا ہے اُجلی صبحوں کو
ابھی تو رات کے آسیب کو
خورشید کی لو سے
جلا کر راکھ کرنا ہے
ابھی کتنی تمناؤں کی مشعل ساتھ لے کر
کھوجنا ہے دو جہانوں کے کئی رازوں کو
جو مستور رہیں اب تک
ابھی تو
دیکھنا ہے
سورجوں کے عکس
کیوں پڑتے نہیں
ناچیز ذرّوں پر؟

اُلجھن

اندھیری راہیں، سیاہ جادے
سیہ لبادے
نہ جانے اِن راستوں پہ ہم چل رہے ہیں کب سے
نہ جانے کب تک؟
اِدھر اُدھر گھومتے رخوں میں
نہیں منوّر کوئی نشاں بھی
کہ کس طرف کوئی جا رہا ہے
سیاہ شب ہے سیاہ دن بھی
سجھائی دیتا نہیں ہے کچھ بھی
دکھائی دیتا نہیں ہے کچھ بھی
مگر بظاہر رواں دواں ہیں

فرزانہ رزمی

مسیحا

مسیحا زمیں پر
پھر اک بار اترا
وہ اپنے جلو میں
نئی روشنی لے کے آیا
وہ اجڑے ہوئے پیڑ پہ دستِ شفقت جو رکھے
تو سوکھی ہوئی ٹہنیاں بھی ہری ہوں
وہ مردہ دلوں میں اگر روح پھونکے
تو ہر دل میں خوشیاں کچھ ایسی بھری ہوں
کہ آنکھیں جو ہیں نور سے آج خالی
انھیں روشنی کا تکلم عطا ہو
وہ لب جن پہ مہرِ اذیت لگی ہے
انھیں پھر سے اذنِ ترنم عطا ہو
میں سوچوں تو دیکھوں
کہ آکاش کی وسعتوں میں
زمیں سے سما تک
وہی نام روشن
وہی نام زندہ
مرے ذہن سے سرحدِ ماورا تک
ازل سے ابد تک
مری زندگی میں، وہی حرفِ اول
وہی حرفِ آخر

گواہی

اے میرے مالک
تو اپنی موجودگی کے شعلے کی روشنی سے
مرے جہاں کی
قدیم یخ بستگی کو
ایسی تمازتیں دے
مرے لہو میں چمک اٹھے تیرا اسمِ اعظم
مری جبینِ نیاز دمکے
یہ تیرگی کا دبیز پردہ، یہ سب سیاہی
ہوا میں تحلیل اس طرح ہو
کہ میرے خوں کا ہر ایک قطرہ
ترے نوازش کی دے گواہی

افشاں عباس

مراجعت

تنہا شاخ پہ سوکھے پتے ۔ کیا دیکھو گے!
وقت کی چھاگل نے چھلکائی ۔۔ دُور کہیں ہریالی
سبز رُتوں کے ترسے آنگن
کب سے رستہ دیکھ رہے ہیں
زرد رُتوں کے پیلے بن میں
سوکھے پتوں کی چیخیں ہیں
تم ہی کہو ۔ بے رنگ فضا، بے فیض ہوائیں
کیا ڈھونڈو گے ۔ کیا پاؤ گے!
اپنے تن کی ساری جگمگ
تنہائی کی گرد میں آخر چھوڑ آؤ گے
اُجیالوں کے ۔۔ خوشبوؤں کے
سارے بندھن توڑ آؤ گے
آؤ کوچ کرو اُس دیس کی جانب
جس کی فضا میں پھولوں کی مہکار رَچی ہے
خوشبو کی بارات سجی ہے
جب تم اپنے آپ میں
لوٹ آؤ گے
پیچھے مڑ کر جب دیکھو گے
تم کو ملیں گے
تپتی ریت پہ ۔۔ ننھے بچے کے پاؤں کے نشاں!

آئینہ پھر ٹوٹ گیا

آئینہ پھر ٹوٹ گیا تھا
کرچی کرچی سوچوں نے
پھر حرف کا دامن تھام لیا تھا
حرف نگر کے چوراہے پر
سوچ دھمال کا منظر جیسے
سارا عالم رقص میں تھا
سارے رنگوں پر چھائی تھی انجانی خوشبو کی مستی
سُر سنگیت پہ مخمل جیسے
جذبوں کی رعنائی بکھری
اور غزل تخلیق ہوئی ۔۔ !
لوٹ آئی ہوں پھر میں اُس بے رنگ فضا میں
چپ دھرتی میں
جس کی ہر دیوار پہ چپ کی چھاپ لگی ہے
گونگے حرفوں والی کتنی کتابیں
اپنے آپ پہ نوحہ کناں ہیں
میں بھی الماری میں جیسے
ایک کتاب کی صورت اپنے آپ پہ نوحہ خواں ہوں ۔!

تصدق شعار

بُعد

خدایا تو نے اتنا بُعد کیوں رکھا
کسی پر بے محابا بخشش و انعام کی بارش
کوئی یکسر تہی داماں
کسی کے پاس گاڑی
اور کسی کے پاس پاؤں بھی نہیں پیدل مسافت کو
کسی کے پاس بنگلہ
اور کسی کے پاس کٹیا بھی نہیں ہے استراحت کو
کوئی مالک زمینوں اور خزینوں کا
کسی کے پاس مٹی بھی نہیں ہے استقامت کو
کسی کو اطلس و کمخواب کا جامہ
کہیں سمجھا گیا کافی لباسِ آدمیت کو
کسی کے پاس ثروت آدمی کا مول کرنے کی
کسی کے پاس پیسے تک نہیں اپنی حجامت کو
اور اس پر طرفگی احکام کی یہ ہے
کہ سب انسان مل بیٹھیں
تمام انسان یکساں ہیں —!

محمد مشتاق آثم

قرض

سنہری سیبوں کی جھاڑی وہ لگائے، کتنی عمیق سوچوں میں گم تھی
اور اس کی رنگت
کہ جیسے کھیتوں میں سرسوں پھولے
وہ رنگ اور وہ لہو کا میلہ
بہا کے ہمراہ لے گیا تھا
دکھوں کا ریلا
وہ الجھی سوچوں کے کینوس پر
اداس رنگوں کی ڈِسک تھامے
ابھارتی تھی وفا کی مورت
دکھوں کا اک جال بُن رہی تھی
وہ چھوڑ آئی تھی جھونپڑے میں نحیف بچہ
نشے میں بدمست ایک شوہر
وہ جس نے سارے قبیلے والوں کو مات دے کر
لگا کے ان سب سے اونچی بولی
اُسے خریدا تھا چند سو میں
اسی زمانے سے رات اور دن
وہ جسم و جاں کی کڑی مشقت سے
اپنی قیمت چکا رہی ہے

ابو ذر

گمشدگی

بانسری کے حسیں سُر سجے، تو کہیں
ایک چرواہے کی بکریاں کھو گئیں
راہ چلتے ہوئے ایک معصوم کو
دل نشیں دلنشیں تتلیاں مل گئیں
راستہ کھو گیا

قافیوں سے خیالوں کو جاتے ہوئے
تیری یاد آ گئی
تیری باتوں سے مصرعے اُترنے لگے
جب خیال آ گیا
قافیہ کھو گیا

حسن جس روپ میں
جب کبھی آ گیا
کچھ نہ کچھ ہو گیا!
کچھ نہ کچھ کھو گیا!

تنگ آمد

وہ دِن گئے ... جب
تمھارے لہجے کی اُنگلیوں سے
ہم اپنی شامیں گزارتے تھے
تمھارے وعدوں کے ریشموں سے
ہم اپنے خوابوں کے ننگے جسموں کو
ڈھانپتے تھے

ہم اپنی عمریں
تمھارے لفظوں کے سائبانوں میں
کاٹتے تھے

سو اَب کے وعدہ کرو تو
ایفا کے سیدھے رستے سے چل کر آنا
وگرنہ بولو تو
بولنے سے ذرا سا پہلے
یہ سوچ لینا
کہ اب کے ہم سب .... !
وہ دن گئے جب .... !

احمد ندیم قاسمی

میرا اپنا

ریت اور برف پہ ہر نقشِ کفِ پا میرا ہے
میں نے ہر سمت میں، ہر ملک میں، ہر موسم میں
جستجو کی ہے کہ شاید کوئی اپنا مل جائے
کوئی وہ، جس کے قریب آکے یہ محسوس کروں
زندہ رہنے کا مجھے بھی کوئی حق حاصل ہے
میں جو زندہ ہوں تو بے وجہ نہیں زندہ ہوں

اب یہ محسوس ہوا ہے مجھے، اِک عمر کے بعد
اجنبی جو نظر آیا تھا، وہی اپنا ہے
نہ کوئی خون کا رشتہ، نہ کوئی عمر کی قید
وہ جو بے لوث ہے، پانی میں کنول کی صورت
جو محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا
جو محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں لے سکتا

خود بدولت

اشفاق احمد

دونوں بہنیں اور دونوں بھائی چپ چاپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ اور دوسرا وہی کچھ سوچ رہا تھا جو باقی کے تینوں نے ابھی سوچ کے چھوڑا تھا۔ رشیدہ نے کہا "مجھے کل ہر صورت واپس جانا ہوگا کیونکہ کرنل صاحب کے موتیے کا آپریشن ہے، اور میں جب تک اُن کے پاس نہ ہوں تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور جوش سے اور خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔" دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور آپا۔ ضرور —— آپ کو ہر حال میں جانا چاہیے اور کرنل صاحب کی تسلی کرنی چاہیے۔"

محمود گدو بیراج سے آیا تھا اور ابھی اس کی ڈھیر ساری چھٹی باقی تھی، لیکن اس کی ڈھیر ساری چھٹی کا گھر والوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں تھا کہ محمود بہت ہی کم گو اور کم آمیز قسم کا انجینئر تھا۔ مسعود اسلامیہ کالج پشاور میں اکنامکس کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اس کی چھٹی تو کم تھی لیکن وہ تار بھیج کر اور چھٹی بھی لے سکتا ہے، اور فون کر کے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہاں بلا سکتا تھا۔

میجر فرخندہ سی ایم ایچ میں گائنی کی ڈاکٹر تھیں، اپنے اباجی کی عاشق، اپنے اباجی کی برتری کا چلتا پھرتا اشتہار اور اپنے اباجی کا قیمتی ووٹ۔ جب سے اباجی کے ذہن اور بدن کا رشتہ کمزور ہوا تھا وہ بھی چھٹی لے کر اباجی بختیار خاں کے پاس آ کر ان کی تیمار داری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ جب کبھی میجر فرخندہ پر طویل مایوسی کا دورہ پڑتا تو اباجی بختیار خاں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر اُس کی کمر پر زور کی تھپکی دے کر اونچی آواز میں کہتے "چن اپ میجر۔ چن اپ —— ایسی صورت ہم کو پسند نہیں ہے۔" اور میجر غمناک ہو کر چن اپ کر لیتی۔

اباجی بختیار خاں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی اور بغیر نقشہ پاس کروائے بنائی تھی، اس میں کچھ تجاوزات بھی آ گئی تھیں جن میں کچھ تو سرکاری تھیں اور کچھ دوسرے لوگوں کی ملکیت گھیر گئی تھیں۔ خاں صاحب نے کسی کی پروا کئے بغیر اپنے زور عمل سے اپنی زندگی کو بنایا تھا اور خوب بنایا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی سے ری رولنگ مل کے مالک بن گئے تھے اور ان کے کارخانے میں چوبیس گھنٹے کی شفٹ میں باسٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ ایک نائب تحصیلدار کا اتنے بڑے مرتبے پر پہنچنا ان کے ذہن اور بدن کی اعلیٰ درجہ کی سنکرونائزیشن سے عمل میں آیا تھا اور اس عمل میں بہت سے بے عمل لوگ ان کی پلاننگ کی بھٹی میں بھسم ہو گئے تھے۔ بختیار خاں پلاننگ کے بادشاہ تھے اور اگر وہ صنعت کاری کے میدان میں نہ اترے ہوتے تو واقعی کسی ملک کے بادشاہ ہوتے۔ اگر بادشاہ کا لفظ ممنوع الاختیار ہوتا تو بختیار خاں حکمراں ضرور ہوتے۔ ان کی ایک حکومت ہوتی۔ ایک محل ہوتا۔ نورتن ہوتے۔ سفارت خانوں کا ایک شہر ہوتا۔ ذاتی ہوائی جہاز، ہیلی کوپٹر اور ذاتی ہیلی پیڈ ہوتے اور دوسری راجدھانیوں اور رجواڑوں سے ان کے بہترین تعلقات ہوتے۔ یعنی وہ کچھ بھی کہلاتے ان کی ایک رعایا ضرور ہوتی اور وہ اپنی رعایا کو کسی بھی نام سے پکارتے رعایا اُن کی حکمرانی کی تصدیق کرتی۔ وہ ایک باعمل، باہمت، اور باکردار آدمی تھے۔ ان کی ساری زندگی محنت و مشقت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی اور اس کے کسی انگ پر بدمعاشی، بد اخلاقی، جنسی بے راہروی یا بدمستی کا کوئی چھینٹا تک نہ تھا۔

بختیار خاں نے نیم وا آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں دیکھا۔ پھر پتلیاں گھما کر گلوکوز کی بوتل پر نظر ڈالی اور اندر ٹیوب میں گرتے ہوئے قطروں کا نظارہ کرنے کے بعد ذرا سا مسکرا کر کہا: "مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔ میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ ——" میجر فرخندہ نے سٹتھوسکوپ لگا کر ان کی ہارٹ بیٹ چیک کی اور پھر اپنی کرسی پر اسی طرح جا کر بیٹھ گئی۔

بختیار خاں نے کہا "مولانا صاحب تشریف نہیں لائے؟ مولانا ظفر علی خاں صاحب!"

مسعود نے کہا "نہیں اباجی آج تو تشریف نہیں لائے۔"

"کمال ہے" بختیار خاں نے آنکھیں بند کرکے کہا "مجھ سے خود انھوں نے فون پر فرمایا تھا کہ تمہاری مزاج پرسی کو آؤں گا اور تمہارے ساتھ چائے پیوں گا، تو اب چائے کا وقت تو ہوگیا ہے۔ کیوں رشیدہ؟"

رشیدہ نے کہا "جی اباجی چائے کا وقت تو ہوگیا ہے۔"

"تو پھر" بختیار خاں نے ذہن پر بوجھ دیتے ہوئے کہا "یا تو انگریز نے انھیں پھر گرفتار کر لیا ہوگا۔ یا ایک آدھ دن ریسٹ کرنے کی غرض سے کرم آباد تشریف لے گئے ہوں گے۔"

"ہوسکتا ہے اباجی وہ کرم آباد تشریف لے گئے ہوں" مسعود بولا۔

"لیکن آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کرکے خاموشی سے لیٹے رہیں اباجی" ڈاکٹر فرخندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔"

"ریسٹ" بختیار خاں نے ہنس کر کہا "ریسٹ! ہاں مری سوہنی دھی۔ ریسٹ تو میں نے ساری زندگی نہیں کیا۔ ریسٹ کو تو میں انسان کا سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں — گناہ کبیرہ — اور سارے گناہ معاف ہوسکتے۔ لیکن بے عملی اور بیکاری اور بے کارکردگی کا گناہ کبھی معاف نہیں ہوسکتا۔ جس نے سٹرگل، کوشش، جدوجہد، کشمکش کو چھوڑ دیا وہ انسان نہیں پتھر ہے، مٹی کا تودا ہے، ریت کا ڈھیر ہے —— پرسوں میری مہاتما بدھ سے بڑی بحث ہوئی۔ جین مندر کے سامنے پٹڑی پر جا رہے تھے۔ میں نے موٹر روک کر پکڑ لیا اور ہاتھ تھام کر بڑے ادب سے کہا "سر آپ نے بڑی زیادتی کی انسانیت کے ساتھ جو اس کو نرم روی، نرم دلی اور ترک خواہش کا درس دے دیا" شرمندہ سے ہوکر اپنا ہاتھ چھڑانے لگے اور مسکرا کر بولے "کیا کریں بختیار خاں، ہم کو اسی بات کا حکم تھا۔" میں نے کہا سر آپ نے ایسا حکم کیوں مان لیا آپ کو بحث کرنی چاہیے تھی، آرگیومنٹ دینی چاہیے تھی کہ کوشش اور جدوجہد کے بغیر انسان کس طرح سے زندہ رہے گا، کس طرح آگے بڑھے گا، کس طرح نشوونما پائے گا۔ کہنے لگے "بس طرح دریا آگے بڑھتا ہے، پنچھی زندہ رہتا ہے، برگد نشوونما پاتا ہے۔" میں نے کہا سر ایک تو آپ کو اس برگد کے پیڑ نے تباہ کر دیا جس کے نیچے جاکر آپ بے یار و مددگار بیٹھ گئے تھے اور سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ اگر آپ نے ہمت کی ہوتی اور کوشش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہوتا تو کپل وستو جیسی آپ کی کئی راجدھانیاں ہوتیں اور اس وقت دنیا کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ ہوتا۔ لیکن آپ نے رہبانیت کی تعلیم دے کر اور ترک خواہش کا سبق سکھا کر لوگوں کو بھی بے عمل کیا اور خود بھی تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کرکے اس جہان سے چلے گئے۔ کوئی آپ کو جانتا ہی نہیں!"

ڈاکٹر فرخندہ نے کہا "اباجی آپ سونے کی کوشش کریں۔ میں کھڑکیوں کے پردے کھینچے دیتی ہوں۔"

"پرانی سی بات ہے بیٹا" بختیار خاں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں، جو جاگتے ہیں وہ پاتے ہیں۔ میں سونا نہیں چاہتا۔ جاگنا چاہتا ہوں، مجھے مرنے سے نفرت ہے اور مدہوشی سے بیر ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ ہی رہوں گا انشاءاللہ —— میں امر ہوں، کیونکہ میں کوشش ہوں، محنت ہوں، جدوجہد ہوں" پھر انھوں نے چونک کر پوچھا "راجہ صاحب کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

"کونسے راجہ صاحب اباجی؟" پروفیسر مسعود نے پوچھا۔

اپنے راجہ غضنفر علی خاں صاحب ـــــ مجھ سے والٹن ایئرپورٹ پر ملے تھے لیکن وہ بھی جلدی میں تھے اور میں بھی تیزی میں تھا۔ ہاتھ ہلا کر فرمانے لگے "میں آپ کو فون کروں گا خاں صاحب۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے، انھوں نے فون نہیں کیا۔ ویسے تم لوگ بھی اپنی اپنی غرض کے بندے ہو۔ شاید تم نے فون ریسیو ہی نہ کیا ہو ـــــ ویسے میں نے مہاتما بدھ کو آج لاجواب کر دیا۔ شرمندہ سے اور کھسیانے سے کھڑے تھے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ میں نے ان کا کندھا ہلا کر کہا "سر! کوشش اور سعیٔ مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسان حیاتِ ارضی میں آفتابِ عالمتاب بن کر دمکتا ہے ـــــ انھوں نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی ملائمت سے کہا "خاں صاحب! انسان مقابلے کی دنیا میں انسان کے خلاف ہی نبرد آزما ہوتا ہے۔ دیوار، پتھر، کھمبے، جنگلے اور درخت سے مقابلہ نہیں کرتا۔ تیس چالیس انسانوں کو جب ایک کامیاب انسان پرے پرے کر کے پیچھے دھکیل کے اور زمین پر گرا کر آگے بڑھتا ہے تو پھر زمین پر گرے ہوئے ان تیس چالیس ذلتوں کے ماروں کا ہم کیا کریں۔ ان کا گھر کدھر ہے، بھریں۔ ان کی سہانتا کیسے کریں۔ ان کو زندہ کس طرح سے کریں۔ وہ بھی تو انسان ہیں، وہ بھی تو اس معاشرے کا ایک حصہ ہیں، ان کو بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔" میں نے کہا "سر! میں تو آپ کو بڑا دوراندیش اور بدھی وان سمجھتا تھا لیکن آپ نے یہ کیا کچی بات کر دی۔ آپ سے تو ہٹلر اور ہلاکو زیادہ صاحبِ عمل تھے۔ انھوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور آپ کی رہبانیت کے تصور کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دیں۔ ملکوں کی نئی سرحدیں قائم کیں اور شہروں کے اندر دیواریں کھنچوا دیں۔ آپ برگد کے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ کیا مل گیا اس سے دنیا کو اور آنے والی نسلوں کو ـــــ مہاتما بدھ میری باتیں سن کر شرمندہ سے ہو گئے اور میرا کندھا تھپتھپا کر بولے "آپ کے لئے آپ کا دھرم اور ہمارے لئے ہمارا۔ اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ پھر ملاقات ہو گی تو اور باتیں ہوں گی اس وقت مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔" ڈاکٹر ارشد نہیں آئے آج؟"

"آئے تھے اباجی!" رشیدہ نے کہا "صبح آپ کو ٹیکہ دے کر گئے تھے اور شام کو پھر آئیں گے شاید۔"

"مہاتما بدھ جاتے جاتے کہنے لگے "خاں صاحب! مقابلہ بازی گھوڑوں پر تو سجتی ہے انسانوں پر نہیں۔" یہ کہہ کر بختیار خاں طنزیہ ہنسی ہنسے اور گلوکوز کی ڈرپ دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بختیار خاں نے آنکھیں کھول کر سب کو باری باری دیکھا اور اور دھیمی آواز میں کہنے لگے "پچھلے ہفتے وہ بڈھا فرانسیسی مجھے جی پی او کی سیڑھیوں پر مل گیا۔ اس کی چوخانہ گول ٹوپی نے اس کا بایاں کان بالکل چھپا رکھا تھا اور وہ اپنی پائپ میں پھونکیں مارتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک کر کہا "اوے آندرے ژید یہ تم نے کیا بکواس کی کہ بڑے انسانوں کے عظیم کارناموں میں عقل کے مقابلے میں قسمت زیادہ کارفرما رہی ہے۔" اس نے اپنے کندھے سکوڑ کر کہا "پاردوں موسیو مجھے اردو نہیں آتی سوری۔" اور کنی کاٹ کر تیزی سے دوسری طرف نکل گیا ـــــ اچھا! آج صبح جے پرکاش نرائن تو نہیں آئے تھے؟"

"نہیں اباجی!" میجر فرخندہ نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کم گو محمود نے بڑی آہستگی سے کہا "میں بہت تھک گیا ہوں ذرا کمر سیدھی کر کے واپس آتا ہوں۔"

"اوے محمود" بختیار خاں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا "تیرے جیسے لوگ جو ریشمی نائٹ سوٹ پہن کر سوتے ہیں وہ صبح مشکل ہی سے اٹھ سکتے ہیں۔ اور جو صبح سویرے مشکل سے اٹھتے ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ جا دفع ہو جا۔"

محمود جو اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا، دوسرے کمرے میں دفع ہو گیا اور بختیار خاں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔

رشیدہ نے میجر فرخندہ سے کہا "مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے، اسی لئے تھوڑی دیر کے لئے میں بھی اجازت چاہوں گی۔"

بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر انگلی اٹھا کر کہا "خبردار ـــــ کوئی ضرورت نہیں سامان پیک کرنے کی۔ آرام سے بیٹھو۔"

رشیدہ جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی چپ چاپ پھر بیٹھ گئی۔

مسعود نے کہا "آپ جوس لیں گے اباجی ــــ ایپل جوس"۔

"نو تھینک یو۔ مہربانی"۔ بختیار خاں نے ہونٹ سے کہا "میں کوئی بیمار ہوں جو ایپل جوس پیتا پھروں ــــ شکریہ"۔

پھر فرخندہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گریہ پائی کے ساتھ جا کر ڈرپ سٹینڈ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو اس نے گلوکوز کی الٹی لٹکی ہوئی بوتل کو دیکھا پھر قطروں کی ٹپکاٹ کو ذرا سا اور تیز کر دیا۔ بختیار خاں نے ایک جھرجھری لے کر ریس کے گھوڑے کی طرح ناک کے نتھنے پھلائے اور پھر کہنے لگے "آج دوپہر میں نے ریڈیو سٹیشن فون کیا تھا لیکن مجھے وہ خبیث ملا نہیں۔ سٹیشن ڈائرکٹر کہنے لگا وہ ہر روز یہاں نہیں آتے ہفتے میں ایک بار آتے ہیں۔ میں نے جھڑک کر کہا اوے تم سٹیشن ڈائرکٹر ہو کر اس کا پروگرام بند نہیں کر سکتے "تو وہ گھگھیا کر کہنے لگا ہماری تو بہت کوشش ہے سر لیکن ہمارے لسنرز اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا لعنت ہو تم پر اور تمہارے لسنروں پر"۔

پھر تھوڑا کا دیر رک کر بختیار خاں بولے "بڑا اندھیر ہے ڈاکٹر فرخندہ یہ بدبخت ہمارے نوجوانوں کو ترقی کرنے سے روک رہا ہے۔ کمپی ٹیشن سے نکال رہا ہے۔ دولت کے حصول سے منع کر رہا ہے۔ نوجوانوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہے اور ہر ہفتے ریڈیو سے بکواس کر کے چلا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو۔ انھوں نے محنت کی ہے، مشقت جھیلی ہے۔ بے میرٹ کے لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو۔ اس ملک سے ونج کر دو وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔ کامیابی ایسا خمیرہ مروارید ہے پروفیسر مسعود جس سے معاشرے کے ڈوبتے ہوئے دل کو تقویت ملتی ہے"۔

"اباجی آپ سو جائیں"۔

"سو نہ سکیں تو تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جائیں"۔

"چپ نہ رہ سکیں تو کوئی ذکر شروع کر دیں"۔

بختیار خاں نے اپنے بچوں کی باتیں سنی ان سنی کر کے کہا "پرسوں خانساماں کچن میں اس بدبخت کا پروگرام اونچی آواز میں لگا کر سن رہا تھا اور وہ اپنے مخصوص لہجے میں بکواس کر رہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی دونوں کو ہی برداشت کرنا ایک مشکل کام ہے۔ کامیابی کے ساتھ نشہ آتا ہے۔ شراب، ڈرگ، نارکوٹکس، پھر طلاق آتی ہے۔ اس کے بعد دوسری شادی بلکہ شادیاں..... بدمعاشیاں..... داداگیریاں... نوسربازیاں... لمبے لمبے سفر شروع ہو جاتے ہیں گھنے گھنٹے بعد دواؤں کا ورد ہونے لگتا ہے۔ جسمانی، روحانی، نفسیاتی عارضے بڑھ جاتے ہیں۔ مایوسی کے بادل چھانے لگتے ہیں..... اور آخر میں خودکشی آ جاتی ہے..... یہ ہیں کامیابی کی برکتیں اور ناکامی میں صرف ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے ــــ میں نے خانساماں سے چیخ کر کہا بند کرو اس کتے کی بکواس کو جو لوگوں کو دنیا سے الگ رہبانیت کا اور گوشہ نشینی کا درس دے رہا ہے"۔

رشیدہ نے دبی زبان میں کہا "اباجی، خانساماں آپ کے رویہ کی شکایت کر رہا تھا"۔

"کرے شکایت، شوق سے کرے"۔ اباجی نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا "مجھے کیا پرواہ ہے اس کی، میں اس کا نوکر ہوں؟ غلام ہوں؟ ایمپلائی ہوں؟ کوئی دبتا ہوں اس سے؟ کرے شکایت، کھل کے کرے۔ اس کی شکایت سے ڈر کر میں حق اور سچ کہنا نہیں چھوڑوں گا اور تم کے اعلان سے منہ نہیں موڑوں گا ــــ اب تم لوگ خود ہی فیصلہ کرو کہ جب میں کامیاب ہوا اس زندگی میں اور ایک نام پیدا کیا شہرت حاصل کی دولت کمائی، کارخانے لگائے تو کیا میں نے تمہاری ماں کو چھوڑ دیا؟ کوئی نئی شادی کی، کوئی بدمعاشی، کوئی نشہ، کوئی گھمنڈ کوئی طاقت کا ناجائز استعمال کیا؟ بتاؤ کیا؟ ــــ حالانکہ میں سب کچھ کر سکتا تھا، سب کچھ کروا سکتا تھا۔ اپنی ہر بات منوا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں کیا کچھ، نہیں منوایا کچھ۔ نہیں تقاضا کیا کوئی ــــ میں کوئی لمبے سفروں پر نہیں گیا ماسوائے اپنے ماہانہ بزنس ٹورز پر۔ میں نے کوئی گولیاں کھانا شروع نہیں کیں ماسوائے اپنی روزمرہ وٹامن کے۔ آئرن ٹونز کے۔

سوئنگ پاؤڈر گے۔ نیند کی گولی کے، اور اجابت صحیح کے لئے منرل آئل کے ایک چمچے کے۔" پھر انہوں نے سر تکیے سے ذرا اوپر اٹھا کر کہا "اوے میں کبھی بیمار ہوا اپنی زندگی میں۔ آج تک۔ اس وقت تک۔ کوئی ذہنی کوئی جسمانی عارضہ... کوئی فزیکل ڈیلیٹ... کسی قسم کی... بولتے کیوں نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا۔ بکواس کیوں نہیں کرتے... بولو... بولو... بولو۔ میری بات کا جواب دو.... بات کا جواب دو۔"

بختیار صاحب اس قدر اونچی آواز میں بولنے کے بعد بیہوش ہوگئے اور ان کے سرہانے مانیٹر کی بیپ تیز ہوگئی۔ ڈاکٹر فرخندہ نے جلدی سے ایک ٹیکہ ڈرپ کی نالی کو دیا اور پھر سارے اٹھ کر اباجی بختیار خاں کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں دو بہنیں اور مسعود بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے تھوڑی دیر میں خانساماں یخنی کی پیالی اور تحریری استعفیٰ لے کر آگیا۔ یخنی کی پیالی اس نے آپا رشیدہ کو دی اور استعفیٰ پروفیسر مسعود صاحب کے سامنے تپائی پر پھیلا دیا۔ میجر فرخندہ نے کاغذ پر نگاہیں ڈالے بغیر چن اپ کر کے سردار سے کہا "دیکھو سردار تم اباجی کی طبیعت کو تو شروع ہی سے جانتے ہو اور ہم سے بہتر جانتے ہو۔ پھر تم یہ عرضیاں لکھ لکھ کر کیوں لاتے ہو؟"

سردار نے تقریباً روتے ہوئے کہا "اب میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہوگیا ہے آپاجی۔ صاحب ہر وقت مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور میری ماں بہن پُنتے رہتے ہیں۔ میں بھی آخر عزت دار آدمی ہوں۔ بال بچوں والا ہوں۔ میں کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتا رہوں آپ مجھے آزاد کر دیں صاحب جی اور میری دعا لیں۔"

پروفیسر مسعود نے جھوٹ موٹ جھڑک کر کہا "اوے بکواس نہ کر احسان الٰہی جب ہم سارے یہ سب برداشت کر رہے ہیں تو تو کیوں نہیں کر سکتا؟ آخر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بھیدی ہیں پھر یہ استعفیٰ کس لئے؟"

مسعود نے خانساماں کا استعفیٰ پھاڑ دیا اور اس کے پرزے خانساماں ہی کے ہاتھ میں دے دیئے۔

میجر فرخندہ نے کہا "اس مہینے سے تم کو پچاس روپے ماہوار زیادہ ملا کریں گے کیونکہ تم ایک بیمار آدمی کی دیکھ بھال کر رہے ہو اور تمہاری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔"

خانساماں خوشی سے پھولا نہیں سمایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آپا رشیدہ واپس کراچی چلی گئی تھیں کیونکہ کرنل صاحب کے موتیے کا آپریشن ضروری تھا۔ انجینیئر محمود تھے تو سہی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اباجی بختیار خاں کی تیمار داری کا سارا بوجھ میجر فرخندہ اور پروفیسر مسعود پر تھا۔ حاضری تینوں ہی دیتے تھے لیکن محمود صاحب کی نہ تو کوئی رائے تھی اور نہ ہی وہ کوئی تجویز پیش کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اباجی کے بارے میں فکرمند نہیں تھے۔ وہ کافی پریشان تھے لیکن ان کے پاس اظہار کی کمی تھی۔

آج اباجی جسمانی طور پر پہلے سے بہتر نظر آتے تھے لیکن ان کی سوچ اسی مقام پر اٹکی ہوئی تھی۔ آواز ذرا دھیمی ہوگئی تھی لیکن جوش و خروش ویسا ہی تھا۔ انھوں نے تکیے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی مسکرانے کو بھی زور لگایا مگر دونوں ہی کام نہ ہو سکے۔ اپنے بچوں کو سامنے بیٹھا دیکھ کر کہنے لگے "مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمہیں پک کرنے جا نہ سکا۔ دفتر سے میں نے تم کو بہتیرے فون کئے مگر تم میں سے کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا اس لئے میں اکیلا ہی چینی ریستوراں چلا گیا۔ یہ رشیدہ کدھر ہے؟"

"آپا کراچی چلی گئی ہیں اباجی۔" میجر فرخندہ نے کہا "عادل بھائی کا آپریشن ہے۔"

"عادل کا آپریشن" بختیار خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اس کو کس آپریشن کی ضرورت آپڑی؟"

"موتیے کا آپریشن ہے اباجی" مسعود نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اب وہ لیزر سے یہ آپریشن کرتے ہیں۔ زیادہ دقت نہیں ہوتی۔"

"اچھا" بختیار خاں آنکھیں بند کر کے بولے "انسان اگر اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کرے تو اس کو کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی۔ مجھے بھی چائنیز مینو دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ میں مینو دیکھے بغیر نمبروں کے حساب سے آرڈر دیتا ہوں اور مجھے تقریباً سارے آئیٹم زبانی یاد ہیں لیکن کل رات میں نے بیرے کو ابھی آرڈر نہیں دیا تھا کہ مجھے کونے میں ایک ہیولا سا نظر آیا جو ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا ضرور لیکن کچھ سمجھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بیرے نے آکر مجھے کہا "وہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں"۔ میں آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ان صاحب کی طرف چل دیا۔ اور میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی فرخندہ جب میں ایک مدت کے بعد سکندر کو دیکھا۔ وہ ویسا ہی ہشاش بشاش اور نوبر نو تھا اس کے ساتھ اس کے دو مہمان تھے جو مجھے دیکھ کر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنے ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے —— تم تو سکندر کو اچھی طرح سے جانتے ہو مسعود؟"

"جی اباجی کیوں نہیں" مسعود نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن اس وقت میرے ذہن میں ان کی شکل کچھ ٹھیک سے نہیں آرہی۔"

"حد ہو گئی مسعود۔۔" بختیار خاں نے چڑ کر کہا "بھئی سکندر اعظم، مقدونیہ کے شہنشاہ فلپس کا بیٹا، فاتح اعظم!"

فرخندہ نے کہا "اباجی آپ باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحب منع کر گئے ہیں۔"

اباجی نے فرخندہ کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا "اس کے ساتھ چوڑے رخ کی ٹوپی لگائے نپولین بونا پارٹ تھا اور ساتھ ننگے سر ماوزے تنگ تھا جس نے بند گلے کی موٹی بش شرٹ اور اسی کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ اونچا کر کے کہا "عمل و حرکت اور فعل و اقدام کے پاسبانو میرا سلام قبول کرو اور میرے مقدر کے ستارے پر نگاہ ڈالو کہ میں کرۂ ارض کے عظیم ترین راہنماؤں کی محفل میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں"۔ انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا سلام قبول کیا لیکن منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔

فرخندہ نے کہا "اباجی آپ نے اپنا گرین کیپ شول لے لیا؟"

اباجی نے کہا "جب بیرا مینو لے کر آیا تو میں نے کہا آج آپ تینوں میرے مہمان ہیں اور میں نہایت ادب کے ساتھ شرف میزبانی کے حصول کی درخواست کرتا ہوں۔ سکندر نے اور ماؤ نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بونا پارٹ کہنے لگا۔ میں معذرت چاہتا ہوں خان صاحب آج میری طبیعت ذرا بوجھل ہے اس لئے میں کھانا نہیں کھاؤں گا البتہ آپ کے ساتھ بیٹھوں گا ضرور۔ میں نے کہا "آپ صرف لائٹ قسم کا سوپ لے لیجئے، چکن بروتھ یا تھائی سوپ"۔ نپولین نے کہا "میں محفلوں اور ضیافتوں میں کبھی بھی کھانا نہیں کھاتا۔ کیونکہ میں اپنا دایاں ہاتھ ہمیشہ اپنی واسکٹ کے اندر رکھتا ہوں۔ یہ دیکھیئے، اس نے اپنا ہیٹ ہلا کر کہا میں اپنی ہر واسکٹ کے درمیانی دو بٹنوں کا فاصلہ زیادہ رکھواتا ہوں تاکہ میرا ہاتھ آسانی سے اندر داخل ہو سکے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ ماحضر تناول کریں میں آپ کو کمپنی دوں گا۔" جب ماؤ بیرے کو آرڈر لکھوا چکے تو میں نے سکندر اعظم سے کہا۔ یہ علاقہ تو آپ کا دیکھا بھالا ہے اور آپ اسے فتح کر چکے ہیں اس لئے آپ کو تو کوئی دقت نہیں ہوگی۔۔۔ اس نے مسکرا کر کہا "آپ کا یہ علاقہ تو میں نے فتح نہیں کیا تھا، البتہ اس کے سارے بالائی حصے میرے زیر نگیں تھے۔ میں نے سلیوکس کو ایک بلو پرنٹ بنا کر دیا تھا کہ اگلی مرتبہ جب میں آؤں گا تو یہ سارا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں داخل کروں گا لیکن واپسی پر سا ہیوال کے کچھ جانگلیوں سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان لوگوں کے پاس باقاعدہ تو کوئی ہتھیار تھے نہیں۔ ڈانگوں کے ساتھ سن کی رسیوں سے چھریاں باندھ کر بلمیں سی بنا لی گئے تھے۔ اس وقت گو میری سپاہ تھک چکی تھی پھر بھی ہم ان جانگلیوں سینہ سپر ہو کر لڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ میں نے کہا سکندر صاحب اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی کم فوج کے ساتھ آدھی دنیا کو فتح کر لینا صرف آپ کے جوش عمل کی وجہ سے ہوا ورنہ یہاں تو کالے پہاڑ ایسے ہاتھیوں کی لاتعداد فوجیں تھیں۔ سکندر نے کہا "بس جی کیا عرض کریں

خاں صاحب یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ ایک جانگلی کی برچھی میرے کندھے میں لگی اور دو تین انگل اندر اتر گئی۔ میں نے گھوڑا چڑھا کر اس جانگلی کا تو خاتمہ کر دیا البتہ اس زنگ آلود برچھی سے مجھے سیپٹک ہو گیا اور تیز بخار نے میرا دماغ شل کر دیا۔ پھر میں آپ کے علاقے پر دوسرا حملہ کرنے کی حسرت دل ہی میں لے گیا۔" نپولین نے کہا "یہ سب قسمت کے کھیل ہیں اور جو کچھ ہونی کرتی ہے وہ ہو کے رہتا ہے۔ میں نے سارے یورپ کے چھکے چھڑا دیئے۔ مصر کے ابوالہول میرے دبدبے کے آگے اپنی ٹوٹی ناک رگڑنے لگے لیکن ہوا وہی جو تقدیر میں لکھا تھا۔ اپنی ساری تیاری، کوشش ہمت اور پلاننگ کے باوصف میں روس میں پھنس کے رہ گیا۔ وہاں سے واپسی بڑی ذلت کی واپسی تھی۔ پھر واٹرلو کے مقام پر دو ٹکے کے نیلسن نے میری ہیرے جیسی فوج کی آن بان کو مٹی میں ملا دیا۔" ـــــ ماؤ نے کہا "کسی ملک پر فوج کشی کرنا اور قلعوں اور محلوں کے محاصرے کر کے جنگجو محافظوں سے ہتھیار ڈلوانا، اپنی دھرتی سے مگ طیارے اڑا کر دشمن پر بمباری کرنا اور اپنے گھر کے صحن سے راکٹ لانچ کرنا بڑا ہی آسان کام ہے لیکن ذلتوں اور پستیوں میں ڈوبی ہوئی اپنی قوم میں انقلاب لانا مشکل ہی نہیں ناممکن بات ہے۔ میں نے گراں خواب چینیوں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کر کے ایک زندہ قوم میں تبدیل کر دیا۔ ان کو لانگ مارچ کی سوئی کے ناکے سے گذار کر ایک سپر پاور بنا دیا ـــ لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔" "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کامریڈ" میں نے چلا کر کہا اور کھانا کھاتے ہوئے لوگ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بختیار خاں" ماؤ نے بڑے تحمل سے جواب دیا "لوگ انقلاب کا ذکر بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن جب وہ آ جائے تو اسے پسند نہیں کرتے۔" ـــــ سکندر اعظم نے ڈرم سٹک کی بوٹی منہ سے نکال کر کہا "کیسی باتیں کرتے ہو یار، تمہاری قوم تو تمہیں پوجتی ہے۔ اگر وہ تمہیں ایک دیوتا نہیں سمجھتی تو ایک پیغمبر ضرور خیال کرتی ہے۔" نپولین نے کہا "ہم بادشاہ لوگ اور فاتح لوگ تو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن انقلابی لیڈر تو لوگوں کے دلوں میں محبت اور مروت کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں، وہ تو امر ہو جاتے ہیں۔" ـــ میں نے بونا پارٹ سے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں نپولین! ماؤزے تنگ صاحب کی تو چین میں پرستش ہوتی ہے۔ لوگ ان کے جذبۂ حب الوطنی اور خلوص وایثار کو اب تک یاد کرتے ہیں اور جو جو قربانیاں انھوں نے چین کو آزاد کرانے میں دی ہیں اور جس ہمت اور جوانمردی کے ساتھ انھوں نے امریکا کی مکروہ سیاست اور ثقافت کو اپنی سرزمین سے دور رکھا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔" ـــــ سکندر اعظم نے کانٹا روک کر پوچھا "کیا ژم تم نے چلائی تھی ماؤ امریکا کے بارے میں؟" "میں انھیں پیپر ٹائگر کہتا تھا" ماؤ نے کہا "اور یہ اس وجہ سے کہتا تھا کہ میرے لوگوں کے دل سے امریکا کی بڑائی اس کی امارت اور اس کی جارحانہ صلاحیت کا خوف دور ہو جائے اور وہ کم از کم پوری ایک صدی تک امریکا کو چین کی سرزمین سے دور رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق ملک چلا سکیں۔" "اور اسی طرح سے ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "جب کوئی عمل نیک نیتی سے اور خلوص سے اور لگن سے کیا جاتا ہے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جو اس وقت چین میں روز روشن کی طرح نظر آ رہا ہے۔ ہم پاکستانیوں کو تو چین کی دوستی، اور چین کے عمل اور چین کی راست روی پہ فخر ہے۔" "لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے خاں صاحب" نپولین نے واسکٹ سے ہاتھ نکالے بغیر کہا کہ "چین میں جو کچھ ماؤ نے کیا اور چین کو جس طرح ماؤزے کرچلا اور چین جس انداز سے لال کتاب کی حدت میں تپ کر فولاد بنا وہ اپنی اس منزل سے واپس بھی لوٹ سکتا ہے جس طرح روس سے میری مراجعت ہوئی تھی۔"

"یہ تو خیر نہیں ہو سکتا۔" ماؤ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے جواب دیا "یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ ساٹھ ستر سال گذرنے کے بعد لوگ بور ہو کر اپنے عمل پر نظر ثانی شروع کر دیں اور میری تعلیمات میں بدعتیں تلاش کر کے الگ سے ایک ٹولہ بنا لیں ـــ لیکن ابھی اس میں بہت دیر لگے گی۔" "آپ نے کام ہی ایسا پکا کیا ہے کہ اب اس کی چولیں کبھی بھی ڈھیلی نہ ہو سکیں گی۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ اب ان کی تعلیمات کا اثر ایشیا سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ کیوں ٹھیک کہا ناں میں نے؟"

"جی اباجی" مسعود نے ہونے سے کہا اور اپنی گھڑی میں اگلی خوراک کا وقت دیکھنے لگا۔

اباجی تھوڑی دیر تک تو آنکھیں بند کئے لیٹے رہے، اچانک ایک بار پھر ان کا ٹل کھل گیا کہنے لگے "یہ بونا پارٹ بھی عجیب مسخرا آدمی ہے۔ آدہ

پون گھنٹہ ہماری باتیں سننے کے بعد بولا "بھائی صاحب میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کے بنائے ہوئے اصول اور ضابطے، پلان اور منصوبے فلسفے اور ہنر مندیں انسان کے دکھوں کا علاج نہیں کر سکتے۔ انسانوں کے لئے تو کچھ اوپر ہی سے بن کر آنا چاہیئے۔ کوئی زائچہ، کوئی صحیفہ، کوئی پلان، انسانی تجویزیں تو بڑھے بیل کی طرح جلد ہی گوڈا ٹیک جاتی ہیں"۔۔۔ مجھے نپولینؔ کی یہ بات سُن کر رونا آ گیا اور میرا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "فاتح بروشیا! یہ تم کیا رجعت پسندوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔ انسانوں کے مسائل انسان ہی حل کر سکتے ہیں اور انسانوں کے دکھ درد کا علاج انسان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی آسمانی قوت یا آفاقی طاقت زمین کے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان صرف اپنی محنت سے، اپنے زورِ عمل سے، سرگرمی اور جانفشانی سے، مشقت اور دوڑ دھوپ سے اپنی راہوں پر چراغاں کر سکتا ہے، اور اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے"۔ "میری بھی یہی سوچ تھی" ماؤ نے کہا "لیکن اب مجھے انسانی کوشش اور انسانی تجویز بالکل بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی تجویز کی کوشش، محنت، اور جدوجہد کا نتیجہ اکثر کٹی کاٹ جاتا ہے اور مجھے اس فیکٹر کی تلاش ہے جو تیجے کی کٹی کٹوا دیتا ہے"۔ میں نے ماؤ کا یہ فقرہ سن کر چھری کا نا ہاتھ سے رکھ دیا، اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلا۔ سکندر اعظم نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا بات ہے بختیار خان تم رو کیوں رہے ہو۔ کیا کہا ان لوگوں نے تم سے؟" میں نے سکندر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح ماؤ اور بونا پارٹ پر لپکا کہ کوشش، محنت، مشقت اور جدوجہد چھوڑ کر انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے۔ غاروں میں چلا جائے جنگلوں میں نکل جائے، رہبانیت اختیار کرلے، جامد ہو جائے، پتھر بن جائے اور ترقی نہ کرے، آگے نہ بڑھے، روشنی نہ پھیلائے۔

بونا پارٹ نے کہا "جب میں نے مصر فتح کیا تو مجھے وہاں کے لوگوں سے پتہ چلا کہ انسانوں کے لئے اوپر سے دو کام ہی تجویز ہوتے ہیں امر کے مطابق کرتا جائے اور مناہی کو چھوڑتا جائے"۔

"اور ترقی نہ کرے آگے نہ بڑھے کوشش نہ کرے"۔

نپولینؔ نے کہا "ترقی تو پیچھے سے خود بخود چلی آ رہی ہے اپنی عادت اور سنت کے مطابق، زوردار ہوا کی طرح۔ ہمیں تو صرف اوامر اور نواہی کی ڈور کو تھام کے رکھنے کا حکم ہے، پتنگ تو خود بخود اوپر چڑھتی جائے گی ہوا کے زور پر۔ ہم تینوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ڈور کا تو کوئی دھیان نہیں کیا اور پتنگ کو اوپر اٹھانے اور پھدک پھدک کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتے رہے"۔

سکندر اعظم نے کہا "یہ کیا چیز ہوتی ہے جس کا تم نے ابھی نام لیا اور جس کی ڈور تھام کر رکھنے کا حکم ہے"۔

بونا پارٹ نے کہا "یہ ڈوز اور ڈونٹس کا ایک مینوئیل ہے جو مصر والوں کے پاس تھا"۔

"پھر تم نے لیا کیوں نہ ان سے یہ مینوئیل؟" سکندر نے پوچھا۔

"وہ عجیب سے لوگ تھے" نپولینؔ نے کہا "اپنی ہی بدمستیوں اور خرمستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ مینوئیل کہاں ہے اور کس کے پاس ہے"۔

"ان کو ٹکٹکی پر کسنا تھا، ان کا غذی شیروں کو" ماؤ نے غصے سے کہا۔

"میں نے ان کو مشکیں باندھ کر کیمپ حاضر کر دیا تھا لیکن وہ سارے اول درجے کے لوگ تھے۔ سارے کا سارا گروہ بھلکڑ سے لوگوں پر مشتمل تھا، کوئی کہتا تھا میرے دادا کے پاس ہوتا تھا یہ مینوئیل۔ میں نے دیکھا ضرور ہے لیکن پھر پتہ نہیں کہاں گیا۔۔۔ ایک عورت کہتی تھی میری نانی کے سسرال والے اسے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ سارے مر کھپ گئے۔ اب پتہ نہیں کس کے پاس ہو گا"۔

"اسے تلاش کرنا بونا پارٹ۔۔۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آتا"۔

"یہ تمہارے زمانے کی چیز نہیں سکندر، تم سے بعد کی ہے" نپولینؔ نے کہا "اس میں انسان کی زندگی کا مکمل زائچہ موجود ہے، اور ترقی کے لئے

اور آنے والے زمانوں کے لئے کھلا راستہ دے دیا گیا ہے۔"

"میں نے استاد زماں سے ایک ایسا ہی مینوئل بنانے کی درخواست کی تھی۔" سکندر نے کہا "اور انھوں نے بنایا بھی... لیکن وہ چل نہیں سکا۔"

"یہ ارسطو کے بس کا روگ نہیں تھا سکندر اور نہ ہی یہ کسی اور انسان کے بس کی بات ہے..... اصل میں یہ ایک اور ہی چیز ہے...."
میں نے چیخ کر کہا "تم مسلمان تو نہیں ہو گئے بونا پارٹ، ایک فنڈا مینٹلسٹ قسم کے مسلمان۔"
نپولین نے ہنس کر کہا "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مسلمان ہونے کی اور مجھے کیا خوشی مل سکتی ہے اس گروہ میں داخل ہونے سے؟ پہلے ہی اس دنیا میں کروڑوں مسلمان موجود ہیں اُنھوں نے کیا کر لیا۔"
سکندر نے کہا "اگر یہ مینوئل میرے زمانے میں ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں ساری دنیا کو فتح کرنے کے بجائے سارے کرۂ ارض کو سوکھا کر دیتا۔"
پھر اس نے ذرا سا سوچ کر کہا "مجھے میرے حضرت دیوجانس کلبی نے ایک مرتبہ فرمایا بھی تھا......"
"لیکن میں نے اُسے مزید بات کرنے موقع نہیں دیا۔ غضب خدا کا، ایسے باہمت، باعمل اور نبرد بیکار کے سمبل، عمل و حرکت کے دیوانے طرفداران عمل اور موضوع کیا چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ میرے مہمان تھے اور بہت ہی معزز مہمان تھے ڈاکٹر فرخندہ، لیکن پتہ نہیں ان کو ہو کیا گیا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو آ رہے تھے۔ ویسے ایسے ہو سکتا ہے پروفیسر؟"
"جی ضرور ہو سکتا ہے۔" پروفیسر مسعود نے کہا "ہو کیوں نہیں سکتا۔ زندگی میں سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔"
"لعنت ایسی زندگی پر۔" بختیار خاں نے چڑ کر کہا "جو موج آگے بڑھنے کے لئے بنی ہے وہ پیچھے کیسے جا سکتی ہے۔"
"اباجی" پروفیسر مسعود نے ذرا تگڑے ہو کر کہا "زندگی کوئی جامد چیز تھوڑی ہے کہ حکم کے تحت ایک ہی مقام پر پڑی رہے۔ یہ تو ایک رواں دواں کائنات ہے۔ آگے بھی جاتی ہے پیچھے بھی آتی ہے۔ دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف گھوم جاتی ہے۔ نہ آگے کوئی حد ہے نہ پیچھے، زندگی جو ہوئی اباجی۔"

اباجی بختیار خاں نے اپنے جاہل بیٹے کو جھڑکی دینے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ان کے پپوٹے اُٹھ نہ سکے۔ انھوں نے نفرت اور ناراضگی کی چند تیوریاں اپنے ماتھے پر ڈالیں اور چھوٹے بڑے سانس لینے لگے۔
خانساماں سوپ کی ٹونٹی دار پیالی لے کر اندر آیا تو میجر فرخندہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پیالی تپائی پر رکھنے کے لئے کہا۔ وہ الوؤں کی طرح دیدے گھما کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اور احمق پنے سے اپنی باچھیں پھیلاتا اور سکیڑتا پیالی ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسعود نے سر کے اشارے سے فرخندہ کو سمجھایا کہ ٹھیک ہے۔ اسے جانے دو۔

رات تک تو اباجی ٹھیک رہے اور رات کو اپنا جوس اور سوپ لے کر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے لیکن دوائیں لینے کے بعد ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ میجر فرخندہ نے ان کو ڈرِپ لگانے کی کوشش کی تو انھوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر جب وہ ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی تو سر کے اشارے سے روک کر اپنے بستر سے اٹھا دیا۔ فرخندہ نے ان کا پپوٹا کھول کر آنکھ کا معائنہ کرنا چاہا تو انھوں نے کافی مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اٹینڈنٹ نرس کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب ابھی رہنے دیں تھوڑی دیر بعد آکر چیک کر لیجئے گا۔"
بختیار خاں نے بھرپور آواز میں پوچھا "اور کون ہے تمہارے ساتھ فرخندہ" تو نرس نے کہا "میں ہوں سر فرزانہ۔"
"ٹھیک ہے۔" انھوں نے مربیانہ انداز میں پوچھا "اپنی ڈیوٹی پر آگئی ہو"
"جی سر۔"

میجر فرخندہ نے فرزانہ کو دروازے کے پاس بلا کر کہا "دیکھو میں اپنے کمرے میں ہوں۔ اگر اباجی کو ذرا سی بھی بے چینی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب" فرزانہ نے مدھم آواز میں کہا "مجھے معلوم ہے۔"

میجر فرخندہ چلی گئی تو فرزانہ نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ناول سے خلال کی نشانی نکالی اور مریض پر ایک نظر ڈال کر ناول پڑھنے لگی۔ اس وقت ناول میں بلی کتوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔

صبح سویرے، فجر کی اذان کے ساتھ اباجی بختیار خاں کی حالت غیر ہو گئی اور ان کی سانس رک رک کر چلنے لگی۔ چند لمحے تو فرزانہ نے ان کی نبض دیکھ کر اور ان کا بی پی چیک کر کے گزار دیئے لیکن جب ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں تو وہ گھبرا کر ڈاکٹر فرخندہ کو جگانے چلی گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ ہڑبڑا کر اٹھی تو اس نے فرزانہ کی شکل دیکھ کر اسے محمود بھائی اور مسعود بھائی کو بھی اٹھانے کے لئے کہا۔ اباجی کے کمرے میں پہنچ کر فرخندہ نے مریض کی حالت دیکھی تو لپک کر گیلری میں پڑے فون پر ڈاکٹر قدیر کو اطلاع دی۔ اور جب وہ فون کر کے واپس مریض کے کمرے میں گئی تو محمود بھائی اور مسعود بھائی دونوں ہی وہاں موجود تھے اور اباجی کے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ محمود نے ہاتھ کے اشارے سے فون کی بابت پوچھا تو فرخندہ نے سر ہلا کر کہا "کر دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب پہنچ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک تینوں اسی طرح اپنے باپ کے گرد کھڑے رہے اور فرزانہ چارٹ میں کچھ بھرتی رہی۔ پھر اچانک مریض کا سانس نارمل ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کر کے اور پتلیاں گھما کے تینوں کو باری باری سے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا "ڈاکٹر قدیر کو فون کیا؟"

"جی اباجی" ڈاکٹر فرخندہ نے جواب دیا۔

"پہنچ رہا ہے؟"

"جی، بس آ رہے ہیں۔"

"جاگا ہوا تھا؟"

"جی، نماز پڑھ کر سیر پر جانے والے تھے۔"

"اب تو سیدھا یہاں آئے گا ناں؟"

"جی اب تو سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتی بجھا دو اور کھڑکیوں سے پردے ہٹا دو۔ باہر سے بڑی اچھی روشنی آ رہی ہے۔"

"جی بہت اچھا۔"

میجر فرخندہ کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگی تو فرزانہ نے اپنی سیٹ سے اچھل کر فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹھہریں ڈاکٹر صاحب یہ میں کر دیتی ہوں، آپ آرام سے بیٹھ جائیں"۔ ڈاکٹر فرخندہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور نرس فرزانہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر قدیر تشریف لے آئے تھے اور فرزانہ ان کا بیگ اٹھا کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے مریض کا چارٹ دیکھا۔ پھر ڈاکٹر فرخندہ سے پوچھا "خاں صاحب نے رات کیسے گزاری؟"

"بے چینی میں۔ بڑی بے چینی میں۔" بختیار خاں نے مجسم کراہ بن کر کہا "یہ رات بہت ہی لمبی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب، بڑی مشکل سے صبح کی ہے۔"

"ویسے تو آپ ٹھیک ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"ویسے ٹھیک ہوتا تو آپ کو کیوں فون کرواتا"، بختیار خاں نے چڑ کر کہا "مجھے آپ کے درشنوں کا شوق تو نہیں ہے"!

ڈاکٹر کی آمد کا سن کر مسعود اور محمود بھی اندر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر کم خوابی کے اثرات نمایاں تھے اور وہ کچھ بیزار سے نظر آ رہے تھے ڈاکٹر قدیر نے محمود کی طرف رخ کر کے کہا "انھیں ہسپتال شفٹ کرنا پڑے گا محمود صاحب اور نیورو فزیشن اور نیورو سرجن کو کنسلٹ کرنا ہوگا۔ میں انھیں فون کر دیتا ہوں"۔ محمود نے اثبات میں سر ہلایا تو اباجی بختیار خاں نے چڑ کر کہا "مجھے کوئی دماغی عارضہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ جو آپ مجھے نیورو فزیشن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا سی ہارٹ کنڈیشن ہے جو بلڈ پریشر کی زیادتی سے پیدا ہو گئی ہے۔ میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔ آپ میری دوائیں تبدیل کر دیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خاں صاحب" ڈاکٹر قدیر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "میں دوائیں تبدیل کر دیتا ہوں لیکن ایک دوسری اوپینین لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

بختیار خاں نے ڈاکٹر صاحب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں بند کئے اُسی طرح لیٹے رہے۔ سب نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور مزید خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر آلٹ پلٹ کے چارٹ دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور فرزانہ جھک کر کمبل کے کنارے گدے تلے دبانے میں مصروف ہو گئی۔

اباجی بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر آہستہ سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب چلے گئے؟"

"جی نہیں"، ڈاکٹر قدیر نے کہا "میں موجود ہوں۔"

"کل شام عصر اور مغرب کے درمیان ڈاکٹر صاحب" بختیار خاں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا "برانڈرتھ روڈ پر قارون صاحب سے ملاقات ہوئی"

"قارون سے؟" ڈاکٹر قدیر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب، قارون سے ـــــ میں نے پہلے تو انھیں کبھی نہیں دیکھا لیکن کل اچانک ان کی زیارت ہو گئی۔ وہ سرخ و سیاہ رنگ کی اوپن بگھی میں زر بفت کا قیمتی گاؤن پہنے کھڑے تھے اور سینکڑوں معززین علاقہ ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ یہ اوپن بگھی ولیمنی نے خاص طور پر ان کے لئے بنا کر بھیجی تھی اور اس کے دونوں طرف ریشم اور کمخواب کی جھولیں لٹک رہی تھیں۔ لوگ اہلاً وسہلاً و مرحبا کہتے ہوئے ان کی گاڑی کے ساتھ ہو لئے جا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے تیس چالیس چاق و چوبند باوردی ملازموں کا ایک دستہ ان کی گنجیوں کی بھاری بھرکم چین اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کیا لیکن انھوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔ معززین کے گروہ جو اس کی گاڑی کے اردگرد تیز تیز چل رہے تھے، ایک دوسرے سے کہتے جا رہے تھے، کیا ہی خوب ہوتا اگر یہ دولت، یہ ساز و سامان، یہ کر و فر، یہ مال و زر ہم کو بھی ملتا اور ہم بھی قارون کی طرح عیش کرتے ـــــ تیز رفتار گروہ میں سے ایک نے نعرہ لگایا "صاحب نصیب!" اور ہم سب نے مل کر جواب میں نعرہ لگایا "خوش نصیب، خوش نصیب"۔ نوجوان نے نعرہ مارا "بھاگ بھرا اور طالع مند"، ہم نے جواب میں نعرہ مارا "قسمت والا دولتمند" نوجوان نے کہا "ذی ثروت سرور ہے" ہم نے کہا "دھن والا زردار ہے۔ دھنی ہے مایہ دار ہے"۔ قارون ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا ہمارے نعروں کا جواب دیتے جا رہے تھے اور ہمیں بے چین ہو کر ساتھ ساتھ بھاگنے سے روک رہے تھے کہ چلو مزدر مگر آہستہ چلو۔ ہمارا یہ قافلہ برانڈرتھ روڈ سے شاہ عالمی کی طرف جا رہا تھا اور لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس جلوس میں شریک ہو رہے تھے۔ ہر شخص مسرور و شاداں تھا اور ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اتنے بڑے بڑے مرتبے والے مالدار اور زردار امیر و امراء کے جلوس میں بھاگنا اتنی بڑی سعادت تھی جو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوئی جنھوں نے آپ کی زیارت کی ـــــ آپ سن رہے ہیں ناں میری بات ڈاکٹر صاحب؟"

"جی جی سن رہا ہوں" ڈاکٹر قدیر نے کہا "بڑے غور سے سن رہا ہوں"!

"لیکن ڈاکٹر صاحب کراون بس اڈے سے ذرا آگے بابا غلام محمد ٹنڈا لوہے کچرے کا ٹھیلہ دھکیلتا ہوا چلا آرہا تھا۔ لوگوں نے لپک کر اس کا ٹھیلہ ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت بھاری تھا اور آپ کی سواری قریب پہنچ گئی تھی۔ بابے ٹنڈے نے روزمرہ کا معمول سمجھ کر اپنا ٹھیلہ ہجوم میں سے گزارنا چاہا تو آپ کی پجیرو اس کے آدھ ٹن وزنی ٹھیلے سے رک کر کھڑی ہو گئی۔ جب بابے گاموں نے جھومتے ہوئے لوگوں کا گیت سنا: دھن والا زردار ہے، دھن ہے مایہ دار ہے، سلام ہو سلام ہو۔ ہم پر بھی انعام ہو ____ تو بابے غلام محمد نے میلے سلوکے سے اپنا واحد بازو اوپر اٹھا کر اور ہاتھ کی اوٹ سے آنکھوں کی دھوپ روک کر اونچی آواز میں ہم سے کہا "اوئے تمہارا ناس جائے تم اس دولت پر کیا للچاتے ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب اس دنیا کی کمائی سے ہزار درجہ بہتر ہے اور یہ نعمت ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی حرص و طمع سے صبر کرتے ہیں" ____ قارون صاحب نے تو اس بات کا بُرا ماننا ہی تھا ہم سب کو بھی اس احمق کی جسارت پر بڑا غصہ آیا سنہرے مستقبل کی طرف بڑھنے والے نوجوانوں نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا۔

نقرا ہے نادار ہے
مورکھ اور نادان ہے
بابا گاموں ڈھانڈا ہے
عقل کے نام پہ آنڈا ہے

جب شور ذرا تھما اور قارون صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا تو بابا گاموں بجسم تحیر ٹکر ٹکر قارون صاحب کو دیکھے جا رہا تھا اور اپنے ٹھیلے سمیت وہیں جما کھڑا تھا۔ قارون صاحب نے کڑک کر کہا "او مفلس، کنگلے، بھوکے، شودے، دہاڑی دار! تجھے پتہ نہیں میں کون ہوں؟" تو گاموں نے اپنا واحد بازو ہوا میں لہرا کر احمقوں کی طرح جواب دیا "مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے قارون کہ تو کون ہے۔ لیکن اپنے آپ پر اور اپنی ذات پر اتنا گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر خدا نے اپنی مہربانی سے اور اپنے کرم سے تم کو اتنا دے رکھا ہے تو اس میں کچھ اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دے اور اس دنیا میں آخرت کی جستجو بھی کر۔ اور اس دنیا سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا نہ بھول" پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا "میری بات کان کھول کے سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا۔ میرا اسوہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" ____ پھر ڈاکٹر صاحب! قارون صاحب نے پجیرو میں کھڑے کھڑے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کیا اور مائیک پر فرمایا "اے لوگو غور سے سن لو اور اچھی طرح سے جان لو کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی عقل اور ہنرمندی سے ملا ہے اور یہ سارا مال میں نے اپنی دانش کے زور پر جمع کیا ہے اور کوشش، جد وجہد، سعی مسلسل کا جو علم مجھے حاصل ہے اور جس کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سازگار کر کے اپنے آپ کو سنوارتا، اپنی ذات کو ابھارتا اور اپنے مال کو انبارتا رہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اس علم سے اور اس حکمت سے حاصل ہوا ہے۔ میں اپنی محنت، کوشش، تگ و دو، تجویز اور تن دہی سے حاصل کیا ہوا مال کیوں کسی کو دوں اور اپنے علم، اپنی ہنرمندی اور اپنی عقل پر کیوں نہ ناز کروں؟" ڈاکٹر صاحب میں تو حیران رہ گیا! آپ سُن رہے ہیں ناں؟"

"جی جی میں سن رہا ہوں!"

"آپ غور سے سن رہے ہیں ناں جو انھوں نے فرمایا؟"

"جی میں نے ایک ایک بات غور سے سنی ہے اور ہر ہر فقرے پر غور کیا ہے!"

کیا شان تھی ان کی ڈاکٹر صاحب۔" اباجی بختیار خاں نے کہا" اور کیا رعب اور جلال تھا ان کے چہرے پر، اور کیا روشنی تھی ان کے ماتھے پر خود سازی اور خود مختیاری کی کہ میں تو ششدر رہ گیا۔ ان کے اندازِ گفتار اور عظمت کردار نے مجھے ان کا گرویدہ کر لیا۔ وہ انسان تو نہیں نظر آ رہے تھے ڈاکٹر صاحب، عزم و ہمت، خود شناسی، علم و حکمت اور فہم و فہمید کے دیوتا نظر آتے تھے —— میں اس عمر اور اس بیماری کے باوجود ان کی بگھیرد کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا، نہ میری سانس پھولی، نہ ہارٹ بیٹ میں اضافہ ہوا، نہ بلڈ پریشر بڑھا اور نہ ہی میں نے تھکاوٹ محسوس کی۔ وہ ایک عجیب سماں تھا، عجیب منظر تھا اور عجیب وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب دنیا کی ایک مقتدر، مقدس، محترم اور ذی عزت و عالی خیال ہستی مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھی اور میں ساون کی برکھا میں نہاتے بچے کی طرح شاداں و فرحاں ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ پتہ نہیں اب ان کی زیارت نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر یہ موقع ہاتھ آتا ہے کہ نہیں۔ اور پھر مرے بھاگ جاگتے ہیں یا نہیں کیونکہ اب تو میں زندہ ہی اس پر ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ان کی زیارت ہو جائے اور میں اور بھی قریب سے ان کو دیکھ لوں، ان سے مل لوں، ان سے بات کر لوں۔"

یہ کہہ کر اباجی بختیار خاں خاموش ہو گئے اور ان کے ہونٹوں پر پپڑی سی جم گئی۔ ڈاکٹر قدیر نے گھڑی دیکھی اور اہل خانہ سے کچھ کہے بغیر مریض کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

پورچ کی طرف چلتے ہوئے جب پروفیسر مسعود نے ڈاکٹر قدیر سے پوچھا کہ اباجی کو کس وقت ہسپتال شفٹ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا "میرا خیال ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کل تک انتظار کر کے پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

کیا کیا رنگ محبت کے ہیں

ام عمارہ

"ہمارے پاس ہے کیا، جو کریں فدا تجھ پر، مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں
"مستعار رکھتے ہیں ــــ ارے ہاں مستعار ــــ!"
"کان کھالئے۔ کیا مصیبت ہے بھئی!"
"کوئی بھی کان نہیں کھائے ہم نے۔ ہر وقت کی شکایت ــــ بھئیا یہ کیا، جب دیکھو ہمارے خلاف ایک ہی بات کہ جینا اجیرن کر دیا ہے۔ ہر وقت کی روں روں ــــ چار طرح کی آوازوں نے بیچ بیچ کان کھالئے جیسے ــــ"
"اونہہ۔ خواہ مخواہ ہی ــــ" اس نے ذرا بلند آواز میں سوچنا شروع کر دیا۔

بلا وجہ کا رعب۔ ہم بھلا ان کا دیا کھاتے ہیں۔ پھر کیوں نہیں۔ ہاں اور کیا۔ یہاں ہے کیا۔ آپ کمایا، آپ کھایا ــــ اور سب کی عزت کی۔ یہ بھائی ہیں۔ وہ باپ ہیں ــــ ہیں تو پھر ــــ پھر ہم کیوں ڈریں۔ دیو تو نہیں کہ نگل جائیں گے۔ ایک دن ہوتا ہے چھٹی کا۔ وہ بھی ان کی مرضی سے گذاریں ــــ نا بابا ــــ یہ نہیں ہوگا۔ بھیا تو بس ہمیں اپنے ہی جیسا دیکھنا چاہتے ہیں ــــ ہاں ہم ان کی طرح ــــ بھلا ہم کیوں ــــ بس بھئی ہم تو ــــ

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگی ــــــــ"

"مگر یہ زندگی ــــ مستعار ــــ ارے ہاں مستعار ــــ رکھتے ہیں!"
"رحم کرو، کسی کو تمہاری اس مستعار زندگی سے دلچسپی نہیں۔ بس چپ کر جاؤ۔"
"نہیں بس، تم اٹھ جاؤ ــــ"
"سونے بھی نہیں دیتیں بڈھو۔ ساری رات دفتر میں جاگو اور اب صبح ہی صبح تم بھئی کیا کرتی ہو ــــ" خدا الرحمٰن نے رضائی کھینچ کر منہ ڈھانپ لیا۔
"کیا نحوست ہے بھیا۔ دن کے دس بج رہے ہیں صبح کب کی رخصت ہو گئی اور اب تو ہم دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہے ہیں بھلا کب تک تمہارے پر اٹھے پر سے مکھی ہنکاتے رہیں ــــ ہاں!"
"مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں ــــ ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں ــــ"
"بابا تم کسی پر کچھ فدا مت کرو۔ بند کرو اپنا یہ منحوس شعر۔ کان کھالئے میرے۔ سونے دو خدا کے لئے!" خدا الرحمٰن نے لحاف ہٹا کے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

غدا، الرحمن نے جو اس کا بھائی تھا اور جسے اس کا باپ کرنل عباس، اپنے جیسا فوجی بنانا چاہتا تھا۔ فوجی بننے کی بجائے اپنی مرضی سے ایک چھیچھڑ اخبار میں نائٹ شفٹ انچارج تھا اور صبح کے تین بجے تک اخبار کے دفتر میں بیٹھا کسی اہم خبر کے انتظار میں جھک مارتا رہتا کہ کوئی ایسی خبر جو اس کے اخبار کے سرکولیشن میں اضافہ کا باعث بن جائے۔ لیکن وہی ڈھاک کے تین پات ـــ خبریں تو بہت تھیں لیکن صرف سینہ گزٹ کے لئے۔ اخبار کا پیٹ بھرنے کے لئے بھی بہت کچھ تھا۔ لیکن زبان کی لذت اور شریانوں میں خون بن کے بہنے والی خبریں ـــ! ان کا تو کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔ سارے اخبار ایک جیسے۔ کس کی مجال تھی کہ اپنی باتیں کر جاتا۔ زمانہ منافقت کا ہے اور لوگ اپنے سائے سے ڈرتے ہیں۔ فدا الرحمن اپنے آپ سے کہتا بنگالی ناولوں کے کردار کی طرح سر سے چادر لپیٹے ٹمٹماتے ہوئے بلب کی روشنی میں ریڈیو پر نگاہیں جمائے ٹیلیفون کو ہاتھ میں پکڑ کے ڈائل گھماتا اور سوچتا رہتا۔ کوئی اچھی سی خبر جس سے ایک دن کے لئے ہی سہی، اس کے اخبار کا سرکولیشن ہزاروں تک پہنچ جائے مگر ـــ مگر ـــ اور ہر صبح اپنے اخبار کی کاپی دیکھ کر اس کا دل بجھ جاتا۔ پروف کی بے شمار غلطیاں ـــ چار صفحے کے اس اخبار میں زندہ رہنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ عجیب اخبار ہے! اور یہ پروف ریڈر تو کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ غصے سے بھنا جاتا ہے ـــ اس کی بنائی ہوئی خبریں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کیا کیا جائے ـــ ملازمت کہاں ملتی ہے کہ ـــ" وہ اپنے آپ سے ہی ہمکلام رہتا۔

چپڑاسی برسوں سے آ کر اسے جھنجھوڑتا "خان صاحب کہتے ہیں پرفارما تیار ہے۔ صرف فرسٹ لیڈ کے لئے اتنی دیر۔ بس اب آپ۔"

"بہت اچھا" اور بہت دیر جھک مارنے کے بعد بے معنی سی خبر اسے پکڑا دیتا ـــ "لے جاؤ ـــ اور ـــ اور بس۔ تم چلو میں بھی آ ہی رہا ہوں ـــ"

وہ ٹیلی پرنٹر پر آئی ہوئی خبروں کو غور سے دیکھتا۔ نہیں یہ ہمارے کام کی نہیں ہیں ہم اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی کون کیا ہے۔ کس طرح معلوم ہو ہمارے پاس ہے کیا ـــ"

"ارے" اسے ہنسی آ جاتی۔ اس پر شاہدہ کا سایہ پڑتا جا رہا ہے۔ شاہدہ جس کا خیال تھا کہ "اسے سیدھے جہنم میں جانا ہے کہ جس راستے کو اس نے اپنایا ہے وہ خاص الخاص جہنم کو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نافرمان ہے۔ اس نے باپ کی نافرمانی کی ہے اور اسے ہمیشہ اس کی سزا ملے گی۔"

"اس زندگی سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے ـــ" اس نے سوچا اور پھر چادر میں منہ چھپا لیا۔

"اور نافرمانی ـــ!" اس نے کروٹ بدلی "تو بھئی اچھا جرم ہے مجھ سے نہیں ہوتی لفٹ رائٹ ـــ" وہ بے چین ہو کر کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔ جیسے وہ سچ مچ جہنم میں ہو اور نیچے سے آگ کی سینک آ رہی ہو۔

وہ بولی "مگر یہ اخبار کی نوکری۔ یہاں کیا ہے؟ بابا نکال دیں تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ نہ صبح کا ٹھکانہ، نہ شام کا۔ تنخواہیں قسطوں میں ملتی ہیں۔ نہ سوئٹر، ٹوپی نہ پیر میں جوتا۔ شرم کرو تمہیں کوئی پڑھا لکھا کہنے کو بھی تیار نہیں ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں ٹوپی پہننے کا زمانہ نہیں اور جوتے ـــ"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے جوتے واقعتاً سال خوردہ تھے۔

"بھئی پاؤں دیکھے ہیں اپنے ـــ" شاہدہ کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں دیکھے ہیں بہت بدصورت ہیں۔"

"جی بدصورت ـــ بدصورتی، خوبصورتی تو اپنے بس میں نہیں ہوتی ـــ لیکن حفاظت ـــ پاؤں پھٹے ہوئے ہیں جناب کے۔ آپ ان کی حفاظت نہیں کرتے۔ یہ خدا کے ہاں آپ کے خلاف گواہی دیں گے کہ آپ نے ان سے کام تو بہت لیا، میلوں پیدل چلے۔

دن رات چلے ـــــ لیکن اندھیرے اجالے ان کا خیال نہیں کیا ـــــ اور آپ کے اعضاء ـــــ"

"میرے اعضاء میرے اپنے ہیں ـــــ"

"بالکل نہیں۔ یہی تو آپ کی بھول ہے بھیّا فداالرحمٰن صاحب۔ سب آپ کے خلاف ہو جائیں گے قیامت کے دن ـــــ"

شاہدہ دینیات کی لیکچرر تھی، انگلش میڈیم اسکول میں پڑھاتی تھی۔ خوب فیشن کرتی۔ شوخ کپڑے، رنگین چہرہ اور اوپر سے فداالرحمٰن کے لئے ہر لمحے جہنم کی آگ۔ فداالرحمٰن چادر سے منہ ڈھانپے مسکرانے لگا "ہاں بھئی اپنا میک اپ تو بہو کو سر تا سر جنت کی رنگین شام نظر آتا ہوگا۔ اور ہم ـــــ اور ہم ہر لمحے جہنم کا کندہ بنائے جاتے ہیں۔"

"اب۔ اب اُٹھ بھی جاؤ فداالرحمٰن۔ پڑا اٹھا کر کے تمہارے جوتے کی طرح سخت ہوگئی ہے اور اب میں اسے دوبارہ گرم بھی نہیں کروں گی۔ ہاں ایک دن کی چھٹی ہوتی ہے ہماری اور بھیا تم کو ذرا بھی ہمارا خیال نہیں۔"

"کیا جہنم بنایا ہوا ہے میری زندگی کو۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہارا پراٹھا" فداالرحمٰن کاٹ کھانے والے انداز میں چادر پھینک کے اٹھ بیٹھا۔

شاہدہ نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا کہ فداالرحمٰن کا حلق پھاڑنا کوئی نئی بات نہیں تھی ـــــ نئی بات یہ تھی کہ اس نے بابا کے سامنے آواز اونچی کی تھی ـــــ باباجی کے سامنے کوئی سانس بھی زور سے نہیں لے سکتا تھا۔ کہتے ہیں بابا اپنے زمانے میں بڑے ہی کامیاب افسر تھے اور انھوں نے جنگیں بھی لڑی تھیں تمغے بھی حاصل کئے تھے ـــــ مگر ان کا بیٹا ـــــ اکلوتا بیٹا ـــــ جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح آتا تھا۔ دن کے دس بجے تک سویا رہتا تھا۔ کپڑے ملے دلے۔ آنکھیں سرخ۔ کوئی اس کا رعب نہیں مانتا تھا اور وہ ـــــ وہ خود تو ـــــ بہت ہی رعب داب والے تھے اور ان کا سارا رعب اپنے ماتحتوں پر پڑتا تھا ـــــ افسر تو کسی کی بھی نہیں سنتے سوائے جی جناب کے ـــــ اور انھیں جی جناب سننے کی عادت تھی ـــــ بیوی کو بھی انھوں نے آرام دہ جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ دسترخوان پر تنہا بیٹھ کر انواع و اقسام کی نعمتیں نوش کرتے اور بیوی مکھیاں ہنکاتی رہتیں، نظر بھر کے نہ دیکھتیں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے ـــــ اور جی بھر کے تابعداری کرتے کرتے دو بیٹی اور ایک بیٹا چھوڑ کے آرام سے رخصت ہوگئیں اور بابا کو چپ سی لگ گئی۔ ریٹائر تو وہ ہو ہی چکے تھے لیکن۔ بیوی (جو ایک خاموش آڈینس تھی) کے مرجانے کے بعد بابا کو پتہ چلا کہ وہ تنہائی اکیلے ہیں اور کوئی ان کی بات سننے والا نہیں ـــــ وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے ـــــ حد ہوگئی ـــــ یہاں تک کہ صاحبزادے نے بھی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے ان کی افسری سے ہی نفرت تھی کہ ساری عمر وہ گھر میں افسری کرتے رہے۔ دراصل بڑے افسر بننے کے ارمان میں بابا ساری عمر اپنے افسروں کے نرم گرم کو برداشت کرتے رہے اور گھر پر ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے بڑے افسروں کی تقلید کرتے اور ان کا گھر ـــــ واقعتاً بڑا ہی منظم تھا۔ ان کی بیوی نے مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا کہ کل کی گڑیا کی طرح گھومتی رہتی تھی ـــــ ہر بات ایسے پوری ہو جاتی جیسے یہ بھی "یہ بھی میرے دل میں ہے" ـــــ لیکن اولاد ـــــ! بڑی بیٹی کو نیک بخت بیاہ گئی تھی ـــــ کہاں بیاہا، کس سے بیاہا۔ کیا کرتا ہے ـــــ بابا کو پتہ ہی نہیں چلا ـــــ صرف پیسے خرچ کئے تھے انھوں نے ـــــ

شاہدہ نے پڑھ لکھ کے نوکری کرلی ـــــ بیٹے نے ان کی افسری کا ایسا اثر قبول کیا کہ تیسرے درجے کی زندگی گذارنے پر تیار ہوگیا۔ فرسٹ کلاس ڈگری تھی، اس کی لٹریچر میں۔ اور اخبار اس کا دوسرے درجے کا تھا۔ ان کی خواہش کے مطابق نہ ہی وہ فوجی بنا اور نہ ہی اس نے سی ایس پی افسر بننے کے بارے میں سوچا۔ بس ہر وقت پتہ نہیں کس سوچ میں ڈوبا رہتا۔ اور بڑی بڑی آنکھیں سوکھے ہوئے چمرخ چہرے پر ڈولتی رہتیں ـــــ"

"اسے ہوا کیا ہے" بابا سوچتے ـــــ

اور فداالرحمٰن سوچتا ـــــ "بابا کو کیا ہوا ہے۔ یہ چپ سے کیوں ہو گئے ہیں۔ بات ہی نہیں کرتے۔ کہیں سے ان کی آواز ہی نہیں آتی۔ ورنہ جب بھی گھر میں قدم رکھو ایک کھرج دار آواز کسی نہ کسی کونے سے قدم پکڑنے کو حاضر لیکن اب" فداالرحمٰن نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا "بابا کہیں باہر تو نہیں گئے ہیں ـــــ نہیں ـــــ وہ کیا اپنی آرام کرسی پر اخبار پکڑے بیٹھے ہیں۔ اور وہ ـــــ اس نے اتنے زور سے آواز نکالی تھی ـــــ" اس نے کانپ کے سوچا ـــــ "اماں کہیں گی ہم بہت بدلحاظ ہو گئے ہیں والدین کا ادب نہیں کرتے حالانکہ اس دنیا میں لانے والے والدین ہی ہوتے ہیں۔ اور ان کا اولاد پر بڑا احسان ہوتا ہے۔ زندگی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ خوشی کے ایک ایک لمحے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ ایک سہم سی ہر وقت طاری رہتی ہے۔ اس نے باغیانہ انداز میں سوچا۔

بالکل غلط۔ یہ سہم تو خیر ہے ہی لیکن وہ "تمہاری ماں جیسی کی شبنمی ٹھنڈک۔ وہ کیف ـــــ وہ سایہ ـــــ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہاں وہ سایہ جس نے ڈھال بن کے ہر کڑے وقت میں اس کا بچاؤ کیا اور پانی بن کے آبیاری کی، اسے ایک بڑا افسر بنانے کا خواب دیکھا۔ اس سے امتحان بھی دلوایا۔ مقابلے میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ اب یہ اس کی خرد ماغی تھی کہ منتخب ہونے کے باوجود افسری کے خواب اس نے کبھی نہیں دیکھے ـــــ اپنے ابا کی افسری نے اسے بہت مارا تھا ـــــ اور اب وہ کسی کا افسر نہیں بننا چاہتا تھا۔ اماں اس کا بہت خیال رکھتی تھیں ـــــ کہتیں "میرا بیٹا تو بہت ہی اللہ والا عالم، فاضل، حیادار اور درویش صفت ہے۔ اس کا کوئی کیا مقابلہ کر سکتا ہے ـــــ مگر ـــــ بیٹا۔ درویشی کا زمانہ چلا گیا ـــــ تم کچھ سوچو اپنے بارے میں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ تم اپنی سرکاری نوکری ـــــ"

"اماں" فداالرحمٰن لاڈ سے اماں کی گود میں سر رکھ دیتا۔ اور اماں ایک لفظ بھی آگے کہے بغیر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں، پیشانی چومتیں اور ابا کے گھن گرج میں گم ہو جاتیں کہ ان کی فطرت میں ناز برداری اور محکومیت تھی۔ بابا ان پر حکومت کرتے تھے۔ ان سے ناز برداری کرواتے اور وہ خود کسی سے کیا چاہتی تھیں ـــــ فداالرحمٰن نے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلی پھنسائی ـــــ!

"اماں آپ تو بہت ہی خوش رہتی ہیں ـــــ کاش میں بھی آپ کی طرح خوش رہ سکتا ـــــ" ایک دن اس نے اماں سے لاڈ کرتے کرتے کہا تھا ـــــ

"میں خوش رہتی ہوں" اماں کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں ـــــ "واقعی میں خوش رہتی ہوں!" اماں نے آنکھیں پھیلا کے اسے دیکھا اور دو موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے۔

"اماں ـــــ میری اماں۔ آپ کو کیا دکھ ہے ہم نے تو دل دُکھانے والی کوئی بات نہیں کہی ـــــ اماں ہم تو ـــــ وہ یعنی ـــــ!" فداالرحمٰن نے گھبرا کے اماں کو اپنی طرف کھینچا۔ اماں جو اسے پریوں کی شہزادی، خوشیوں کی ملکہ اور پھولوں کے دیس کی باسی لگتی تھیں، اچانک ہی دنیا کی مظلوم و مجبور ترین عورت معلوم ہونے لگیں۔ ان پر چڑھا ہوا متوسط طبقے کا ملمع اترنے لگا۔ شرافت کی چادر سر سے اترنے لگی اور ـــــ اور اماں نے بڑی مضبوطی سے شرافت کی اس اجلی چادر کو سنبھال کے سر پر ڈالا ـــــ اور سمٹ کے کھڑی ہو گئیں کہ بابا کی گرجدار ہوتی آواز کسی کونے سے سنائی دے رہی تھی۔ اماں خاموشی سے دبے پاؤں اُن کی طرف چلی گئیں کہ خراب باتیں بچوں کے کانوں میں نہ پڑیں اور خان صاحب کی افسری کہیں بچوں کا دل نہ دہلا دے۔ فداالرحمٰن نے برآمدے میں چوکی پر بچھی ہوئی شفاف چاندنی پر ایک نظر ڈالی ـــــ "کچھ بھی نہیں بدلا ـــــ اور بابا بھی بیٹھے ہیں ـــــ پھر یہ سناٹا کیوں ـــــ؟ اور میری آواز، آوازِ بازگشت کیوں بنی اس کا جواب کیوں نہیں آیا ـــــ!"

شریفوں کے گھر سے آواز باہر نہیں نکلتی ـــــ سہمی ہوئی باریک آواز ـــــ جو اپنی پردہ پوشی کے لئے ہوتی ہے ـــــ ہر لمحے سکڑی اور ڈری ہوئی کہ لوگ کہیں یہ نہ کہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں ـــــ اور شاید اسی لئے بابا ـــــ بابا ـــــ کیوں خاموش ہیں۔ آج ان کی

مردانگی کہاں گئی ہے ـــــ اس نے نفرت سے سوچا ـــــ یہ تو پھولوں سے زیادہ نازک اور شبنم کی طرح پاکیزہ ماں ـــــ ان کی سلطنت تھی۔ ایک جابر حکمراں کی سلطنت جہاں رعایا کو دم مارنے کا یارا نہیں تھا کہ رعایا کو اپنی عزت کچھ زیادہ ہی عزیز تھی ـــــ فدا الرحمٰن خاصا سخت دل انسان تھا آنسو اس کی آنکھوں میں کبھی نہیں آئے تھے۔

"اماں کا جنازہ رکھا تھا۔"

"کب ـــــ کہاں؟"

"ہو گئے کئی سال، لیکن یہ تو کل ہی کی بات لگتی ہے ـــــ"

آپا روتی ہوئی آئیں "اماں کیسے مر گئیں فدا۔ اماں کیسے گذر گئیں۔"

"ایں۔ کیا؟ اچھا۔ اماں مر گئیں ـــــ" وہ حیرت سے اپنی بہن کو دیکھنے لگا۔ وہ ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا۔ اسے تو کسی نے اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ ـــــ "اماں مر گئیں ـــــ کب کیسے ـــــ" اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا۔

"ابھی ـــــ ابھی ذرا دیر پہلے ہم نے دریافت کیا کہ اماں مر گئی ہیں ـــــ" آپا کے آنسو چہرے کو دھو رہے تھے۔

"آپا ـــــ آپا کیسی باتیں کرتی ہو ـــــ اماں کو تو میں ٹھیک ٹھاک چھوڑ گیا تھا۔ مجھے چائے بنا کر پلائی تھی انھوں نے ـــــ"

"میں ٹھیک باتیں کر رہی ہوں۔ اماں سچ مچ مر گئیں آج۔ ویسے تو ہم نے انھیں ہمیشہ ہی مرا ہوا پایا ـــــ" آپا نے اپنے چہرے سے آنسو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا۔ کیا آپا ـــــ کیسے ـــــ" اس کے سر میں ٹیس سی اُٹھنے لگی:

"آپا۔ ہماری اماں۔ ہم کیا کریں" ـــــ شاہدہ آپا سے لپٹی رو رہی تھی ـــــ

"ہاں بیٹو چپ ہو جاؤ ـــــ اماں تو ہماری تھیں ہی مردہ۔ شرافت کا کفن لپیٹے ایک لاش ـــــ فدا، تم سمجھ سکتے ہو ہمارا مسئلہ۔ ہم بیٹیاں۔ میرا مطلب ہے ہم عورت ہیں۔ ہم کھیت ہیں۔ اور کھیت میں ہل چلانے والا کسان بھی مرد ہوتا ہے۔ تم بھی مرد ہو۔ تم زمین کا دکھ سمجھ سکتے ہو کہ زمین کو آباد تو مرد ہی کر سکتا ہے۔ اللہ نے بھی یہ اختیارات تمہیں دیئے ہیں کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں ـــــ اور کسی کو کیا پتہ کہ ـــــ کہ زمین کا سینہ چیرنے والا ہلوا ہا کیسے کیسے چرکے لگاتا ہے ـــــ ہائے میری ماں ـــــ" آپا نے آنسوؤں سے اپنا چہرہ دھونا شروع کیا۔

"آپا" شاہدہ آپا سے لپٹ گئی۔ "اماں کو نہلانا ہے ـــــ"

"اچھا۔"

"پھوپھو کہتی ہیں وہ نہلائیں گی ـــــ"

"نہیں، ہم اپنی اماں کو خود نہلائیں گے ہم نہیں چاہتے کہ ہماری اماں کو کوئی اور ہاتھ لگائے اور ہماری اماں کی شرافت کا کفن کسی اور کے سامنے اترے۔ ان کے گھاؤ صرف ہم دیکھ سکتے ہیں، شاہدہ ہم بیٹیاں ہیں اپنی اماں کی ـــــ یہ داغ شاید کبھی ہم پر بھی لگ جائیں گے ـــــ"

"آپا ـــــ آپا ـــــ" شاہدہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"رؤو نہیں چندا۔ اپنی اماں سے زندہ رہنا سیکھو۔ انھوں نے تو خود واقعتاً ـــــ" آپا نے چہرے پر پھیلے ہوئے آنسو اپنے آنچل سے صاف کئے۔

بابا جھکے ہوئے چلے آرہے تھے ــــ بابا کو تو میں جوان چھوڑ کے گیا تھا۔ ابھی شام ہی کی بات ہے۔ یہ جھکا جھکا سا آدمی اچانک ہی ــــ مگر کیوں۔ کیسے۔ یہ ہمارے بابا۔ نہیں اس ٹوٹے ہوئے آدمی کو میں بالکل نہیں جانتا ــــ ریٹائرڈ آرمی افسر جو اپنی بیوی سے کہیں زیادہ جوان نظر آتا تھا۔ کیسے ــــ کیسے ــــ! فدا نے پریشان ہو کے سوچا تھا۔

آپا خنک آنکھوں سے بابا کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سرخ آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے چنگاریاں برس رہی تھیں۔ بابا نے ایک تنظر سب کو دیکھا۔ اور نظریں جھکا کے مڑ گئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ــــ فدا پریشان ہو کے ان کے قریب گیا۔ بابا جنہیں اس نے کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ جن کے قریب جانے کی شاید کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اماں مرض کا علاج تھیں۔ دکھ سکھ کی ساتھی ٹھنڈی چھاؤں۔ اب وہ کہاں تھیں ــــ

آپا کہتی ہیں اماں مر گئیں ــــ اور شاید ــــ شاید بابا کی کمر اسی لئے جھک گئی کہ ــــ "آیئے بابا یہاں بیٹھیے"۔

اماں کا جملہ کانوں میں گونجا۔ "تمہارے بابا تم سے خفا ہیں۔ تم نے نوکری کو ٹھکرا کے اچھا نہیں کیا۔ بچے، باپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیئے۔ باپ کی بد دعا لگ جاتی ہے۔ دنیا میں تکلیف پہنچاتی ہے اور آخرت میں جہنم کی آگ مہیا کرتی ہے"۔

اس نے کانپ کے بابا کو پکڑ لیا۔ بابا بھی کانپ رہے تھے۔ "بابا آپ یہاں ــــ یہاں بیٹھ جایئے"۔

بابا بیٹھ گئے ــــ فدا الرحمٰن نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں کو صاف کیا۔ سر کا درد آنکھوں کی راہ بہہ نکلا۔

"بیٹا تم ــــ فدا! بچے! تم بھی مجھے اپنی ماں کا قاتل سمجھتے ہو۔ اپنی بہنوں کی طرح ــــ"

"نہیں بابا۔ بھلا۔ وہ کیوں؟ ــــ آپ تو ــــ آپ تو اتنا پیار کرتے تھے ان سے۔ پھر بھلا۔ آپ تو ــــ آپ تو ہمارے بابا ہیں ــــ بھلا ہم ــــ"

"ہاں بیٹا ہم تمہارے بابا ہیں ــــ لیکن ــــ لیکن تمہاری اماں نے شاید یہ نہیں بتایا کہ شاہدہ ہی ہماری مشترکہ اولاد ہے۔ ورنہ تم ــــ تم اور نورین ان کے ساتھ آئے تھے ــــ"

"جی بابا، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی طبیعت ــــ"

"طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا کہ ہم نے اپنے ایک افسر کی بیوی سے شادی کی تھی ــــ افسر جو ہمیں سخت ناپسند تھا اور جس کی بیوی کے عشق میں ہم گرفتار تھے۔ اور پھر ــــ اور پھر ہم نے فیصلہ کر لیا۔ اور تمہاری اماں ہمارے ساتھ آگئیں ہم نے شادی کر لی اور ــــ"

"اور آپ ہمیں کیوں لے آئے"۔ فدا کو اس انکشاف پر غصہ نہیں آیا۔ وہ حیرت زدہ تھا ــــ اس کے سر کا درد بڑھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو رگڑا اور ان خون میں تیزی آئی۔ سناٹا دور ہونے لگا۔ سر کا درد سمٹنے لگا۔ اور چکر سا آنے لگا۔

"آپ ہمیں۔ ہمارے بابا کے پاس چھوڑ آتے ــــ خواہ مخواہ کی پریشانی ــــ ہم آپ کی ذمہ داری جب نہیں تھے تو خواہ مخواہ ہی"۔ فدا الرحمٰن نے الجھ کے بابا کو دیکھا۔ اس کا اپنا دم نکلا جا رہا تھا۔ بھاری آواز ڈوبتی معلوم ہو رہی تھی ــــ جان نکل رہی تھی۔

"بیٹا ہم تم کو کیوں چھوڑ آتے۔ کسان تو اپنے کھیت کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر کھیت میں فصل بوئی ہوئی ہو تو کھیت کسان کو اور بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے پھر میں کیسے تمہیں ــــ تمہیں ــــ تمہارے بغیر ہماری زمین بنجر نہ ہو جاتی"۔

"اچھا تو آپ ہمارے بابا نہیں ہیں۔ ہمارے دوست ٹھیک کہتے تھے کہ میں آپ سے بالکل نہیں ملتا۔ اور ــــ" اور اس نے حیرانی سے اپنی ڈوبتی ہوئی آنکھیں بابا پر گاڑ دیں "آپا کو پتہ ہے؟"

"ہاں وہ تم سے پانچ سال بڑی ہے۔ اور تم اس وقت دو سال کے تھے۔ اور اب ـــــ اب بیٹا تم ہی ہمارا سہارا ہو ـــــ"

فدا نے بیگانہ نگاہوں سے اس آدمی کو دیکھا جس کی دبنگ آواز میں افسوس اور خوف تھا ـــــ

"آپا ـــــ" اس نے دور جاتی ہوئی بہن کو پکارا ـــــ "آپا" وہ گلا پھاڑ کے چلایا ـــــ

"کیا ہے فدا۔ ہم اماں کو کفن پہنا کے آ رہے ہیں۔ ہم تمہیں بلانے آئے تھے کہ اماں کا آخری دیدار ـــــ"

"آپا تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ یہ ہمارے ـــــ ہمارے ـــــ"

"بابا نہیں ہیں" آپا کے آنسو پھر منہ دھونے لگے۔ "وہ اس لئے میرے بھائی کہ اماں کا خیال تھا کہ کچے پودے کو کبھی چلچلاتی دھوپ میں نہیں چھوڑتے کمھلا جاتا ہے۔ نشو و نما رک جاتی ہے۔ اور وہ کبھی کبھی ہمیشہ کے لئے مرجھا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کی نشو و نما کے لئے سائے کی بڑی ضرورت ہے۔"

"پھر بھی ہم ـــــ پھر بھی ـــــ ہم نے کونسا۔ یعنی ہم کونسے ـــــ"

"تم آگے نہیں بڑھے تو کس کا قصور ہے۔ تمہارے خون میں لاابالی پن ہے میرے بھائی کہ ہمارا باپ ایک بڑا افسر تھا ضرور لیکن سخت لاپروا تھا جسے اپنے اسٹیٹس کا کبھی خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ اور ہر چھوٹا بڑا اس کی نظر میں برابر تھا۔ اور ایسے ہی نظریے کبھی کبھی دکھ دیتے ہیں۔ اسی لاپروائی نے ان کو ہم سے چھڑا دیا کہ بڑھاپے میں کی جانے والی جوان بیوی کو دو بچوں کی ماں ہو جانے کے باوجود برابری کی محبت چاہیئے تھی۔ شوہر کے ہاتھوں میں باپ کا دستِ شفقت نہیں چاہیئے تھا ـــــ اور پھر ـــــ اور پھر وہ ناقابل یقین کام اماں نے کر ڈالا جو شاید وہ کبھی بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ واقعتاً بہت ہی شریف تھیں ـــــ دوسری شادی کوئی گناہ نہیں ہے لیکن ـــــ لیکن وہ اتنا سمٹیں کہ صرف محبت اور ناز برداری کا نمونہ بن گئیں۔ اور بابا ـــــ بابا اچھے ہیں۔ اور انھوں نے بہت نبھایا لیکن انھیں اماں پر بے اعتباری رہی کہ اماں نے ان کے ساتھ آ کے اپنی نظر میں اپنا اعتبار کھو دیا تھا اور اب دو بیٹیوں کی ماں ہو کر وہ نہیں چاہتی تھیں ان کی بیٹیوں کو ویسی کوئی ہوا لگے۔ اماں تو سانس بھی ڈر ڈر کے لیتی تھیں۔ شبنم کی طرح شفاف، پھولوں کی طرح ہلکی۔ شرم اور شرافت کو اوڑھے ـــــ اور یہ بابا ـــــ بابا اچھے ہیں۔ ہمیں ان سے سچ مچ محبت ہے فدا۔ انھوں نے ہمیں کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ ہمارے بابا نہیں ہیں۔ لیکن اماں ـــــ انھوں نے یقیناً ان کے ہاتھوں بہت دکھ سہے۔ زبان کا دکھ۔ انھیں حسرت رہی کہ یہ بڑے بلکہ بہت بڑے افسر بن جائیں لیکن یہ بھلا ـــــ اماں کیا کریں۔ سو یہ اماں کے افسر بن گئے۔ اماں جو ہمارے بابا کی شفقت سے گھبرا کے نکل آئی تھیں، برابری کی محبت کے لئے ترستی رہیں۔ وہاں کوئی ان کی ناز برداری کرتا تھا اور یہاں اماں دلداری کرتی تھیں اور اس حد تک سرگرم نیاز رہیں کہ انھیں صرف ناز والا بنا دیا ـــــ سن رہے ہو فدا؟ انھوں نے شاہدہ کو ہوسٹل بھیجنا چاہا تھا کہ اماں کا سایہ اس پر نہ پڑے ـــــ وہ تو ہوسٹل نہیں گئی۔ اماں نے البتہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دیا ـــــ"

بابا اس وقت بے جان آنکھوں سے آپا کو دیکھ رہے تھے ـــــ انسان ایک رات میں بوڑھا ہو سکتا ہے ـــــ فدا نے سر جھٹک کے اس جانے بوجھے اجنبی کو دیکھا ـــــ!

"آپ کو کیسے پتہ چلا یہ سب؟"

"بابا نے مجھے بتایا ہے۔ یہ ہمارے محرم ہیں۔ ہماری اماں کے پیارے شوہر یہ ہم سے کچھ بھی نہیں چھپاتے۔" آپا بابا سے چمٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ "فدا تم بابا کی نافرمانی نہیں کرو گے کہ ہمیں اماں بہت پیاری تھیں۔ اماں کو بابا بہت ہی عزیز تھے تم ان کے بیٹے ہو۔ اور شاہدہ ـــــ"

"شاہدہ تو آپا سچ مچ ہماری بہن ہے مگر سچ سچ آپا میں سوچا کرتا تھا کہ وہ ہماری طرح کیوں نہیں۔ خاموش، لاپروا، لاابالی ـــــ وہ تو ہر صورت بابا کی بیٹی ہے اور ہم ـــــ" فدا الرحمٰن نے بابا کو دیکھا ـــــ

"تو ہماری ماں نے خودکشی کر لی؟" اس کی آنکھوں میں شک ابھرا ـــــ "اور میں وہاں دفتر میں کام کرتا رہا اور ہماری اماں ـــــ" اس کے دل
میں نفرت کا لاوا پھوٹا ـــــ اس نے اپنی آنکھیں اس ٹوٹے پھوٹے آدمی پر گاڑ دیں ـــــ "میری ماں کا شوہر ـــــ میری ماں کا قاتل ـــــ
آدھ بیس ـــــ نہیں وہ تو اپنی ماں کا شوہر اور اپنے باپ کا قاتل تھا ـــــ آنکھیں خشک تھیں ـــــ دل میں آگ دہک رہی تھی۔

"فدا۔ آؤ جنازہ تیار ہے۔ بابا کو پکڑ لو۔ ان کا بہت برا حال ہے۔ اماں کو اس طرح دل نہیں ہارنا چاہیئے تھا۔" آپا کی آواز گونجی ـــــ
آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز ـــــ اماں کی طرح ٹھہری ہوئی اور فیصلہ کن۔

"نہیں آپا یہ ہماری ماں کے ـــــ" شک اس کی زبان پر آیا۔

"نہیں میرے بھائی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے ـــــ ان کا دل ہوا ہو گیا ـــــ بابا ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اس کا اندازہ انہیں ہمیشہ
سے تھا ـــــ لیکن زبان ـــــ زبان سے صرف گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی تھی۔ کبھی محبت کی کبھی خفگی کی۔ اس زبان سے کبھی زہر نہیں ٹپکا
تھا۔ اور جب زہر ٹپکا تو اماں کے دل میں اتر گیا۔"

اماں کا بے جان وجود کفن میں لپٹا تھا۔ شاہدہ بے قرار ہو ہو کر بابا سے لپٹ رہی تھی اور وہ آپا سے لپٹ گیا تھا۔

اور اب ـــــ اب ڈھیر سارا وقت گزر گیا تھا۔ رنگ برنگے لباس میں لپٹی شاہدہ اسے آواز دے رہی تھی "کہ پراٹھا گرم ہو گیا ہے اور
چمڑے میں تبدیل ہونے سے پہلے اسے چاہیئے کہ وہ اسے اپنے حلق سے اتار لے۔"

اس نے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔ گھر میں اتنا سناٹا ہے ـــــ اندوہناک لمحے تو بہت پیچھے رہ گئے۔ کاروبار زندگی چل رہا
ہے۔ سب کچھ ہی ہو رہا ہے مگر یہ سناٹا ـــــ شاید یہ مجھے ہی لگتا ہے۔ سامنے برآمدے میں چوکی پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ پاس ہی آرام کرسی پر
وہ بوڑھا آدمی بیٹھا جو اس کا باپ نہیں تھا اور جس کی نافرمانی سے باز رہنے کی تلقین اس ماں کیا کرتی تھی کہ "باپ کی بددعائیں لگ جاتی ہیں۔ دنیا خراب
ہوتی ہے سو الگ اور آخرت میں جہنم کی آگ جلاتی ہے سو الگ۔"

اور اب کہاں کی نافرمانی اور کس کی نافرمانی چلو اس آگ سے تو چھٹکارا ملا جس سے اماں ڈراتی تھیں۔ اس نے پاؤں پلنگ پر سے اتارے قدم
زمین پر رکھے اور پھٹی ہوئی ایڑی فرش کو رنگین کر گئی۔ درد سے پاؤں پھٹنے لگا۔

"واقعتاً ہمارے پاؤں محاسبہ کریں گے۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی کریموں اور پیٹرولیم جیلی کی بوتلوں کو دیکھا۔ درد کی پروا نہ کرتے
ہوئے چپل پہنی اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر آیا۔ ادھر ادھر دیکھا ـــــ زور سے شاہدہ کو پکارا لیکن کوئی پھنکار کہیں سے نہیں آئی کہ "یہ شریفوں کا
گھر ہے۔ آہستہ بولو کوئی بہرہ نہیں ہے ـــــ"

وہ ایک ایک قدم چلتا ہوا آرام کرسی کے پاس جا کھڑا ہوا ـــــ "اور یہ ـــــ" اس نے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس اس بادشاہ
کو دیکھا جس کی سلطنت لٹ گئی تھی ـــــ اس نے رحم سے اس شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ حکمرانی کہیں دور دم توڑ گئی تھی۔ اس نے
آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھ بابا کے کاندھے پر رکھ دیئے، بابا نے یہ ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے۔ آنسوؤں سے اس کے ہاتھ بھیگنے لگے۔

"بابا" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کے بابا کی پیشانی پر گرے۔

"رو نہیں۔ ابھی ہم زندہ ہیں ـــــ" بابا کی گھن گرج والی پر اعتماد آواز گونجی۔

ساری فضا میں زندگی دوڑ گئی۔ اور فدا الرحمٰن نے فوراً اپنے آنسو پونچھ لیے کہ کہیں بابا کی نافرمانی اسے سچ مچ جہنم کا کندہ نہ بنا دے۔

خبر ہونے تک

نگہت مرزا

نہ معلوم کیوں پہلی نظر میں وہ مجھے کمینہ سا لگا۔

گو میں نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔

یوں بھی شادی کو ابھی صرف ایک ہفتہ گذرا تھا اور اتنے کم عرصے میں کسی کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی ہیں اگر اپنی رائے کا اظہار کر دیتی اور وہ بُرا مان جاتا تو ــــــ؟ بس اسی اندیشے نے میری زبان بندی کئے رکھی۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا۔ مری میں اکا دکا لوگ تھے۔ گرمی ختم ہوتے ہی مری کی رونق بھی رخصت ہو چکی تھی۔ البتہ نو بیاہتا جوڑے کسی خاموش سڑک یا درختوں کے جھنڈ میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے۔ عورتوں نے خوب بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوتے اور زیوروں سے لدی پھندی ہوتیں۔ درختوں کی ٹہنیاں پکڑ کر انتہائی احمقانہ پوز بنوا کر تصویریں کھنچوائی جاتیں ہم ان کی ہیئت کذائی پر ہنسے چلے جاتے۔

رات کو آتشدان میں آگ جلا کر ہم اُس کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتے۔ کافی اور کارڈز کے دور چلتے رہتے۔ رات کے ڈیڑھ دو بج جاتے تو اُس کی بیوی ہمدردی سے میری طرف دیکھ کر کہتی "لو جی، یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ ہم لوگ یونہی کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کو تو یہ وقت تنہا گذارنا چاہیئے!"

"دونوں ــــــ اور تنہا!" وہ میری طرف دیکھ کر کہتا۔ زیادہ پی جانے سے اُس کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی ہوتیں۔ اُس کے موٹے موٹے بھدّے ہونٹ گھنی مونچھوں تلے عجیب سے انداز میں مسکرا رہے ہوتے۔ اور میں سوچتی۔ یہ شخص، بغیر کسی شک و شبہ کے، انتہائی گھٹیا ہے۔

رات کے آخری پہروں میں، جب ہم انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف آتے، تو اُس کی نظروں میں کھلی حسرت ہوتی، جیسے کہہ رہی ہوں ــــــ تمہارے ساتھ یہ کیوں ہے؟ میں کیوں نہیں؟؟؟

اور وہ میرے میاں کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھا۔ اور ہم ہنی مون کے لئے اُس کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

مومو بہت سلجھی ہوئی، باوقار اور قرینے کی لڑکی تھی۔ میں کبھی کبھی کچن میں اُس کے پاس چلی جاتی۔ اُس کی باتوں میں ایک ٹھہراؤ ہوتا۔ شائستگی ہوتی اور وہ سوائے اپنے میاں کے ہر موضوع پر سلجھی ہوئی باتیں کرتی۔ اُس کی شادی کو دس سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا مگر وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ "پتہ نہیں کبھی اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں!" وہ مجھ سے آنکھیں چرا کر، کندھے جھٹکتے ہوئے بولی ــــــ "دراصل، اجے مجھے اتنا چاہتا ہے۔ بالکل دیوانوں کی طرح ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ ہم نے سارا پیار، ساری چاہتیں ایک دوسرے کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ سو کبھی کسی تیسرے وجود کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی!"

میں حیرت سے منہ کھولے اُس کا چہرہ تکتی رہی۔ خود کو دھوکا دینا کتنا مشکل امر تھا، اور وہ کتنی سہولت سے ــــــ! مگر کیا واقعی وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی یا اُس کا اجے ــــــ؟؟

مجھے اجے کے ساتھ اپنا پہلا ٹکراؤ یاد تھا۔

میں کسی ڈنر پر جانے کے لئے تیار ہو کر باہر نکلی تھی۔ میرے میاں گاڑی کے پاس کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اُسی لمحہ ایک گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور میرے میاں خوشی سے اُچھل پڑے۔ "ارے یہ تو اجے ہے!"

معلوم ہوا اجے اُن کا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو اور نہ معلوم کیا کچھ ہے۔ میں اس دوران گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

"نمٹ! ان سے ملو، ایاز ملک اور اجے —— یہ ——"

اُس نے ہاتھ اُٹھا کے میرے میاں کو خاموش کر دیا اور گاڑی کی کھڑکی میں سے اندر جھانکتے ہوئے بولا "خوب —— بہت خوب ——!"

اُس کی آنکھوں میں کھلی ستائش تھی جیں ہلکے سے مسکرا دی۔ اُس کا سر کچھ اور اندر ہو گیا۔ اُس نے کھڑکی کے شیشے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اُس کی آنکھوں کا انداز بدل گیا اور وہ جیسے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئیں "تم اِس سے پہلے کہاں تھیں؟ تم میرا نصیب کیوں نہیں بنیں؟ —— میں تمہیں لینا چاہتا ہوں!"

وہ بلاشبہ انتہائی کمینہ آدمی تھا، یہ میں نے اُسی لمحہ جان لیا تھا اور پیشتر اس کے کہ میں اپنی رائے اُس کے منہ پر مارتی، میرے میاں نے اُس کا بازو پکڑ کر سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا "کیوں اجے، بھابی پسند آئی؟"

وہ بادلِ نخواستہ کھڑکی سے ہٹا اور اپنے چھ فٹے قد اور ڈیل ڈول کی نمائش کے لئے ایک لمبی سی انگڑائی لے کر میری طرف دیکھ کر بولا "یار، بہت خوش قسمت آدمی ہو!"

اور ادھر مومو کہہ رہی تھی کہ اجے اُس سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے اور یہ کہ انھیں بچوں کی قطعی خواہش نہیں!"

کیا مومو واقعی اتنی معصوم تھی، یا پھر وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی۔ دونوں صورتیں میرے حساس ذہن کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا مومو کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں اور پوچھوں، سچ سچ بتاؤ، کیا تمہیں اجے پر مکمل بھروسہ ہے؟ کیا اکیلے میں تمہارا دل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اجے تم سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ مگر اس کا ٹھہرا ٹھہرا سلجھا لہجہ، اُس کی پُروقار چال، پُراعتماد مسکراہٹ مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتی۔

ویسے بھی میرے پاس ثبوت کے طور پر کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ سوائے اُن دو خاموش نظروں کے جو آتے جاتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہر لمحہ میرے سراپا کا تعاقب کرتیں، جو مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتیں، پر میں نادان بن جاتی۔

ایک شام ہم سب آتشدان کے گرد جمع تھے۔ مومو کافی پھینٹ رہی تھی۔ اجے ساتواں یا آٹھواں پیگ پی چکا تھا اور بے ہنگم طریقے سے آتشدان کے سامنے کشنوں کے ڈھیر پر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اچانک اُس نے مومو سے مزید کباب لانے کی فرمائش کی۔ مومو نے کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولی "نمٹ اسے تھوڑا سا اور پھینٹ دو!" اور وہ خود کچن میں کباب تلنے چلی گئی۔

میں کافی پھینٹنے لگی تو کاریڈور میں رکھے فون نے شور مچا دیا۔

"بھائی، آپ کا فون ہے!" مومو نے دروازے میں سے سر نکال کر میرے میاں کو بلایا۔

اجے نے سر کے نیچے سے کشن نکال کر اپنی سرخ بوجھل آنکھوں سے مجھے گھورا، پھر کشن کو معنی خیز انداز میں سینے کے ساتھ بھینچنے لگا۔

"Let's pretend that I am your huby"

میں اُس کی بات اَن سُنی کرنے کی خاطر کافی اور زور سے پھینٹنے لگی۔ اُس نے میری گھبراہٹ دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔

مومو کبابوں کی پلیٹ اُٹھائے اندر چلی آئی "یہ کس بات پر اتنے قہقہے لگ رہے ہیں؟"

"نمٹ سے پوچھو!" اُس نے انتہائی کمین پنے سے کہا اور کُشن دوبارہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

مومو نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہارے اجے بہادر کوئی گھٹیا سا لطیفہ سنا رہے تھے" میں نے اپنے سینے میں اُبلتے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اجے، ہو جائے کوئی پھڑکتا ہوا لطیفہ" میرے میاں اِس دوران فون سُن کر واپس آ چکے تھے۔

"نہیں یار موڈ نہیں" اس نے کباب کھاتے ہوئے بے دلی سے کہا۔ پھر بات بدلنے کو بولا "کس کا فون تھا؟"

"نمٹ کی ماما کا فون تھا، پوچھ رہی تھیں واپسی کا کیا پروگرام ہے؟"

"واپسی!" اجے کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی "یار ایسی بھی کیا جلدی؟ ابھی تو آئے ہو" پھر میری طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "یہ دن پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے!"

میں نے پھینٹی ہوئی کافی کا مگ اُٹھایا اور کچن میں جانے لگی۔

"بھئی یہ میوزیکل کافی کب پینے کو ملے گی؟"

کافی پھینٹتے ہوئے میری چوڑیاں بج رہی ہیں۔ غالباً یہ اُسی طرف اشارہ تھا۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر کچن میں چلی گئی۔

پھر برسوں تک ہمارا ملنا نہ ہو سکا۔ میرے میاں کی پوسٹنگ باہر ہو گئی۔ کافی برسوں کے بعد جب ہم وطن پہنچے تو میرے ساتھ میاں کے علاوہ دو گول مٹول سے بچے بھی تھے۔ آتے ہی مختلف قسم کے مسائل میں الجھ گئے۔ نئے گھر کی تلاش، بچوں کے سکول کا مسئلہ، بچوں کو سکول لانے لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام وغیرہ وغیرہ۔

دو چار مہینوں کے بعد جب سارے مسائل طے پا چکے تو میرے میاں کو پرانے دوستوں کی یاد نے ستایا۔ دھر ادھر فون کھڑکے قہقہے گونجے، پرانی یادیں تازہ کی گئیں اور انہی دنوں مجھے یہ مژدہ سنایا گیا کہ اس ویک اینڈ پر اجے اور مومو ملنے آ رہے ہیں۔

میرے ذہن میں دور کہیں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ جی چاہا منع کر دوں، ویک اینڈ کا کوئی اور پروگرام بنا لوں، کہیں چلی جاؤں، مگر بیشتر اس کے کہ میرے ہونٹوں سے کوئی انکاری جملہ نکلتا۔ میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال لپکا "آنے دو، آنے دو اُسے۔ اب میں وہ نئی نویلی پانچ سات کی دلہن نہیں تھی، جو پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی اور دل کی بات زبان پر لاتے ڈرتی تھی۔ سات طویل برس گذر چکے تھے اور اب میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ بچے لان میں گیند کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ میں بھی وہیں کرسی ڈالے رسالہ پڑھ رہی تھی۔ کچھ ایسی محویت تھی کہ گاڑی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ مومو کے قہقہے نے میری محویت توڑی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے رسالہ کرسی پر پھینکا اور اس سے لپٹ گئی۔

"ماشاءاللہ۔ باہر کی ہوا بہت راس آئی ہے!" مومو نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"ارے یہ تو بالکل ولیسی کی ویسی ہیں ——" اجے کا وہی چبا چبا کر بولنے کا انداز تھا۔ میں نے اُس کی طرف نظریں اٹھائیں، اُن آنکھوں میں کھلی دعوت دیکھ کر غصے کی ایک لہر آئی مگر میں نے خود پہ قابو پا لیا، اور جوابی حملے کے لئے تیار ہو گئی۔

"اچھا" میں ہنس کر اجے سے مخاطب ہوئی "آپ کے چہرے پر تو وقت اپنے نشان چھوڑ گیا۔"

میں نے اُس کے قدم لڑکھڑانے کی خاطر دانستہ ایسا کہا تھا حالانکہ وہ برسوں پہلے کا اجے تھا۔ وہی بانکپن، وہی شگفتہ کھلا ہوا چہرہ۔

مگر حقیقتاً اُس کا چہرہ لٹک گیا۔ شگفتہ کھلا ہوا چہرہ پلک جھپکتے میں مرجھا کر رہ گیا۔ آنکھوں کے نیچے لکیریں یوں نمودار ہوئیں جیسے برسوں کی تھکن اور شب بیداری کا نتیجہ ہوں ـــــ گویا میرا وار کارگر ثابت ہوا تھا۔ مگر وہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔ میں نے اُس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے دائیں طرف دیکھا۔ جیکو اور سنی بال کے پیچھے بھاگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے ـــــ "مما ـــــ مما"۔ ان کی چیخوں نما ہنسی میں ایک ہی لفظ گونج رہا تھا ـــــ وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے جھک کر دونوں کو دائیں بائیں پہلو سے لگا لیا۔

"بیٹے آنٹی انکل کو سلام علیکم بولیے۔"

دونوں نے بیک وقت ادب سے سلام کیا۔

موموں نے گھاس پر دوزانو بیٹھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "اِدھر آئیے جی۔" وہ جیکو اور سنی کو گود میں بٹھا کر اُن سے باتیں کرنے لگی۔

چند لمحوں میں اجے کو کیا ہو گیا تھا۔ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ گاڑی سے اترا تھا۔ بشاشت سے اُس نے مجھے Greet کیا تھا۔ پھر؟ کیا میرا وہ جملہ اس کا دل توڑ گیا تھا؟ مجھے اتنی کمینگی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خود پر لعن طعن کی۔ مگر ملامت کا یہ لمحہ طول نہ پکڑ سکا۔ میرے میاں جوگنگ سے واپس آ گئے تھے اور اجے کے بجھے ہوئے وجود سے لپٹے خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔

رات کو کھانے دانے سے فارغ ہو کر بچوں کو سلانے کے بعد ہم چاروں اوپر ٹیرس پر چلے گئے۔

اکتوبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ راتیں خنک اور خوشگوار تھیں۔ اجے ایک آرام کرسی میں دھنسا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میں اور مومو ٹیرس کی ریلنگ سے کمر ٹکا کر باتیں کرنے لگیں۔ "یمنٹ، تمہارے بچے بہت پیارے ہیں ماشاءاللہ۔" مومو نے دبی دبی حسرت سے کہا۔

"سنو، تم لوگ Adopt کیوں نہیں کر لیتے کوئی بچہ؟" میں نے مومو کے حسرت بھرے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے اُسے خلوص سے مشورہ دیا۔

"اجے نہیں مانتے ـــــ" وہ دور ستاروں کی طرف نظریں جمائے بولی "کہتے ہیں۔ اگر اپنا نہیں تو کوئی بھی نہیں۔"

"اپنی اپنی سوچ ہے، میرے خیال میں تو Adopt کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

"تم لوگ کیا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کے کھڑی ہو گئی ہو، اِدھر آ کے بیٹھو۔" میرے میاں غالباً اجے کا موڈ بحال کرنے میں ناکام ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے ہمیں مدد کے لئے آواز دی۔ "ایاز ملک صاحب کو ہم نے اس قدر فلسفیانہ بلکہ درویشانہ موڈ میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ براہ راست مومو سے مخاطب ہوئے۔ "اس کی کوئی خاص وجہ؟"

مومو جا کر اجے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ "شام تک تو ہمارے اجے بہادر ٹھیک ٹھاک تھے۔" اس نے بڑے پیار سے اجے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "اُس کے بعد کی ذمہ داری آپ لوگوں پر ہے۔"

مجھے بے اختیار اپنا کہا ہوا جملہ یاد آ گیا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لگتا ہے اس شخص نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔

اجے مومو کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ "بات دراصل یہ ہے میاں کہ آپ جوانوں میں میں خود کو بہت بوڑھا اور کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ آج پہلی دفعہ مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ زندگی اتنی تیزی سے بیت گئی اور میں ابھی تک کچھ بھی Achieve نہیں کر سکا۔"

"کون سی Achievement کی بات کر رہے ہیں آپ؟ زندگی کے تو بے شمار شعبے ہیں۔" مومو جو اجے کے اچانک کرسی سے اُٹھ جانے سے گرتے گرتے بچی تھی۔ ذرا سا تنک کر بولی۔

"کسی میں بھی نہیں ـــــ جان ـــــ کسی ایک میں بھی نہیں۔" اجے کی آواز میں دبا دبا غصہ تھا۔ احساسِ محرومی تھا یا کیا کچھ تھا۔ میں کچھ فیصلہ نہ کر پائی مگر مجھے بے پناہ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ دونوں، جو خود ان کے بقول "Love Birds" کہلاتے تھے آج اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہیں۔

"چھوڑ دیار. اتنے موڈ کیوں ہو رہے ہو؟" اجے کی تقلید میں میرے میاں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اتنے برسوں بعد ملے ہیں. ان برسوں میں کیا بیتی، ایک ایک لمحہ کا حساب دینا اور لینا تھا ــــ باقی یار دوستوں کی سناؤ. فراز کدھر ہے؟ نعیم کا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ ارے ہاں. سنا ہے باجوہ نے شادی کرلی؟"

اجے نے زوردار قہقہہ لگایا "باجوہ کی شادی ــــ ارے یاد کیا یاد دلایا تم نے، دُلہا بنا ہوا وہ معمول سے کہیں زیادہ احمق لگ رہا تھا ــــ"

وہ دونوں پرانے دوستوں کی یادیں تازہ کرنے لگے. میں اور مومو دوبارہ ریلنگ کے پاس چلی گئیں اور اپنی باتیں کرنے لگیں۔

اگلے ہی روز اجے اور مومو واپس چلے گئے۔

میں اپنے کیے پر جی ہی جی شرمندہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اجے پر غصہ بھی آتا رہا کہ ایسی بھی کیا خود پرستی کہ ایک چھوٹے سے جملے نے اس کے قدم اکھیڑ دیئے. میرے سان گمان میں نہ تھا کہ اجے کے یکلخت بجھ جانے کا سبب میرا کہا ہوا وہ بے ضرر سا جملہ نہ تھا بلکہ ــــ مگر اس "بلکہ" کا علم مجھے بہت زمانے بعد ہوا!

گرمیاں رخصت ہو چکی تھیں اور پہاڑی علاقے کی مخصوص ٹھنڈ سر شام ہی ماحول کو بہت افسردہ اور چپ چاپ بنا دیتی تھی. بچوں کو سلا کر حسب معمول ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھے ٹی. وی کے بور پروگرام دیکھ کر اپنی بوریت کم کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا تھے کہ گیٹ پر کسی گاڑی نے ہارن دیا. ہم دونوں نے نظریں اُٹھا کر ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" واجد نے مجھ سے پوچھا.

"جو کوئی بھی ہے، انتہائی بدتہذیب ہے۔" میں نے اون سلائیوں کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا. "گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن دے رہا ہے، اتنی تمیز نہیں کہ اُتر کر کال بیل بجا دے۔"

یکلخت واجد نے اخبار پھینکا. یوں جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آگیا ہو. لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ باہر لپکے.

دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ اندر داخل ہوئے تو اُن کا چہرہ مکمل کنفیوژن کی تصویر بنا ہوا تھا.

"کون تھا؟" میں نے اون سلائیاں گود میں ڈالیں اور تجسس سے آگے بڑھ کر پوچھا.

میرے میاں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے وہ کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش میں مبتلا ہوں.

"کون تھا بھئی؟" میں نے بے صبری سے دوبارہ پوچھا.

"اجے تھا" واجد ہولے سے بولے.

"کون؟"

"اجے"

"اوہ ــــ تو وہ اندر کیوں نہیں آئے. اکیلے تھے کیا؟"

"نہیں اکیلا تو نہیں تھا"

"ارے مومو بھی تھی اور باہر ہی سے چلی گئی؟"

"نہیں، مومو نہیں تھی"

"یہ آپ کیسی پہیلیاں بجھوا رہے ہیں. صاف صاف بتاتے کیوں نہیں؟"

"بتاتا ہوں تمت، ذرا مجھے اپنے حواس بحال کر لینے دو۔" اُن کا پریشان چہرہ دیکھ کر میں نے چپ سادھ لی۔
"اجے اپنی سیکنڈ وائف کے ساتھ آیا تھا ہنی مون کے لئے۔"
"کیا؟"
میں اتنے زور سے چیخی کہ واجد اپنی کرسی سے اُٹھ کر میری طرف دوڑے "آہستہ بولو تمت۔ بچے اُٹھ جائیں گے۔" انھوں نے میرے حواس باختہ چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"مگر واجد یہ ہوا کیسے؟ مومو کدھر ہے؟"
"میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، حالانکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آرہا ہوں۔" واجد یوں سر پکڑ کے بیٹھ گئے جیسے انھوں نے کسی مرگ کی خبر سُن لی ہو۔
اور یہ تھی بھی کچھ ایسی ہی انہونی بات۔
مجھے مومو کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے یاد آرہے تھے۔ اُس کی متانت، اُس کی سنجیدگی، اُس کا پر اعتماد لہجہ، اجے پر اس کا اندھا دھند بھروسہ۔
"دراصل ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنا بے تحاشا چاہتے ہیں کہ کسی تیسرے وجود کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف کس اعتماد سے اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ اور صرف ایک دفعہ نہیں، کئی بار کہا تھا۔
کاش میں اُس وقت اُسے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیتی۔ مگر کیسے؟؟؟
اُس کے بھروسے کی دیوار کو ڈھانا ایسا آسان نہ تھا۔
اجے نے یہ کام کیوں کر کیا ہوگا؟
کیا اس دنیا میں مومو کا نعم البدل ممکن تھا؟
اور وہ بھی شادی کے پندرہ برسوں کے بعد! اتنے طویل عرصے میں تو ایک بے زبان جانور سے بھی اُنسیت ہو جاتی ہے۔
اجے نے مومو کو کیسے چھوڑا ہوگا؟
ہم دونوں رات بھر جاگا کئے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لمحہ بھر کو آنکھ لگتی تو مومو کا دلکش چہرہ سوالیہ نشان بن کر سامنے آجاتا۔ اعتماد کی دیوار ڈھے جانے کے بعد اُس کا غیر محفوظ اور بے سہارا وجود رات بھر مجھے Haunt کرتا رہا۔
کوئی چار چھ ماہ بعد کی بات تھی۔
فراز فیملی کے ساتھ ایک شام بغیر اطلاع کے چلے آئے۔ یہ بھی اجے اور واجد کے بچپن کے دوست تھے اور ہماری طرح کافی عرصہ باہر رہ کر ہم سے سال بھر پہلے ہی پاکستان لوٹے تھے۔
"اجے بھائی کو دیکھو۔ اس عمر میں اُسے شادیاں رچانے کا شوق سما گیا ہے۔" فراز کی بیگم چھوٹتے ہی بولیں۔
"ہاں ـــــ اُن کی شادی کا سُن کر مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔" میں نے دبے دبے کہا۔
"اے کون سی شادی؟ وہ تو شادیوں پر شادیاں کر رہا ہے۔ میں کہتی ہوں باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ مومو سے شادی کے پندرہ برس گزر گئے کبھی اولاد کا خیال نہیں آیا۔ اور اب ایکدم اولاد کے لئے مرنے لگا ہے۔"
"اولاد کے لئے ـــــ!"

میرے ذہن میں یکلخت کوندا سا لپکا۔ اولاد کے لئے ـــــ او خدایا! تو اجے کا ہمارے ہاں آنے کے فوراً بعد سنی اور جیکو کو دیکھ کر بجھ جانا ـــــ!
گویا میرے جملے نے اُس کے قدم نہیں اکھیڑے تھے۔ میں خواہ مخواہ اپنے کیے پر پچھتاتی پھری۔ جبکہ وہ بے چارہ تو احساسِ محرومی کا شکار تھا۔

مومو کے بعد جس لڑکی سے اُس نے شادی کی خدا معلوم اُسے کیا بیماری تھی کہ چھ ماہ کے اندر ہی اسے طلاق دے کر گھر بھجوا دیا۔ فراز بتاتے تھے کہ پچھلے ہفتے اُس نے ایک اور شادی کر لی۔ لڑکی اُس سے عمر میں بیس پچیس برس چھوٹی ہے۔"

"اور مومو کدھر ہے؟" میں نے بے حد پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"مومو کی اجازت سے ہی تو وہ یہ سب ناٹک کھیل رہا ہے۔"

"مومو کی اجازت سے؟" مجھے اپنے گلے پھندا سا محسوس ہوا۔

"وہ غریب اجازت نہ دیتی تو کیا کرتی۔ طلاق کہلوانے سے بہتر تھا کہ سینے پر صبر کی سل رکھ کر........"

مجھ میں اور سننے کی تاب نہ تھی۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ہونٹ چباتی کچن میں چلی گئی۔

واجد نے مجھ سے بہت کہا کہ کسی ویک اینڈ پر اجے کے پاس چل کر مومو کی خیریت دریافت کرتے ہیں مگر مجھ میں مومو کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

بہت سا عرصہ بغیر ملے گذر گیا۔

پھر اُڑتی اُڑتی سی سنی کہ اجے کی تیسری بیوی نے بالآخر اُسے "باپ" بنا دیا ہے۔ ایک کمزور سی چھ سات پاؤنڈ کی بچی پیدا ہوئی ہے۔
واجد نے پھر مجھ سے کہا کہ چل کر مبارکباد دے آئیں مگر میں اس دفعہ بھی نہ مانی۔ اجے اگر خود یہ اطلاع ہمیں دیتے تب ہمیں مبارکباد کے لئے جانا پڑتا۔

نہ معلوم اجے کیوں ہم سے ملنے سے کتراتا تھا۔ میرے میاں کبھی کبھی اُسے یاد کر کے افسردہ ہو جاتے۔ اس نے واجد کے ساتھ بچپن کا سنہرا زمانہ گزارا تھا۔ اکٹھے تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ ملازمت نے ان دونوں کو علیحدہ کر دیا مگر پھر بھی ہر عید تہوار پر یہ دونوں اکٹھے ہوتے اور خوب ہنگامے کرتے۔ اب بقول میرے میاں کے اجے "بیویوں" کے چکر میں پڑ کر اپنی عاقبت خراب کر رہا تھا

اُس کے بعد آنے والے برسوں میں مختلف قسم کی افواہیں سننے میں آتی رہیں۔ اجے تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا مگر "ولی عہد" ہنوز ایک خواب تھا۔ اُس کی تیسری بیوی ندرت اور مومو میں زبردست ٹھننے لگی تھی۔ بات اب گالی گلوچ سے بڑھ کر مار پیٹ تک پہنچ چکی تھی اور اجے ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو گیا تھا۔ ہم دونوں یہ افواہیں سنتے اور ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے۔ اجے کی مدد کرنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ وہ غلطیوں کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں ڈوب چکا تھا۔ اب اُس کے لئے دعائے خیر کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک شام میں بچوں کو ہوم ورک کرا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ واجد نے فون اُٹھایا۔ تھوڑی سی رسمی بات چیت کے بعد ریسیور اوندھا کر مجھے آواز دی "نمت۔ بیگم فراز کا فون ہے۔ لگتا ہے اُن کی پٹاری میں کوئی زبردست خبر ہے۔ میری تو اگلے گھنٹے بھر کی چھٹی۔"

میں نے بیزاری سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "واجد جی! بچوں کا ہوم ورک اب آپ ہی دیکھئے، بلکہ میرے لئے ایک پیالی گرم چائے اور ڈسپرین کا بھی انتظام کر دیجیے۔"

"ہیلو نمت!" بیگم فراز چھوٹتے ہی بولیں۔ واقعی اُن کے پیٹ میں بہت اہم خبر کلبلا رہی تھی۔ "کچھ پتہ چلا تمہیں؟"

"نہیں تو ـــــ کیا ہوا؟"

"ارے بھئی یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ ندرت کے ہاں پرسوں بیٹا پیدا ہوا ہے اور ـــــ"

"اوہ، تو اچھے بھائی کو بالآخر "ولی عہد" مل گیا" میں بیگم فراز کی بات کاٹ کر بے تابی سے بول اٹھی۔

"ولی عہد تو مل گیا مگر خود والد صاحب ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اے لو، اور سنو، تمہیں ندرت اور مومو کے جھگڑوں کا علم نہیں؟ خدا معاف کرے، اُن کے گھر میں تو اب چوبیس گھنٹے چیخ پکار مچی رہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو وہ وہ مغلظات سناتی ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے کبھی بچوں پر لڑائی، کبھی چیزوں کو توڑنا پٹخنا، کبھی ـــــ"

"اچھے بھائی کو کیا ہوا؟" میں نے اُن کی لمبی چوڑی تمہید سے گھبرا کر پوچھا۔

"وہی تو بتا رہی ہوں۔ جس آدمی کو گھر میں سکون نہ ملے اُسے ایک نہ ایک دن دل کا دورہ تو پڑتا ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟ اچھے کو ہارٹ اٹیک ـــــ"

"ہاں ہاں ـــ اُن کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے۔"

"خدا رحم کرے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ جس ولی عہد کو "پانے" کے لئے انھوں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے اُسے پروان چڑھانے کی "مہلت" بھی مانگ لیتے۔

فون رکھ کر میں نے واجد کی طرف دیکھا۔ اُن کی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی واجد۔" میں نے اُن کا کندھا ہلایا۔

"کیا خیال ہے اچھے کو ولی عہد کی مبارکباد دینے چلیں۔" انھوں نے میری طرف دیکھا مگر کچھ بولے بغیر سر ہلا دیا۔

اگلے روز واجد کی میٹنگ تھی۔ وہ صبح جلدی نکل گئے۔ سنی کو کچھ دنوں سے بخار آ رہا تھا۔ میں اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تو اس نے ٹائیفائڈ کا خدشہ ظاہر کیا۔ اُس کے بلڈ ٹیسٹ کے بعد میں گھر لوٹی تو واجد تب تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ بچے کو دوائی وغیرہ دے کر میں نے آفس فون کیا۔ واجد کی آواز غیر معمولی بھاری ہو رہی تھی۔ "اچھا ہوا تم آگئیں۔ سنی کیسا ہے؟"

"سنی کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔"

"اوہو، بُرا ہوا۔" وہ بے دھیانی سے بولے "سنو نمٹ میں ذرا جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟؟"

"اچھے کو خدا حافظ کہنے۔"

"کیا مطلب؟"

"آج صبح وہ ہم سے بچھڑ گیا ہے۔" واجد کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

"اوہ خدایا۔" میرا سر چکرا گیا۔

"سنی بیمار ہے، تم تو نہیں جا سکتیں۔ میں بس ابھی جا رہا ہوں کل کسی وقت آجاؤں گا۔" مزید کچھ کہے بغیر انھوں نے فون رکھ دیا۔

میں فون پر دونوں ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر گم سم بیٹھی رہی۔

اچھے نے اپنی بساط سے بڑھ کر پرواز کی کوشش کی تھی نا۔ جبھی تو اُس کے پر کاٹ دیئے گئے تھے۔ کاش! انہیں پہلے سے اپنا انجام معلوم ہو سکتا!

ہنوور کا سفر

منیر الدین احمد

مجھے جرمنی میں رہتے ہوئے ڈیڑھ برس ہو چکا تھا مگر میں نے اس وقت تک ہمبرگ اور لیوبک کے سوا اس ملک کا کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تھا۔ ایسٹر کی چھٹیاں آئیں تو میں نے ہنوور جانے کا پروگرام بنایا، جو ہمبرگ سے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ میرے پاس فالتو پیسے بالکل نہ تھے، جو ریل گاڑی کے ٹکٹ اور ہوٹل میں قیام پر خرچ کئے جا سکتے ہوں، اس لئے میں نے سوچا کہ سفر آٹو سٹاپ کے ذریعے کروں گا اور ہنوور میں یوتھ ہوسٹل میں جا کر ٹھہروں گا جس کا کرایہ برائے نام ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ارادے کا ذکر اپنی لینڈ لیڈی کے خاوند ہربرٹ سے کیا، تو اُسے اپنی جوانی کا اکلوتا سفر یاد آ گیا، جو اُس نے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ہمراہ سائیکلوں پر کیا تھا۔ وہ ہنوور سے بھی گزرے تھے، جہاں پر انھوں نے اسٹیشن کے مشن ہاؤس میں رات گزاری تھی۔ یہ جگہ نادار مسافروں اور ایسے لوگوں کو رات بھر ٹھہرانے کے لئے بنائی گئی ہے، جن کا کوئی گھر بار نہ ہو۔

ہربرٹ کے دیکھتے دیکھتے زندگی میں کس قدر انقلاب آ چکا تھا۔ اس کی جوانی اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں انفلیشن اور بے روزگاری کے شکنجوں میں گزری تھی، جب دو وقت کی روٹی کا پیدا کرنا سب سے بڑا مسئلہ ہوا کرتا تھا۔ نازی پارٹی کے برسرِ اقتدار آتے ہی بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے ایسے پروگراموں پر عمل درآمد ہونے لگا جن کا انجام دوسری جنگ عظیم کی صورت میں برآمد ہوا۔ آٹوبان سڑکیں بننے لگیں اور ہتھیار تیار کرنے والی فیکٹریوں میں دن رات کام ہونے لگا۔ ہربرٹ کا تعلق سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ یہ حالت جنگ کے خاتمے تک رہی۔ ایسے حالات میں انھیں نہ تو سیر و تفریح کی فرصت تھی اور نہ ہی اس کام کے لئے ان کے پاس پیسے تھے۔

جنگ کے بعد مغربی جرمنی کی از سرِ نو تعمیر کے نتیجے میں خوش حالی کا ایسا دور آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جرمن قوم کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ ابتدائی برسوں میں لوگوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے سوا کسی دوسری چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے فاقوں والے برسوں کی کسر نکالی جا رہی تھی۔ پھر لوگوں نے اپنے گھروں کو سامانِ آسائش سے بھرنا شروع کیا اور اچھے کپڑے پہننے کا رواج ہوا۔ اب لوگ سیر و تفریح کی طرف متوجہ ہوئے۔ پچاسویں دہائی کے اواخر میں، جب میں جرمنی میں پہنچا، لوگ اٹلی کے ملک کی دریافت میں مصروف تھے۔ بے شمار لوگ ایک آدھ بار اٹلی کا سفر کر چکے تھے اور وہاں پر جرمن ٹورسٹوں کے ہجوم، چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور اطالوی مردوں کی جرمن عورتوں میں غیر معمولی ہر دلعزیزی کی داستانیں مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔

مگر ہربرٹ اور اس کی بیوی اپنی جوانی کے اکلوتے سفر کی یادوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی آمدنی محدود تھی اور پس انداز کردہ رقم کا ایک ایک پیسہ انھوں نے اپنے مکان کی تعمیر پر لگا دیا تھا۔ اس مکان میں لگنے والی ایک ایک اینٹ ہربرٹ نے اپنے ہاتھوں سے چُنی تھی اور سیمنٹ اور ریت کی ہر بوری کو اپنے کندھوں پر اٹھا کے لایا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتی تھی کہ لوگ سفروں پر جاتے اور اپنا روپیہ پیسہ برباد کرتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ جاننے کے لئے کہ اچھے اور برے انسان ہر جگہ پر پائے جاتے ہیں، آدمی کو سفروں پر جانے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اس بات کو

ہر کوئی اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑانے سے بخوبی جان سکتا تھا۔ میری سفر کے حق میں دی ہی ساری دلیلیں ہربرٹ کو قائل نہ کر پاتی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر انسان پیدل چل کر جائے یا سائیکل پر سوار ہو کر اپنے پٹھوں کو استعمال میں لا کر سفر کرے، تو اس کی لذت بالکل ایک دوسری ہوگی۔ یہ کیا ہوا کہ کار، ریل گاڑی یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر انسان دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اس تیز رفتاری کے سبب انسان کی روح کہیں رستے میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ دراصل آدمی کو ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ٹٹو پر بیٹھ کے جانا چاہیے۔

ہربرٹ کی تقریر مجھے ہنوور کے سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ میں ایک صبح اپنا مختصر سا سامان کا بقچہ پیٹھ پر باندھے ہوئے آٹو باہن پر جا کھڑا ہوا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک کار میرے پاس آ کر رکی۔ ڈرائیور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس کا سر آدھا گنجا ہو چکا تھا۔ اس کی توند اتنی بڑی تھی کہ سیٹ اور سٹیرنگ ویل کے درمیان چپہ بھر جگہ باقی نہ تھی۔ اُسے ہنوور سے گزرنا تھا اور وہ مجھے شہر کے عین درمیان پہنچانے کو تیار تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ لمبے سفروں پر اکثر بیچ ہائیکنگ کرنے والوں کو ساتھ لے جایا کرتا تھا تاکہ رستے میں گپ شپ لگا سکے۔ وہ سوئٹزرلینڈ کی گھڑیوں کی ایک فرم کا ایجنٹ تھا اور اس سلسلے میں سارا ہفتہ شہر بہ شہر گھوما کرتا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی زندگی خوب مزیدار گزرتی ہوگی۔ آج یہاں تو کل وہاں اور ساتھ کے ساتھ انسان پیسے بھی کما لیتا ہے۔ اُسے یہ بات اچھی لگی اور اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے اور اپنی فتوحات کی داستانیں سنانے لگا۔ ان لڑکیوں کی کہانیاں جو اُسے رستے میں آئے دن بیچ ہائیکنگ کرتی ہوئی ملا کرتی تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کی کہانیاں ناقابلِ اعتبار ہوتی گئیں اور میری دلچسپی اس کی باتوں میں گھٹتی گئی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہونے لگی کہ لوگ جھوٹ بولنے میں کیسی دیدہ دلیری دکھاتے ہیں۔

ہنوور پہنچ کے سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ڈگمار کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ڈگمار اس شہر کی رہنے والی تھی اور میری طرح ہمبرگ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ ہماری دوستی ان دنوں سے تھی، جب مجھے ہمبرگ میں آئے ہوئے ہفتہ عشرہ ہوئے تھے۔ میں نے زبان سیکھنے کے لئے جرمن کلاسوں میں داخلہ لیا تھا۔ جرمن زبان کا سرٹیفیکیٹ حاصل کئے بغیر یونیورسٹی میں تعلیم شروع کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ ڈگمار نے ایک روز مجھے کیفے ٹیریا میں مخاطب کر کے جرمن زبان سیکھنے میں مدد دینے کی پیش کش کی اور شرط یہ لگائی کہ میں اُسے اردو پڑھا دیا کروں۔ پتہ چلا کہ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے قبل ایک سال انگلستان میں گزارا تھا، جہاں پر اس کی ملاقات ایک پاکستانی طالب علم اصغر کے ساتھ ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی اور وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔

ڈگمار نے مجھے اپنا شہر دکھانے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں میں ڈگمار میرے لئے ایک گائیڈ کا درجہ رکھتی تھی۔ جرمن معاشرے کو سمجھنے اور یہاں کی زندگی کے اصولوں کو جاننے کے لئے مجھے اس سے بہتر رہنما نہیں مل سکتا تھا۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ تیسری دنیا سے آنے والوں کا جب یورپ میں ایک یکسر اجنبی ماحول سے واسطہ پڑتا ہے جس کی قدریں مختلف ہوتی ہیں اور جہاں کے باسیوں کا رہن سہن، سوچ بچار اور معاملہ کرنے کے اصول دوسرے ہوتے ہیں، تو ان کو ایک ثقافتی دھچکا لگتا ہے۔ جس کے اثرات بڑے دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ میں پاکستان کے ایک چھوٹے قصبے سے آیا تھا جہاں کی زندگی میں ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا۔ تیز رفتاری نام کو نہ تھی۔ لوگوں کا آپس میں تعلق انسیت اور مروت کا تھا۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی محض دکھاوے کی چیز نہ تھی بلکہ اس کا عملی اظہار قدم قدم پر ہوتا تھا۔ نمائش کی بجائے لوگ اخفا کو پسند کرتے تھے۔

جرمنی میں ہر چیز مختلف تھی۔ رات بھی دن کی طرح روشن تھی۔ چیزوں کی چمک دمک کے سبب انسان کی آنکھیں چکا چوند ہوتی تھیں۔ ساری زندگی ایک نمائش کے مترادف تھی۔ دکانیں ہر قسم کے سامان سے لدی پھندی تھیں اور لوگ سامانِ آسائش و آرائش خریدنے میں اس قدر منہمک تھے جیسے اس سے بڑی عبادت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بازاروں اور دکانوں میں اس قدر بھیڑ ہوتی تھی کہ لگتا تھا، جیسے سارا شہر وہیں پہ امڈ آیا تھا۔ میرے لئے یوں بھی ہر چیز نئی تھی۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور میرے لئے نمائش گھر تھے۔ میں بھی دوسرے کے ساتھ اپنے خالی اوقات کو ان

دوکانوں میں گھوم پھر کے گزارتا تھا اگرچہ میری جیب میں پیسے نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے کہ سوائے کھانے کے سامان کے میں اور کوئی چیز نہیں خرید سکتا تھا۔ میں جب لوگوں کو خریداری کرتے ہوئے دیکھتا تھا اور ان کے مسرت کے سبب تمتماتے ہوئے چہروں کو تکتا تھا تو سمجھتا تھا کہ جرمن لوگ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ اس مال و متاع کے حصول کی خاطر لوگ دن رات جان ماری کرتے تھے اور ان کی خوشیاں کتنی کھوکھلی اور عارضی ہوتی تھیں۔

ڈگمار کی زبانی مجھے نوجوان نسل اور اس کے والدین کے درمیان پائی جانے والی خلیج کا پتہ چلا۔ دوسری عالمگیر جنگ کو ختم ہوئے ابھی پندرہ برس ہی ہوئے تھے اور نازی پارٹی کے چیلے چانٹے معاشرے میں ہر طرف پائے جاتے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں سے ہر کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کا تعلق نازی پارٹی کے ساتھ کبھی رہا ہی نہ تھا۔ نوجوان نسل جب ان سے استفسار کرتی تھی کہ نازیوں کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف تم نے کیا عملی قدم اٹھایا تھا، تو اکثر یہ جواب ملتا تھا کہ ہمیں ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ ڈگمار کا کہنا تھا کہ اس کا باپ نازی عہد میں سرکاری وکیل تھا، کم از کم اس کو پتہ ہونا چاہیئے کہ اس کے بچے اس جواب سے مطمئن نہ کیے جا سکتے تھے۔ ڈگمار کے الفاظ میں اس کے باپ کی نسل نے ایک عالمی جنگ ہار کر بھی کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اس کے باپ کو پتہ تھا کہ ڈگمار ایک پاکستانی طالب علم سے محبت کرتی تھی۔ اس لیئے وہ بار بار کہا کرتا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی کو داماد کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں ایک ایسے ماحول سے آیا تھا، جہاں پر بچے اپنے ماں باپ کی بات کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ اب میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جرمن لڑکی کی زبانی سن رہا تھا کہ اُسے نہ صرف اپنے باپ کی بات سے اختلاف تھا، بلکہ وہ اُسے اپنی زندگی میں دخل انداز ہونے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھی۔

ڈگمار ایک بالغ نظر لڑکی تھی اور اس کے ساتھ دوستی خود میری اپنی ذہنی ترقی میں بے حد ممد ثابت ہوئی۔ ہمارے درمیان کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر پوری آزادی کے ساتھ بات نہ کی جا سکتی ہو۔ میں نے دیکھا کہ جرمن عورتوں میں اپنے آپ پر حد درجہ اعتماد پایا جاتا تھا۔ ڈگمار شرم و حیا کا مرقع تھی۔ اس اعتبار سے وہ سراسر ایک مشرقی عورت لگتی تھی، جس کو مغرب کی بے راہ روی جیسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔

یوتھ ہوسٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کرنے کے بعد میں ڈگمار سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ اُس روز ڈگمار کے علاوہ صرف اس کی ماں گھر پر تھی اور اُس نے ہماری خاطر خاص طور پر ایک کیک تیار کر رکھا تھا۔ بالکل ایسا کیک وہ ہر ہفتے ڈگمار کو پارسل کے ذریعہ ہمبرگ بھیجا کرتی تھی۔ جس کا ایک ٹکڑا ڈگمار میری آمد والے دن تک بچا کر رکھا کرتی تھی۔ ہم ہفتے میں دو دو روز ملتے تھے جمعرات کے روز وہ میری رہائش گاہ پر آتی تھی اور اتوار کے روز میں اس کے ہاں جاتا تھا۔ دونوں روز ہم گھنٹوں تک اکٹھے گزارتے تھے۔ دنیا جہان کے موضوعات پر بحثیں کرتے تھے لمبی سیریں کرنے نکل جاتے تھے اور گاہے گاہے اوپیرا یا تھیٹر میں جاتے تھے۔ جرمن زبان کا جو لہجہ ہنوور میں بولا جاتا ہے اُسے اس زبان میں سٹینڈرڈ لہجہ قرار دیا جاتا ہے اس طرح مجھے ڈگمار کی صورت میں بہترین استانی ملی تھی جس نے میرا لہجہ درست کرنے میں بے حد مدد کی۔

ڈگمار مجھے، اپنے شہر کی سیر کروانے کے بعد شام کے وقت یوتھ ہوسٹل میں چھوڑ گئی۔ جہاں پر میرا ہم کمرہ کینیڈا کا ایک نوجوان تھا۔ جس نے چند برس تک کمائی کرنے کے بعد دنیا کی سیر کا ارادہ کیا تھا چلنے سے پہلے اُس نے منگیتر کو اپنی منگنی کی انگوٹھی یہ کہہ کر دے دی تھی کہ اگر اس کی غیر حاضری کے دوران اُسے کوئی اور لڑکا مل جائے جس سے اُس کا شادی کرنے کو دل چاہتا ہو تو اپنے آپ کو آزاد سمجھے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔ پاول اس طرح ہر قسم کے پھندوں سے آزاد ہو کر دنیا میں گھوم رہا تھا، اور لڑکیاں معلوم ہوتا تھا، اُسے ہر جگہ مل جاتی تھیں۔ ہنوور کے یوتھ ہوسٹل میں ہی اس کو ایک جرمن لڑکی مل گئی تھی، جو اس کے ہمراہ سارے جرمنی میں گھومنے کو تیار تھی۔ پاول نے آتے ہی ایک موٹر سائیکل خرید لیا تھا اور اُس روز

اپنی نئی سہیلی کو اس پہ بٹھا کے سارا دن گھومتا رہا تھا۔

اگلی صبح میری واپسی کا پروگرام تھا۔ مجھے ایک ٹرام میں آخری سٹاپ تک جانے کا مشورہ دیا گیا، جہاں سے چند سو قدم کے فاصلے پر ہمبرگ کی سمت جانے والی آٹوباہن موٹر سڑک پائی جاتی ہے۔ مجھے وہاں سے ہچ ہائکنگ کے ذریعہ واپس ہمبرگ جانا تھا۔ جب ٹرام کے ڈرائیور نے آخری اسٹاپ کے آنے کا اعلان کیا تو میں نے اپنے پہلو والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا کہ آیا وہ آٹوباہن کی طرف جانے والے رستے کی نشان دہی کر سکے گی؟ میں نے اس وقت تک اس کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا اور سارا وقت کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتا رہا تھا۔ میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ بھی میری طرح اپنی گود میں ایک بقچہ رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ اب جو میں نے گھوم کے اس پہ نگاہ دوڑائی تو اس کے سرخ و سفید چہرے پر پھیلی ہوئی بیک وقت معصومیت اور عیاری کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ بے حد صحت مند لگ رہی تھی۔ اتنی صحت مند کہ اس کا بدن اس کے بلاؤز میں سے چھلکا پڑتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کئی سال پرانا بلاؤز پہن رکھا تھا، جو اُسے تنگ ہو چکا تھا۔ اُس نے ٹرام سے اترتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور بتایا کہ اُسے بھی اسی طرف جانا تھا۔

اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا، جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے، کہ وہ مجھ سے میرے آگے پیچھے کے بارے میں پوچھتی اور جاننا چاہتی کہ میں کب سے جرمنی میں مقیم تھا اور آیا مجھے اس کا ملک پسند آیا تھا یا نہیں اور یہ کہ میں کرتا کیا تھا اور رہتا کہاں پر تھا۔ مگر میری توقع کے اُلٹ اُس نے جو پہلی بات کہی، وہ یہ تھی کہ اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا کہ میں اسی کا پرانا واقف کار عبداللہ تھا، جس کے ساتھ اس کی ملاقات کئی سال ادھر ہمبرگ کے بیسواؤں کے بازار ریپرباہن میں ہوئی تھی۔ اب میں لاکھ کہوں کہ نہ تو میں اس کا واقف کار عبداللہ ہوں اور نہ ہی کبھی میں ریپرباہن پہ گیا ہوں اور ہماری ملاقات کئی سال ادھر ہو ہی کیسے سکتی تھی، جب کہ مجھے جرمنی میں وارد ہوئے بمشکل ڈیڑھ برس ہوا تھا، مگر وہ اپنی ضد پہ اڑی رہی اور مجھے یقین دلانے لگی کہ اس کا حافظہ بہت عمدہ تھا۔

یہ بحث کرتے کرتے ہم دو تین گلیاں عبور کر کے ایک سڑک پر گھومے جس کا نام دِل شٹراسے تھا۔ وہاں پر دو کاریں کھڑی تھیں اور ایک لمبا دھڑنگا گنجے سر والا آدمی کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یکا یک لڑکی نے مجھے پکڑ کر پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیا اور فوراً ساتھ کی گلی میں مڑ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس اچانک بیک گیئر کا تعلق ان کاروں اور مرد کے ساتھ تھا، جو مجھے پہلی نظر میں ہی بدمعاش لگا تھا۔ شاید وہ وہاں پر لڑکی کی راہ تک رہا تھا۔ مگر لڑکی میرے کسی سوال کا جواب دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اُس نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی اور مجھے بھی جلدی جلدی کرنے کو کہنے لگی۔

ہم گھوم پھر کے ایک پارک میں جا نکلے جس میں اتنی صبح امن و امان کا سماں چھایا ہوا تھا۔ سیر و تفریح کے لئے آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور ہمیں ایک خالی کنج تلاش کرنے میں ذرا بھر دیر نہ لگی۔ عام طور سے ایسے کنجوں میں کوئی نہ کوئی جوڑا بوس و کنار کرتا ہوا ملتا ہے۔ یہ جگہ ایک گھنے درخت کی ٹہنیوں سے اس طرح ڈھانپی ہوئی تھی کہ باہر سے کسی کی نظر اندر نہ پڑ سکتی تھی۔ لڑکی جس کا نام ریناٹے تھا، وہاں پہنچ کر مطمئن ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ ہمیں وہاں پر کوئی تلاش نہ کر پائے گا۔ مگر وہ یہ بتانے پر آمادہ نہ ہو رہی تھی کہ کون اس کی تلاش میں تھا اور کس وجہ سے؟ اس نے یہ کہہ کر میرا منہ بند کر دیا کہ جلدی کے کام شیطان کے ہوتے ہیں اور اگر میں اُسے تھوڑی سی مہلت دوں تو وہ مجھے دھیرے دھیرے سب کچھ بتا دے گی۔ پھر مجھے ہمبرگ پہنچنے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ وہاں پر کون سے بیوی بچے میری راہ تک رہے تھے۔

وہ دن یوں بھی تعطیل کا تھا اور ریناٹے کے بقچے میں چاکلیٹ، بسکٹ، بادام اور دوسری بے شمار خورد و نوش کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ دو روز پہلے اس کی ماں کا پیکٹ آیا تھا، بلکہ اُس نے کیک خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے بھیجا تھا۔ ریناٹے کا ارادہ یہ چیزیں اس تہوار

کے روز اپنے اطالوی دوست کے ہاں لے جانے کا تھا۔ مگر اب وہ تہوار میرے ساتھ منانا چاہتی تھی۔ میں نے بتیرا کہا کہ اس کا اطالوی دوست اس کی راہ تکتا رہے گا۔ مگر ریناٹے کو اس کی پروا نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اُسے اتنے برسوں کے بعد ملا تھا اور وہ ہماری تجدید ملاقات کو باقاعدہ منانا چاہتی تھی۔

اب جب کہ وہ مجھے عبداللہ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ اس کا بیسواؤں کے بازار ریپر باہن کے ساتھ کیا تعلق تھا۔ اور پچیس تیس زمانے کی وہ بات کر رہی تھی، ان دنوں میں تو وہ ابھی بہت کم عمر ہوگی۔ پتہ چلا کہ وہ آٹھ نو سال پہلے اس بازار میں رنڈی رہ چکی تھی۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کی بھی نہ تھی۔ میں یہ سُن کے حیران ہوا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ اتنی کم عمر کی لڑکیاں رنڈیوں کا کسب نہیں کرتیں، یا کم از کم اس عمر میں وہ اس بازار میں جا کر نہیں بیٹھتیں۔ اس زمانے میں بعض رنڈیاں کاروں میں پھرتی تھیں اور سڑکوں پر گاہک تلاش کرتی تھیں۔

میں نے جاننا چاہا کہ اتنی چھوٹی عمر میں وہ کیونکر رنڈی بن گئی تھی، جب کہ اُسے یقیناً کہیں نہ کہیں ملازمت مل سکتی تھی اور اگر وہ تھوڑی بہت کوشش کرتی تو شاید کوئی مرد اس کے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہو جاتا۔ اس زمانے میں جرمن نوجوان شادی کرنے سے کتراتے نہیں تھے جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ ریناٹے میری سادہ لوحی پر دل کھول کر ہنسی اور پوچھنے لگی کہ کیا بیسوائی ایک پیشہ نہیں تھا اور کیا شادی کرنے والی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ وہی کچھ نہیں کرتیں، جو وہ کرتی رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اپنی عورت کو مرد اہمیت نہیں دیتے جب کہ رنڈیوں کے ناز نخرے اُٹھاتے ہیں اور پیسے بھی ادا کرتے ہیں۔

میں سادہ لوح ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ ان دونوں چیزوں میں فرق نہ جان سکتا۔ اس لئے اس کی باتوں میں نہ آیا اور اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ مجھے اپنی زندگی کی داستان لگی لپٹی رکھنے کے بغیر سنائے۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، مگر جب میں نے کرید کرید کر سوالات پوچھنے شروع کئے اور اس سے یہ کہلوانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا اس رستے کو اختیار کرنے کا سبب ایسے حالات بنے تھے، جن پر اس کا قابو نہ تھا —— تو اسے یہ بتاتے ہی بنی کہ اس بات کا تعلق اس کے باپ کے ساتھ تھا۔ میں نے قیافہ لگایا کہ شاید اس کے باپ نے اسے پیسے دینے بند کر دیئے تھے، مدرسے سے اُٹھوا لیا تھا یا شاید گھر سے نکال دیا تھا۔

بالکل یہی بات تھی کہ اُس نے ریناٹے کو گھر سے نکال دیا تھا یا زیادہ بہتر ہوگا اگر کہا جائے کہ گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ باپ بیٹی میں اختلافات شاید اس وجہ سے پیدا ہوئے ہوں گے کہ بیٹی نافرماں بردار ہوتی جا رہی تھی اور ماں باپ کے قابو میں نہ رہی تھی۔ اُس نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے باپ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ جب اس کے اس اشارے سے بھی بات میرے پلے نہ پڑی، تو اُسے کھل کے بتانا پڑا کہ اُس کے باپ کی خواہش جنسی تھی اور یہ کہ وہی اس کی زندگی میں پہلا مرد بن کے آیا تھا۔ اس کی ماں کو اس بات کا پتہ تھا مگر وہ ریناٹے کی مدد کرنے کے قابل نہ تھی۔ ریناٹے کا باپ بے تحاشا شراب پیتا تھا اور نشے میں اس کی ماں کو مارا بھی کرتا تھا۔ اس نے اُسے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اُس نے پولیس کے پاس رپورٹ کی تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ ریناٹے کی ماں نے خود اُسے کہا تھا کہ وہ گھر سے چلی جائے، تاکہ وہ اس روز روز کی اذیت سے بچ جائے۔

مگر گھر سے باہر اُسے بھلا کہاں پر تحفظ مل سکتا تھا۔ ریناٹے نے سکول ساتویں جماعت سے چھوڑ دیا تھا۔ کسی جگہ اپرنٹس شپ نہ مل سکی تھی دو چار فرموں میں کام کیا تھا، مگر چونکہ کسی قسم کی ہنرمندانہ قابلیت نہ رکھتی تھی، اس لئے معمولی قسم کے کاموں کے سوا کوئی نوکری نہ مل سکتی تھی۔ تنخواہ اتنی کم ملتی تھی کہ اس میں کمرے کا کرایہ اور رہنے سہنے کے تمام اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ ان دنوں میں وہ ایک بھڑوے کی نظر میں آ گئی، جس کا خیال تھا کہ اس کی شکل و صورت کی لڑکی کہیں زیادہ پیسے کما سکتی تھی۔ ان دنوں چونکہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے کم تھی، اس وجہ سے وہ اس

پینے کے لئے لائسنس حاصل نہ کر سکتی تھی اور چھپ چھپا کے کام کرتی تھی۔ اس کا طریق یہ تھا کہ اُسے ہمبرگ کے چکلے دیپر باہن کے ایک پب میں ویٹرس رکھ لیا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہیں پہ اس کی ملاقات عبداللہ کے ساتھ ہوئی تھی، جس کے ہمزاد ہونے کا شرف وہ مجھے دینے پر تلی ہوئی تھی۔

پھر ایک روز اس کی ماں کا خط آیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی، جس کے سبب اس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی اور اُسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔ ریناٹے فوراً سمجھ گئی کہ معاملہ کیا تھا۔ جب کبھی اس کا باپ شراب کے نشے میں اس کی ماں کی ٹھکائی کرتا تھا، تو ہمسایوں سے بات کو چھپانے کے لئے اس کی ماں سیڑھیوں سے گر جانے کا بہانہ لگایا کرتی تھی۔ ریناٹے اسی روز اپنے شہر پہنچی، اور ہسپتال میں جا کر ماں سے تمام قصہ سنا، جو یہ تھا کہ اس کا باپ دراصل ریناٹے کی ماں پر تشدد کر کے اُسے بیٹی کو واپس بلانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ ریناٹے نے ماں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر باپ مارنے پیٹنے سے باز نہ آیا تو وہ کچھ کر بیٹھے گی۔ چنانچہ اس شام وہ گھر پہنچی تو باپ وہاں پر نہ تھا۔ وہ حسب عادت پب میں شراب پینے گیا ہوا تھا۔ ریناٹے باورچی خانے میں سے سب سے بڑی چھری لے کر آدھی رات تک اس کی راہ تکتی رہی۔ جب وہ نشے سے چور گھر پہنچا تو اس قابل نہ تھا کہ ریناٹے کے حملوں کا مقابلہ کر سکتا۔ اگلے روز جب پولیس کو اس کی لاش ملی تو اس کے بدن پر چھری کے چودہ وار گنے گئے۔

ریناٹے راتوں رات غائب ہو گئی تھی۔ جب بعد میں پولیس نے اُسے ہمبرگ میں گرفتار کیا، تو بھڑوے نے شہادت دی کہ ریناٹے نے وہ رات اس کے ساتھ گزاری تھی۔ مگر اخباروں میں ریناٹے کی تصویریں چھپنے پر ریل گاڑی کے مسافروں نے گواہی دی کہ اُس نے ان کے ہمراہ قتل کی رات سفر کیا تھا۔ بالآخر ریناٹے کو ماننا ہی پڑا کہ اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا، اُس نے کھل کے تمام واقعات بیان کر دیئے۔ اس کی عمر چونکہ اٹھارہ برس سے کم تھی، اس لئے اس کا مقدمہ کمسن مجرموں کی عدالت میں چلا۔ البتہ اس کا جرم قتل بالقصد کے مترادف جانا گیا اس لئے اس کو آٹھ سال کے قید و بند کی سزا دی گئی۔

جس روز ہماری ہینوور میں ملاقات ہوئی تھی، اس سے صرف تین ماہ کے بعد اس کی قید کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ اُسے دو سالوں سے تہواروں کے دنوں میں جیل خانے سے باہر جانے کی چھٹی ملتی تھی۔ یہ دن وہ اپنے ایک اطالوی دوست کے ہمراہ بسر کیا کرتی تھی، جس کے ساتھ اس کا تعارف ریلوے اسٹیشن پر ہوا تھا۔ اس روز بھی وہ اُسی کے ہاں جا رہی تھی۔ مگر رستے میں چونکہ اس کی ملاقات اپنے پرانے دوست عبداللہ کے ساتھ ہو گئی تھی اس لئے اُس نے سوچا تھا کہ وہ چند گھنٹے میرے ساتھ گزارے گی۔ میں نے بہتیرا پوچھا کہ وہ دل شکستہ سے کیوں بیٹھی تھی اور وہ گنجے سر والا شخص کون تھا، جو کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، مگر اس سے اُس نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہاں سے واپس وہ اس لئے لوٹی تھی کہ اُس نے یکلخت وہ دن میرے ساتھ بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کنج میں چھپ کے اس لئے بیٹھی تھی تاکہ اس کا اطالوی دوست ہمیں تلاش نہ کر لے۔

ہم نے سارا دن اکٹھے گزارا۔ پچھلے پہر کنج سے باہر نکلے اور شہر کے سنٹر کی طرف چل دیئے۔ جھیل پر گھومتے پھرے، جہاں پر بے شمار بادبانی کشتیاں چل رہی تھیں۔ لوگوں کو دیکھتے رہے، جو بطخوں اور کبوتروں کو باسی روٹیوں کے ٹکڑے ڈال رہے تھے۔ اُس روز دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم بہار کے پھول کیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ درختوں پر سبزہ اُگنے لگا تھا۔ ابھی ہوا میں خنکی ضرور تھی مگر سب لوگ کوٹوں کے بغیر چل پھر رہے تھے۔ میں ریناٹے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کی جیل کی زندگی کے بارے میں، مگر وہ موڈ میں نہ تھی۔ اُس روز اُسے اپنی اُس زندگی کے بارے میں فکر لگی ہوئی تھی، جو جیل خانے سے باہر قید کی میعاد گزرنے کے بعد آنے والی تھی۔ اپنے ہمبرگ والے بھڑوے کے پاس وہ بالکل واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُس نے سارے برسوں کے دوران اس کی خبر نہ لی تھی، اور اس کا اطالوی دوست شادی شدہ تھا، اگرچہ اس کی بیوی پیچھے وطن میں رہتی تھی۔

شام کے وقت یوتھ ہوسٹل کے بند ہونے کے وقت سے پہلے مجھے وہاں پر پہنچنا تھا۔ میں نے ریناٹے سے پوچھا کہ وہ رات کہاں پر گزارے گی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی فکر نہ کرنی چاہیے۔ اُسے کوئی نہ کوئی بستر رات بسر کرنے کے لئے مل جائے گا۔ جیل میں واپس جانے کا وہ ارادہ نہیں رکھتی تھی کم ازکم اس رات نہیں، کیونکہ وہ رات اس کی چھٹی میں شامل تھی۔ میں نے کہا کہ اپنے اطالوی دوست کے ہاں چلی جائے، مگر وہ وہاں جانے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ لگتا تھا کہ اس کے رات کے ٹھکانے کی فکر مجھے اس سے زیادہ لگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ میرا مذاق اڑانے لگی۔ پھر وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی کہ وہ کسی بھی شراب خانے میں جا کر کسی بھی مرد کی گود میں بیٹھ سکتی تھی۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے اس موضوع کو چھوڑ دیا۔

وہ مجھے یوتھ ہوسٹل کے گیٹ پر چھوڑ کر جانے لگی تو مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔ اس روز تک میں سمجھتا آیا تھا کہ بیسواؤں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ جب کہ ریناٹے نے سارا دن ایک اجنبی کے ساتھ گزار دیا تھا اور وہ تہوار کا دن تھا۔ میں نے سارے دن کے دوران اس کو ایک بوسہ تک نہ دیا تھا۔ رخصت کے وقت میں نے اس کے گال چوم لئے۔

میرے ہم کمرہ پاول کو نیلی آنکھوں والی ایک نئی لڑکی مل گئی تھی، اب وہ اس کو اپنے ہمراہ جرمنی میں گھومنے پر آمادہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اپنی ایک روز پہلے والی سہیلی کے جملہ حقوق سے وہ میرے حق میں دست بردار ہونے کو تیار تھا۔ مگر میرے خیالات ریناٹے کے گرد گھوم رہے تھے۔ جو اس عرصے میں یقیناً شہر کے سنٹر میں پہنچ چلی ہوگی، شاید کسی پب میں کسی مرد کی گود میں بیٹھی ہوگی۔

اس سے اگلے روز میں ہمبرگ واپس پہنچا، تو ہربرٹ اپنے گھر کے باغیچے میں کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار لہرایا اور مجھے اپنے پاس آنے کو کہا۔ اخبار کی جلی سرخی ہنوور میں ہونے والی ایک لڑائی کے بارے میں تھی، جس میں ہمبرگ کا ایک بھڑوا اور ایک اطالوی شریک تھے، جو ول ہنزا سے میں رہتا تھا۔ دونوں بری طرح زخمی ہوئے تھے اور ہسپتال میں پڑے تھے۔ ان کا جھگڑا ایک رنڈی کے بارے میں تھا جسے بھڑوا اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اطالوی کو خبردار کرنے گیا تھا کہ اس عورت کا پیچھا چھوڑ دے۔

ہربرٹ نے کہا کہ وہ خبر اس کو ہنوور جانے کے بغیر گھر بیٹھے بٹھائے پہنچ گئی تھی۔ اس کو اس کی خاطر سفر اختیار نہیں کرنا پڑا تھا۔ میرے ہنوور میں ہونے کا مزہ تو تب آتا اگر میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا۔ میں نے جواب دیا کہ لڑائی ہوتے میں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ نہیں دیکھی تھی، مگر جس عورت کی خاطر لڑائی ہوئی تھی، اس کے ساتھ ایک پورا دن گزارا تھا۔ ہربرٹ کو میری بات پر اعتبار نہیں آیا۔ اگر میں اس کی جگہ پہ ہوتا تو مجھے بھی اعتبار نہ آتا۔

(کرفیلڈ، ۱۸ر جولائی ۱۹۸۹ء)

دل دریا

بلقیس ظفر

امیر علی اپنے نام کے برعکس بیحد غریب آدمی تھا۔ نئے ملک میں آنے والے دوسرے کئی لوگوں کی طرح اس نے نہ تو کلیم داخل کرایا تھا، نہ زبردستی کسی گھر پر قبضہ کیا تھا۔ بس رضاکاروں نے ترس کھا کر اس کی حالت کے مطابق ایک چھوٹا سا پکا مکان اسے دیدیا تھا جس کے دو کمرے تھے۔ ایک دالان اور چھوٹا سا صحن، اوپر والی منزل میں ایک غسلخانہ، باورچی خانہ اور ایک چھوٹی سی بیٹھک، جس میں اس نے اپنا ذاتی سامان لا رکھا۔ باقی گھر اس نے اپنی بیوی اور تین بچوں کو دیدیا۔

اس محلے میں تقسیم سے پہلے دوسروں کا پیٹ کاٹ کر اپنی توندیں بڑھانے والے ساہوکاروں کے بڑے بڑے پکے، ٹن ٹن بجتے، اونچے اونچے سیمنٹڈ مکان بنے تھے۔ اونچی کرسی والے ان مکانوں کے سامنے والی پکی سیڑھیوں کو روزانہ گھر کی عورتیں دھویا کرتیں۔ مگر اب یہاں زبردستی یا کلیم کے ذریعے آبسنے والوں میں دودھ والا، باربر اور کچھ قصاب تھے۔ اس محلے کے پرانے باسیوں میں ایک چوڑی گر اور ایک مولوی صاحب ہی تھے جن کے کنبے اب بھی یہیں آباد تھے۔ لالے سب کوچ کر گئے تھے۔ آگے جاکر انہوں نے جوڑ توڑ سے بڑی حویلیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے کنبے کی خواتین پردے میں رہتی تھیں۔ انہیں کبھی کبھار برقعوں میں لپٹے ہوئے کہیں آتے جاتے دیکھتے تو لوگ احتراماً راستہ دیدیا کرتے۔ مولوی صاحب بڑی پابندی سے اپنی بیٹھک میں محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔

امیر علی اپنے میلے سے پائجامے پر اٹنگا کرتا پہنے بغل میں ہارمونیم دبائے، سر پر دو پلیّا رکھے باہر نکلتا تو محلے کے لوگ اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے اور آپس میں معنی خیز اشارے کرتے۔ وہ چپکے سے، آنکھیں نیچی کئے، اینٹوں کی بنی گلی میں سے بائیں کو مڑ جاتا۔ لوگوں کی اشارہ بازی زیادہ ہو جاتی اور لڑکے بالے ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کر ادھر دیکھتے جدھر امیر علی کی منزل تھی۔ اور وہ تھی پچھلی گلی میں آباد کوچہ جس میں سب بائیاں رہتی تھیں۔ امیر علی بھی جاکر بڑی خاموشی سے اپنی شناسا مالکہ کے پاس دری پر جا بیٹھتا۔ آجکل اس گلی کے باسیوں کو رزق کی بڑی تنگی تھی۔ وہ سب مل کر اپنے پرانے شناساؤں کو یاد کرتیں جو تنک لگائے ادھر اُدھر دیکھتے ان کے بالاخانوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ اور بڑی بڑی نوٹوں کی گڈیاں جاتی دفعہ تھما جاتے تھے۔ ہائے اب وہ اتنے تلتے کہاں۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتیں اور ناک سکوڑ کر سوچتیں۔ اب تو سارے لوگ، معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب کے ہتھے چڑھ گئے یا شاید سب فقتے ہی ادھر آن مرے کسی کے پاس پیسہ ہی نہیں جو ادھر کا رُخ کرے۔ اُدھر دودھ والے کی دوکان پر خوب رونق رہتی۔ وہ امیر علی کے گھر کے سامنے ہی رہتا تھا۔ خوب ٹھاٹھ سے خود بھی دودھ پیتا، بچی کھچی بالائی اور دہی پر ہاتھ صاف کرتا اور محلے والوں کی ضروریات بھی پوری کرتا۔ صبح نماز کے وقت سے ہی آس پاس کے گاؤں سے لوگ گدھوں اور خچروں پر بڑی بڑی جسامت کی ولٹوہیوں پر دودھ لاتے جو شام تک اس کے کڑھاؤ میں ابلتا رہتا۔ سارا دن گاہکوں کا جمگھٹا اس کی دکان پر رہتا تھا۔ رات کو وہ لالٹین جلاکر دوکان میں

رکھ لیتا۔ اس کی دوکان اس قسم کی باتوں کا واحد اڈہ بن گیا تھا جہاں ہر قسم کی گفتگو ہو سکتی تھی۔ امیر علی بھی ان کا ہدف ہوتا تھا مگر اس سے متعلق باتیں اشاروں کنایوں میں ہوا کرتیں۔

ایک روز ہارمونیم کو احتیاط سے جھاڑتے ہوئے امیر علی اپنے ماضی میں کھو گیا۔ اس کا ریاست میں پکا مکان تھا جس کے وسیع برآمدے پر چقیں پڑی ہوتیں اور ڈیوڑھی سے ہی اندر سے اٹھنے والے گیتوں کے مدھر بول سنائی دیتے۔ جب وہ ہارمونیم پر کوئی نئی طرز نکالتا تو اس کے شاگرد واہ واہ سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ غالیچے بچھے فرش پر ایک طرف کو طبلچی اور ستار والا بھی بیٹھے ہوتے جو ساز بجانے کے ساتھ ساتھ اس کے سُروں پر سر بھی دُھنتے۔ مولا، کیا خوشحالی تھی۔ کیا عزت تھی۔ اب تو کچھ بھی نہ رہا۔ زمانے کی آندھی نے اسے اٹھا کر کہیں سے کہیں لا پٹخا۔ امیر علی نے ایک لمبی سانس لی۔ اور کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

اس کے آس پاس والے محلے داروں کے نوعمر لونڈے اپنے فارغ وقت میں فٹ پاتھ پر چھابے رکھے، ان میں رنگ برنگی سستی ٹافیاں ڈالے ہانک لگاتے رہتے۔ اِدھر امیر علی کے دو بیٹے رفیق اور وزیر تھے، بالکل نکمے، تنکا تک دوہرا کرنے کے روادار نہ تھے۔ ہزار دفعہ امیر علی نے کہا۔ اس کی مریل سی بیوی نے بھی سمجھایا کہ ریڑھی لگا لو۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں اپنے دسویں پاس ہونے کا غرور تھا۔ وہ پڑھے لکھے ہو کر اس طرح کے کام کریں؟ توبہ توبہ۔ اور وہ آوارہ گردی کرنے باہر نکل جاتے۔ حمیدہ بانو اپنی بارہ سالہ بیٹی کنیز سے مل کر دال چاول بیننے میں مشغول ہو جاتی۔ ارے کرم اچھے ہوتے تو دیس ہی کیوں چھٹتا وہ کلپتی، اور ریاست سے ملنے والے وظیفے کو یاد کرنے لگتی۔ کیا اچھے دن تھے۔ یوں کنگلے تو نہ تھے۔

اسی آپا دھاپی میں رمضان آیا اور نکل گیا۔ اب عید تھی اور امیر علی کی تباہ حالی ویسی ہی تھی۔ وہ اپنی بیوی، دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کنیز بانو کو ایک بھی نیا کپڑا خرید کر نہ دے سکا، حالانکہ کنیز نے دبی زبان سے اپنی فرمائش اس کے گوش گذار کر دی تھی کہ ابا ایک دوپٹہ لا دیں۔ میں اپنے جوڑے ہوئے پیسوں سے چھوٹا گوٹا خرید کر اس پر لگا لوں گی۔ مگر امیر علی یہ چھوٹی سی فرمائش بھی پوری نہ کر سکا۔ خود پرانے کپڑے اپنی مریل سی بیوی سے دھلوا کر بغیر استری کے پہن کر نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔

واپسی پر اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے چارپائی پر بیٹھنا چاہا کہ بیوی لپک کر سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ "اے دیکھو تو۔ بوجھو بھلا میرے کنے کیا ہے؟" اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

امیر علی حیران رہ گیا۔ ان پھٹے حالوں میں وہ اِٹھلانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "مجھے کیا معلوم؟"

اس پر بیوی نے کنیز کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ جھپاک سے اندر گئی۔ واپسی پر اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس پر کپڑا پڑا تھا۔ حمیدہ بانو نے کپڑا سرکا کر اسے ٹرے میں رکھی چیزوں کا جلوہ دکھایا۔ ایک ٹبے سے ڈونگے میں فیرنی ماپڑا تھا جس پر چاندی کے ورق بھی لگے تھے۔ دوسری جانب قرینے سے تہ کیا ہوا سرخ جارجٹ کا دوپٹہ تھا۔ اس پر لگی کرن جھلملا رہی تھی۔

"یہ کیا ہے" ۔ وہ حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"مولبی صاحب کے گھر سے آئی ہیں یہ چیزیں۔ لو بھلا۔ مجھے کیا معلوم تھا اتنے اچھے لوگ ہیں۔ میں تو بس دو ہی دفعہ ان کے ہاں گئی۔" پھر اس نے دوپٹہ پھیلا کر میاں کو دکھایا۔ "یہ دیکھو گوٹا کرن بھی لگا ہے۔ یہ میری کنیز کے لئے اللہ نے بھیجا ہے۔"

امیر علی بیٹی سے چمچہ منگا کر شیر خرما کھانے میں جٹا تھا۔ اور اس کے دل میں بہت سی دعائیں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ مولوی صاحب کی اقتصادی حالت جیسی کچھ تھی، وہ خوب جانتا تھا۔ مگر اس پر یہ ظرف ـــ! اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنھیں اس نے شیر خرمے کے گھونٹ کے ساتھ نگل لیا۔

امیر علی تانگے کے گھوڑے کی طرح صرف سامنے کی راہ دیکھ کر زندگی بھر چلتا رہا۔ لوگ کس طرح جوڑ توڑ سے روپیہ بناتے ہیں، اس کا نہ اسے علم تھا نہ ضرورت۔ مگر اب ـــ؟ وہ پوچھتا کہ ایسے عزیز اقارب اور ملنے جلنے والوں کی طرح اس نے بھی کیوں نہ کسی بھرے پڑے گھر پر چھاپہ مار لیا۔ آج کو وارے نیارے ہوتے۔ اُدھر گلی محلے کے لڑکوں کے چھاپے، دیوڑھیوں اور پھر دکانوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ان کے گھر جو انہیں بالکل خالی ملے تھے (لیکن تنکا تک چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ نقدی، روپیہ، قیمتی چیزیں، کپڑا، برتن غرض سب کچھ بٹور کر لے گئے تھے) اب مختلف مہنگی چیزوں سے سجنے لگے۔ ریڈیو، الماریاں، ریشمی کپڑے، زیور، سبھی اشیاء ان کے پاس آگئیں اور وہ مزید حقارت اپنے الفاظ میں بھر کر امیر علی پر طنز و تشنیع کے چھینٹے پھینکنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک نوجوان کہتا۔ "بھئی کوئی موٹی اسامی نہیں پھنسی ابھی تک۔ وہی پہلے کے سے حال ہیں۔"

"ارے لعنت بھیجو ایسی کمائی پر۔" دوسرا فرش پر زور سے تھوک پٹخارتا۔ "بائیوں سے لیا ہوا پیسہ حرام ہوتا ہے۔"
"ایسے لوگوں سے محلے کو پاک ہو جانا چاہیئے۔" تیسرا ناک چڑھا کر بولتا۔

اسی قسم کی باتیں اور طنزیہ قہقہے دور تک امیر علی کا پیچھا کرتے۔ یہ سب لوگ حسین بخش دودھ والے کے پٹھے تھے۔ حسین بخش کبھی کبھی سرسری طور پر نوجوانوں کو ڈانٹتا کہ مت کیا کرو ایسی باتیں۔ بھئی ہمیں کیا لینا دینا کسی سے۔ خود ہی بھگتیں گے جہنم میں جا کر ـــ اِدھر کچھ دنوں سے اس "خاص کوچے" میں امیر علی کے ہارمونیم کی ریں ریں کے علاوہ کچھ طبلہ نواز، ستار والے اور ہار پھول والے بھی رونق بڑھانے لگے تھے۔ بائیوں نے اپنے اپنے پسندیدہ مزار پر شیرینی چڑھائی۔ رزق کا دروازہ کھلنے لگا تھا۔

کچھ دنوں سے سیلاب کی خبریں ریڈیو اور اخبارات میں آنے لگی تھیں۔ خاص طور پر ملک کے مشرقی حصے میں بڑی تباہی مچی تھی۔ حکومت نے امدادی فنڈ کھول دیا تھا۔ حسین بخش کی دکان پر روزمرہ کی ضروری اشیاء اور کپڑوں وغیرہ کے ڈھیر لگنے لگے تھے۔ اس نے ایک سوراخدار صندوقچہ بھی رکھ لیا تھا جس میں آتے جاتے گاہک کچھ نہ کچھ ریزگاری ڈال دیتے۔ امیر علی ان دنوں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے وہ فقرے کسنے اور طنزیہ قہقہے لگانے سے یکسو ہو کر امدادی سامان جمع کرنے میں جٹے تھے۔

ایک روز شام ڈھلے جب حسین بخش لالٹین جلائے دن بھر کی کارگزاری کا حساب لکھ رہا تھا تو امیر علی چپکے سے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ حسین بخش نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"کیوں دودھ چاہیئے؟ پاؤ یا آدھا پاؤ؟" اس نے پنسل کان پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ـــ" امیر علی نے سوکھے لبوں پر زبان پھیری اور جیب ٹٹولنے لگا۔

"پھر! دہی دیدوں؟" حسین بخش نے بیزاری سے پوچھا

"نہیں ـــ یہ ...... یہ کچھ رقم ہے۔ یہ لو۔ امدادی فنڈ کے لئے" اس کے خشک لکڑی جیسے دبلے ہاتھوں میں کچھ

نوٹ دبے تھے۔

یکلخت حسین بخش کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"اُسے حرام کی کمائی دیتا ہے"؟ وہ چنگھاڑا۔ "لے جاؤ یہ رقم۔ ہمیں نہیں چاہیئے۔"

"نہیں۔ یہ حرام کی کمائی نہیں۔ اپنے دیدوں کی قسم یہ میری مزدوری کے پیسے ہیں۔" وہ بلبلایا۔ ——————

—— "اپنے بچوں کی قسم کھاتا ہوں حسین بخش بھائی۔ یہ حرام کے پیسے نہیں۔ میں نے گنڈیریاں بیچ کر یہ رقم جمع کی ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے "یقین کرو حسین بھائی ——"

یہ کہکر اس نے مٹھی میں دبے نوٹ حسین بخش کے پھٹے پر رکھ دیئے اور تیزی سے مڑ کر گھر کی طرف یوں چلا جیسے موت تعاقب میں ہو۔

حسین بخش نے سلام کرتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اس نے امیر علی کے دیئے ہوئے روپے صندوقچی میں ڈال دیئے۔

دانش ور

ضیاء بٹ

سردیوں کی اندھیری رات میں دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز سے دتّے موچی کو ڈر لگ رہا تھا۔ رات کافی گذرنے کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ نہ جانے اس کی بیوی سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی البتہ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ دتّے موچی کو صبح سے پہلے، اپنا آبائی گاؤں چھوڑنے کا غم تھا جسے اس نے اپنے بیٹے کی خاطر برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ——— اس کا لڑکا بھی نہیں سو سکا تھا وجسم اور رضائی کے ملاپ سے کریم رول بنا، اپنا منہ دوسری طرف کئے سوچ رہا تھا کہ راتوں کو کتے کیوں بھونکتے ہیں۔ شاید ان چوکیداروں سے ڈرتے ہیں جو ایک ہاتھ سے لاٹھی بجاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین تھامے "جاگتے رہو" کی آواز لگاتے ہیں۔ اگر یہ جانور اپنے وقت میں چوکیدار کے وجود کو پسند نہیں کرتے تو چودھری کے اس حکم کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگر میں نے مولوی حیات اور طفیل گجر سے صبح تک معافی نہ مانگی تو گاؤں چھوڑنا ہوگا ——— پھر ڈیرے میں بیٹھے گاؤں کے لوگوں کی تمام باتیں ایک فلم کی طرح اس کے پردے پر چلنے لگیں۔

رحمو نے پیندے سے پکڑ کر حقّے کی نلکی کو نمبردار کی طرف موڑا۔ نمبردار نے لمبا کش لگانے کے بعد سانس کو باہر نکالتے وقت کھانستے ہوئے پوچھا "سنا او رحمو کوئی لاہور کی نئی تازی!"

"نمبردار جی کیا بتاؤں! اکبری منڈی میں جہاں میں کام کرتا ہوں، پیدل چلنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن شہری لڑکے تانگوں، ریڑھوں اور بسوں کے درمیان میں سے موڑتے ماڑتے سائیکل اس طرح سے آگے نکال لے جاتے ہیں کہ ان پر بازی گروں کا گمان ہوتا ہے۔ اور تو اور میں نے تو لڑکیوں کو بھی سائیکلیں اور کاریں چلاتے دیکھا ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ قیامت آنے والی ہے!"

"سائیکلیں برقعوں سمیت کیسے چلاتی ہیں؟" کریمو ماشکی نے پوچھا۔

"چھوڑو یار، دوسری قومیں چاند سے آگے نکل گئی ہیں اور آپ لوگ ابھی تک سائیکل کے چکر میں ہیں۔" دتّے موچی کے لڑکے نے بات کاٹ دی۔

"خاک پہنچے ہیں چاند پر۔ معلوم نہیں کس پہاڑی پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور ہمیں پاگل بنا رکھا ہے۔ پیر جی نے موکل پیچھے لگائے تھے کہ ذرا دھیان رکھو کدھر جاتے ہیں تب سے چاند کو چھوڑ کر مریخ کی باتیں کرنے لگے ہیں!" مولوی بولا۔

"رحمو ذرا حقے کے پیندے کو چھوڑو"۔ دتّے موچی کے لڑکے نے کہا۔

"کیوں؟" رحمو نے حقے کے پیندے سے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ڈیرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ دتّے موچی کے لڑکے کی طرف متوجہ ہوئے "ذرا پیر جی سے کہو کہ اپنے موکل کو حکم دے کہ حقے کا رخ کسی اور طرف کر دے۔"

"خبردار اگر مزید گستاخی کی، کھوپڑی توڑ دوں گا۔" مولوی حیات گرجا۔

"اوئے چپ۔ ہم یہاں لڑنے کے لئے نہیں آئے۔ چودھری صاحب نے الیکشن کے سلسلے میں گاؤں والوں کو یہاں بلوایا ہے۔ اور ہاں لڑکے۔ ذرا بڑے چھوٹے کا لحاظ رکھا کرو۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی پہچان ہی کھو بیٹھو" نمبردار غصے سے بولا۔

"آخر موچی کا بیٹا ہے۔ خاک تمیز ہوگی اسے" طفیل گجر بولا۔

"موچی ہونا تو عیب نہیں۔ میرا باپ محنت مزدوری کرکے روٹی کماتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر محنت کش سے محبت رکھتا ہے۔ تمہاری طرح دودھ میں پانی تو نہیں ملاتا۔ جانتے ہو حدیث ہے کہ ملاوٹ کرنے والے ہم میں سے نہیں۔"

"اوئے موچی دے پتر، کینڈے میں رہو۔ ایسا نہ ہو کہ بی۔ اے پاس کرنے سے پہلے ہی تمہارے باپ کو بین کرنے پڑیں" طفیل گجر نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غضبناک لہجے میں کہا۔

ڈیرے میں بیٹھے باقی لوگ خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ دور سے چودھری کو آتے دیکھ کر سب اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ چودھری نے ڈیرے میں آتے ہی بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا "الیکشن ہو رہے ہیں۔ آپ سب نے چودھری شکور کو ووٹ ڈالنے ہیں۔ اس کا انتخابی نشان کرسی ہے۔ کرسی پر مہر لگانا۔ اسی لئے میں نے آپ سب کو یہاں بلوایا تھا۔"

"بہت اچھا جی۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔" بہت سی آوازوں نے ایک ساتھ کہا۔

"چودھری جی۔ آپ خود الیکشن کیوں نہیں لڑتے؟" دتے موچی کے لڑکے نے سوال کیا۔

"بچو! وہ اپنا ہی آدمی ہے۔" چودھری نے جواب دیا۔

"چودھری جی میرے خیال میں اس کی شہرت کوئی اچھی نہیں۔ کہتے ہیں رسہ گیر ہے۔" دتے موچی کے لڑکے نے کہا۔

"تیرے باپ کی بھینس اس کے ہاں پہنچ گئی ہے؟ تو زبان بند نہیں رکھ سکتا۔" چودھری گرجا۔

"آپ کے آنے سے پہلے نمبردار کے منع کرنے کے باوجود یہ مولوی حیات اور میری بے عزتی کر چکا ہے۔ اس کے باپ کا آپ خیال رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں خاموش رہا۔ ورنہ اس کا دماغ درست کر دیتا۔" طفیل گجر بولا۔

"اچھا یہ بات ہے۔ اس کے باپ سے بات کرتا ہوں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اب آپ لوگ جائیں۔ مہر لگاتے وقت کرسی کے نشان کا دھیان رکھیں اور ہاں یاد رکھنا میرے گاؤں سے جس کسی نے کسی اور کو ووٹ دیا اس کا مجھے پتہ چل جائے گا ـــــ" چودھری نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

شام کو جب دتہ گھر آیا تو وہ بہت پریشان تھا۔ بیوی نے لڑکے کی موجودگی میں وجہ پوچھی تو کہنے لگا "چودھری نے دکان خالی کروالی ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ اگر تمہارے لڑکے نے کل تک مولوی حیات اور طفیل گجر سے معافی نہ مانگی تو گاؤں کو چھوڑنا ہوگا۔"

"کیا کہا ہے تم نے ان سے؟"

"بیٹا معافی مانگ لو اپنی پڑھائی پوری کرنے کی خاطر" دتے نے بیٹے کا جواب سننے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"حیات کو تو چھوڑیئے۔ بیوقوف آدمی ہے۔ مگر معافی تو طفیل گجر کو مانگنی چاہیئے۔" لڑکے نے تمام قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ ہو چکا ہے کہ معافی کسے مانگنا ہے۔ یہ میرے اور تمہارے بس کی بات نہیں۔" دتے نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے جہنم میں جائے چودھری۔ ماں اور آپ صبح میرے ساتھ لاہور جانے کے لئے تیار رہیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا

کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ ہمارا گذارہ ہو جائے گا۔ لاہور میں کام بھی بہت ہے اور مزدوری بھی کافی۔ وہاں بیگار میں جوتے بھی نہیں بنانے پڑتے۔"

"اٹھو بھاگوان صبح ہونے والی ہے"۔ دتّے موچی کی آواز نے بیٹے کے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا اور ماں بیٹا ایک ساتھ سامان باندھنے میں مصروف ہو گئے۔

دتّے نے اگرچہ محلے میں ہی کام شروع کر دیا تھا لیکن وہ اکثر غم زدہ رہتا تھا۔ بیٹے نے امتحان سے فارغ ہو کر ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھی اور جب اس نے پہلی بار ٹیوشن کے پیسے لا کر باپ کو دیئے تو وہ بہت خوش ہوا اور پوچھنے لگا "کیا نوکری مل گئی ہے؟"

"نہیں ابھی بی۔اے کا نتیجہ نہیں آیا۔ یہ لوگوں کے بچوں کو پڑھانے کے پیسے ہیں۔ گاؤں میں ہوتا تو چودھری کے بچوں کو مفت پڑھانا پڑتا" دتّے کے بیٹے نے جواب دیا۔

"دفع کرو ابھی تک تم نے چودھری کے سلوک کو دل سے نہیں بھلایا"

"آپ ابھی تک گاؤں کو نہیں بھلا سکے میں چودھری کے سلوک کو کیسے بھلاؤں جس نے ہمیں وہاں سے نکالا ہے"۔ بیٹے نے جواب دیا۔

محلے کے ایک قہوہ خانہ سے اُٹھنے والے شور نے باپ بیٹے کی بات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

بیٹا باہر نکلا۔ کچھ لوگ آپس میں الجھ رہے تھے۔ ایک گروپ پارلیمنٹ توڑنے کے فیصلے پر سخت تنقید کر رہا تھا اور دوسرا گروپ پارلیمنٹ توڑنے والے کی حمایت۔ قریب تھا کہ وہ آپس میں دست و گریباں ہو جاتے۔ دتّے موچی کے لڑکے نے دخل دیتے ہوئے کہا "بھائیو، میری بات سنو۔ پارلیمنٹ توڑنے کا فیصلہ غلط ہے یا درست۔ اتنی سی بات ہے نا لیکن آپ نے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ وزارت عظمٰی سے نکالے ہوئے نے اپنے باغ کے آموں کے ٹوکرے کس کس کو بھیجے۔ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے کہ وزارت عظمٰی سے برطرف شدہ شخص نے اسے بھی آموں کا تحفہ بھیجا جس نے اسے برطرف کیا تھا۔ ہم اور آپ جب بھی آم کھائیں گے بازار سے خرید کر۔ یارو جو لوگ ہمارے مرنے اور جینے میں شریک نہیں ان کی خاطر کیوں آپس میں لڑتے ہو"۔

دتّے موچی کے لڑکے کی باتوں نے لڑائی ٹال دی اور سب نے مل کر چائے پی۔ پیسے دینے کا وقت آیا تو دتّے موچی کا لڑکا کہنے لگا "اصولی طور پر پیسے مجھے دینے چاہئیں لیکن میرے پاس پیسے ہیں نہیں"۔

"کوئی بات نہیں آپ ہمارے بھائی ہیں"۔ سب نے جواباً کہا۔

قہوہ خانہ میں مختلف الخیال لوگوں کا آنا جانا رہتا۔ اس میں چھوٹی اور بڑی عمر کے سب لوگ شامل تھے۔ کبھی کبھار کوئی واقف دتّے موچی کے بیٹے کو آواز دے کر اندر بلا لیتا۔ وہ چائے پینے سے اکثر انکار کرتا لیکن قہوہ خانہ میں ہونے والی گفتگو میں پوری دلچسپی لیتا۔

آج جب وہ ٹیوشن سے فارغ ہو کر گھر واپس جا رہا تھا تو قہوہ خانہ میں بیٹھے ہوئے ایک تعلیم یافتہ لیکن بیکار نوجوان نے اسے اندر بلا لیا جب وہ قہوہ خانہ میں داخل ہوا تو ولیوں اور کرامات کا موضوع چھڑا ہوا تھا۔ ایک فرشتہ صورت آدمی مختلف واقعات بیان کر رہا تھا۔ بیان کردہ ہر واقعہ کے بعد کچھ معمر لوگ سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ رہے تھے۔ چند نوجوان خاموش بت بنے بیٹھے تھے۔ انھوں نے معنی خیز نظروں سے دتّے موچی کے لڑکے کی طرف دیکھا جس نے بولنا شروع کیا۔

"حضرت جی بات یہ ہے کہ ہمیں نبی کریم کی زندگی سے رہنمائی ملتی ہے۔ ان کی زندگی زندہ رہنے کا بہترین نمونہ ہے۔ پھر خلفائے راشدین کا زمانہ ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ان نیک اور پاک لوگوں کے عہد میں انھیں ایسی تخلیں لگتی

تھیں جہاں دلوں پر "مہریں" لگائی جاتی ہیں۔ اور پھر مہریں لگانے سے آج کے مسائل تو حل نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک کرامات کا تعلق ہے تو آج کی کرامات پر غور کیوں نہیں کرتے۔ کیا یہ کرامت سے کم ہے کہ آسٹریلیا میں کرکٹ میچ ہو رہا ہے اور آپ اس قہوہ خانہ میں یہ میچ دیکھ سکتے ہیں۔ آدمی لندن سے بولتا ہے اور آپ اپنے گھر میں بیٹھے اُسے سن سکتے ہیں اور اس سے بات کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی کرامت یہ گھڑی ہے جس نے ساری دنیا کو مسخر کر رکھا ہے۔ آپ کی اذانیں، نمازیں، روزے، گاڑیاں، ہوائی جہاز اور آپ کی روزمرہ کی زندگی اس چھوٹی سی گھڑی کی پابند ہے ـــــ باقی رہا ولیوں کا معاملہ تو سب سے بڑی ولیہ میری ماں ہے جس نے مجھے نو ماہ تک اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ پھر گرم اور سرد موسم میں میری پرورش کی۔ دوسرے نمبر پر میرا والد ہے جس نے میری تعلیم و تربیت پر اپنا سب کچھ قربان کیا۔"

دتّے موچی کا لڑکا ابھی بول رہا تھا کہ عمر رسیدہ لوگ لاحول پڑھتے ہوئے قہوہ خانہ سے نکل گئے مگر نوجوانوں کے چہروں پر رونق سی تھی۔ البتہ دکاندار کہہ رہا تھا۔ بھائی کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ میری دکانداری کا معاملہ ہے۔ وہ واضح طور پر دتّے موچی کے لڑکے کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔

دتّے موچی کے لڑکے نے قہوہ خانہ میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ بی۔ اے کا نتیجہ آنے پر اب وہ کسی نوکری کی تلاش میں رہتا۔ سارا دن نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر گھر لوٹتا۔ تھوڑا بہت آرام کرنے کے بعد وہ ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا۔ ایک دن وہ قہوہ خانہ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ کارپوریشن کے عملے نے قہوہ خانہ کے باہر پڑے میز کرسیوں اور برتنوں کو اٹھا کر ٹرک میں لاد لیا۔ قہوہ خانہ کا مالک پریشان تھا اور اہل محلہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے بڑھ کر کہا۔ "اس غریب کا سامان کیوں اٹھاتے ہو؟۔ اس سامان نے ٹریفک میں کون سی رکاوٹ ڈالی ہوئی ہے؟"

"اسے بھی بٹھا لو ٹرک میں۔ سرکاری کام میں مداخلت کرتا ہے۔" ٹرک کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے مجسٹریٹ نے حکم دیا اور بیشتر اس کے دتّے موچی کا بیٹا کچھ بولتا دو چار آدمیوں نے اسے اٹھایا اور ٹرک میں ڈال دیا۔

دفتر پہنچ کر اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا ـــــ "ہاں تو تم سرکاری کام میں مداخلت کے مرتکب ہوئے ہو۔ جانتے ہو اس کی سزا کیا ہے؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"مجسٹریٹ صاحب، کراؤن بس کے اڈے سے لے کر دہلی گیٹ تک لوگوں نے فٹ پاتھ اور آدھی سڑک پر دونوں طرف قبضہ کر رکھا ہے۔ آدمی پیدل نہیں چل سکتا اور اگر ہنگامی حالات میں کسی مریض کو ہسپتال پہنچانا ہو تو وہ شاید راستہ میں ہی مر جائے کیونکہ ٹریفک ہر وقت جام رہتا ہے۔ آپ ان لوگوں کا سامان کیوں نہیں اُٹھاتے؟ محلے کے ایک غریب آدمی کا سامان آپ نے اٹھوا لیا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میں سرکاری کام میں مداخلت نہیں کر رہا بلکہ سرکاری حکام کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلا رہا ہوں۔"

"ہوں! کیا کام کرتے ہو؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"میں نے ابھی بی۔ اے کیا ہے۔"

"چھوڑ دو اسے۔ ابھی بچہ ہے۔" مجسٹریٹ نے حکم دیا۔

"نہیں صاحب میں نہیں جاؤں گا، جب تک دکان کا سامان واپس نہیں ہوتا۔"

"سامان بھی دے دو۔"

"یہ اس کی دوکان کا سامان نہیں ہے سر۔" عملے کا ایک رکن بولا۔

"اگر میری دکان ہوتی تو سامان مل جاتا؟ انصاف کے معاملہ میں میرے تیرے کی بات کیوں کرتے ہو؟" دتّے موچی کے لڑکے نے پوچھا۔

سامان بھی دے دو پہنچا دے گا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

سامان رہبڑے، پر رکھ کر جب دتّے موچی کا لڑکا محلے میں پہنچا تو سب لوگ حیران تھے۔ قہوہ خانہ کا مالک واضح طور پر ممنون تھا۔ البتہ وہ ہیروئن فروش آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

"یار، پڑھا لکھا اور دلیر نوجوان ہے۔ اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" ایک بولا۔

"مجھے کار خاص کا آدمی لگتا ہے۔ قہوہ خانہ میں بیٹھے لوگوں سے عجیب وغریب گفتگو کر کے ان کے خیالات اوپر پہنچاتا ہوگا۔" شیدا تیجز بولا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کے باپ نے کہا "بیٹا لوگوں کے کام کرنا اچھی بات ہے لیکن اپنی نوکری کا بھی کچھ کرو۔"

"بابا نوکری ملنا مشکل ہے۔ میرے پاس کوئی سیاسی سفارش نہیں بس ٹیوشن ہی پڑھاؤں گا اور اگلا امتحان پرائیوٹ دوں گا۔"

"کب تک امتحان پاس کرتے رہو گے؟" باپ نے پوچھا۔

"جب تک فیل نہیں ہو جاتا۔"

"فیل نہیں ہو جاتا؟"

"ہاں" بیٹے نے ذرا بیزاری سے جواب دیا اور دتّے موچی نے گردن تھوڑی سی ٹیڑھی کر کے اور ہاتھ کی انگلیوں کو گھما کر خاموشی اختیار کر لی۔

سارا دن دفاتر کے چکر لگانا اس کا روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ کچھ اہل محلہ کے لئے اور کچھ نوکری کی تلاش میں۔ دوپہر کھانا کھانے کے بعد تھوڑا بہت آرام کرتا اور پھر ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا۔ رات کو وہ ایم۔اے کی تیاری کرتا۔ لیکن پچھلی رات وہ پڑھ سکا نہ سو سکا، کیونکہ محلے کی ایک مسجد میں ماہانہ ختم تھا۔ تمام رات لاؤڈ سپیکر استعمال ہوتا رہا۔ آج اسے بہت سے دفاتر میں جانا تھا۔ ایک بیوہ کو ابھی تک پنشن نہیں ملی تھی۔ دوسرے کے لڑکے کو ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے اور انھیں بیمہ پالیسی کی رقم کا انتظار تھا۔ تیسرے کے لئے ٹیلیفون کا اور چوتھے کے لئے بجلی کا بل ٹھیک کروانے جانا تھا اور خود اسے نوکری کے سلسلے میں انٹرویو بھی دینا تھا۔

انٹرویو اس کے خیال میں اے۔ون ہوا تھا لیکن نوکری پھر بھی نہ ملی۔ دوسرے دفاتر میں اہل محلہ کے کاموں کے سلسلے میں اس کے دلائل اور صبر کا امتحان ہوتا رہا۔ ایک آدھ کام ہو گیا، باقی کل پر رکھ دیئے گئے۔

واپسی پر ایک اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ رپورٹنگ روم میں بیٹھے ایک صحافی سے مخاطب ہوا "کراؤن بس کے اڈے سے لے کر دہلی گیٹ تک فٹ پاتھ اور آدھی سڑک پر ناجائز تجاوزات ہیں۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"اسے چھاپئے۔"

"اخبار میں صرف خبر چھپتی ہے اور اس بات کا تو سب کو علم ہے۔" رپورٹر نے جواب دیا۔

"میرے محلے سے کارپوریشن والے سامان اٹھا کر لے گئے تھے۔ میرے دخل دینے پر انھوں نے سامان کو واپس کر دیا لیکن مجھے دو گھنٹے تک حبس بے جا میں رکھا۔"

"کوئی ثبوت؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"خیر چھوڑیں اس بات کو یہ خبر نوٹ کر لیں کہ میرے محلے میں دن دہاڑے ہیروئن بکتی ہے۔"

"تھانے رپورٹ کرو۔ ہم چھاپیں گے تو نشہ کرنے والوں کو ایک اور اڈے کا پتہ چل جائے گا۔"

"تھانے میں نے رپورٹ کی تھی لیکن ابھی تک کچھ نہیں بنا۔ آخر آپ لوگوں کی بھی کچھ ذمہ داری ہے۔" دتّے موچی کے لڑکے نے

بیزاری سے کہا۔

"بھئی ہم ملازم ہیں اور ہر ملازم کی حدود مقرر ہوتی ہیں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" رپورٹر نے جواب دیا۔

"یار یہ کیسا معاشرہ ہے جہاں قانون کا احترام کرنے والے گھاٹے میں اور قانون کا مذاق اُڑانے والے فائدے میں ہیں۔ آخر کیا بنے گا ہمارا؟" دتّے موچی کے لڑکے نے پوچھا۔

"زیادہ فلاسفی کیا کرو۔ پاگل ہو جاؤ گے۔ حالات خود اپنا راستہ نکالیں گے۔" رپورٹر بولا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ دتّے موچی کا لڑکا گھر لوٹا۔ لڑکے کا چہرہ پڑھ کر باپ نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ لڑکا کھانا کھانے کے بعد کچھ آرام کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ محلے کی مسجد سے، لاؤڈ سپیکر کی پوری والیوم کے ساتھ کوئی صاحب کڑک دار آواز میں کچھ وعظ فرمانے لگے۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے وعظ کا!" وہ بڑبڑانے لگا "یہ کیسے لوگ ہیں۔ نہ کسی طالب علم کا خیال کرتے ہیں نہ کسی بیمار کا، نہ کسی معصوم بچے کا۔ تھکے ہارے لوگوں سے بھی بے نیاز ہیں۔ غضب خدا کا ایک ایک محلہ میں چار چار پانچ پانچ مساجد میں ہر نماز کے لئے ایک ساتھ اذان کچھ اس انداز سے دیتے ہیں کہ کوئی ایک اذان بھی صحیح طور پر سنائی نہیں دیتی۔ کیا لاؤڈ سپیکر پر اذان دینے سے نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے؟ اور پھر یہ کوئی وقت ہے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کا؟"

دتّے موچی کا لڑکا یہ سب کچھ سوچتا ہوا اٹھا اور گھر سے نکل کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ "مولوی صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی اس بے وقت گرج سے کتنے مریض بے چین ہوں گے۔ کتنے بچے گھبرا کر جاگ گئے ہوں گے اور رو رہے ہوں گے۔ کتنے طالب علم کتابیں سامنے رکھے حیران بیٹھے ہوں گے۔ کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے؟"

اتنا کہنا تھا کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے دھکے مار مار کر خانۂ خدا سے باہر نکالتے ہوئے کہا "دہریہ! سرپھرا! بدتمیز!"

"سرپھرے تو تم ہو جو ارشاداتِ نبوی پر عمل نہیں کرتے۔ دہریے بھی تم ہو جو احکاماتِ خداوندی کی روح سے ناواقف ہو اور ایک حق بات کہنے والے کے ساتھ بدتمیزی بھی تم کر رہے ہو۔"

گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے اور دتّے موچی کے لڑکے کا گریبان دو تین آدمیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اتنے میں شیدا نجو لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے سر پر زور کا ایک تھپڑ مارتے ہوئے بولا "یہ مخبر ہے مخبر۔ سی آئی ڈی ہے۔"

دتّے موچی کے لڑکے کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ سر سے خون جاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نہایت تاریک رات میں ایک چوکیدار ہر قسم کی آوازوں سے بے نیاز، ہاتھ میں لالٹین لئے برابر "جاگتے رہو" کی آواز لگا رہا ہے۔

مُسلمان

نیلوفر اقبال

وہ تینوں چرچ کے سامنے کھڑے تھے۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت میں سناٹا تھا۔ آج اتوار کا دن نہیں تھا۔ وہ اندر جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو چرچ کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ بنی پھولوں کی کیاریوں میں ایک شخص کام کرتا نظر آیا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر ان کو دیکھا اور ہاتھ میں کھرپا لئے کھڑا ہو گیا۔

"فادر اینڈریوز ہیں اندر؟"

آدمی نے انھیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر بہت چوڑا اور بلند دروازہ تھا جس پر لکڑی کی کھدائی کے نفیس نقش و نگار تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی چرچ کا ہال تھا۔

"میں فادر کو بلا کر لاتا ہوں" وہ شخص بائیں طرف کی دیوار کے ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔

وہ تینوں پہلی بار چرچ آئے تھے۔ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لینے لگے۔ لکڑی کے بنچوں کی دو رویہ قطار کے بیچوں بیچ رستہ تھا جو سیدھا سامنے دو تین سیڑھیاں بلند پلپٹ (Pulpit) تک جاتا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی چوبی میز رکھی تھی جس کے اوپر دو سنہری شمع دان اور تازہ خوش رنگ پھولوں سے بھرا پیالہ نما گلدان تھا۔ اس سے چند قدم پر روسٹرم تھا جس کے سامنے مائیک تھا۔ روسٹرم پر چند کتابیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔

"یہاں پادری خطبہ دیتا ہے۔" حاجی صاحب نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"خطبہ نہیں سرمن۔" ماسٹر نے تصحیح کی۔ "ویسے بات ایک ہی ہے۔"

"انگریز ہے کیا؟"

"نہیں ادھر ہی کا رہنے والا ہے۔"

جہاں وہ کھڑے تھے دروازے کے دونوں طرف سنگ مرمر میں تراشے گئے تقریباً تین تین فٹ بلند دو مجسمے تھے۔ ایک مقدس مریم کا تھا جس کے سر پر سنہری شعاعوں کی صورت بنایا ہوا تاج تھا۔ دوسری طرف صلیب پر عیسیٰؑ کا مجسمہ تھا۔ ہال میں چاروں طرف کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ان کے درمیان والی دیواریں سنہری فریموں میں ماں اور بچے کی اور مسیح کے مصلوب ہونے کے مختلف مناظر کی تصاویر سے مزین تھیں جس چیز نے سب سے زیادہ ان کی توجہ کھینچی وہ ہال کے سامنے والی دیوار پر نصب لکڑی کی بہت بڑی صلیب تھی۔ اس پر مسیح کا قد آدم پتھر کا مجسمہ تھا۔ ہال کی چھت گرجے کی باہر سے نظر آنے والی ہیئت کے مطابق تکون تھی بے شمار رنگین شیشوں سے مزین تکونیں چاروں طرف سے بلند ہو کر درمیان میں ایک نوک پر آ کر مل جاتی تھیں۔ چھت پر جا بجا لٹکے ہوئے فانوس اور محراب دار منقش دیواریں —— یہ سب مرعوب کن تھا۔ چرچ کے اندر وہی مخصوص مقدس ماحول تھا جو انسان کو مؤدب اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ تینوں

بالکل خاموش تھے۔

ہال کی بائیں جانب ایک دروازہ کھلا اور فادر اینڈریوز داخل ہوا۔ وہ درمیانی عمر اور سانولی رنگت کا آدمی تھا اور اس وقت روزمرہ کے لباس میں تھا۔ گلے میں چین کے ساتھ پتھر کی صلیب لٹک رہی تھی۔ وہ ان کو دیکھ کر اس طرف چلا آیا۔ انھوں نے اسے سلام کیا۔ اس نے بھی سلام کہہ کر جواب دیا۔

"کہیئے کیسے آنا ہوا؟" فادر اینڈریوز نے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "ماسٹر صاحب آپ کا معاملہ ہے۔ آپ ہی بتائیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

فادر نے ہاتھ کے اشارے سے ان تینوں کو بنچوں پر بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی ان کی طرف رخ کر کے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ماسٹر نے گلا صاف کیا۔ پھر بولا "میں ماسٹر نصیر احمد ہوں۔ مسلم ہائی سکول میں پڑھاتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ حاجی رزاق صاحب ہیں اور یہ میرے ایک اور محلے دار کبیر احمد صاحب ہیں۔ یہ سب اس محلے کے شرفا ہیں اور آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ہم وفد بنا کر آئے ہیں آپ کے پاس۔"

"خیریت؟" فادر کے چہرے سے مسکراہٹ معدوم ہو چکی تھی اور اب وہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"بات اس طرح ہے فادر صاحب کہ ہمارے محلے میں ایک شخص جارج رہتا ہے۔ جارج ونسنٹ۔ پورا محلہ تنگ ہے اس آدمی سے۔ شروع شروع میں آیا تو ہمیں اس کے بارے میں صحیح علم نہیں تھا ورنہ میں کیوں پھنستا اس کے چکر میں۔ اس نے مجھ سے کسی ہسپتال کا بل چکانے کا بہانہ کر کے دو ہزار روپے ادھار لیے اور کہا یہ کہ صبح بنک کھلتے ہی نکلوا کر ادا کر دے گا۔ میں نے محلے داری کے خیال سے ہمدردی کی۔ وہ دن اور آج کا دن۔ تقریباً چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ ٹالتا جا رہا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس کا دینے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ سب محلے والے کہہ کہہ کر تھک گئے۔ میں بھی مانگ مانگ کر شرمندہ ہو گیا۔ لیکن وہ شخص تو ٹھیک سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگلے مہینے میری ہمشیرہ کی شادی ہے۔ ایک ایک روپے کی ضرورت ہے مجھے۔ میں محدود آمدنی والا معمولی سکول ٹیچر ہوں۔ ان معززین کو گواہی کے لیے ہمراہ لایا ہوں۔ اب آپ ہی ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں۔ مہربانی کر کے میری رقم اس شخص سے دلوا دیجیے۔"

فادر کے ماتھے پر فکرمندی کی تیوریاں آ گئیں "کیا کام کرتا ہے یہ جارج؟"

"بجلی کے محلے میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی آمدن کافی ہے۔ آپ کو تو یہاں کے محکموں کا حال معلوم ہی ہے۔ حرام کی آمدنی ہے۔ بے دریغ عیاشیوں پر لنڈھاتا ہے۔ اب آپ کو کیا بتائیں۔ بتاتے بھی شرم آتی ہے۔ اپنے ہی محلے کے ایک آدمی کو بجلی کا کنکشن چاہیے تھا۔ اس تک سے بھی رشوت مانگتے شرم نہ آئی اس کو۔ یہ تو حال ہے اس آدمی کا۔ شراب وہ شخص پیتا ہے۔ خراب عورتوں کو گھر پر وہ لاتا ہے۔ جوئے کی بازیاں رات رات بھر اس کے گھر پر جمی رہتی ہیں۔ ہنسنے کی ایسی ایسی مکروہ آوازیں آتی ہیں اس کے گھر سے —— اور اب تو محلے میں ڈکیتیاں بھی ہونے لگی ہیں۔ اکثر پہرے والے سپاہیوں سے گپ شپ کرتا نظر آتا ہے —— خدا جانے کیا چکر ہے......"

"سپاہی تو مسلم ہیں نا؟" فادر نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو مسلمان ہی ہیں۔ اور کیا ہونا ہے انھوں نے۔" ماسٹر نے سوال کی نوعیت سمجھے بغیر کہا۔ اور بات جاری رکھی۔ "اور پھر یہ کہ محلے کی عورتوں کو بھی بری نظر سے دیکھتا ہے۔ اوباش دوستوں کے ساتھ گلی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ بے چاری خواتین باہر نکلتے بھی گھبراتی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اب دیکھیے نا، کہنے کو ہم لوگ مسلمان ہوتے ہیں اور آپ مسیحی لیکن دیکھا جائے تو شرم و حیا اور نیک کردار کا تصور تو

آپ کے مذہب میں بھی ہے۔ مسلمان آپ کی کتاب کو بھی خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک گرجن ایسے شرمناک کردار کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ جبکہ اخلاقی لحاظ سے عیسائیوں پر بھی وہی پابندیاں ہیں جو کہ مسلمانوں پر۔"

"اس سے بھی زیادہ ـــــ اس سے بھی زیادہ۔" فادر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہر اتوار کو میرے پاس جو لوگ چرچ کی سروس میں شریک ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر گھروں میں صفائی وغیرہ کا کام بھی کرتے ہیں۔ میں ان کو اپنے سرمن میں ہمیشہ ایمانداری کی ہدایت دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں Beg but do not steal مانگ لو لیکن چوری نہ کرو۔ اب آپ لوگ خود ہی دیکھ لیں۔ گھریلو چوریوں میں بہت کم عیسائی مہتر ملوث ہوتے ہیں۔ مسلمان ملازم زیادہ چوریاں کرتے ہیں۔"

ان تینوں کی نظریں ملیں۔ فادر کی بات انھیں پسند نہیں آئی تھی لیکن موقع کی مناسبت سے خاموش رہے۔

"لیکن یہ جارج تو آپ کے سرمنز کی صریحاً نفی کرتا نظر آتا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں آپ لوگ کس جارج کی بات کر رہے ہیں۔ میں اسے شکل سے پہچانتا بھی ہوں۔ وہ بہت کم چرچ آتا ہے۔ اب ڈکنفیشنز میں بھی نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں تو اس کا اکثر آنا ضروری ہے۔ اس کی روح بے حد خطرے میں ہے۔ ایسا کریں، آپ اسے میرے پاس لے آئیں، ٹھیک ؟"

"بالکل ٹھیک۔ اب یہی کرنا ہوگا۔ میں اسے جلد ہی آپ کے پاس لے آؤں گا۔"

ماسٹر نصیر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی باقی دونوں معززین بھی۔

(۲)

ماسٹر نصیر نے جارج کے گھر پر دستک دی۔ کافی دیر کے بعد اندر سے بنیان اور سرخ دھاری دار نیکر میں ملبوس جارج خود دروازے سے نکلا۔ اس کی موٹی موٹی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ماسٹر شش و پنج میں پڑ گیا کہ آیا بات کرنے کے لئے یہ وقت مناسب بھی ہے یا نہیں۔ ماسٹر کو دیکھ کر جارج نے سیٹی کے سے انداز میں ہونٹوں کو گول کیا۔

"جارج تمہیں چرچ میں فادر نے بلایا ہے۔" ماسٹر نے کہہ دیا۔

"کیوں ؟"

"میں نے انھیں قرضے والی بات بتائی تھی ـــــ اب تمہیں انھوں نے چرچ میں بلایا ہے۔"

"ماسٹر صاحب عجیب آدمی ہو یار۔ جب پتہ ہے تمہیں رقم نہیں ہے میرے پاس تو چرچ والا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ـــــ ہزار دفعہ تو کہا ہے جب پیسہ ہوگا دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فادر کے سامنے چل کر یہی بات کہہ دو۔"

"فائدہ کیا ؟"

"بس تمہیں فادر نے بلایا ہے۔ کپڑے پہن کر چلو میرے ساتھ۔"

"کل چلوں گا ـــــ آج کام ہے مجھے۔"

"یار انتظار کر رہا ہے فادر۔ اب چلے بھی چلو۔ کونسا دور جانا ہے۔ دو منٹ کا تو رستہ ہے۔" ماسٹر نے آواز میں سختی پیدا کی۔

"میں کہتا ہوں فادر کو بیچ میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی۔ میں کوئی مکرا تو نہیں تمہارے قرضے سے ـــــ عجیب بندے ہو تم۔"

"بس جو بھی ہے فادر کے سامنے طے کر لینا۔ جلدی سے کپڑے پہن کر آؤ۔ فادر انتظار کر رہا ہے۔"

جارج با دلِ نخواستہ اندر چلا گیا اور دس منٹ کے بعد پتلون اور قمیص پہن کر نکل آیا۔

"دل خوش کر رہے ہو اپنا ـــــ فائدہ کچھ نہیں ہونا" جارج نے بے اعتنائی سے کہا۔

پانچ منٹ پیدل رستہ طے کرنے کے بعد دونوں چرچ پہنچ گئے۔ فادر ہال میں موجود تھا۔ آج وہ سروس والے سیاہ لبادے میں ملبوس تھا۔ سنہری صلیب اس کے سینے پر چمک رہی تھی۔ وہ میز کے پاس کھڑا کسی کتاب کے ورق اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس نے جارج اور ماسٹر کو بنچوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بدستور کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ماسٹر نے جارج کو چپکے سے صلیب کا نشان بناتے ہوئے دیکھا اس سے اُس کی کچھ تسلی ہوئی کہ کم از کم اس ملعون کے دل میں مذہب کا کچھ تو لحاظ باقی ہے۔

فادر نے اشارے سے دونوں کو قریب بلایا۔ بڑی صلیب کے سامنے جارج نے واضح طور پر صلیب کا نشان بنایا اور فادر کو سلام کیا روسٹرم پر بائیبل کھلی رکھی تھی۔

"جارج" فادر نے پُروقار آواز میں کہا "تم نے ماسٹر سے دو ہزار روپیہ قرض لیا ہے؟"

"لیا ہے"

"اب تم ہولی سکرپچر پر ہاتھ رکھ کر اور خداوند یسوع مسیح کے سامنے حاضر ہو کر ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ یہ قرضہ کب واپس کرو گے؟"

"بس جلدی دے دوں گا" جارج نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں صحیح دن بتاؤ اور اس دن ہر صورت قرض واپس کرو"

جارج خاموش رہا۔ اس کی نظریں کبھی اپنے جوتے پر اور کبھی ہال میں لگی تصویروں پر گھومنے لگیں۔

"جواب دو" فادر نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت ٹھیک سے نہیں بتا سکتا" جارج نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جارج" فادر نے کمالِ ضبط سے کام لیتے ہوئے پُروقار آواز میں کہا "میں نے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن سوچا تھا کہ شاید مبالغہ آرائی ہو، لیکن اب...... یاد رکھو ہم ایک مسلمان ملک کی اقلیت ہیں۔ تمہارے کردار کے بارے میں اس نوعیت کی باتیں سن کر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تم تو کئی بار خدا کے اس گھر میں آ چکے ہو۔ سب کے ساتھ آواز ملا کر اس کی حمدیں گا چکے ہو۔ پھر اسی کی ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ میں تمہاری روح کی طرف سے فکرمند ہو گیا ہوں ـــــ لیکن یہ سب باتیں تو میں تم سے بعد میں پوچھوں گا۔ تمہیں اگلے اتوار کو کنفیشن کے لئے آنا چاہیئے۔ ابھی تو تم یہ قرض والا معاملہ ختم کرو۔ کوئی بھی جواب دینے سے پہلے سوچ لینا کہ وعدہ خلافی کرنے والے پر خدائے ذوالجلال کا قہر نازل ہو کر رہتا ہے"

جارج کچھ دیر سوچنے کے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر فادر کی طرف سیدھا دیکھتا ہوا بولا "میں اس وقت کوئی بھی وعدہ نہیں کر سکتا ـــــ پیسے جب ہوں گے دے دوں گا ـــــ کوئی کھا تو نہیں جاؤں گا اس کے پیسے۔ معلوم ہوتا ہے دو ہزار نہیں دو لاکھ روپے دیں اس کے" اس نے زہریلی نظروں سے ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"بند کرو فضول بات" فادر کا ضبط جواب دیتا نظر آ رہا تھا "اِدھر آؤ میرے ساتھ" اس نے جارج کو بازو سے پکڑا اور بڑی صلیب کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا "کھاؤ قسم خداوند یسوع مسیح کی کہ میں فلاں دن قرض واپس کر دوں گا"

جارج نے کچھ دیر صلیب پر لٹکے ہوئے جسم کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے بازو چھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

فادر اینڈریوز کے چہرے پر ضبط کے باعث تناؤ آ گیا "تو تم جواب نہیں دو گے"

"نہیں" جارج نے بدتمیزی سے کہا۔ ماسٹر نصیر سن ہو گیا۔ اسے اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوئیں۔ فادر کی بیکسی کے خیال سے وہ نظریں چراتا ایک طرف کو ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ فادر کچھ دیر بالکل ساکت کھڑا رہا۔

"ادھر آؤ" وہ جارج کو بازو سے پکڑ کر ہال کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ ماسٹر نصیر پلٹ کر غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ فادر نے جارج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کچھ کہا۔ جارج یوں چونک پڑا جیسے اسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ کچھ دیر ہال میں سناٹا رہا۔ جارج سوچوں میں گم نظر آتا تھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے دروازے کے پاس رکھے ہوئے مصلوب مجسمے کے سامنے رک گیا اور اس نے اشارے سے کراس کا نشان بنایا۔ فادر اس کے قریب پہنچ گیا۔ جارج نے فادر سے کچھ کہا جو ماسٹر فاصلے کی وجہ سے بالکل نہیں سن سکا۔ پھر فادر اور جارج آہستہ آہستہ چلتے ماسٹر کے قریب آئے۔

جارج فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ماسٹر تمہارا قرضہ میں اگلے جمعہ کو دے دوں گا"

(۳)

جمعہ کے دن صبح دس بجے جارج نے دو ہزار روپے لا کر ماسٹر کو دے دیئے اور چپ چاپ واپس چلا گیا۔ ماسٹر ہکا بکا نوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی واقعی اس کی رقم مل سکتی ہے۔ لیکن روپے واقعی اس کے ہاتھ میں تھے۔ سو سو کے چند نوٹ، پھر دس اور پانچ روپے کے نوٹوں کا بنڈل اور پچاس کے قریب نوٹ ایک ایک روپے کے تھے۔ جیسے بڑی مشکل سے ایک ایک نوٹ کر کے رقم جمع کی ہو۔ ماسٹر نے نوٹ میز کی دراز میں ٹھونسے۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ وہ جارج کے پیچھے دوڑا۔

"جارج ——— رکو ذرا ——— جارج" جارج اس وقت گلی کا موڑ مڑ رہا تھا۔ ماسٹر نے اسے جا لیا۔

"بہت شکریہ تمہارا ——— بہت بہت شکریہ"

جارج نے بے پروائی سے "کوئی بات نہیں" کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا۔

"جارج تم پچھلی باتوں کا خیال نہ کرنا۔ میں بھی مجبور تھا۔ بہن کی شادی وغیرہ ......"

"کوئی بات نہیں" جارج بولا۔

"اور ہاں بھائی ——— وہ بات تو بتاؤ ذرا"

"کون سی بات؟"

"وہ جو فادر نے تم سے کہی تھی ——— الگ سے"

جارج نے حیرانی سے ماسٹر کی طرف دیکھا، جیسے ماسٹر پاگل ہو گیا ہو "کیا مطلب؟" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ارے بھائی وہی بات، جسے سن کر تم نے قرضہ واپس کیا"

"مجھے یاد نہیں"

"کمال کرتے ہو ——— اتنی جلدی کوئی بھول سکتا ہے۔ فادر نے کوئی خاص بات کہی ضرور تھی ورنہ تم کہاں ......"

"تمہیں تمہاری رقم مل گئی۔ باقی باتیں چھوڑو" جارج نے بدلحاظی سے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا گلی سے نکل گیا۔

شام تک ماسٹر کے قرضے کی بازیابی اور جارج والا واقعہ پورے محلے میں مشہور ہو چکا تھا۔ ماسٹر نصیر کے دوست حاجی رزاق اور کبیر صاحب بھی پورا واقعہ سننے کے لئے ماسٹر کے گھر پہنچ گئے۔ پوری بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے کہ آخر وہ کون سی بات تھی کہ جہاں بائبل اور صلیب بھی کامیاب نہ ہوئے وہاں اس ایک بات نے معجزہ سا کر دکھایا۔ دیر تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں لیکن کوئی مؤثر بات نہ سوجھ سکی۔ کھدر سے مجبور

ہو کر انھوں نے جارج کو دوبارہ گھیرنے کا تہیہ کیا۔

شام کو ماسٹر نصیر، حاجی رزاق اور کبیر صاحب نے جارج کو اس کے گھر پر گھیر لیا۔ بہت زور مارا محلے داری کا واسطہ دیا لیکن جارج نے بول کر نہ دیا۔ یہی کہتا رہا" مجھے یاد نہیں" جب ان کا اصرار زیادہ بڑھا تو اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔"فادر نے مجھے منع کیا ہے۔"

وہ مایوس واپس آئے لیکن تجسس اور بڑھ چکا تھا۔ وہ تینوں حاجی صاحب کے گھر چائے پینے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ پھر جارج کی بات ہونے لگی۔

"کیوں نہ فادر سے پوچھیں۔" حاجی رزاق نے رائے دی۔

"جارج جیسا کچا آدمی نہ بولا تو فادر کہاں بولنے والا ہے۔" کبیر صاحب بولے۔

"ویسے کوشش کی جا سکتی ہے۔" ماسٹر کہنے لگا "یہ پادری عام طور پر شریف ہوتے ہیں ـــــ کوئی بعید نہیں کہ بتا ہی دے۔"

"کوشش کرو پھر تم ہی ـــــ" حاجی صاحب بولے۔

"ایسا کرو شکریہ کے بہانے سے چلے جاؤ ـــــ" کبیر صاحب نے کہا۔

"اور تم کامیاب لوٹے تو مٹھائی ہماری طرف سے۔"

"بالکل۔ بالکل۔ مٹھائی تو ہوگی۔" حاجی صاحب خوش ہو کر بولے۔

"نہی؟"

"نہی!"

(۴)

فادر نے اچانک ماسٹر کو سامنے دیکھا تو اس کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیوں ماسٹر صاحب کام ہو گیا؟"

"ہو گیا۔ آپ کی مہربانی سے۔"

"میری نہیں۔ اس کی۔" فادر نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی مہربانی تو ہر وقت شامل حال ہے ـــــ لیکن پیسے تو اس نے آپ ہی کے کہنے پر نکالے۔"

"اچھا ـــــ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کے پیسے ادا ہوئے اور اس کا بوجھ ہلکا ہوا۔"

دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

"اور سب خیریت؟" فادر نے پوچھا۔

"جی شکر ہے اللہ کا ـــــ بس شکریہ ہی ادا کرنے آیا تھا...... ایک چھوٹی سی بات اور تھی۔" ماسٹر نے کہہ دیا۔

فادر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"معمولی سی بات ہے ـــــ دیکھئے ٹالیے گا مت۔"

"آپ بات تو کہیں۔" فادر نے شگفتگی سے کہا۔

"فادر ـــــ آپ نے اس دن جارج سے کیا کہا تھا کہ ـــــ کہ وہ یکدم بدل گیا؟"

فادر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ وہ ماسٹر کے پاس سے ہٹ کر میز کی طرف مڑ گیا اور بے ترتیبی سے بکھری کتابوں کو ترتیب دینے لگا۔ ماسٹر اس کے ردعمل سے کچھ گھبرایا لیکن پھر تجسس ہر چیز پر غالب آ گیا ـــــ اب یا پھر کبھی نہیں۔ اس نے دل میں کہا اور ہمت کر کے بولا "کیوں فادر ـــــ کیا جواب نہیں ملے گا؟"

"مائی سن ـــ ہر بات کا جواب ضروری نہیں ہوتا" ـــ فادر کی آواز میں نرمی تھی۔ جبکہ چہرہ اندرونی تناؤ کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کے نرم لہجے سے ماسٹر کی ہمت بندھی۔

"میں تو آج پوچھ کر ہی جاؤں گا"

"نہیں دوست۔ ایسا مناسب نہیں ـــ تم جاؤ اب۔ ماس کا وقت ہو رہا ہے"

"اب تو شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ ظلم ہوگا اگر آپ نے نہ بتایا"

"میں کسی پر ظلم نہیں کرتا ـــ ضد مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم خدا حافظ کہہ دیں ایک دوسرے کو۔ مجھے کام ہے اب"

فادر روسٹرم سے سکرپچر کی کتابیں اٹھا کر دروازے کی طرف چلنے لگا۔

"آپ کو قسم ہے فادر" ماسٹر بچوں کی طرح ضد پر اُتر آیا۔

"قسم تو بہت نامناسب بات ہے" فادر نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر آخر آپ بتاتے کیوں نہیں ـــ آخر ہمارے لئے بھی تو سوچنے کا مقام ہے ـــ سارے محلے نے دباؤ ڈالا۔ پولیس کی دھمکی دی۔ چرچ میں لایا گیا۔ بائیبل کے اور حضرت عیسیٰ مسیح کے واسطے دیئے گئے۔ لیکن وہ شخص ٹس سے مس نہ ہوا، اور آپ کی ایک بات نے...... آخر وہ کیا بات تھی؟"

"ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی" فادر کی آواز میں وہی شفقت تھی جس سے ماسٹر کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔

"فادر دیکھئے نا ـــ آپ نہیں بتائیں گے تو ہماری مٹھائی ماری جائے گی"

"مٹھائی؟"

"شرط لگی ہے مٹھائی کی"

"شرطیں بہت لگاتے ہو تم مسلمان" فادر کی آواز میں طنز تھا۔

"تو پھر بتا دیں نا۔ کیوں ہماری مٹھائی گنواتے ہیں"

"مٹھائی کا بہت شوق ہے تم مسلمانوں کو؟"

"ایسا ہی سمجھ لیجئے" ماسٹر نے ہنس کر کہا۔

فادر کچھ دیر خاموش رہا۔ وہ سوچ میں گم نظر آرہا تھا۔ پھر کہنے لگا "اس روز تم لوگ مل کر میرے پاس آئے تھے اور دنیا کی کوئی برائی نہ تھی جو تم لوگوں نے جارج کی ذات میں بیان نہ کی ہو"

"یہ سچ ہے۔ وہ ہے بھی ایسا" ماسٹر نے فوراً کہا "حالانکہ دیکھا جائے تو آپ کے مذہب میں بھی اچھے کردار کا وہی تصور ہے جو کہ ہمارے ہاں ہے، لیکن ـــ جارج تو بہت ہی برا آدمی نکلا۔ کوئی کیریکٹر ہی نہیں اس شخص کا......"

"مجھے بہت دکھ پہنچا تھا" فادر نے ماسٹر کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اُسی لہجے میں اپنی بات جاری رکھی "مقدس ماں مریم کے پاک بیٹے نے دنیا کو ایک ہی پیغام دیا ہے ـــ محبت ـــ ہمیں دنیا کو اور اس کے لوگوں کو محبت کی نظر سے دیکھنا سکھایا گیا ہے۔ اور اپنے بچوں کو بھی ہم یہی سکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہی اصل اور اصول ہے چرچ کا ـــ ہم کسی کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے خواہ وہ دنیا کی نظر میں کتنا ہی گرا ہوا کیوں نہ ہو۔ مائی سن۔ وہ دیکھو سامنے۔ وہ پوری دنیا کے گناہوں اور دکھوں کو اپنی روح میں سمیٹ کر صلیب پر چڑھ گیا۔ اس نے کسی سے نفرت نہیں کی۔ صرف محبت کی اور خدائے ذوالجلال نے اپنے مقدس بیٹے کی محبت کو مرنے نہیں دیا۔ جوں کا توں زندہ

اٹھا لیا آسمانوں پر۔"

فادر سانس لینے کو رکا۔ پھر بولا "ہمارے لئے ہمارے سب بچے خداوند یسوع مسیح کے ریوڑ کی بھیڑیں ہیں۔ کوئی ریوڑ سے بھٹک جائے تو ہم اسے محبت سے واپس لانے کا جتن کرتے ہیں۔ اس سے نفرت نہیں کرتے —— دکھ محسوس کرتے ہیں اس کے لئے۔ نفرت نہیں۔ اسے کافر نہیں کہتے۔ مرتد قرار نہیں دیتے۔ اسے پیار سے پکارتے ہیں۔ پھر بھی ہم میں نہ لوٹے تو اس کی روح کو جھنجھوڑ ڈالنے کا جتن کرتے ہیں۔ اسے شرابی، زانی، راشی، چور قرار دے کر ہمیشہ کے لئے نفرت کے متعفن دلدل میں غرق نہیں کر دیتے —— وہ دیکھو سامنے دروازہ 'Confessional' لکھا ہے جس پر ایک سے ایک گناہگار روح کے کرب میں مبتلا میرے پاس آتے ہیں۔ وہ اعتماد کے ساتھ آتے ہیں۔ جانتے ہیں یہاں کوئی تضحیک نہ ہوگی۔ کوئی بے عزت نہ کرے گا۔ روتے ہیں، آنسوؤں سے گناہوں کو دھوتے ہیں۔ خدا کے سامنے اعتراف کرتے ہیں گناہوں کا اور دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور چرچ کے اندر سے بہتر آدمی بننے کا عزم لے کر نکلتے ہیں۔"

فادر پھر رکا۔ ماسٹر سوچنے لگا میں تو کچھ اور پوچھ رہا تھا اور یہ فادر......

فادر نے اپنی بات جاری رکھی "مائی سن۔ محبت وہ روشنی ہے جس کے پھیلاؤ کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسی جذبے سے ہم اپنے مسیحی معاشرے کا خمیر اٹھاتے ہیں —— یہی تو وہ جذبہ ہے جس کے تحت ہمارے معاشرے کے وہ فرد جن پر خدا نے اپنی نعمتوں کی بارش کر رکھی ہے۔ اپنے کم خوش نصیب بھائیوں کو بھلاتے نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں کے دولت مند ارب پتی اور شو بزنس کے وہ کامیاب لوگ جنہیں تم تعیش پرست گردانتے ہو، برا کہتے ہو۔ وہ کس طرح سوشل ویلفیئر کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، یہ دنیا کے لئے ایک مثال ہے۔ ان ہی کے قائم کردہ ٹرسٹ ہیں جن سے چیریٹی ہسپتال، کالج اور ویلفیئر کے بے شمار ادارے چلتے ہیں —— جبکہ تم لوگ جو اپنے مذہب کے غرور اور کردار کے تکبر میں مبتلا ہو۔ کیا حال ہے تمہارے معاشرے کا —— ہم دوسروں کے لئے لاکھ برے سہی لاکھ الزام تراشیاں کرو تم ہم پر۔ اپنوں کے حق میں تو اچھے ہیں اور تم لوگ —— تم لوگ تو جن کو اپنے لئے چنتے ہو وہ بھی تمہارے نہیں بنتے —— پورے معاشرے کے وسائل ان ہی چند لوگوں کے ہاتھوں میں منجمد ہو جاتے ہیں —— برا نہ ماننا ماسٹر۔ تم مسلمانوں کے ہاں لاکھوں انسانوں کا جم غفیر دن رات حیوانوں کی طرح کام کرتا ہے اور حیوانوں سے بدتر طریقے سے زندگی بسر کرتا ہے تاکہ چند لوگ —— صرف چند لوگ عیش و آرام سے رہ سکیں۔ معاف کرنا یورپ کے کتے بھی تمہارے معاشرے کے غریب لوگوں سے بہتر زندگی گزارتے ہیں......."

فادر سانس لینے کو رکا۔ ماسٹر حیران تھا کہ فادر یہ سب غیر ضروری اور فالتو باتیں کیوں کر رہا ہے —— اور کسی طرح اصل بات کی طرف آ ہی نہیں چکتا۔ وہ کچھ بولنے والا تھا کہ فادر نے ا[illegible] [illegible] سے اسے روک دیا اور بولا "سو جارج کو جب میرے پاس لایا گیا تو بے شمار برائیاں تھیں اس کی ذات میں۔ جو تم [illegible] [illegible] نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا —— ان تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی تھی بے ایمانی اور وعدہ خلافی...... اور پھر اس پر کوئی شرمساری بھی نہیں —— بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی......۔ بہت دکھ ہوا تھا مجھے۔" پادری خاموش ہو گیا۔

"پھر...... کیا کہا تھا آپ نے جارج سے؟" ماسٹر نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا: کہیں تو مسلمان تو نہیں ہو گیا؟"

پری زاد

عطیہ سیّد

یہ آمدِ بہار کا ایک دن تھا، ایک ایسا دن جب سردی سے منجمد جسموں کے مسام کھلنے لگتے ہیں اور زندگی کی حرارت شہر کے سلیٹی برفاب کو پگھلانے لگتی ہے۔ حتیٰ کے یہاں کے باسیوں کے برفیلے، بے رنگ، بے جذبات چہروں پر بھی بہار کا گلابی عکس یوں چھلکنے لگتا ہے کہ لحہ بھر کو یہ گمان باطل ہوتا ہے کہ وہ چلتے پھرتے میکانکی پتلے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسان ہیں۔

تحسین کپڑے دھونے کی غرض سے ففتھ ایونیو کے نکڑ پر پبلک لانڈری میں جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے نکلی تو باہر جاپان کے تحفے چیری کے درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر شرمیلے شگوفے سر اٹھا رہے تھے جن کے نازک وجود بلند و بالا عمارتوں کے پتھریلے ماحول کو عجیب حسن بخش رہے تھے۔ اُس نے اپنے بوجھل پٹھوں میں ہلکا پن اور تھکے ہوئے ذہن میں تازگی کی لہر کو محسوس کیا۔ اس تازگی اور ہلکے پن سے جیسے اس کے پر لگ گئے۔ اس کے پاؤں دوڑنا چاہتے تھے کہ اس کے پٹھوں کی توانائی میں اضافہ ہو چکا تھا اور اس کے لبوں پر بھولے بسرے گیت کی آہٹ تھی۔ وہ خوش تھی، صحیح معنوں میں خوش۔ جب سے وہ اس شہر میں آئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ ایک سرخوشی اس کے جسم میں سرایت کر چکی تھی اور خون کے ساتھ ساتھ رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی بے نام مسرت سے دمکنے لگی تھیں اور زردی مائل چہرے پر گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ اس شہر میں آنے کے بعد آج اُس نے پہلی مرتبہ حُسن کو دیکھا تھا، بہار کو چھوا تھا۔ یہ بہار کی سرسراہٹ ہی تو تھی جو اسے اس مردہ شہر کے پتھریلے در و دیوار سے سنائی دی تھی اور اس کے ریشے ریشے میں سرور کی مانند سما گئی تھی۔

پانچ بجے کا وقت تھا لیکن ابھی تک سورج کی روشنی اس بات کا ثبوت تھی کہ چاہے سورج دکھائی نہ دے مگر وہ ان اونچی آسمان کو چھونے والی عمارتوں کے پیچھے کہیں موجود ہے۔ ہوا چل رہی تھی لیکن وہ اپنی سرمائی چبھن کھو بیٹھی تھی۔ سڑک پر پیدل چلنے والے بھی اپنے معمول کے اعصابی تناؤ کے بجائے قدرے آسودہ دکھائی دے رہے تھے۔ تحسین نے بھی آج گرم کپڑوں کے بجائے سوت کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سیاہ زمین پر سرخ باتیق ڈیزائن اور سرخ سینڈل پہنے وہ اپنے ہی احساسِ جمال سے دوچار تھی، یا شاید یہ موسم کی دلفریبی کا سرور تھا۔

دریا کنارے سے مرکزی بلیوارڈ کی جانب ڈھلوان چڑھتے ہوئے اُسے اپنی پشت پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے دو آنکھیں اُس کے سر کے پچھلے حصے سے چپکی ہوں۔ اُس نے مڑ کر دیکھا ڈھلوان پر کچھ عورتیں بچوں کو گاڑیوں میں ڈالے گپ شپ کر رہی تھیں، چند ریٹائرڈ بوڑھے اِدھر اُدھر بنچوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے اور بس۔ اس سارے منظر میں کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہ دے رہا تھا جسے اُس سے دلچسپی ہو۔

"یہ شاید میرا واہمہ تھا" تحسین نے سوچا، اور اُس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے دوبارہ وہی احساس

ہوا جیسے کوئی پشت سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر پھر پیچھے نگاہ دوڑائی، مگر پس منظر میں ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ عورتیں وہیں کھڑی تھیں، بوڑھے اونگھ رہے تھے اور بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس بے معنی احساس اور بے بنیاد خیال پر مزید وقت ضائع نہیں کرے گی۔ چنانچہ وہ تیزی سے مرکزی بلیوارڈ کی طرف چلنے لگی۔

کئی دن گذر گئے۔ شہر کی برف راتیں پہلے خنک اور پھر سبک نیم گرم راتوں میں ڈھل چکی تھیں۔ یہ بھی ایسی ہی رات تھی۔ جو بحیرۂ روم کے کناروں پر آباد شہروں کی یاد دلاتی تھی کہ اس کی ہوا میں پیزا کی مہک اور ہسپانوی سموسوں کی باس رچی بسی تھی۔ بھلے موسم کے بازوؤں میں شہر کے بے فکروں کے قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ جدت پسند فیشن پرست اپنے خوفناک حد تک مضحکہ خیز لباسوں میں ملبوس کریہہ المنظر انداز میں بنے سنورے، سڑکوں پر چہل قدمی میں مصروف تھے۔ کہیں بوڑھوں کا مجمع تھا اور کہیں نوخیز لڑکے لڑکیاں محو خرام۔ کہیں فٹ پاتھ پر لمبی زلفوں والے گٹار کی تانیں بکھیر رہے تھے، اور کہیں کیسٹ پلیئر کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ رات گئے تک سڑکوں پر یہ ہجوم، یہ بے فکر خوش باشی، رنگے برنگے لباس، چہلیں، موسیقی ـــــ یہ سب کارنیول کا سا سماں باندھ رہے تھے۔

تحسین دیر تک گلی کوچوں میں گھومتی رہی کہ موسم کی دلفریبی پُرکشش تھی یا شاید اس لیے کہ اُسے آج کی شب اُس شہر کی یاد دلا رہی تھی جو مسافتوں کی گرد میں ڈوب کر بہت دور رہ گیا تھا۔ ایٹی ففتھ سٹریٹ تھرڈ ایونیو کے قریب کتابوں کی ایک دوکان تھی جس کا مالک کولمبین تھا۔ وہ اچھی حالت کی سیکنڈ ہینڈ کتابیں فروخت کرتا تھا۔ تحسین کو حیرت ہوئی کہ اس کی دوکان اتنی رات گئے تک کھلی تھی۔ وہ دوکان کے قد آدم شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھی کہ خوش اخلاق کولمبین نے اسے دیکھ لیا اور دروازہ کھول کر بولا "مام! اندر آکر نئی کتابیں دیکھیں۔ یہ نیا سٹاک آج ہی شام کو پہنچا ہے۔ سو سوچا کہ آج کا کام کل پر کیوں چھوڑا جائے۔ آج ہی ڈبے کھول کر کتابوں کو ٹھکانے لگا دوں۔"

"اوہ، شکریہ۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ اتنی رات گئے دوکان کی بتی کیوں جل رہی ہے۔" تحسین نے کہا۔

وہ دوکان کے اندر چلی گئی اور نئی کتابوں کو دیکھنے کی غرض سے انھیں اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس کے مطلب کی کوئی کتاب نئے سٹاک میں نہیں تو اُس نے کولمبین سے کہا۔ "اچھا، خدا حافظ۔ میں اب چلتی ہوں۔"

کولمبین نے چہرے پر چیزیں فروخت کرنے والوں کی روایتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "رکیں۔ نیچے تہہ خانے میں کچھ اور کتابیں بھی ہیں آپ ان کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ میں ابھی لاتا ہوں جسٹ ڈونٹ ویٹ۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا، اور اس کے ساتھ ہی وہ چیتے کی سی چستی سے تہہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

وہ کولمبین کی تہہ خانے سے واپسی کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظریں باہر کی جانب مڑ گئیں۔ قد آدم شیشے کی کھڑکی میں ایک حسین لڑکا جس کی عمر مشکل سے پندرہ برس ہو گی، یوں ساکت و جامد کھڑا تھا کہ چوکھٹے میں تصویر کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے اردگرد اور بھی کئی لڑکے لڑکیاں کھڑے ہنسی ٹھٹھول میں مصروف تھے۔ اگرچہ وہ سب شوخ انداز تھے لیکن یہ لڑکا ان میں اس حد تک نمایاں تھا کہ وہ سب اپنی شوخیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے باوجود اُس تصویر کا پس منظر دکھائی دیتے تھے جس کے مرکز میں وہ اپنے خاموش جمود کے ساتھ کھڑا تھا۔ پہلے تحسین کو یوں محسوس ہوا کہ شاید وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے مگر جب اُس نے غور سے دیکھا تو لڑکے کی نظریں کھڑکی کے قد آدم شیشے کے نچلے حصے سے چپکی تھیں جہاں دو تین کاکروچ سیر گشت میں مصروف تھے۔ جانے

اُن میں کیا مقناطیسی قوت تھی کہ لڑکا انہیں پلک جھپکائے بغیر دیکھنے میں محو تھا۔

"مام، یہ ہیں وہ کتابیں!" کولمبین نے کتابیں اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی اور اُن کے ورق اُلٹنے لگی۔

تحسیس دوکان سے باہر نکلی تو کتابیں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ باہر فٹ پاتھ سے نوخیز لڑکے لڑکیوں کا گروہ اور اُن کے ساتھ وہ لڑکا بھی غائب ہو گیا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف آتے ہوئے جب وہ معروف مرکزی بلیوارڈ سے پچھلی گلیوں کی طرف مڑی تو اُسے قدرے خاموشی اور سنسانی کا احساس ہوا۔ وہ اپنی تازہ خریدی ہوئی کتابوں کے بارے میں سوچنے لگی، اور پھر آہستہ آہستہ اَنجانے میں اُس کی سوچ کا رُخ کھڑکی کے چوکھٹے میں فٹ تصویر نما لڑکے کی جانب مڑ گیا۔ وہ یقیناً بے حد خوبصورت تھا۔ اُس کا نکلتا ہوا قد اُس کی مستقبل کی دراز قامتی کا پتہ دے رہا تھا۔ لمبی سنہری زلفیں، سبز کٹوراسی آنکھیں، انتہائی متناسب نقوش اور معصومیت کا تقدس اُسے قدیم اطالوی اساتذہ کی مذہبی تصاویر میں بنائے گئے ننھے فرشتوں کی دلفریبی بخش رہے تھے۔

اپنے اپارٹمنٹ کی نیم تاریک گلی میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے سوچا۔ "جانے کیا بات ہے کہ اُس کا خیال پلٹ کر اُس لڑکے کی جانب جا رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت حسین تھا یا پھر اس لیے کہ وہ اُس شوخ و شنگ گروہ کے درمیان ساکت و جامد کھڑا منفرد نظر آ رہا تھا۔ پھر اُس نے ذہن سے اُس کے خیال کو جھٹک دیا۔ وہ اپارٹمنٹ میں پہنچ چکی تھی اور ابھی اُسے بہت سے کام کرنے تھے۔

اس واقعے کے دو تین ہفتے بعد کی بات ہے کہ تحسیس ڈاؤن ٹاؤن جانے کے لیے بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آخر بس آ پہنچی اور انتظار کے طویل لمحے ختم ہوئے۔ بارش کی وجہ سے بس میں کافی رش تھا لیکن تحسیس کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی کیونکہ اُس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی بوڑھی خاتون اگلے ہی سٹاپ پر اتر گئی۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اُس کی ٹانگوں کے تھکے ہوئے پٹھوں کو کسی قدر آسودگی کا احساس ہوا۔ اُسے شہر کے آخری سرے پر جانا تھا، اس لیے سفر بہت لمبا تھا۔ یہاں اپنے قریب بیٹھے ہوئے یا ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں کی طرف دیکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے، سو تحسیس وقت گذارنے کے لیے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، اگرچہ باہر کے منظر میں عجیب یکسانیت تھی۔ وہی پہاڑ جیسی بلند و بالا سلیٹی دیو قامت عمارتیں، وہی ان کے پاؤں میں کیڑوں کی طرح رینگنے والا انسانوں کا ہجوم، ایک جیسی شاہراہیں اور ان کی بغل میں مڑتی ہمزاد گلیاں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس شہر کو کسی حسابی ذہن نے بڑی محنت اور منصوبہ بندی سے بے رنگ یکسانیت اور پاگل کر دینے والے تناسب میں ڈھالا تھا۔ بالکل بھول بھلیاں کی طرح جس میں سبھی راستے ایک سے ہوتے ہیں، کوئی سنگ میل، کوئی نشانِ راہ موجود نہیں ہوتا جو راہبری کر سکے، جو حافظے میں محفوظ کیا جا سکے، جو اس گورکھ دھندے سے باہر نکلنے کی امید ہو۔

تحسیس انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اسے وہی احساس ہوا جیسے کسی کی نگاہیں اُس پر مرتکز ہوں۔ اُس نے اِدھر اُدھر دزدیدہ نگاہی سے دیکھا کہ اُس کے مہذب ہونے کا بھرم نہ کھل جائے، مگر اُسے کوئی ایسا شخص دکھائی نہ دیا جو اس کی جانب دیکھ رہا ہو۔ سب اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے، جزیروں کی طرح ایک دوسرے سے کٹے ہوئے، اکائیوں کی طرح منفرد اور مجرد۔

"نفسا نفسی کے اس جنگل میں کسے فرصت ہے کہ اُسے دیکھے اور وہ بھی اس قدر شدت سے کہ اُس کی گردن کی حساس جلد جھنجھنا اُٹھے۔ واہمہ ہو گا۔" اُس نے سوچا۔ اُسے آج کل جانے کیوں یہ احساس ہوتا تھا۔ ابھی چند دن پہلے اپنے اپارٹمنٹ کو جاتے ہوئے شاہراہ سے نیم تاریک گلی میں داخل ہوتے ہی اُسے یوں لگا جیسے کوئی اُس کے پیچھے چل رہا ہو، حالانکہ اُس نیم تاریک گلی میں اُس کے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اب اُسے اکثر یہ گمان گذرتا تھا۔ پچھواڑے کی اندھی گلیوں میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی، پُر ہجوم شاہراہوں کی

بھیڑ میں جیسے کوئی اس کے ساتھ ہوتا تھا، کوئی سایہ، کوئی موجودگی، کوئی نہ دکھائی دینے والی ہستی جس کی پراسراریت اس کے اعصاب کو مغلوب کرتی جا رہی تھی۔

"کوئی بھی نہیں ہے، ایسے ہی التباس، حواس کے مغالطے۔ یا پھر شاید اس شہر کا اثر ہے۔" تحسیس نے سوچا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اُس کی گردن میں پھر ہلکی سی سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس مرتبہ اس کا اضطراری ردِ عمل انتہائی تیز تھا۔ ایک سیکنڈ میں اُس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی نگاہیں خود بخود پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لڑکے پر ٹھہر گئیں۔ اچانک سناٹا آسمان کو چھوتی عمارتوں کی کلغیوں سے نیچے اُتر آیا۔ لمحہ بھر کو جیسے جادو کے زور سے شہر اور اُس کے سارے باسی، بس اور اس کی سواریاں سب غائب ہو گئے۔ صرف پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی آنکھیں رہ گئیں۔ جو پھیل کر سب چہروں پر چھا چکی تھیں۔ اُس کی سبز جھیل آنکھوں میں خاموشی تھی، گہرے پانیوں کی خاموشی تھی، گھنے جنگلوں کا سناٹا تھا۔

یہ صرف ایک پل تھا۔ پلک جھپکتے ہی لڑکا اپنی سیٹ سے اُٹھا اور اُس سٹاپ پر اُتر گیا جس پر اس عرصے میں بس رک چکی تھی۔ یہ وہی لڑکا تھا جو کارنیوال سمان رات کو مبین کی دوکان کے باہر نوخیز لڑکے لڑکیوں کے گروہ میں ساکت و جامد کھڑا تھا۔

اُس دن کے بعد جانے کیوں اُس کا دھیان بار بار اس لڑکے کی طرف جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے انگ انگ سے ڈھکی چھپی آزردگی پھوٹ رہی تھی، اُس کے سارے وجود میں بے بسی مخفی طور پر رچی تھی، جیسے اتنے حُسن کے باوجود اسے کوئی چاہنے والا، کوئی سراہنے والا نہ ہو۔ بہرحال اُس میں کوئی چیز تھی جو تحسیس کی توجہ کھینچ رہی تھی، کوئی چیز جو اُس کی گرفت میں نہیں آتی تھی جیسے کسی معمہ کا غائب حصہ۔

ایک دن تحسیس دریا کنارے پہنچی۔ بنچ پر بیٹھی ہڈسن کے گدلے آلودہ پانیوں کو نقرئی ہوتا دیکھ رہی تھی۔ نیم گرم موسم کی خوشگواری سے اُس کے پٹھے ڈھیلے، پپوٹے بوجھل اور ذہن خالی تھا۔ سورج کی گداز حدت سے اُس کے تن بدن میں ناقابل فہم طمانیت در آئی تھی۔ وہ اس وقت سر پر تنے گھنے درخت کی شاخوں سے لٹکتے پتوں اور ڈھلوان پر اُگی گھاس کی طرح فطرت کا حصہ بن چکی تھی، اُس کا ذہن خالی اور دل مکمل پرسکون تھا۔ مگر اُس کے لیے آنند کی یہ گھڑیاں عموماً بڑی مختصر ہوتی تھیں۔ اب بھی ایک نامانوس آواز اُسے نروان کی اس کیفیت سے واپس دنیا میں کھینچ لائی۔ آواز کیونکہ عقب سے آئی تھی اس لیے تحسیس نے پلٹ کر دیکھا۔ بنچ کے پیچھے جھیل آنکھوں والا خوبصورت لڑکا کھڑا تھا۔ دھوپ کے سنہری پن سے اس کی خوبصورتی مزید نکھر آئی تھی۔

"کیا میں بنچ پر بیٹھ سکتا ہوں؟" اُس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں" تحسیس نے جواب دیا۔

وہ بنچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا اور اُس نے اپنے کوٹ کے اوپر اُٹھے ہوئے کالر میں منہ کا نچلا حصہ یوں چھپا لیا کہ صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

تحسیس دریا میں مرغابی کی طرح تیرتی بطخوں کو دیکھنے لگی لیکن اُسے احساس تھا کہ لڑکا کنکھیوں سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُسے یہ صورتِ حال تکلیف دہ معلوم ہوئی اور اُس نے سر گھما کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکے کی گہری آنکھیں متلاطم تھیں جیسے ان کی تہہ میں کوئی بات ہو۔ تحسیس کے چہرے پر سوالیہ تاثر دیکھ کر لڑکا بولا۔ "میں اپنا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ میں ٹونی ہوں، ٹونی بردا لیکن میرے دوست مجھے صرف

ٹونی ہی کہتے ہیں۔"

"اچھا ٹونی تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی" تحسین نے وہاں کے آداب کے مطابق ہلکی سی مسکراہٹ سے یہ جملہ ادا کیا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" تحسین نے پوچھا۔

"میں یہیں رہتا ہوں۔"

"اکیلے؟"

"نہیں —— لیکن میں تنہا ہوں، بالکل تنہا۔" ٹونی نے عجیب افسردگی سے یہ الفاظ کہے۔ اُس کی آواز میں اُس جنگلی مستانگ کی ہنکار کا جارح کرب تھا جو اندھی رات میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہو لیکن اس افسردگی اس کرب کا تاثر صرف لمحے بھر کو تھا۔ وہ ایک مختصر، انتہائی مختصر سا لمحہ تھا انکشاف کا جس کے دوران جنگجو کی زرہ کی دراڑ سے اس کا ننگا غیر محفوظ جسم عریاں ہو گیا تھا، اگرچہ یہ عریانی یہ انکشاف بجلی کے لشکارے کی طرح کوند کر غائب ہو گیا۔ اگلے ہی پل لڑکے کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ بکھر گئی اور اس کی آنکھوں میں ستارے کی جھلملاہٹ تھی۔ اس نے پھر کہا۔ "میں تنہا ہوں، بالکل تنہا —— کیونکہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں۔"

"اچھا، تم نیویارکر نہیں؟"

"ہاں، بلکہ میں امریکن بھی نہیں۔"

"اس کا مطلب ہوا تم میری طرح غیر ملکی ہو۔"

"میں اجنبی ہوں پردیس میں ہوں۔" پھر ٹونی نے تھوڑا سا رک کر کہا۔ "دراصل میرا کسی ملک سے تعلق نہیں۔"

"تمہارا کسی ملک سے تعلق نہیں؟" تحسین نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ سچ ہے، بلکہ میرا اس سیارے ہی سے کوئی تعلق نہیں۔" ٹونی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ تحسین کی حیرانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"تمہارا اس سیارے ہی سے کوئی تعلق نہیں!" تحسین نے استفہامیہ انداز میں دوہرایا۔ "تو پھر تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میرا سیارہ زمین سے روشنی کے کھربوں سال کی مسافت پر چوتھی کہکشاں میں واقع ہے اور اس کے تین چاند ہیں۔"

اب تحسین کو شک ہو چلا تھا کہ ٹونی اُسے اُتو بنا رہا ہے یا پھر نوجوانی کی دہلیز پر گامزن ہونے کے باوجود اس کے خمیر میں ابھی بچپن کے اثرات اس قدر نمایاں ہیں کہ وہ Make Believe کی دنیا میں بستا ہے۔ اس گفتگو کے دوران ٹونی کی خوبصورت آنکھوں میں کبھی شرارت لشکتی اور کبھی اس کی آواز پرخلوص گداز سے ڈبڈبا جاتی تھیں۔ سو تحسین یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ آیا ٹونی کا ذہن خوابوں کی دھند میں لپٹا ہوا ہے یا وہ اُسے چونکانے کی کوشش میں ہے۔ بہرصورت اس نے ٹونی کی کم عمری کی رعایت سے خواب کے اس سفر میں اُس کا ساتھ دینا ہی مناسب سمجھا۔

"وہاں ایک عظیم قوس قزح سیارے کے افق پر کمان کی طرح کھنچی رہتی تھی۔ اسی میں میرا کانچ محل تھا، جس میں نور کے نیزوں سے شفاف بلوروں کے ساتھ کھیلتا تھا۔" ٹونی نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں اپنے بزرگ یاد ہیں؟" تحسین نے محظوظ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ زیادہ نہیں۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ ہاں، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے ذہنوں میں صدیوں کی دانائی، ان کے سینوں میں فضائے بسیط کی وسعت اور ان کی آنکھوں میں بے پناہ شفقت تھی۔"

"اچھا۔ پھر کیا ہوا؟ تم یہاں کیسے پہنچے؟" تحسیس نے ٹونی کے تخیل کے ہم رکاب رہتے ہوئے پوچھا۔

"میرا محل کانچ کا تھا۔ اس کی دیواریں ایسے شفاف شیشے کی تھیں کہ باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ میرے بزرگوں نے مجھے بتایا تھا، بہت سمجھایا تھا کہ آئینہ خانے کو ہلکی سی ضرب بھی پاش پاش کر سکتی ہے، مگر میں چھوٹا تھا، بچہ تھا۔ ایک دن کوئی تتلی کہیں سے بھٹکتی ہوئی میرے کانچ محل کی دیواروں سے آٹکرائی۔ اُس کے رنگ برنگے پھول جیسے پروں کو سورج کی روشنی میں تھرکتا دیکھ کر میں اپنی چیزیں جمع کرنے کی طمع پر قابو نہ پا سکا اور میں نے بے قرار ہو کر نور کے نیزے کی انی شیشے کی نازک دیوار پر دے ماری کہ تتلی کے رنگوں کو بوتل میں بند کر سکوں، زوردار چھناکے سے دیوار ٹوٹ کر بکھر گئی اور باہر موجود ہوا چنگھاڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اُس کی شدت سے میرا سنگھاسن الٹ گیا، بلوریں بے بسی سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں، اور ہوا کے ایک وحشی ریلے نے مجھے محل سے باہر کھینچ لیا۔ پھر ہوا کے گرداب سے میرا وجود چکر لگاتا ہوا کھربوں سال کے سفر کو گھڑیوں میں طے کرتا ہوا کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اس شہر کے ایک گھر میں پنگھوڑے میں لیٹا رو رہا تھا۔ ایک غصیلا خونخوار مرد اور کریہ المنظر نیم عریاں عورت میرے پاس کھڑے لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مرد کہہ رہا تھا یہ تمہاری ذمہ داری ہے اور جواب میں عورت پھنکار رہی تھی۔"

ٹونی نے کچھ اس قدر رقت آمیز سنجیدگی سے یہ قصہ سنایا کہ تحسیس کے منہ سے بے اختیار نکلا "آئی ایم سوری۔"

یہ سن کر ٹونی ہنسنے لگا "نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ یہ اتفاق کا کھیل ہے۔" پھر اُس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "کیا تم روزانہ یہاں آتی ہو؟"

"نہیں روزانہ تو نہیں مگر اکثر آتی ہوں —— اچھا، ٹونی! خدا حافظ۔ شام ہونے کو ہے۔ چلنا چاہیئے۔"

"خدا حافظ۔" ٹونی نے تحسیس کے بجائے بہتے پانیوں پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

ویک اینڈ پر تحسیس سنٹرل پارک کے کونے میں واقع نیشنل آرٹ میوزیم جانے کے لیے پارک سے گذر رہی تھی کہ اچانک ٹونی چھلاوے کی طرح درختوں کے ایک جھنڈ سے برآمد ہوا۔ اُس نے ٹراؤزر گھٹنوں تک لمبی جرابوں کے اندر کیے ہوئے تھے اور غالباً سترھویں صدی کے انداز کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سنہری زلفیں گھنگھریالی فرانسیسی وگ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ قدیم یورپین انداز میں جھک کر آداب بجا لایا۔

"اوہو۔ ٹونی تم نے تو مجھے چونکا دیا ہے۔" تحسیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹونی نہیں مادام۔ لوئی۔ لوئی الفانسو آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر ایک مرتبہ جھک کر کورنش بجا لایا "مادام! آج کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں نیشنل آرٹ میوزیم کی جانب جا رہی ہوں۔"

"اچھا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔"

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔" تحسیس نے کہا۔

یہ سن کر ٹونی بڑی ادا سے اس کا بازو تھام کر چلنے لگا۔ تحسیس اس سارے سوانگ سے محظوظ ہو رہی تھی، لیکن اُس نے شائستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ ٹونی سترھویں اٹھارویں صدی کا خوبصورت چھیل چھبیلا دکھائی دے رہا تھا، مگر وہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں امریکہ کے جدید ترین شہر کے مرکزی پارک میں کھڑا تھا جس کے نیچے سے زمین دوز ٹرینیں تیزی سے بھاگتی جا رہی تھیں اور باہر سڑکوں پر سر بفلک سکائی سکریپر حیرت انگیز ٹیکنولوجیکل آسائشوں سے لیس سر اُٹھائے کھڑے تھے۔

ان سب کے درمیان ٹونی کا لباس اور انداز نہایت بے ربط ہونے کے باعث مضحکہ خیز دکھائی دے رہے تھے۔

"ہاں تو ٹونی آج تم لوئی الفانسو ہو۔" تحسین نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج نہیں ہمیشہ سے تھا۔" ٹونی نے کسی قدر چڑچڑاہٹ سے کہا۔ "مادام کو معلوم نہیں میں کون ہوں۔"

"اچھا تو تم بتا دو۔"

اس پر ٹونی نے سر کو نخوت سے اوپر اٹھاتے ہوئے سینہ تان کر کہا۔ "میں برگنڈی کے چودھویں ڈیوک کی سب سے چھوٹی بیٹی کی اولاد میں سے ہوں جس کی شادی سپین کے شہزادے الفانسو سے ہوئی تھی۔ اسی لیے میرا پورا نام لوئی الفانسو ہے۔"

"یعنی تم آدھے فرانسیسی اور آدھے ہسپانوی ہوئے۔" تحسین نے کہا۔ پھر اس نے ٹونی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ ہاں ٹونی فرانسیسی بھی ہو سکتا ہے اور ہسپانوی بھی ——— اور شاید اطالوی بھی۔ یہ سب ممکن تھا کیونکہ اس کے نقوش کسی واضح قومیت کی نشاندہی نہیں کرتے تھے اور نہ اس کا لہجہ کسی خاص علاقے سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا ——— اور کوئی بھی روپ دھا سکتا تھا۔

تحسین نے دیکھا کہ رخصت ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں ٹونی کے ریشم کے لچھوں کی طرح ملائم سنہری بالوں میں جگنو دوڑا رہی تھیں جیسے بہتے پانیوں کی لہروں پر دھوپ مقیش کے جال بُنتی ہے۔ اس کے ذہن میں نجانے کیسے پریزاد کی تعریف آگئی جو اس نے کسی کتاب یا ڈکشنری میں پڑھی تھی ——— "پریزاد ——— پری کا مذکر۔ تخیلاتی مخلوق۔ جو انتہائی حسین اور طرحدار ہوتے ہیں۔ انسان کو کوئی زک نہیں پہنچاتے۔"

پھر تحسین کو خود ہی اپنی سوچ کی مضحکہ خیزی پر ہنسی آگئی۔ وہ ہنسنے لگی۔ ٹونی یہ سمجھا کہ وہ اس کی کہانی پر بے اعتباری کے سبب ہنس رہی ہے، سو اُس نے گرم ہوتے ہوئے کہا "مادام کو اگر میری باتوں پر یقین نہیں تو میرے جد امجد کی تصویر دیکھیں۔ جو اسی میوزیم میں موجود ہے۔"

جب ان دونوں نے میوزیم میں داخلے کا ٹکٹ خرید لیا، ٹونی اُسے ہاتھ سے پکڑ کر میوزیم کے مختلف کمروں سے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اُس مقام پر لے آیا جہاں ہسپانوی شہزادے الفانسو کی تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کے نیچے تحریر تھا:

"لوئی الفانسو ——— سپین کا شہزادہ، چودھویں ڈیوک آف برگنڈی کی سب سے چھوٹی بیٹی کا شوہر۔"

ٹونی تصویر کے ساتھ جُڑ کر اسی انداز میں کھڑا ہو گیا جس میں شہزادے کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دونوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔

اس کے بعد تحسین کی ٹونی سے اکثر مڈبھیڑ ہونے لگی۔ بازار میں، گلی کے نکڑ پر، چوراہا پار کرتے ہوئے، دریا کنارے پارک میں ہر جگہ ٹونی کہیں سے آ دھمکتا۔ پہلے پہل تو وہ اسے سوئے اتفاق سمجھتی رہی، لیکن جوں جوں ان سر راہے ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا، اُسے یہ گمان ہونے لگا کہ یہ آمنا سامنا محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ اُسے یہ شبہ بھی ستانے لگا کہ وہ ہیولا ٹونی ہی تھا جو بھرے بازاروں اور پچھلی تاریک گلیوں میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا جیسے کسی مسافر کے ساتھ ابر آوارہ کا ٹکڑا۔ ہر دن اس کا یہ شک قوی تر ہوتا چلا جا رہا تھا کہ وہ آنکھیں ٹونی ہی کی تھیں، جو اس کے تعاقب میں دن رات، اس کی جستجو میں شب و روز اُس پر مرتکز رہتی تھیں، اُسے تکتی رہتی تھیں، مگر دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

ٹونی نت نئے سوانگ بھرتا اور تحسین کو بھی اس کا دل رکھنے کے لیے اس ناٹک میں شریک ہونا پڑتا۔ تحسین کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سوانگ کا رسیا اور رأس کا لوبھی ہے۔ جب اُس نے ٹونی کو "جاپانی باغ" میں دیکھا تو وہ جاپانی لباس پہنے، بالوں کو سیاہ کیے،

میک اپ سے اپنی کٹوراسی آنکھوں کو ترچھے بادام کی شکل میں ڈھالے، کالے کونٹیکٹ لینز (Contact Lens) آنکھوں میں ڈالے باغ کے فراخ ریتلے صحن میں گنگناتے آبشار کے کنارے سرکنڈوں کے عقب میں اپنے خیال میں گم بیٹھا تھا۔ تحسیس نے جب اُس کا نام لے کر پکارا تو ٹونی نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں اجنبیت کی سرد مہری سے کانچ تھیں۔ اس کے ماتھے پر ہلکی سی تیوری بتا رہی تھی کہ وہ اسے پہچاننے کی ناکام کوشش میں اعصابی تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ ٹونی کی سرد مہری سے پسپا ہو کر وہ معذرت کرتے ہوئے ریتلے صحن کے گرد کھڑے برآمدے کے ایک اور حصے میں جاپانی اور جاپانیوں کی "رسم چائے" (Tea Ceremony) کے حسن سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اچانک کسی نے انتہائی مدھم سروں میں ہوا کی سرسراہٹ کی طرح تحسیس کو پکارا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو ٹونی تھا جو "ہائے" کہنے کے بعد اُس کے پاس خاموشی سے دو زانو بیٹھ گیا۔ "جاپانی باغ" کی مختلف تقریبات کے بعد وہ دونوں باہر نکلے تو ٹونی اس کے ساتھ یوں گھلاوٹ سے باتیں کرنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ اداکاری نہیں تھی بلکہ اُسے سچ مچ یہ یاد نہیں تھا کہ تحسیس آبشار کے قریب سرکنڈوں کے پاس اُس سے ملی تھی۔ اب اس کا شک یقین میں ڈھلتا جا رہا تھا کہ ٹونی باقاعدہ تخیل کی دنیا کا باسی تھا۔ لیکن ابھی اس کے پاؤں حقیقت کی ٹھوس زمین کو چھو رہے تھے، اگرچہ اس کا سر بادلوں میں تھا۔ ابھی وہ تجسیم تمنا اور موجود کے درمیان حد فاصل کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، مگر وہ ہواؤں کی زد میں کسی بوسیدہ دیمک زدہ رسی کے بنے ہوئے پل سے گزر رہا تھا اور اس کے وجود کا ہلکا سا عدم توازن اُسے دریا برد کرنے کو کافی تھا۔

بعض اوقات ٹونی کے بارے میں تحسیس کے شکوک و شبہات تشویش میں بدل جاتے تھے، کیونکہ کبھی کبھی اس کی شیرینی اور سبھاؤ کے بطن سے ایک سیاہ ہمزاد یوں پھوٹتا جیسے روشنی کے خاص زاویے کے سبب کسی جسم سے اس کا سایہ وجود میں آتا ہے۔ ان تاریک لمحوں میں وہ اچانک بغیر کسی معقول وجہ کے ہیجانی ابال کا مظاہرہ کرتا۔ بے وجہ الجھتا، اور بے کار باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس کیفیت میں اُسے لوگوں اور حتیٰ کہ بے جان اشیاء پر بھی شدید غصہ آتا۔ ایک مرتبہ تحسیس پبلک لانڈری میں گئی تو ٹونی بھی کپڑوں کی دھلائی کی غرض سے وہاں موجود تھا۔ ٹونی نے واشنگ مشین میں سکہ ڈالا لیکن مشین چالو نہ ہوئی۔ کچھ دیر اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش کے بعد ٹونی کو شدید غصہ آ گیا، منہ لال بھبھوکا ہو گیا، آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ مشین کو برا بھلا کہنے کے بعد اُسے ٹھڈے مارنے لگا۔ تحسیس نے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی مگر ٹونی آپے سے باہر تھا۔ آخر لانڈری کے منیجر نے اُسے باہر نکال دیا۔

برانکس کے واقعے نے تحسیس کی تشویش کو خوف کا رنگ دے دیا۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ٹونی اُسے گلی کے نکڑ پر ملا اور اصرار کرنے لگا کہ وہ اُس کے ساتھ برانکس جائے۔ جب تحسیس نے اُسے اپنے دوستوں کے ساتھ چھٹی منانے اور سیر و تفریح کے لیے کہا تو ٹونی نے منہ پھلا لیا اور اپنے دوستوں کو غیر دلچسپ قرار دیتے ہوئے پھر کہا کہ وہ اُس کے ساتھ اتوار کا دن گزارے۔ آخر تحسیس کا دل پسیج گیا اور وہ اس کے ساتھ برانکس جانے کے لیے رضامند ہو گئی۔

وہ دونوں جب برانکس پہنچے تو سورج ڈوبنے کو تھا۔ سب وے کے سٹیشن سے نکلتے ہی سامنے نشیب میں ایک شہر تھا، اُجڑا ہوا ویران جس کے بام و در آتش رفتہ کی گواہی میں سیاہ پنجر تھے۔ یہ راکھ کا ڈھیر، کوئلہ کی جیومیٹری، سرمایے کی میکانکس کا گلا سڑا کچل برانکس تھا جل کر بھسم ہوئی سربفلک عمارتوں کے خاکستر در و دیوار اپنی اندھی آنکھوں سے انھیں تک رہے تھے۔ ان کی ہیبت ناک ویرانی دیدۂ عبرت تھی۔ تحسیس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ "یہ کیا ہے؟" اُس نے لرزتے ہوئے ٹونی سے پوچھا۔

"یہ برانکس ہے،" ٹونی نے نشیب میں شہر کی تباہ حال شاہراہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مگر اسے کیا ہوا؟" تحسیس نے پھر پوچھا۔

"یہ جل گیا تھا۔" تھوڑے سے توقف سے ٹونی نے کہا "بعض کہتے ہیں جلا دیا گیا تھا۔"

"لیکن آخر کیوں؟" تحسیں نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

"روایت ہے کہ عمارتیں بوسیدہ تھیں۔ مالکان ان کی انشورنس کا پیسہ حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خود آگ لگوائی اور ظاہر یوں کیا کہ یہ حادثہ تھا۔"

"اور ان مکانوں میں رہنے والوں کا کیا بنا؟" تحسیں نے خوف سے لرزہ براندام پوچھا۔

"ظاہر ہے بہت سے جل مرے، بہت سے معذور، اپاہج اور اندھے ہو گئے، کیونکہ مالکان نے آتش زنی کو حادثہ ظاہر کرنا تھا سو پیشگی اطلاع تو نہیں دینی تھی۔"

ٹونی کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا جیسے سیاہ بادل کا پردہ سرک آیا ہو۔ "کیا تمہیں زندہ گوشت کے جلنے کی بُو نہیں آ رہی؟" ٹونی نے دور خلا میں کسی نقطے کو گھورتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر دہشت سے تحسیں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ٹونی اور تحسیں اِدھر اُدھر سیاہ ملبے میں گھومنے لگے۔ کہیں کہیں موسموں کی دست بُرد سے محفوظ بعض عمارتوں کے بچے کھچے حصے اپنا نحیف و نزار وجود تھامے سیدھا کھڑا رہنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک عمارت میں ٹونی اندر چلا گیا۔ تحسیں بادلِ نخواستہ اس کے پیچھے گئی کہ وہ ان سیاہ کھنڈروں کی غمناکی میں تنہائی کی متحمل نہ تھی۔ یہ غالباً کسی عمارت کا بقیہ حصہ تھا جو دو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ جالوں سے اٹا ہوا، غبار آلود ۔۔۔ مدت سے انسانی قدموں کی آہٹ سے نا آشنا تھا۔ جب تحسیں اور ٹونی اندر داخل ہوئے تو جالوں میں لٹکتی مکڑیوں نے انھیں ٹھٹھک کر دیکھا۔ ٹونی نے وہاں پڑی لکڑی کی ایک چھٹی سے راستے میں آنے والے جالوں کو ہٹانا شروع کیا۔ تحسیں کا دم گھٹنے لگا۔

"چلو ٹونی واپس چلو۔ بھلا یہ بھی کوئی جگہ ہے چھٹی منانے کی۔"

ٹونی اس کی بات اَن سنی کر کے ویران کمروں کی سیاہ و بوسیدگی میں گھومتا رہا۔ باہر کیمیاوی کثافت سے آلودہ آسمان پر مٹیالا چاند نکل آیا تھا۔ کمروں کی دیواروں میں موجود دراڑوں اور تارِ عنکبوت کے جال سے بلگجی مٹیالی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی، اور اس مدقوق روشنی میں وہ اور ٹونی کھڑے تھے۔ دو سایے اپنے زمانوں کے اسرار میں گم، گرفتار۔ وہ قرونِ وسطیٰ اور ٹونی قرونِ جدید۔ وہ ماضی اور ٹونی مستقبل۔ وہ اپنے مکان میں بازگشت کی طرح محصور و محفوظ اور ٹونی مکان کی کشش کے حصار کو توڑ کے نکلا ہوا اسپِ مست۔ اس کے پاؤں ٹھوس خشک زمین میں گڑے تھے، اور ٹونی فضائے بسیط میں پرِ کاہ کی طرح اُڑ رہا تھا۔ مگر وقت کے اس لمحے "اب" جو ماضی اور مستقبل کے درمیان کچے دھاگے کا پل تھا کہ گھڑی بھر میں نیست و نابود ہو جائے گا ـــــ اس شام کے نیلے کنارے دونوں وقت پل بھر کو ایک دوسرے سے مربوط تھے۔

ٹونی دیوار میں ایک کھڑکی کے شگاف میں بیٹھ گیا اور باہر آسمان کو دیکھنے لگا۔ "آج شاید بارش ہونے کو ہے۔" اس نے گہری اداسی سے کہا۔

"وہ کیسے؟" تحسیں نے پوچھا۔

"آج بارش ہونے کو ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہے، چھلکنے کو ہے۔" ٹونی اپنے آپ سے کہہ رہا تھا اور اس جملے کو دوہراتا جا رہا تھا جیسے کوئی نظم کہہ رہا ہو۔

تحسین کھڑکی کی دہلیز میں ٹونی کے پاس آ بیٹھی۔ دھندلکے کے باوجود اُسے ٹونی کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے رہے تھے، وہ اپنے آبی مقبروں سے باہر نکلنے کو تھے۔

میں ہڈسن کے کناروں کا پروردہ، گمشدہ، بھٹکا ہوا۔ صلیب بھی ہوں اور مصلوب بھی" پھر اس کی آواز رندھ گئی "میرے حسین بدن میں جہنمی سورج کا لمس ہو رہا ہے" ـــــ آنسو اس کی آنکھوں سے آبشار کی طرح بہنے لگے۔

تحسین کے دل کو ترس نے چھید ڈالا "ٹونی، آئی ایم سوری، سو سوری" تحسین نے کہا۔

ٹونی نے اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اُسے ٹونی ننھا سا معصوم بچہ معلوم ہوا، گمشدہ، بھٹکا ہوا جسے اپنے گھر کے راستے کا علم نہ ہو وہ دھیرے دھیرے ٹونی کو تھپکی دینے لگی جیسے بچے کو لوری سنائی جاتی ہے تحسین نے پا لیا تھا کہ ٹونی کے باطن سے گہرائیوں کی سیاہ نہ ختم ہونے والی رات لپٹی ہے۔

تھوڑی دیر میں تحسین کو احساس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ رندھی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا، مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے سو اُس نے جھک کے اپنا چہرہ ٹونی کے قریب کرتے ہوئے پوچھا "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں تمہارے لیے کچھ محسوس کرتا ہوں" ٹونی نے دھیرے سے کہا۔

تحسین کا تھپکی دینے والا ہاتھ ہوا میں رُک گیا اور تشویش کی رو سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کپکپانے لگی۔ اُس کے پورے بدن میں کھچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ ٹونی نے اس کے وجود کے گریز کو بھانپ لیا۔ اُس نے آنسوؤں سے دھلا چہرہ اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ تحسین کو عجیب خفت آمیز بے چینی سی محسوس ہوئی۔ بچوں میں ایک جبلی وروں بینی ہوتی ہے جو حیات کے تجربے کی دین نہیں ہوتی۔ اس فطری نفس شناسی کے سامنے تحسین نے اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ پایا کہ وہ ٹونی کی چھیدتی ہوئی نگاہوں کے سامنے آئینے کی طرح شفاف تھی۔ اپنے دفاع میں وہ یکدم کھڑکی کی دہلیز سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اور کہنے لگی "ٹونی۔ اب واپس چلنا چاہیے بہت دیر ہو چکی ہے۔"

برانکس والے واقعے کے بعد تحسین ٹونی سے سراسیمہ رہنے لگی۔ ایک عجیب نامعقول اندیشہ نے اُسے گھیر لیا تھا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ چوکنا رہتی اور جونہی اُسے ٹونی کسی گلی کے موڑ پر چوراہے میں یا کسی دوکان میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیتا وہ کترا کر نکل جاتی۔ اگر بچ نہ سکتی اور آمنا سامنا ہو جاتا تو مجبوراً علیک سلیک کر لیتی لیکن زیادہ باتوں سے گریز کرتی۔ شاید ٹونی نے اس کھچاؤ کو بھانپ لیا تھا لیکن اس کا اظہار اس کے چہرے کے سپاٹ تاثر سے نہ ہوتا تھا، کیونکہ اظہار کے کمزور لمحے کے بعد وہ گھونگے کی طرح اپنے خول میں واپس چلا گیا تھا۔ اُس کا چہرہ لکڑی کی طرح بے جذبات ہوتا تھا اور آنکھیں کہیں بہت دور مرکوز رہتی تھیں۔

کئی دن بعد کی بات ہے کہ تحسین رات گئے فارغ ہوئی تو اس میں سب وے کے سٹیشن تک جانے کی سکت نہیں تھی، کیونکہ وہ کافی فاصلے پر تھا۔ سو اُس نے بس سے سفر کرنا مناسب سمجھا جس کا سٹاپ چند قدم دور تھا۔ بس لیتے وقت اسے یہ یاد نہ رہا کہ وہ اُسے سب وے کی طرح مرکزی بلیوارڈ کے بارونق حصے میں اتارنے کے بجائے دریا کنارے اتارے گی جو رات کے اس پہر ویران ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنے سٹاپ پر بس سے اُتری تو دریا کنارے کی سبز پٹی میں گھنے درختوں کے لرزتے سایوں کو دیکھ کر اُس کے دل میں کئی خدشات نے سر اُٹھایا۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اعصاب کو مجتمع کر کے حوصلے سے اس سنسان علاقے سے گذر جائے۔ اللہ اللہ کر کے جب وہ قد آور درختوں کے جھنڈ سے گذر کر پکی سڑک پر پہنچی تو اس کی اعصاب زدگی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ چاند جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ چاندنی میں سڑک کے کنارے کھڑے سلیٹی پتھروں سے تعمیر شدہ مکان قرون وسطیٰ کی یاد دلا رہے۔ اُن کے آہنی صدر دروازے بے چراغ، خاموش مضبوطی سے بند تھے۔ ہو کا عالم تھا اور وہ تن تنہا

سڑک پر چل رہی تھی۔

اس آسیب زدہ ماحول کا قدرتی نتیجہ خوف تھا۔ تحسیس کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے قدموں کی چاپ سنی ہو، جیسے سنگین فٹ پاتھ پر کوئی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔

"کیا یہ میرے اپنے قدموں کی آواز ہے؟ ــــ شاید۔" اُس نے اپنی ہیجانی کیفیت کے باوجود معقولیت سے سوچنے کی کوشش کی۔ "ہاں، ہاں، ایسا ہی ہے۔"

پھر بھی تحسیس کی تسلی نہ ہوئی۔ شک اُس کے ذہن میں سرسرا رہا تھا، سو اُس نے انتہائی تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے ہیولا سا ایک مکان کے صدر دروازے کی محراب میں غائب ہوتا دکھائی دیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ کوئی راہگیر ہوگا جسے اُس گھر میں جانا تھا اور اتفاقاً وہ یہاں تک اس کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا۔ وہ قدرے مطمئن ہو کر چلنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اُسے پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ٹونی باقاعدہ تعارف اور ملاقات سے پہلے خاموش سایے کی طرح اس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔

"ہاں یہ ٹونی ہی ہے کیونکہ آج کل وہ دونوں پھر تقریباً اجنبی بن چکے ہیں لہٰذا ٹونی نے قربت کا یہ بالواسطہ انداز پھر سے اختیار کر لیا ہے۔"

لیکن اس سوچ سے اطمینان اور تحفظ کے احساس کے بجائے تحسیس کے وجود میں تشویش کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ٹونی روحانی طور پر ایک بہروپیا تھا۔ اُسے اپنے چہرے پر مختلف "پرسونا" (Persona) چڑھانے کی عادت تھی۔ بعض دفعہ اُس کے تخیل اور حقیقت یوں گڈمڈ ہو جاتے تھے کہ وہ جو ماسک پہن لیتا اُس کے قول و فعل عین اُس کے مطابق ڈھل جاتے تھے۔

"اس لمحے جانے وہ کس بہروپ میں ہے اور جانے وہ کس حد تک اس بہروپ کی روح اُس کے اندر حلول کر چکی ہے۔" تحسیس نے سوچا اس خیال سے اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور وہ انتہائی تیزی سے چلنے لگی۔ اُس کے پیچھے چلنے والے کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی اختیار کر گئی۔ اُس کے لمبے تڑنگے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُن کی لپک نے اُس پر دہشت سی طاری کر دی اور وہ اپنے پٹھوں کی ساری توانائی اکٹھا کر کے سرپٹ دوڑنے لگی۔

اب وہ اپنے محلے کے موڑ پر آ پہنچی تھی۔ اُس نے موڑ کاٹا اور اپنے محلے میں داخل ہو گئی۔ جس عمارت میں اس کا اپارٹمنٹ تھا اُس کی نیم تاریک ڈیوڑھی میں کوئی سر پر ٹوپی پہنے مفلر سے منہ لپیٹے کھڑا تھا اس لیے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس ہنگامی صورت حال کی سراسیمگی میں وہ اُسے مدد کے لیے پکارنے پر مجبور تھی۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا "ہیلپ، ہیلپ۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے!"

ڈیوڑھی میں کھڑا مفلر سے منہ لپیٹے شخص بجلی کی سی سرعت سے تحسیس کے پاس سے گزر کر سڑک پر جا پہنچا اور اُس کا تعاقب کرنے والے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس ہاتھا پائی میں اُس کا پیچھا کرنے والے کی ہڈ (Hood) سر سے ڈھلک گئی تھی۔ وہ ایک لمبا تڑنگا حبشی تھا۔ دوسرا شخص جو تحسیس کی مدد کو ڈیوڑھی سے نکلا تھا اس کی ٹوپی اور مفلر بھی زمین پر گر چکے تھے اور اُس کی لمبی سنہری زلفیں کھمبے کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔

"اُف میرے خدا! ٹونی تو یہ ہے۔ وہ کوئی اور شخص ہے جو میرا پیچھا کر رہا تھا، اور میں نے کتنا غلط سمجھا تھا۔" تاسف اور شرمندگی سے اُسے ٹھنڈا پسینا آ گیا۔

ٹونی اور حبشی ابھی تک لڑ رہے تھے۔ اتنے میں لمبے تڑنگے حبشی نے نیویارک کے بدمعاشوں کا روایتی چاقو اپنی بینٹ سے نکال لیا۔ ٹونی اپنی نوخیز قوت سے اس کا چاقو والا ہاتھ روکنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بدمعاش نہ ہونے کے باعث بہت جلد اس کے ہتھکنڈوں کے سامنے بے بس ہو جائے گا۔ اُس نے چیخ کر تحسیس کو پولیس بلانے کے لیے کہا۔ تحسیس کا سُن ذہن متحرک ہوا۔ اُسے یاد آیا کہ مرکزی بلیوارڈ پر پیزا شاپ کے سامنے عموماً پولیس کی گاڑی کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پوری قوت سے بھاگی اور پیزا شاپ پر پہنچ گئی جو زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں اُس وقت بھی پولیس کی گاڑی موجود تھی اور دو پولیس افسر گاڑی سے اتر کر فٹ پاتھ پر کھڑے پیزا کھا رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑنے کی وجہ سے ہانپ رہی تھی اور دہشت کے سبب اعصاب زدہ بھی، سو اُس نے بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں پولیس افسروں سے سارا ماجرا بیان کیا۔ اُن میں سے ایک فوراً گاڑی میں بیٹھ گیا اور ساتھی کو ہدایت کی کہ وہ خاتون کے ساتھ پیدل جائے واردات پر پہنچے، کیونکہ "ون وے" کے ضابطے کی وجہ سے اُسے گاڑی کے ذریعے وہاں پہنچنے میں کچھ دیر لگے گی۔

تحسیس پولیس افسر کو ساتھ لے کر بھاگتے ہوئے واپس آئی۔ ابھی وہ دونوں چند گز دور تھے کہ حبشی بدمعاش کا لمبا تیز دھار والا چاقو بجلی کی طرح لہرایا اور ——— پھر ——— اور پھر ٹونی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

حبشی نے جب دیکھا کہ تحسیس اور پولیس افسر اُس کی طرف آ رہے ہیں تو وہ برق رفتاری سے قریب گلی میں جا گھسا۔ پولیس افسر اُس کا پیچھا کرتے ہوئے گلیوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو گیا۔ تحسیس بھاگتے ہوئے ٹونی کے قریب آ گئی تھی۔ پولیس کار بھی سائرن بجاتے ہوئے وقوعہ پر آ پہنچی تھی۔ پولیس افسر نے اُسے اس طرح پارک کیا کہ اُس کی ہیڈ لائٹس عین ٹونی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں ——— اور ٹونی ان کی روشنی میں اپنی بکھری سنہری زلفوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اُس کی سبز آنکھیں کھلی تھیں اور آسمان کو تک رہی تھیں۔ اُس کے فراخ سینے میں حبشی کا چاقو کھبا ہوا تھا۔

"او میرے خدا! یہ کیا ہوا؟ ٹونی! ٹونی!" تحسیس ٹونی کے پاس دوزانو بیٹھی ایک جنونی کیفیت میں پکار رہی تھی۔

پولیس افسر کار سے اتر کر ٹونی کے جسم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُس نے سینے کے ساتھ کان لگا کر دھڑکن کی آواز سننے کی ناکام کوشش کی، اور پھر کار میں لگی وائرلیس پر قریبی ہسپتال کو ایمبولینس بھیجنے کو کہا۔

ٹونی کا دھڑکتا جسم سرد پڑتا جا رہا تھا۔ تحسیس کا ذہن واقعے کی ہیبت سے سن تھا۔ اس کی سوچ شل اور اعصاب شکستگی کے نقطے پر تھے۔ وہ صدیوں پر حاوی مکمل کرب کے اُس لمحے سے گذر رہی تھی جب وجود بکھرنے لگتا ہے۔ وہ بے مقصد تکرار کیے جا رہی تھی: "ٹونی، ٹونی، ٹونی۔"

"خاتون کیا تم اسے جانتی ہو؟" پولیس افسر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ...... نہیں!" اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پولیس افسر کو دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا جیسے اُسے اُس کی بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

"ہاں یا نہیں؟" پولیس افسر نے جرح کے انداز میں اپنا سوال دوہرایا۔

"ہاں ——— شاید" ذرا توقف سے تحسیس نے اپنی پیشانی پر اعصاب زدگی کی کیفیت میں ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن تک چلنا ہوگا اپنا بیان قلمبند کروانے۔"

"اچھا!" تحسیس نے بے جذبات لہجے میں کہا۔

ہسپتال کی ایمبولینس ٹونی کے سرد ہوتے ہوئے جسم کو لے کر چلی گئی تھی، اور وہ پولیس کار میں بیٹھی پولیس سٹیشن جاتے ہوئے پولیس افسر کے سوال کے بارے میں سوچ رہی تھی "کیا وہ ٹونی کو جانتی ہے ؟" ـــــ شاید ـــــ غالباً نہیں۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹونی کا نام واقعی ٹونی بردا تھا یا بونی الفانسو یا کچھ اور۔ وہ امریکن تھا یا غیر ملکی ؟ اس کے ماں باپ زندہ ہیں یا نہیں ؟ وہ ان کے ساتھ رہتا تھا یا اکیلا ؟ ـــــ کیا ٹونی کو اس سے محبت تھی یا وہ محض اداکاری کر رہا تھا، اپنے بہروپ کی تشفی کے لیے، حال کے ٹھوس حقائق، موجود کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے لیے، یہ بھی ممکن ہے کہ ٹونی کو اُس سے محبت ہو، مگر اُس کی نوعیت اُس کے شعور میں واضح نہ ہو۔ شاید وہ اس میں اپنی ماں کا کھویا چہرہ، اُس کے دھندلائے نقوش ڈھونڈتا ہو لیکن کیا کسی انسان کی انسانیت، کسی شخص کی شخصیت اور کسی فرد کی انفرادیت کو جدید نفسیات کی اصطلاحوں میں، ان کے لیبل لگا کر دفن کر دینا زیب دیتا ہے ـــــ ہاں اس کا بھی امکان ہے کہ ٹونی نے اپنے معاشرے کے مہیب سرد مہر سناٹے میں اُسے تنکے کا سہارا جانا ہو ـــــ اس کا معاشرہ جہاں لوگ، اکائیوں کی طرح بٹے ہوئے اور جزیروں کی صورت کٹے ہوئے ہیں، جہاں افراد لذتیت کی "پیراڈاکس" (Paradox) ، تشکر رطوں کا رس نچوڑنے کی دوڑ میں تلخی کی تلچھٹ کھنگالنے میں مصروف ہیں کہ کسی کے پاس کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ شاید وہ اسے پکار رہا تھا اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹنے کی تمنا میں کہ ہمیں اپنی ذات کا اثبات بھی دوسروں ہی کے حوالے سے ہوتا ہے ـــــ شاید۔

پھر اُس کے ذہن میں پولیس افسر کا سوال دوبارہ ابھرا۔ "کیا تم ٹونی کو جانتی ہو ؟"

وہ زیرِ لب بڑبڑائی "نہیں وہ ٹونی کو نہیں جانتی اس شہر میں ہجوم کی شدت اور جسموں کی قربت کے باوجود کوئی کسی کو نہیں جانتا۔"

دو شاخیں لچکتی ہوئی

مصطفیٰ کریم

جیسا دونوں نے طے کیا تھا، روشن آرا نے وہی کیا۔ بجائے اپنی کار کے وہ ٹرین سے یارک آئی۔ پلیٹ فارم پر نیلو اس کی منتظر تھی۔ دونوں فون پر اکثر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی تھیں اور اس طرح 'ملاقاتیں' ہو جاتی تھیں، پھر بھی وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں لیکن یہ خوشی زیادہ دیر نہیں رہی۔ جلد دونوں چپ ہو گئیں۔ بجھ سی گئیں اور اسکاربرو جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگیں جہاں جانا انھیں ناپسند تھا۔ سوموار سے جمعہ تک بے پناہ مصروفیتوں کے بعد سنیچر اور اتوار، بس دو دن کی فرصت ہوتی ہے۔ ان میں اپنی راحتوں اور پریشانیوں کو سمجھنا، زندہ رہنے کے لئے جو ضرورتیں ہوتی ہیں انھیں پورا کرنا —— اس لئے ویک اینڈ پر سفر کرنے میں انھیں مسرت کس طرح ہوتی!

لیکن اسکاربرو میں روشن اور نیلو کے والدین، اپنے مشترک دوست ڈاکٹر لطف الرحمٰن کے یہاں ایک دعوت میں جمع تھے۔ اسکاربرو سے لیڈز اور یارک کچھ اس قدر دور نہیں بمشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر۔ اسی لئے روشن اور نیلو کو ان کے والدین نے بلایا تھا۔

روشن اور نیلو رشتہ مند نہیں تھیں۔ دونوں سابق مشرقی پاکستان کی المناک تاریخ کی بکھری ہوئی لہریں جو انگلستان آکر جذب ہوئیں اور نئی ست رنگی موجیں بن کر ابھر آئیں۔ دونوں درمیانہ قد، سانولی رنگت، دونوں بچپن سے آشنا، مانچسٹر میں ایک ہی اسکول کی پڑھی ہوئی لیڈز یونیورسٹی کی گریجویٹس —— روشن وکیل بنی اور نیلو ڈاکٹر۔ دونوں نے جو راہ چنی اس میں کامیاب ہوئیں۔ دونوں پُر امنگ، خود اعتمادی سے بھرپور ایک دوسرے کو حوصلہ دیتی ہوئی، زندگی کے راستے پر گامزن تھیں۔ یہی تھا ان کا رشتہ۔ یہی تھی ان کی قربت کی وجہ۔ لیکن زندگی یکساں تو نہیں ہوتی۔ کبھی دھوپ سے گرم۔ کبھی آج کی ٹھنڈی بارش سے خنک صبح کی طرح سرد بے جان سی۔

یارک اسٹیشن ویران تھا۔ جنوری کے پہلے ہفتہ میں ٹرین کی آمد و رفت کم ہو جاتی ہے۔ دور پلیٹ فارم پر کیفے کی زرد روشنی میں ریلوے کے ملازم چائے پی رہے تھے اور اسٹیشن کی آہنی چھت موسلا دھار بارش سے گونج رہی تھی۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ دونوں دوست کانپ گئیں۔ نیلو نے گردن کے گرد مفلر کو اچھی طرح لپیٹا۔ یہ وہی مفلر تھا —— سرخ، اسکوٹش ہائی لینڈز کا بُنا ہوا —— جسے روشن نے نئے سال کے موقع پر تحفتاً اُسے بھیجا تھا۔

دونوں کب تک چپ رہتیں۔ باتیں تو کرنی تھیں۔ کچھ راز کی، کچھ یونہی فضول کی۔ وہ سب کچھ جو وہ فون پر نہیں کہہ سکی تھیں۔ انسان فون پر دل کھول کر گفتگو کرے تو کیسے؟ جس سے مخاطب ہے اس کا چہرہ جو نظر نہیں آتا۔ بات چیت سے ان کے چہرہ پر جو خوشی، غم، ہمدردی نمایاں ہوتی ہے وہ دکھائی نہیں دیتی اس لئے گفتگو کی فرحت نامکمل رہ جاتی ہے۔

ایسی ہی جنوری کی صبح تھی۔ بارش سے نم۔ لیکن شہر لندن تھا اور اُس شہر کا اسٹیشن کنگس کراس، روشن اچانک بولی اور مسکرا دی۔ ایک اداس مسکراہٹ۔" اب ۱۹۹۰ ہے۔ وہ صبح ۱۹۷۲ کی تھی۔ کنگس کراس اسٹیشن پر ہم دونوں کے والدین پریشان اور مفلس کھڑے تھے۔ ان کے پاس

ڈگریاں تھیں لیکن ملازمت نہیں لیکن ہم دونوں خوش تھے۔ بچپنا جو تھا۔۔۔ سب کچھ رخصت ہو گیا۔ بچپن۔ اس کی معصومیت ..... سبھی ...... اس قدر جلد ــــ"، نیلو ہنس دی۔ ایک کرکتی ہنسی۔ پھر دونوں چپ ہو گئیں، چند لمحوں کے لئے ــــ "اس وقت اسکاربرو میں ہمارے والدین گرماگرم باتیں کر رہے ہوں گے.... آتشدان کی گرمی سے گرم ہو رہے ہوں گے ..... اور ہم!" روشن سردی سے کپکپائی۔

"باتیں؟..... مرسڈیز اور بی۔ ایم۔ ڈبلیو موٹروں کی خرید کی بابت۔ بڑے گھر میں منتقل ہونے کی اطلاعیں۔ اپنی بونگس کی دو دکانوں میں دولت کی ریل پیل سے مائیں سرشار..... دلچسپ باتیں..... دلچسپ والدین!" نیلو کے سانولے چہرے پر طنزیہ شکن تھی۔ سر کے بکھرے بالوں کو اس نے ہاتھ سے ہموار کیا۔ کلائی میں بندھی اس کی طلائی گھڑی مدھم صبح میں چمک اٹھی۔

روشن نے اپنی دوست کی جانب دیکھا۔ اثبات میں سر ہلایا اور بولی "وہ کیوں متفکر ہوں ..... یہ دنیا اب ہماری ہے جو تہس نہس ہو رہی ہے۔ پچاس سال بعد بنگلہ دیش، اور دنیا کے حسین شہروں کے سلسلے کا درخشاں گوہر ــــ وینس، زیر آب ہو گا..... کتنا بڑا المیہ!"

"اور ہم بے بس ہیں!"

"بے بس!" روشن نے سرگوشی میں اپنی دوست کا لفظ دہرایا۔ روشن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بے اختیار اُس کے بھورے کوٹ کے نیچے پیٹ پر چلا گیا جہاں اُٹھتی گرتی لہروں پر سے کوئی پکار رہا تھا "ممی..... ممی"، روشن نے سہم کر سر جھکا لیا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ نیلو کا ہاتھ پکڑ لے۔ سہارے کے لیے۔ لیکن اس نے ضبط کر لیا۔

دوست پر جو گذر رہی تھی اس سے نیلو بے خبر تھی۔ اُس کی نگاہ اُس بھیگے ہوئے سفید تختے پر بھٹک رہی تھی جس پر سیاہ حرفوں سے پارک لکھا ہوا تھا۔ وہ روشن کی جانب بغیر دیکھے بولی "لیکن سب سے بڑا المیہ.....! آئندہ پچاس سال کے اندر وسط افریقہ کی ساری آبادی ایڈس (Aids) کی بیماری سے مر چکی ہو گی.... نہیں..... صرف افریقہ نہیں بلکہ....."

نیلو اپنے دل کی دھن سے جملہ مکمل نہیں کر سکی۔ اُسے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ نگاہوں کے سامنے اس کا دوست، اس کا محبوب ولسن آ گیا جو ایڈس (Aids) کا مریض تھا۔ آئے دن نت نئے جراثیم سے بیمار۔ لاغر جسم کفن کی طرح سفید۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اور وہ بے بسی سے اس سے کہہ رہا تھا ــــ "میں نے ہر احتیاط کی ہے نیلو تمہیں یہ مرض نہیں ہو گا.... تم میری فکر نہ کرو۔"

کیسے نہ کروں فکر۔ تمہاری نہیں تو کس کی کروں؟" جو جواب ولسن کو گذشتہ ہفتہ نیلو نہ دے سکی تھی وہ اس وقت اُس کی زبان پر آ گیا ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نیلو نے اپنے سیاہ اوور کوٹ کی آستین سے آنسو جذب کر لئے۔

"ڈاکٹر ولسن کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" روشن کو نیلو نے مختصر جواب دیا۔ وہ سامنے سگنل کو دیکھ رہی تھی جس پر سرخ روشنی تھی۔

روشن سوچنے لگی "کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔ زخموں کو کریدنے میں۔ جو انسان دُکھ بانٹنا نہ چاہے اس کی خاموشی محترم ہے۔"

"کاش والدین کی نافرمانی ممکن ہوتی۔ اس وقت بجائے سردی میں ٹھٹھرنے کے، ہم ڈاکٹرز میس میں بیٹھے گرم کافی پی رہے ہوتے۔" نیلو بولی اور ساتھ ہی اپنے ٹھنڈے چہرے کو مفلر میں چھپانے کی کوشش کی۔

"تم نے منع کر دیا اس لئے میں اپنی موٹر نہیں لائی ورنہ اب تک اسکاربرو جانے کا نصف راستہ گرم کار میں طے کر چکے ہوتے۔" روشن نے جواب دیا اور اپنے پیروں کو باری باری جھٹکا تاکہ یخ بستہ پاؤں گرم خون کی تیز گردش سے گرم ہو جائیں۔

"ہم آج رات واپس آ رہے ہیں۔ اس وقت وادیوں میں کہر منڈلاتی رہتی ہے جو اسکاربرو کے راستے پر بھاگتی موٹروں کو اچانک گھیر لیتی ہے۔ پھر کچھ نظر نہیں آتا۔ کئی حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ مفت میں جان دینے سے کیا حاصل؟ زندگی بس ایک ہی بار ملتی ہے اس کا

تحفظ لازمی ہے!"

نیلو کا کہنا درست تھا۔ روشن سوچنے لگ گئی۔ "زندگی! اس کا تحفظ!" کاش میں فون پر والدین کو بتا دیتی کہ میں اسکاربرو نہیں آ سکتی، اور اس وقت میں بریڈفورڈ جاتی۔ وہاں بک سنٹر میں وقت گزارتی جہاں وسیم مجھ سے پہلی بار ملا تھا۔ وہاں شاید وسیم کا کوئی دوست مل جاتا جو اس کا پتہ مجھے بتا دیتا۔ پھر میں وسیم کو خط لکھتی۔ اسے بتاتی مجھ پر کیا گزر رہی ہے!

سر جھکائے اور پریشان روشن سوچتی رہی۔ اسکاربرو جانے والی ٹرین آ گئی۔ تین ڈبے تھے اور مشکل سے دس بارہ مسافر۔ سردیوں میں اسکاربرو کون جاتا ہے۔ وہاں سنسان پرومینیڈ پر بجائے ٹورسٹ کی بھیڑ کے چند ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی متلاطم سمندر پر کوئی رسی گل اپنے سفید سرمئی پنکھ پھیلائے، اڑتی دکھائی دیتی ہے۔ بس یہی ہوتی ہے اس خوبصورت شہر کے میرین ڈرائیو کی رونق۔

نیلو اور روشن، دیگر مسافروں سے دور، ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئیں اور اپنا سفری تھیلا پاس رکھ لیا۔ ٹرین جلد روانہ ہو گئی۔ دونوں چپ، فکرمند، خود میں گم تھیں۔ کچھ دیر بعد روشن نے اپنے بیگ سے ایک رسالہ اور ایکشن ایڈ (Action Aid) کے چند کاغذات نکالے۔ روشن ان پر وہ رقم بھرنے لگی جنھیں وہ ہر مہینے، دنیا کے بعض غیر ممالک کے غریب بچوں کی تعلیم کے لیے روانہ کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو سبک سبز رنگ کا قلم تھا، اسے دیکھ کر نیلو کے چہرے پر ہلکی سی شفیق مسکراہٹ آ گئی۔ یہ قلم وہی شیفرز فاؤنٹین پن تھا جسے دو سال پہلے نیلو نے روشن کو وکالت کے امتحان میں کامیابی پر تحفتہً دیا تھا۔ نیلو کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بارش رک گئی تھی۔ حد نگاہ تک چراگاہیں تھیں۔ سبز اور سردی سے مرجھائی، گھانس سے بھری، اور سیاہ درخت تھے۔ اپنی بے برگ، خمیدہ شاخیں ہوا میں پھیلائے۔

اچانک روشن کو ابکائی آئی۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔ رسالہ، کاغذات اور قلم اس نے جلدی سے بیگ میں رکھ دیا لیکن روشن متلی کو روک نہیں سکی۔ وہ بھاگی ہوئی ٹائلٹ میں گئی اور آہنی بیسن پر جھک گئی۔ بہ مشکل منہ سے تھوڑی سی کڑوی سیال شے نکلی لیکن روشن کو سر کی نسیں پھٹتی محسوس ہوئیں اور پیٹ کے اندر جل تھل ہونے لگا۔ اور وہاں کوئی بے قراری سے پکارا ـــــ ممی...... ممی...... بے اختیار روشن کا ہاتھ پیٹ پر چلا گیا۔ بے بسی ہو کر اس نے اپنا سر ٹائلٹ کی دیوار سے ٹکا دیا۔ "زندگی...... ظالم زندگی ....." ایک خاموش پُر اذیت فریاد اس کی زبان پر آ گئی۔ ٹرین کے پہیوں کی تیز رفتاری سے روشن کے پیر کے نیچے ٹائلٹ کا آہنی فرش ہل رہا تھا اور ساتھ ہی اس کا جسم بھی۔ "روشن ہمت...... اس مقدمہ میں تجھے نہیں ہارنا ہے......" اس نے اپنی ہمت بندھائی۔ کچھ دیر بعد بیسن میں لگے نلکے کے پانی سے اس نے کلی کی۔ کاغذی تولیہ سے منہ خشک کیا۔ کچھ سوچا پھر واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ تھکان کی وجہ سے اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نیلو کی نگاہ روشن کے زرد چہرے پر پڑی۔ "تم خیریت سے تو ہو؟"

روشن نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں ٹھیک ہوں...... میں ماں بننے والی ہوں۔" مستقبل کی آزمائشوں سے خوفزدہ روشن نے سرگوشی میں جواب دیا۔

نیلو سکتے میں آ گئی۔ روشن شادی شدہ نہیں تھی۔

"کیا وسیم کو علم ہے؟" نیلو نے دبی زبان میں پوچھا۔ اسے روشن اور وسیم کی محبت کا علم تھا۔

"نہیں...... وہ پاکستان جا چکا ہے...... چھ ہفتہ پہلے...... اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... ورنہ وسیم ہرگز نہ جاتا...... مجھے یقین ہے۔" دھیمی لیکن پُر اعتماد لہجہ میں روشن بولی۔

"اسے تار دے کر بلا لو۔"

"میں نے فون کیا تھا۔ لیکن وسیم کے گھر والوں نے سندھ میں فسادات کی وجہ سے گھر بدل لیا ہے ...... اب اُس گھر میں افغان رہتے ہیں... نہیں کچھ بھی نہیں معلوم"۔ روشن کی پیشانی پر دکھ سے گہری شکنیں اُبھر آئیں۔ اُس نے آنسو ضبط کرنے کے لئے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

روشن کی بے بسی سے نیلو بے چین ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر روشن کے قریب بیٹھ گئی اور اُس کے سرد ہاتھ کو اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا۔

"پھر اُلٹی آ رہی ہے"۔ روشن نے آنکھیں کھول دیں اور مجبور نگاہوں سے نیلو کو تکا۔

نیلو نے اپنے دستی بیگ کو کھولا۔ کچھ تلاش کیا۔ پھر ایک کاغذ میں لپٹی گولیوں سے ایک گولی نکال کر روشن کو دی۔ "لو اسے نگل لو۔ سفر میں اکثر میری طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ متلی روکنے کے لئے میں سفر میں برابر ان گولیوں کو ساتھ رکھتی ہوں"۔

"اس سے نقصان تو نہیں ہو گا...... ؟ مجھے نہیں......" روشن کے سوال میں تحفظ کی طلب تھی اُس دوسری جان کے لئے جو روشن کے جسم میں دھڑکتی رہتی تھی۔

"نہیں قطعاً نہیں......"

"ڈاکٹر ولسن سے جب ملنا تو میری دعائیں بھی کہنا...... اور ہمت نہیں ہارنا نیلو......" روشن کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ چہرہ اب بھی زرد تھا۔ اور تھکان سے سر اب بھی کرسی کی پشت سے ٹکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی دوست کو حوصلہ دے رہی تھی۔

نیلو کچھ نہیں بولی۔ وہ کھڑکی کے باہر تکنے لگی اور ولسن کی بابت سوچنے لگی جسے پتہ تھا کہ وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ جتنے دن بھی وہ زندہ ہے اس کی زندگی اذیت بنی رہے گی۔ ایک مسلسل کرب۔ لیکن مریض بننا کون چاہتا ہے۔ موت کسے پسند ہے اور ولسن کو تو زندگی سے عشق تھا۔ اسکواش اور رگبی کے کھیل۔ دور دراز ملکوں کا سفر، اس کے محبوب مشاغل تھے جن سے ان کی دنیا روشن تھی۔ "یہ پیاری زندگی۔ یہ دلنواز زندگی۔ کاش یہ بار بار ملتی!" وہ اکثر کہتا۔ لیکن ڈاکٹر نے ایک مریض کو بچانے میں اپنی زندگی کا سودا کر دیا تھا۔ اگر ہسپتال میں ایڈس (Aids) کے ایک زخمی مریض کی شریان میں خون دیتے وقت، مریض کی جنونی جھدے، مریض کے جسم سے سوئی نکل کر ولسن کی انگلی میں نہ چبھتی تو اس وقت وہ ایڈس کا مریض نہ ہوتا۔ نیلو اس المیہ کو جانتی تھی۔ وہ ولسن کو ہمت اور حوصلہ دیتی رہے گی۔ لیکن یہ جھوٹی تسلیاں ہیں۔ ڈاکٹر سے بہتر کون اپنے مرض کی نوعیت کو سمجھ سکتا ہے۔ مریض بننے سے پہلے ولسن کے ساتھ نیلو کا جیسا رشتہ تھا اس کے نتیجے میں اس کی بھی وہی حالت ہو سکتی تھی جو اس وقت روشن کی تھی۔ انسان —— انسان ہی ہے۔ ہر احتیاط کے باوجود بداحتیاطی کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔

ٹرین ننھی سی ندی کے پاس سے گذر رہی تھی۔ اس پار قدیم شکستہ چرچ تھا جس کے پاس چند کھپریلوش گھر تھے جن کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا اور گھروں کے درمیان ایک بل کھاتی سڑک تھی۔ جلد ہی ندی پر محرابی چوبی پل آ گیا۔ اور پھر سرو کے درختوں کا جنگل۔ روشن نے پہلو بدلا۔ نیلو کی نگاہ اُس پر پڑی۔ دوا کے اثر سے روشن پر غنودگی طاری تھی۔ چہرہ پرسکون تھا۔ جھکی ہوئی گھنی پلکیں۔ لب ذرا کھلے سے۔ نیلو کو بچپن یاد آ گیا۔ جب وہ اور روشن ساتھ اسکول جاتی تھیں۔ راستے میں استانیوں پر نکتہ چینیاں۔ اپنے مضامین پر اچھے نمبر ملنے پر خوشی کا اظہار۔ گھر میں کسی رشتہ دار کے آنے کی اطلاع۔ امتحانات میں ان کی شاندار کامیابیوں پر دعوتیں۔ جب وہ دمکتی ہوئی ساریاں پہنے مہمانوں کو چائے اور شربت پیش کرتی تھیں۔ ہر طرف سے مبارکبادیں۔ ہر طرف مسرت کا اعلان۔ لیکن آج زندگی کی سنگین حقیقتیں سامنے تھیں جنھوں نے سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ سنگین سچائیاں۔ سنگین سوچ۔ اب وہ کیا بتائیں گی اپنے والدین کو —— اپنی زندگی کی بابت۔ رفیقِ زندگی کے انتخاب کی بابت؟ کہنے کا وقت گذر گیا۔ زندگی ہماری ہے جو بیتے گی ہم پر بیتے گی۔ اپنی خود کلامی کی بازگشت سننے کے لئے نیلو نے دوبارہ روشن کی طرف دیکھا لیکن وہ سو رہی تھی۔

ماٹن اسٹیشن پر ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ روشن نے آنکھیں کھول دیں۔ دوا کے اثر سے اُسے آرام آ گیا تھا۔ اُس نے شکر گذار نگاہوں سے نیلو کی جانب دیکھا۔ چند مسافر ٹرین سے اترے اور چند ٹرین میں آ کر بیٹھ گئے۔ ریل پھر چل پڑی۔ روشن نے اپنے پرس سے چاکلیٹ نکال کر

نیلو کو پیش کیا۔

"تم نے وسیم کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟" نیلو نے چاکلیٹ پر سے چمکیلا گلابی کاغذ الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کی تھی کوشش میں نے اصرار بھی کیا کہ ایم۔ آر۔ سی پی کا امتحان پاس نہ کر سکے تو کیا ہوا۔ ڈاکٹروں کے لئے اور بھی امتحانات ہیں تم پڑھائی کرتے رہو۔ میں خرچ برداشت کروں گی لیکن وسیم نے اسے احسان سمجھا۔ ممنون ہونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔" روشن نے اداسی سے جواب دیا۔

"تم وسیم کے ساتھ شادی کر لیتیں پھر پاکستان چلی جاتیں۔" نیلو ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"یہ ناممکن تھا..... میں ملازمت نہیں ترک کر سکتی۔ میری روزی کی وجہ سے میری خودداری توانا ہے۔"

"میں تم سے متفق ہوں روشن ..... ہم بھی انسان ہیں۔" نیلو نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسکار برو اب قریب آ رہا ہے۔" روشن موضوع بدلنا چاہتی تھی۔ کھڑکی سے باہر وہ پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جو اسکار برو سے قریب تھیں۔ روشن پر جو گزر رہی تھی اُس پر گفتگو کا حق وسیم کو تھا یا روشن کے ضمیر کو۔ جسے روشن نے خاموش کر دیا تھا۔ اُسے وسیم ہی سے شادی کرنی تھی جبھی جسم و جان روشن نے وسیم کے حوالہ کر دیا تھا۔ اگر تلاش کے بعد بھی وہ نہیں ملا تو وہ بن بیاہی رہے گی۔ یہ اس کا اٹل فیصلہ تھا لیکن نیلو تو دوست تھی بچپن کی۔ ہمدرد اور درد مند۔ اسے خاموش رہنے کے لئے روشن نہیں کہہ سکتی تھی۔

"کیا تم اپنی امی کو بتاؤ گی اپنی بابت؟" نیلو کی نگاہیں روشن پر جمی تھیں۔

روشن نے نفی میں سر ہلایا۔ شدید اضطراب سے اس کی پیشانی پر گہری لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ الفاظ چباتے ہوئے وہ بولی..... "ایک نہ ایک دن انھیں معلوم ہو جائے گا..... اور انھیں جان کر اذیت ہی ہو گی..... بے پناہ....." روشن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ..... "لیکن یہ میری جنگ ہے ..... میں لڑوں گی اسے ..... تنہا۔"

بچپن سے اب تک نیلو اور روشن نے بغیر کہے ایک دوسرے کی طلب سنی تھی کبھی امتحان کے بُرے نتائج کی افسردگی اور کبھی والدین کی بیجا ڈانٹ کی آزردگی کے بعد، کبھی نسلی منافرت کا شکار ہونے پر اور کبھی مہینے کی تنخواہ اچانک ختم ہونے کے بعد۔ اور دونوں نے دوست بن کر، بہن بن کر، ماں بن کر اس طلب کی تسکین کی تھی۔

نیلو تڑپ اٹھی۔ "تنہا نہیں ..... میرے ساتھ ..... تمہارے ہونے والے بچے کی میں بھی ماں ہوں ....." نیلو بولی اور اپنے مفلر میں روشن کے آنسو جذب کر لئے۔

رشتے درد کے

محمد سعید شیخ

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ جمیل کی بیوہ مریم اس سے اٹھارہ بیس سال بڑی تھی۔ عمر کا اتنا فرق، جس میں ایک دوسری لڑکی شادی کے قابل ہو سکتی تھی۔

دونوں کو اس فرق کا اتنا پتہ تھا جتنا کہ اپنے سانسوں کا پتہ ہو کہ ان کو نہ بھی گنو تب بھی ان کے آنے جانے کا احساس رہتا ہے۔ پھر بھی دونوں اپنی اپنی جگہ اُسے اتفاق بنانے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے۔ مریم عمر کے اس فرق سے اتنی مغلوب تھی کہ اکثر اسے اپنا خاوند جمیل بہت دُور نظر آتا تھا اور درمیانی فاصلوں میں دُھول اڑنے لگتی تھی۔ جمیل کا چہرہ اور وجود غبار آلود ہو جاتے تھے۔

جمیل کو شروع ہی سے اس فرق کا پتہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے مریم کو قبول کیا تھا۔ پھر بھی اس کی کوشش ہوتی کہ عمروں کے اس فرق کو لوگ بھول نہ سکیں تو اتفاق ضرور سمجھ لیں۔ اس کے باپ ابراھیم نے ان دونوں کی شادی کے موقعہ پر بڑے فخر سے کہا تھا "میرے بیٹے نے چالیس سالہ بیوہ سے شادی کر کے سنتِ رسولؐ کا حق ادا کر دیا ہے!"

جمیل سے شادی کرنے سے پہلے مریم کو یہ علم نہ تھا کہ عمروں کا فرق اس کے لئے اتنا بڑا بوجھ بھی بن سکتا ہے۔ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر وہ اس کوشش میں مصروف رہتی کہ اپنی عمر سے کم عمر کی لگے۔ اس کی جسمانی ساخت اس سلسلے میں اس کی بہت بڑی معاون تھی۔ وہ دو بیٹیوں کی ماں تھی مگر اس کے خدوخال میں ذرا بھی جھول نہ آیا تھا۔ بیوگی کے احساس نے اس کے چہرے پر افسردگی اور محرومی کا ایک خاص احساس ضرور بکھیر رکھا تھا۔ مگر اس کے کہیں اندر جینے کی ایسی قوت ضرور موجود تھی جو اس کے وجود میں جلتی رہتی تھی اور یہی وہ قوت تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے سسرال کے ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مریم اپنی ساری جائیداد بیچ کر اور گاؤں میں جا کر ان کے ساتھ بسنا شروع کر دے۔ مگر مریم کی ایک بیٹی شہر کے سب سے اچھے کالج اور دوسری سکول میں پڑھ رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح شہر کی زندگی چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ پھر اُسے پتہ تھا کہ گاؤں میں اس کے سسرال کا زمینداره تھا، برادری تھی، وہاں وہ کسی طرح بھی ایڈجسٹ نہیں کر پائے گی۔ پھر الیاس نے اپنی زندگی ہی میں اس کے لئے ایک علیحدہ اور آزاد طرزِ زندگی بنایا تھا، اب وہ اس کے والدین اور بھائیوں کے ساتھ کیسے رہ سکتی تھی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب اس کے جیٹھ اور دیور دھمکیوں پر اُتر آئے تھے کہ مریم نے اپنی کوٹھی کے ساتھ والی انیکسی جمیل کو کرایہ پر دی تھی۔ جمیل مریم کے کسی پڑوسی کی وساطت سے ان کا کرایہ دار بن کر آیا تھا۔ اگرچہ وہ اکیلا تھا مگر اس کا وعدہ تھا کہ جلد ہی اپنے والدین کو ساتھ لے آئے گا۔ مریم کسی نہ کسی طرح ان دنوں اپنے آپ کو

غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ شہر میں آئے دن وارداتیں بھی ہوتی رہتیں۔ بیٹیاں بھی بڑی ہو رہی تھیں۔ جمیل غیر محرم تھا، تاہم نہ جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اس پر اعتماد کر سکتی ہے۔ اس کے چہرے کی ہمدردی میں اس کے لئے کوئی یقین دہانی ضرور تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کرایے کی ضرورت تھی۔ الیاس نے اس کے لئے کوٹھی، پلاٹس اور بینک بیلنس کافی چھوڑا تھا گاڑی وہ خود چلا سکتی تھی۔ مردوں سے عدم تحفظ کے احساس نے اسے جمیل کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ضرورتمند تھا۔ کسی فارمیسوٹیکل کمپنی میں ریسرچ آفیسر تھا جس کے سب ڈائریکٹر اس سے کم پڑھے لکھے تھے۔ انہیں وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ عجیب طریقے سے چسکیوں میں چائے پیتے تھے اور کھسر پھسر سی بات کہتے تھے اور چائے کے گھونٹ منہ میں رکھ کر گفتگو کرتے تھے۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس تھا اور اس مایوسی کا ذکر وہ مریم سے بھی کھل کر کر لیتا تھا۔ اُدھر گاؤں میں باپ امام مسجد تھا جس نے پتہ نہیں کن کوششوں سے اُسے اتنا پڑھایا لکھایا تھا اور شہر بھیجا تھا کہ کہیں بڑا سا افسر بن کر اپنی اور اپنے خاندان کی قسمت بدلنے کا سامان کرے گا۔ شہر میں اس کی یہ حالت تھی کہ تنخواہ کا بیشتر حصہ ہوٹل کے کرایوں اور کھانے وغیرہ پر اٹھ جاتا تھا۔

شروع شروع میں جمیل کوشش کرتا تھا کہ مریم کے سامنے نہ آئے۔ باہر کا گیٹ عام طور پر نوکرانی ہی کھولتی تھی اور جب کبھی انجانے میں پورچ سے گزرتے وہ دروازے میں کھڑی مریم کو دیکھ لیتا تو خود بخود اس کی آنکھیں جھک جاتیں جب کافی مہینے اسے اس گھر میں رہتے گزر گئے تو کچھ ضروری کام اس نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔ مثلاً صبح صبح گیٹ کھول کر دودھ والے سے دودھ لینا۔ رات کو گھر کے دروازوں کو باہر سے چیک کرنا اور جب کبھی اسے نیند نہ آتی انیکسی سے نکل کر باہر کوٹھی کے لان میں آ بیٹھتا تھا۔ اُسے اس بات کا دُکھ تھا کہ مریم بیچاری یوں بیوہ ہو کر غیر محفوظ زندگی گذار رہی تھی۔ اُس کا دل ہمدردی سے بھر جاتا اور پھر اُسے اپنے ٹوٹے خوابوں کا غم آ گھیرتا۔ دونوں غم اکٹھے ہو جاتے اور اُداسی اُس کے اردگرد خاموشی سے تیرتی رہتی۔ کئی مرتبہ اُسے لگا جیسے اوپر رومیلا کے بیڈروم سے دو آنکھیں اُسے جھانک رہی ہوں اور کبھی لان کے ساتھ ڈرائنگ روم کے پردے ہل رہے ہوں۔

جمیل کا وجود آہستہ آہستہ اس گھر کی ضرورت بن گیا تھا۔ ایک رات جب باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی تو جمیل نے باری باری کوٹھی کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے چیک کئے۔ گیسٹ روم کا دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا۔ جمیل نے آہستہ سے اُسے دھکیلا تو وہ اندر کی طرف بغیر کسی آواز کے کھل گیا۔ جمیل کو لگا جیسے اندر کوئی ہو۔ کوئی جلتے بلتے گرم گرم سانس لیتا ہوا زندہ وجود۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک لمحے کے توقف کے بعد کسی نے خواب آلود آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں جمیل ...... بیگم صاحبہ یہ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے"، جمیل کی آواز میں شرمندگی تھی۔

وہ وہاں سے ہٹا اور لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے دیکھا۔ مریم بڑے ہلکے پھلکے کپڑوں میں اور چھوٹے چھوٹے پاؤں سلیپروں میں رکھے گیسٹ روم سے باہر نکل آئی۔ وہ جھجکتی ہوئی آئی اور اس سے ذرا ہٹ کر سامنے گارڈن چیئر پر بیٹھ گئی۔ جمیل نے آج شاید پہلی مرتبہ اسے نظر بھر کے دیکھا۔ موسم میں عجیب مہک تھی۔ گرمیاں ختم ہو چکی تھیں مگر سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ نومبر کی چاندنی راتوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی رانی لان میں دھوم مچا رہی تھی۔

"آج میری طبیعت بھی بے چین تھی۔ کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔" مریم یوں بولی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ "آپ کی تنہائی میں مخل تو نہیں ہوئی؟" اُس نے جمیل سے پوچھا۔

"جی نہیں! جی نہیں! آپ کا اپنا گھر ہے۔" جمیل نے فوراً کہا۔

پھر وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ آخر بولی "میں اور الیاس یہاں رات گئے بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شبنم ہمارے جسموں کو بھگونے لگتی تھی۔"

جمیل نے دیکھا چاندنی میں اُس کے چہرے پر عجیب پُرکشش حزن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ اداسی اور افسردگی کا بھی ایک اپنا حسن ہوتا ہے، جمیل نے اس سے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

مریم نے الیاس کے بغیر کبھی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ الیاس روایتی شوہر نہیں تھا بلکہ عاشق تھا اپنی بیوی کا عاشق۔ وہ کہا کرتا تھا "مریم، لگتا ہے میں تمھیں بھگا کر لایا ہوں.... مجھے شک رہتا ہے کہ کہیں تم بھاگ نہ جاؤ۔"

اس کی ہر بات سے اُسے زندگی کے اشارے ملتے۔ ایک ایک حرکت معنی خیز ہوتی۔ پتہ نہیں کیوں وہ زندگی کو اتنا بے ثبات سمجھتا تھا کہ تھوڑے عرصے میں زندگی کو بے تحاشا بسر کرنا چاہتا تھا۔ ہر کام میں جلدی کرنا چاہتا تھا محبت میں بھی پیار میں بھی۔ مریم کو ساتھ لے کر پہاڑوں، وادیوں، صحراؤں میں گھومتا۔ زندگی کے نئے نئے روپ اسے دکھاتا۔ صحرا میں کیمپ لگا کر ٹھہر جاتا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، دریاؤں کے کناروں پر، ریسٹ ہاؤس میں رک کر ساری ساری رات جاگتا رہتا اور کبھی کبھی کسی بڑے افسردہ گیت کے بول گنگناتا اور یوں خلاؤں میں تکتا جیسے کسی انہونی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

جب رومیلا پیدا ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا "میں نے مرد کی زندگی دیکھ لی ہے۔ اب لڑکی.... عورت بن کر زندہ رہوں گا۔"

مریم نے پیار سے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں ڈبوتے ہوئے کہا "میں نے تمھیں تو پیدا نہیں کیا۔"

"کیا ہے.... کیا ہے مریم! ہم اسی طرح پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح زندہ رہتے ہیں۔"

مریم نے اسے تعجب سے دیکھا اور پھر ہنس پڑی جیسے کوئی ماں بچے کی نادانی پر ہنستی ہو۔ اُسے الیاس کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ وہ اس کی باتیں سنتے سنتے سو جاتی تھی۔

الیاس کو فوت ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا مگر وہ اس کے وجود میں، احساس میں، اس کے روئیں روئیں میں زندہ تھا۔ اتنا زندہ کہ اُسے اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں پڑتا تھا۔ جیسے کوئی اپنے خون کی گردش، اپنے تنفس کے متعلق نہیں سوچتا۔ اس کی ایک ایک حرکت روشنی بن کر اس کے خون میں دوڑتی رہتی تھی۔ اور جب اس کا خون جاگتا تھا، یہ روشنی اس کے بالوں کی جڑوں سے قوتِ نمو بن کر پھوٹتی تھی تو اس کا تصور الیاس کے روپ میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ اچانک اونگھ گئی۔ اُسے لگا الیاس اس کے سامنے بیٹھا اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

پھر وہ ہنس دیا اور اس کی ہنسی کی آواز پر وہ چونک گئی۔ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ جمیل اسے دیکھ رہا تھا،

ایسی نظروں سے جن کا اسے تجربہ تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ خواب سے جاگی ہو۔ شرمندہ سی وہ اٹھی اور جمیل اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ایسے میں اسے لگا کوئی ادھر کے کمرے میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے سے پہلے مریم کے متعلق اور اس کے رویے کے متعلق کافی دیر سوچتا رہا۔

وہ چھٹی کا دن تھا جب جمیل کسلمندی سے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تب کوٹھی سے اونچی اونچی مردانہ آوازیں اور ان کے درمیان مریم کی سسکیاں اسے سنائی دیں۔ مریم کا جیٹھ غیاث اور دیور حیات آئے تھے۔ یہ وہی تھے جو الیاس کی موت پر اس کوٹھی میں کئی دن بیٹھے رہے تھے اور ضد کرتے رہے تھے کہ مریم اپنی بچیوں کے ساتھ گاؤں چلی آئے۔ کوٹھی کی نوکرانی نے بتایا تھا کہ بیگم کے سسرال والے مریم کو گاؤں لے جا کر اس کی شادی غیاث سے کرنا چاہتے تھے جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور بیوی پاگل ہو کر ایک حجرے میں بند رہتی تھی۔ اُونچی اُونچی آوازیں سن کر اس کا جی چاہا وہ اٹھ کر اندر جائے مگر مصلحتاً وہ انیکسی ہی میں پڑا رہا۔ جب غیاث اور حیات بک بک کرتے چلے گئے تو نوکرانی نے اسے آکر بتایا کہ انہوں نے بیگم صاحب سے اس کا نام لے کر ایسی باتیں کیں کہ بیگم صاحبہ بے ہوش ہو گئیں اور بیٹیاں چیخنے لگیں۔

جمیل اپنی جگہ بہت پریشان تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کا نام لے کر مریم سے کیا باتیں ان لوگوں نے کی ہوں گی۔ وہ بھی سارا دن باہر نہیں نکلا۔

اگلے روز شام کو وہ اجازت لے کر اندر گیا۔ ڈرائنگ روم میں کافی دیر تک وہ مریم سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا۔

پھر ہفتہ دس دن بعد مولوی ابراہیم اپنے خاندان سمیت وہاں آئے۔ مریم اور جمیل نے چند ملنے والوں کو بلایا اور بڑی سادگی سے جمیل اور مریم کی شادی ہو گئی۔ مولوی صاحب نے نکاح کے بعد دعا کی "میرے مولا! میرے بیٹے نے تیرے حبیب کی سنت کی پیروی کی ہے اسے حوصلہ دینا۔" پتہ نہیں مولوی صاحب کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ جمیل کو اب حوصلے کی ضرورت ہو گی۔

جمیل کی ماں اور بہنیں کوٹھی میں سجا سجایا سامان دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ بہنوں کو اب اپنا مستقبل کسی قدر روشن نظر آنے لگا تھا اور ان کے چہروں کا تکدر بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ یہ تکدر وہی تھا جو مریم کی عمر اور بیوگی کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

شام کو مہمانوں کے اعزاز میں دعوت تھی۔ وہاں موجود لوگ اپنے اپنے انداز میں سوچ رہے تھے۔ بعض زیر لب مسکرا رہے تھے۔ رازداری سا انداز ان کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا۔

"اچھا ......!"

"ہوں ...."

اور بعضوں کی نگاہوں میں سوالوں کی چبھن تھی۔ مریم ان سے بچتی پھر رہی تھی۔ اوپر رومیلا کے کمرے میں اس کے ساتھ اس کی بہن راحیلہ بھی تھی۔ دونوں پردوں کے پیچھے سے نیچے لان میں دعوت کے منظر دیکھ رہی تھیں۔ ناخوشی اور ناپسندیدگی ان کے چہروں پر عیاں تھی۔ دلہن بنی ماں کو دیکھ کر رومیلا کو خاص طور پر بہت الجھن ہو رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا یہ سب کچھ جیسے ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو۔ سب کے سامنے سب کو دھوکا دیا جا رہا ہو اور وہ اس شرمناک کھیل میں شامل ہونے کو تیار نہیں تھی۔

" بڑا ہاتھ مارا ہے یار سالے جمیل نے ۔ ساری عمر دوائیوں کی فیکٹریوں میں سیمپل بیچتا رہتا ۔ اب تو اتنی لمبی چوڑی جائیداد کا مالک ہے "

" یار زندگی بن گئی اس کی تو ! " دوسرے نے بڑے حسد سے کہا

" سالا عیش کرے گا " ایک اور مہمان نے گوشت کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا

" زندگی میں کامیابی اب بغیر شارٹ کٹ کے ممکن نہیں ۔ ہیروئن بیچو ، سمگلنگ کرو ..... " بات کرنے والا بڑے معنی خیز انداز میں رک گیا ۔

" یا پھر مالدار بیوہ سے شادی کر لو ۔ " دوسرے مہمان نے بات اُچک کر مکمل کی تو بڑا قہقہہ پڑا ۔

" کیوں بھئی ! کس بات پر قہقہے لگ رہے ہیں ؟ " جمیل نے قریب آکر پوچھا

" تمہاری خوش قسمتی کے چرچے ہیں یار ! "

مریم کے گرد بھی اس کی دوستوں کا جمگھٹا تھا ۔ " خدا کی قسم مسز جمیل آج تو پہچانی نہیں جاتی ہو ۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تمہاری یہ دوسری شادی ہے "

ابھی مریم سنبھل نہیں پائی تھی کہ دوسری مہمان بولی ۔ " یہ دوسری شادی بھی قسمت والوں کی ہوتی ہے ۔ کیوں مسز انعام ۔

" ایک کے بعد دوسرا ! " مسز انعام نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا ۔

" کیسا تجربہ ہے الیاس کے بعد جمیل کا ؟ " ایک اور خاتون آگے بڑھی ۔

" یہ تو کل ہی پتہ چلے گا ... " مسز انعام نے کہا اور سب نے مل کر زور سے قہقہہ لگایا ۔ یہ مردوں کے قہقہے کے مقابلے کا قہقہہ تھا ۔ بہت سے مردوں نے مڑ کر اُدھر دیکھا بھی ۔

اور مریم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا ردِ عمل کیا ہو ۔ اُسے یہ ضرور لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم پتھرا رہا ہو ، چہرے پر خون ٹھہر گیا ہو ۔ وہ اپنے وجود کو سہارا دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی ۔

جب سب مہمان چلے گئے تو یکدم جیسے اس کے اندر صحرا جاگ اٹھا ۔ سائیں سائیں ہونے لگی ۔ وہ جمیل کے ساتھ اندر کمرے میں آئی تو مانو جسم میں جان نہیں تھی ۔ یوں جیسے بہت بڑا گناہ کرنے جا رہی ہو جس کے بعد سب اُسے پتھر ماریں گے ۔ سنگسار کریں گے ۔

جمیل انیکسی سے کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا ۔ مولوی ابراہیم سرِ شام سب کے ساتھ واپس گاؤں چلے گئے تھے ۔ دونوں بیٹیاں اُدھر کمرے میں بند ہو گئی تھیں ۔ یوں جیسے اردگرد کی دنیا سے ان کا کوئی سروکار نہ رہا ہو ۔

مریم کو لگ رہا تھا کہ الیاس کا ہیولا سا اس کے اردگرد کہیں پھر رہا تھا ۔ ماضی کے گزرے واقعات و لمحات سب جیسے کسی طوفان نے اس کے ذہن کے ساحل پر لا پھینکے تھے ۔ اس کے خون اور اس کی سانسوں میں عجیب بے ترتیبی تھی جس میں نہ خوشی اور جستجو نہیں تھی ۔ خوف تھا ، خدشے تھے ۔ وہ آنے والے وقتوں سے ڈر رہی تھی ۔ اور جمیل اُسے بہت دور کھڑا دکھائی دے رہا تھا ۔ راستے میں بہت گرد و غبار تھا ۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی کہ کسی طرح اُسے سب کچھ صاف دکھائی دے مگر سب دھندلایا ہوا تھا ۔ وہ اپنے وجود کو تلاش کر رہی تھی ۔ اس وجود کو جس سے جمیل اب زندگی کا اثبات چاہتا تھا ۔ زندگی کی نمو چاہتا تھا ۔ سارے گھر میں سناٹا تھا ۔ باہر لان میں ابھی تک رنگ برنگی بتیاں

جل رہی تھیں۔ جن کے رنگ پردوں کو چیر کر اندر کمرے تک پہنچ رہے تھے۔ خاموشی کچھ ایسی تھی جیسے گھر میں کوئی بہت عجیب واقعہ ہو گیا ہو۔ اور مریم جمیل کے پاس یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی جرم سرزد کرنے جا رہی ہو۔ اس کا وجود ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اُسے تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اور وہ غیر شعوری طور پر کسی احساس سے بچنے کے لئے یوں سمٹ کر لیٹی تھی جیسے لیٹنا اس کا مقصد ہو۔ کبھی کبھی اپنے وجود اور اس کی کیفیتوں کو سنبھالنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت سے وہ پہلے بھی گذری تھی۔ مگر اس بات اسے اپنے وجود کا احساس نہیں تھا۔ سب کچھ خوشبوؤں خوابوں میں گندھا ہوا تھا۔ وہ ہوا کے جھونکوں پر سوار الیاس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ رات اس کی زندگی کا حاصل تھی۔ اور آج وہ جمیل کے کمرے میں تھی۔ بھیگے کمبل کی طرح اُس سے اپنا وجود اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ جمیل سے نظریں ملانا اس کے لئے مشکل تھا کہیں وہ اس کے اندر جھانک نہ لے۔ پڑھی لکھی عورت تھی۔ جانتی تھی یہ سب کچھ شرعی تھا، جائز تھا۔ پھر بھی نجانے کیوں اُسے یہ سب کچھ ڈرامہ لگ رہا تھا۔ اسے اپنا رول بہت مشکل لگ رہا تھا۔ جمیل کچھ کہہ رہا تھا مگر لفظ اس کی سماعت کی تپتی دیواروں سے ٹکرا کر ٹوٹ رہے تھے اور دور کہیں کسی گنبد سے الیاس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میں اندھا ہو رہا ہوں مریم! دیکھو! آنکھیں کھولو، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

یہ رات اس پر بہت بھاری گزری۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو جمیل اس کے بالکل ساتھ لگا سو رہا تھا۔ اُس نے سوچا یہاں بالکل اس کے پاس، پہلو میں، الیاس سوتا تھا۔ دونوں مرد تھے مگر کتنے مختلف اور آپس میں کتنے فاصلے پر تھے۔ اور وہ ان کے درمیان جیسے دھار پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنے زیور اور بھاری کپڑے اٹھانے اور جسم کو اکٹھا کر کے بڑی احتیاط سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ قالین پر سامان پھینکا۔ باتھ روم میں جا کر چہرے کے سارے رنگ دھوئے اور آ کر اپنے بستر پر یوں دھم سے گری جیسے کہیں سے بہت لمبا سفر کر کے آ رہی ہو۔ اور اس روز کے بعد وہ اس کمرے میں آ کر ہلکے پھلکے کپڑے پہنتی، اپنے سارے رنگ اتار پھینکتی اور پورا بوجھ علیحدہ کر کے جیسے ہر احساس سے بے نیاز ہو کر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آتی۔ لیکن جب جمیل کے پاس جاتی یا دونوں باہر کہیں نکلتے تو پورے اہتمام سے کپڑے پہنتی اور گہرا میک اپ کرتی۔ اسی طرح جب جمیل کے آنے کا وقت ہوتا تب بھی وہ ہلکے پھلکے کپڑے اتار کر خاص لباس پہنتی اور بن سنور کر بیٹھ جاتی۔ یہ اب اس کی عادت سی بنتی جا رہی تھی۔

جتنا وقت جمیل کے ساتھ گزرتا اسے بات کرتے ہنستے ہر لمحے احساس رہتا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ جیسے وہ یہ سب کچھ پوری کوشش سے پورے شعور سے کر رہی ہو اور اپنے آپ کو خود سے نکل کر دیکھ رہی ہو۔

گھر میں خاصی معاشی آسودگی تھی۔ بچت کی سکیموں اور جائیداد سے معقول آمدنی آ جاتی تھی۔ مریم نے پچھلے سے جمیل کے نام ایک اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں کافی رقم جمع کرا دی تھی۔ جمیل نے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں بھی اچھے گھرانوں میں کر دیں۔ ان شادیوں میں مریم نے بڑے زور شور سے حصہ لیا تھا اور سارے اخراجات بھی برداشت کئے تھے۔ مولوی ابراہیم اور جمیل کی والدہ دونوں جیسے مریم کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ جمیل کو خود بھی اتنی توقع نہ تھی۔ دونوں بہنوں کے سسرال بہت خوش تھے۔ جمیل اس کا بہت شکر گزار تھا۔ مولوی ابراہیم اور ان کی بیوی دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کے باوجود جمیل کو اندر ہی اندر کہیں احساس تھا کہ مریم اس کی بیوی کبھی کبھی بلکہ اکثر اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتی۔ "تم کبھی کبھی یوں کھو جاتی ہو کہ تمہیں بہت دور سے بلانا پڑتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے مریم؟"

جب جمیل اُسے مریم کہتا تو اُسے بہت عجیب سا لگتا۔ وہ تو سوچا کرتا تھا کہ اپنی بیوی کو "یار" "دوست" "جاناں" "نہ جانے

کیا کچھ کہے گا۔ لیکن اب "مریم" سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پاتا تھا اور پھر بھی اُسے لگتا، یہ نام مناسب نہیں ہے۔ "بیگم" کہنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مریم کہتے ہوئے اس کا دل چاہتا اس کا نام کچھ اور ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایسا کیوں محسوس کرتا تھا، اُسے خود بھی اس کا علم نہ تھا۔

مریم کے ساتھ وہ جب کبھی باہر نکلتا تھا تو اسے لگتا مریم سمٹی سمٹی سہمی سہمی لوگوں کی نظروں سے چھپتی پھرتی ہو۔ ایسی محفلوں میں چبھتی اور کھٹتی نظروں سے پناہ ڈھونڈتی وہ گھبرا جاتی۔ مریم ان نظروں کا مطلب سمجھتی تھی۔ اُسے پتہ تھا جہاں وہ ہوگی اس محفل میں اس کا ذکر ضرور ہوگا۔

مریم شاید عادتاً گہرا میک اپ کر کے اور اچھے کپڑے پہن کے نکلتی۔ دوسروں کو ان کی عمروں کے فرق کا پتہ ہو یا نہ ہو، وہ خود جانتی تھی کہ وہ اس فرق کو پاٹ نہیں سکتی تھی۔ لوگ بھی اس کے چہرے کے پیچھے سے دس سال کا حساب لگانے لگتے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا "ہینڈسم" ایک کہتی۔

"الیکس اتنا سمارٹ نہ تھا مگر باتیں بہت پیچھے دار کرتا تھا۔" دوسری یاد کرتی۔

"یہ بھی کم نہیں۔ شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد کیا رنگ نکالا ہے!" پہلی کہتی۔

"لیکن خریدی ہوئی جوانی.... غلامی سے زیادہ نہیں ہوتی" دوسری پھر کہتی۔

"سنا ہے اس کے دفتر میں بڑی کمسن سیکرٹری ہے۔" تیسری شامل ہوتی۔

"کیوں نہ رکھے بھئی! اب اس نے بھی تو شوق پورا کرنا ہے۔ مریم تو اس کی معاشی ضرورت ہے۔" دوسری جواب دیتی۔

جمیل اور مریم دونوں کبھی کبھی یہ گفتگو یا اس کا کچھ حصہ سن لیتے تو بظاہر سُنی اَن سُنی کر دیتے۔ مگر گھر جاتے ہوئے گاڑی میں دونوں یوں خاموش ہو جاتے جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع نہ رہا ہو۔

ایسی دعوتوں سے واپس آکر مریم جمیل کے کمرے میں بہت کم ٹھہرتی۔ قیمتی لباس اور گہرا میک اَپ اسے کاٹنے لگتے۔ وہ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ جلدی جلدی ہلکے پھلکے کپڑے پہن کر بستر پر دراز ہو جاتی اور کافی دیر لمبے لمبے سانس لیتی رہتی جیسے ہوا میں اُسے آکسیجن کی کمی کا احساس ہو رہا ہو۔

بیٹیاں ابھی تک اُس سے اکھڑی اکھڑی تھیں۔ ابھی تک یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے دوسری شادی کی کیا ضرورت تھی۔ کالج اور سکول کی کلاس فیلوز ان کے ساتھ مذاق کرتی تھیں۔ وہ بہت کڑھتیں۔ مگر اپنی ماں سے بات نہ کرتیں۔ ان کے درمیان ایک حجاب سا پیدا ہو گیا تھا۔ مریم ان کے آگے پیچھے بھاگتی، ان کو بار بار پیار کرتی، سینے سے لگاتی اور بہت وقت دیتی، یہاں تک کہ بعض اوقات جمیل کو بھی یوں نظر انداز کر جاتی جیسے اس کا وجود گھر میں کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔ جمیل گھبرا کر اپنے کمرے سے نکلتا اور ان میں شامل ہو جاتا۔ سب اکٹھے ٹی وی دیکھتے۔ جمیل کبھی کبھی ان سے کیرم لُڈو بھی کھیلتا۔ پھر بھی وہ بے تکلفی پیدا نہ ہوتی جس کی اسے خواہش تھی۔ بیٹیاں بات کرتے جھجکتیں۔ چھوٹی تو اسے بڑی مشکل سے ابو کہنے پر راضی ہوئی تھی مگر رومیلا اسے انکل سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی اور نہ ہی سمجھ سکی۔

جمیل کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ رُومیلا اب ویسے بھی جوانی کی ابتدائی منزلوں میں تھی جہاں ہر طرف خواب اور رنگ بکھرے ہوتے ہیں مگر وہ کھوئی کھوئی رہتی۔ جمیل کو اس کے کھلتے ہوئے نین نقوش میں ایک اور آدمی کے خد و خال گھلے نظر آتے۔ وہ آدمی اب تک اس گھر میں موجود تھا۔ اور اس کی پوری کوشش کے باوجود وہ ان کی زندگی سے نہیں نکل سکا تھا۔ الیکس زندہ تھا: ان بچوں میں، مریم کے ذہن میں، یہاں تک کہ اس کے جسم میں بھی۔ شاید اسی لئے اس کے جسم نے

ابھی تک جمیل کے جسم کو اپنا حصہ نہیں بنایا تھا اس کے گرد ایک حصار تھا۔ اونچی لمبی دیواریں تھیں جن کے اندر وہ اب تک داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اُسے اس بات کا کربناک حد تک احساس تھا پھر بھی وہ مریم کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ مریم نے اپنے کمرے سے ایلیس کی تصویریں اتار دی تھیں۔ وہاں اب جمیل کی تصویریں لگی تھیں۔ بچوں کے کمروں میں ابھی تک ان کے باپ کی بڑی بڑی تصویریں اور پھر سب کی اکٹھی رنگین تصویریں اب تک لگی تھیں۔ جمیل اس کمرے میں نہیں جاتا تھا اور مریم ان تصویروں سے نظریں بچاتی تھی۔ جمیل کی دلہن کے ساتھ والی تصویر اب ڈرائنگ روم میں آویزاں تھی۔ جمیل کو مریم اخلاقی طور پر زیر کر چکی تھی۔ پھر بھی اس کے اندر کہیں اندیشے سر اٹھاتے تھے۔ اُسے پتہ تھا کہ وہ عورت تھی اور اتنی دیر جو ایلیس کے ساتھ زندگی گذار چکی تھی تو وہ اب اسی کی ذات کا حصہ تھی۔ وہ اپنے وجود سے ایلیس کا لمس نکال نہیں پائی تھی۔

جمیل اپنی کمپنی کا ایریا منیجر بن چکا تھا۔ دفتر میں جب وہ بہت کھویا ہوتا تھا تو اس کی سیکرٹری اس کے بہت نزدیک آ جاتی۔ یہاں تک کہ اس کے جسم کی خوشبو سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ بڑی ہی نرم آواز میں کہتی "سر آج آپ بہت اداس ہیں! آپ کے لئے کافی بناؤں؟"

اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ کی بنی کافی پسند کرنے لگا تھا۔ اُسے سیکرٹری کی یہ ہمدردی بہت اچھی لگتی اور اسے بھی پاس بٹھا کر کافی پلاتا۔ کبھی کبھی جب بہت تھک جاتا تو اُسے باہر کھانے پر لے جاتا۔ وہ ہلکے ہلکے سُروں میں باتیں کرتی تھی۔ ان کو آپس میں یوں ملاتی تھی جیسے کوئی پھولوں کی پتیاں جمع کر رہا ہو۔ اس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں اُسے بہت اچھی لگتیں۔ اُسے لگتا کہ اگر وہ کسی ساز کو چھیڑیں تو بہت میٹھے سُر نکلنے لگیں۔ اور پتہ نہ چلے کہ ان نغموں کا منبع ساز ہے یا وہ اُنگلیاں۔ ایسے میں جمیل کے اندر اضطراب کا ایک جانا پہچانا سا احساس جنم لیتا اور جرم کا سایہ سا اس کے حواس پر چھانے لگتا۔ وہ بڑے شوق سے سیکرٹری کو ساتھ لے جاتا مگر بڑی بیزاری سے راستے میں اُسے گھر کے قریب اتار دیتا۔ اس کا گھر دیکھنے کی کبھی اس میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔ وہ کئی کئی دن نہ اس سے بات کرتا اور نہ ہی اُس کے ہاتھ کی کافی پیتا۔ پھر کئی دنوں کے بعد اسے اس کی آواز سانسوں کے ساتھ بہت قریب سے آتی "سر! آپ بہت اداس لگ رہے ہیں! آپ کے لئے کافی بناؤں؟"

تب اسے لگتا اس نے بہت دنوں سے کافی نہیں پی۔ کئی مرتبہ کافی پینے کے بعد ایک خاص قسم کی تلخی سی اس کی زبان سے چپکی رہتی اور اسے دور کرنے کے لئے اُسے ٹھنڈے پانی کی بار بار ضرورت پڑتی۔

پچھلے کئی دنوں سے ایک عجیب واہیات اور وحشیانہ قسم کا خیال اس کے ذہن میں اُگ رہا تھا۔ وہ اس خیال کو جھٹک کر سر سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اس خیال کا سامنا کرتے ہوئے وہ خود کو بہت چھوٹا، معمولی اور کمینہ محسوس کرنے لگا تھا۔ "کیا یہ میں نے سوچا ہے؟" "کیا میں اس حد تک بھی سوچ سکتا ہوں؟" وہ حیران ہوتا۔ اُسے اب جیسے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

وہ سوچتا، جب میں نے شادی کی تھی تو کیا کسی کونے کھدرے میں دل کے اندر یہ خیال موجود تھا یا بعد میں چپکے سے آگھسا تھا۔ وہ اپنے آپ اور اپنی ذات پر غور کرنے لگتا۔ وہ اس خیال کو پوری شکل دینے کو بھی تیار نہیں تھا مگر وہ تھا اس کے اندر ..... وہ اس کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

"مریم ......" اور وہ آنکھیں بند کر لیتا تو خیال زیادہ واضح شکل میں سامنے آ جاتا۔

"نہیں میں اتنا کمینہ، اتنا نیچ نہیں ہو سکتا ..... یہ میری سوچ نہیں ہو سکتی۔" وہ جیسے اپنی بے بسی پر آبدیدہ ہو جاتا۔

"میرا باپ تو سمجھتا ہے میں نے ایک بیوہ کو عقد میں لے کر سنتِ رسول کی پیروی کی ہے۔ یتیم بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں کیا اسی عورت، اپنی بیوی ..... کی موت کا خواہشمند ....." اور وہ اٹھ کر اکیلا گھر سے باہر نکل جاتا۔ آوارہ گھومتا رہتا۔ گاڑی میں پہاڑی سڑکوں میں بھٹکتا رہتا اور اس کی سوچ تپتی رہتی۔

اُسے اپنے آپ پر افسوس تھا، غصہ تھا۔ اسے خود سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اور یہ بات تھی بھی ایسی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کر سکتا تھا۔ اب جب کبھی مریم اس کے پاس آکر بیٹھتی تو وہ خود کو اخلاقی طور پر بہت کمتر پاتا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس تھے مگر اپنی اپنی ذات کے قیدی، اپنے اپنے احساسِ جرم کے اسیر۔ زندگی کا عجیب سا ذائقہ تھا، کواڑ گندل کا سا۔

اس رات پچھلے پہر جب مریم چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی تو جمیل کی پشت میں اندر سے درد کی شدید لہر بجلی کے کوندے کی طرح اٹھی اور اس کے سارے جسم کو درد میں ڈبو گئی۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ اُسے غور کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ پہلو پر پہلو بدلتا رہا۔ تکیے کو بازوؤں میں بھینچ کر اُس نے دانت زور سے اس میں گاڑ دیئے مگر درد رُک نہیں رہا تھا۔ پھر بے ساختہ اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ یہ دردِ گردہ تھا۔ پہلے کبھی کبھی معمولی سا درد ہوتا تھا اور وہ ہر مرتبہ چھوٹی موٹی دوائی لے لیتا تھا۔ مگر آج تو جیسے اس کا سارا درد امڈا چلا آ رہا تھا۔ اس کی چیخیں سُن کر مریم اپنے ہلکے پھلکے کپڑوں میں ہی سلیپر پہنے بھاگی آئی۔ اُوپر سے رومیلا اور راحیلہ بھی جمیل کے کمرے میں آگئیں۔ جمیل نے تشنج کی کیفیت میں اُسے بڑی رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر سہمی کھڑی تھی۔ ایک ثانیے کے لئے جمیل نے سوچا، وہ اس کی موت کی خواہش رکھتا ہے اور درد کی شدت نے اسے مزید سوچنے سے باز رکھا۔ بڑی بیٹی آگے بڑھ کر جمیل کی پشت سہلانے لگی۔ مریم نے اس کے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کے قطرات اپنے دوپٹے سے صاف کئے۔ پھر مریم نے جاکر گاڑی نکالی۔ دونوں بیٹیوں نے اُسے سہارا دیا۔ اور گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بٹھا کر وہ دونوں اس کے دونوں پہلوؤں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ وہ اس کے پہلوؤں کو سہلا رہی تھیں۔

ایمرجنسی وارڈ والوں نے سیریئس حالت دیکھ کر اسے فوراً داخل کر لیا۔ اس کو فوراً انجکشن دیئے گئے۔ درد تھمنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت میں غنودگی گھلنے لگی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ بول نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹیسٹ لئے اور اگلی صبح فیصلہ دے دیا۔ ایک گردہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ اپریشن ضروری تھا۔

اپریشن سے قبل جب مریم نے کاغذ پر دستخط کئے تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ مگر اُس کے اندر جیسے کوئی رو رہا تھا "میں دوسری دفعہ بیوہ نہیں ہونا چاہتی۔ جمیل کو بچانا ہوگا۔" مریم جیسے اپنے آپ سے ہمکلام تھی۔

"جمیل بچ سکتا ہے ..... میں اُسے بچا سکتی ہوں" پتہ نہیں کیوں اُسے یقین تھا!

جمیل کو جب اپریشن تھیٹر لیجانے لگے تو مریم اور اس کی بیٹیاں سٹریچر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ سمجھ رہا تھا۔

"ابو!" دونوں بیٹیوں نے بیک وقت رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ ہلکے سے مُسکرایا۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ لوٹے گا۔ واضح، شفاف یقین۔ جس میں زندگی کی ساری حقیقت جمع تھی۔

میں اور میرا ساتھی

نیلم احمد بشیر

خوف اور میں!

ہم دونوں کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اس ساتھی نے ہمیشہ میرا ساتھ نبھایا ہے —— اس کی رفاقت میری زندگی کی چند پائیدار رفاقتوں میں سے ایک رہی ہے۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہی مجھے پناہ دیتا آیا ہے۔ میں اور خوف، ہم دونوں دوست ہیں اور اچھے ساتھی ہیں۔

بچپن بہت اچھا گذرا۔ میں اور میری چھوٹی بہن جندی امی ابا کی لاڈلی بیٹیاں تھیں۔ ابا بہت شفیق تھے۔ ڈانٹتے ڈپٹتے نہیں تھے پیار کے خزانے بھر بھر کے لٹاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کا خوف ذہن پر تسلط جمائے ہوئے تھا۔ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا تھا۔

امی نے بچپن سے ہی یہ تربیت دی تھی کہ گھر میں صبح سویرے شور نہ مچایا جائے۔ ہم بچے "شش شش، اباجی سو رہے ہیں" سرگوشیوں میں کہتے، آہستگی سے چلتے، بے آواز ہنستے اور خاموش قہقہے لگاتے، اسکول جانے کی تیاریاں بڑے آرام سے کر لیتے۔ اباجی کا ڈر بھی سے میرے دل کے کسی کونے میں دبک کر بیٹھ گیا تھا حالانکہ اباجی نے کبھی کچھ کہا نہ تھا۔

مجھے اور جندی کو رات نو بجے ریڈیو پر نشر ہونے والا ڈرامہ سننے کا بہت شوق تھا۔ امی کہتی تھیں تمہارے ابا پسند نہیں کرتے کہ بچیاں عشق و محبت کی باتیں سنیں اور ڈراموں میں یہی واہیات باتیں ہوتی ہیں اس لئے ہمیں ڈرامہ سننے کی اجازت نہ تھی۔ مگر برا ہو ہمارے ہمسایوں کا جن کے اباجی ایسا نہیں سوچتے تھے۔

میں اور جندی رات کو نو بجے ریڈیو پر نشر ہونے والا ڈرامہ سیڑھیوں میں چھپ کر سانس روکے سن ہی لیتے۔ مکالمے جان کھینچ لیتے تھے۔ جوان لڑکی کی سسکیاں اور لڑکے کی آہیں۔ بیچ میں ظالم سماج۔ اُف نہ جانے دنیا میں کیا کیا ہو رہا تھا اور ہم نہ جانے کیا کیا جاننے سے محروم رہ جاتے تھے۔ کاش ہمارے ابا بھی ہماری پڑوسن سہیلی کے ابا کی طرح ہمیں ریڈیو ڈرامہ سن لینے دیتے۔ وہ ساری فیملی رات کھانے کے بعد اکٹھے ہو کر یہ کام کرتی تھی۔

میں اور جندی ڈرامے کا ایک آدھ کونا پکڑ کر ہی خوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگتے۔ ہمسائے کے گھر سے آنے والی آوازیں یوں ہم تک آ آ کر ٹکراتیں جیسے کسی سمندر کے بیچوں بیچ کھڑے لائٹ ہاؤس کے برج سے رات کی خاموشی میں لہریں ہو ہو کے ٹکراتی ہیں۔

ایک رات میں نے اور جندی نے ایک ترکیب لڑانے کی سوچی۔ امی ابا تو اپنے کمرے میں ہوا کرتے تھے اور ریڈیو ڈرائنگ روم میں۔ طے یہ پایا کہ اپنا ریڈیو لگایا جائے اور اس کو کم سے کم والیوم پر رکھ کر کان اس سے چپکا کر ڈرامہ سنا جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ ریڈیو بھی بے حد غیر معمولی قسم کا تھا۔ نانا جی نے تقسیم سے پہلے کسی انگریز سے خرید کر امی کو دیا تھا۔ اس کو آن کرتے وقت

اس قدر زور سے ٹھک کی آواز آتی تھی کہ ہمسایوں کو بھی پتہ چل سکتا تھا کہ ان کا ریڈیو آن ہوا ہے۔ اگر کسی طرح ٹھک کی آواز نہ آئے تو ابا کو کو پتہ نہیں چل سکتا کہ ریڈیو لگا ہوا ہے۔

میں نے کچھ دیر سوچا پھر جندی سے کہا "تم ایسا کرنا جس لمحے میں ریڈیو آن کروں، اسی لمحے ایک چھلانگ مارنا تاکہ ٹک کی آواز چھلانگ مارنے کی دھمک میں چھپ جائے۔"

ایسا ہی ہوا۔ جندی نے کامیابی سے چھلانگ اسی لمحے لگائی تھی۔ امی آئیں "لڑکیو یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"امی کچھ نہیں جندی یونہی اچھل رہی تھی۔" میں نے صفائی پیش کی۔

"یہ اچھل کود کا وقت نہیں۔ رات کے نو بج گئے ہیں، چلو سو جاؤ۔" وہ ڈانٹ کر چلی گئیں۔ میں اور جندی فاتحانہ مسکراہٹ سے ریڈیو سے چپکے چپکے ڈرامہ سنتے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے۔ میں ابھی ظالم سماج کے کئے گئے ظلم پر آنسو بہانے ہی والی تھی کہ اچانک کمرے کے دروازے میں ابا کو کھڑے دیکھ لیا۔ خوف نے میری زبان گنگ کر دی، ہاتھ پیر سُن ہو گئے، گھگھی بندھ گئی لیکن شکر ہے، انہیں پتہ نہیں چلا۔

ابا کا ڈر تب سے اور گہرا ہو گیا جب انھوں نے مجھے میری زندگی کا پہلا تھپڑ مارا۔ ہوا یوں کہ ہمارے سکول میں اسلام آباد سے ایک بہت حسین لڑکی آئی۔ میری کلاس میں داخل ہوئی، سب لڑکیاں اس سے دوستی کرنے کے لئے مری جا رہی تھیں۔ وہ میری دوست بن گئی۔ ایک روز اس نے مجھے اپنی سالگرہ پر مدعو کیا۔ امی ان دنوں لاہور گئی ہوئی تھیں۔ میں جندی، ابا اور ایک نوکرانی کے ساتھ کراچی ہی میں تھے۔ میری دوست کا گھر ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھا اور ہماری فلیٹ والی بلڈنگ لارنس روڈ پر۔ فاصلہ کافی تھا لیکن سالگرہ پر جانے کو دل مچل رہا تھا۔ میں نے سوچا، ابا تو شام کو آتے ہیں۔ ہم سکول کے بعد سالگرہ میں شرکت کر کے ان کے آنے سے پہلے کب کے گھر بھی پہنچ جائیں گے اور انھیں خبر تک نہ ہوگی ——— جندی کو ساتھ لیا، چھوٹا موٹا تحفہ خریدا، اپنی دوست کے ہاں سالگرہ منا کر شاداں و فرحاں گھر کو لوٹے۔

پھر ہوا وہی جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ ابا جلدی گھر آ گئے۔ بیٹیوں کو گھر نہ پا کر پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر پوچھ گچھ کی، سکول بھی گئے۔ پھر گھر آئے۔ ہمسایوں سے دریافت کیا۔ ہم نے کسی کو بتایا ہی نہیں تھا کہ ہم دیر سے گھر لوٹیں گے۔ اس لئے سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ سر جھکائے گھر میں بیٹھے تھے کہ میں اور جندی مزے سے شام ڈھلے گھر پہنچ گئے۔ پڑوس کے فلیٹوں کے لوگ ہمارے گھر کے ارد گرد کھڑے قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

جونہی میں نے خطرہ سونگھا، روح کانپنے لگی۔ سب لوگ ہمیں گمشدہ سمجھ کر حیران و پریشان تھے اور ہمیں دیکھنے کے بعد یہ جاننے کو بے چین کہ اتنی دیر ہم کہاں رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے خوف کے کالے سیاہ بادل کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

"کہاں گئی تھیں؟" ابا غرائے۔

میں نے بتا دیا۔ سچ کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ میں بڑی تھی۔ ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔

انھوں نے پہلے بالوں سے پکڑ کر مجھے زور سے جھنجھوڑا اور پھر زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر رسید کر دیا۔ ساتھ میں ڈانٹ ڈپٹ اور لیکچر بھی پلایا۔ میں اور جندی مجرم بنے خاموش کھڑے رہے۔ ہڈیوں کے گودے تک میں خوف گھستا چلا گیا۔

دور دیس کے کسی اجنبی جزیرے پر سندباد جہازی کے کاندھوں پر ایک بوڑھا سوار ہو گیا تھا!

ابا نے کچھ دن ناراض رہنے کے بعد پیار سے سمجھایا کہ ایسی غلط حرکت کا نتیجہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور ہمیں اس طرح سے

بغیر بتائے کہیں نہیں جانا چاہیئے تھا لیکن ابا کا خوف مجھ سے جدا ہونے کو تیار نہ ہوا میرے ساتھ چمٹ کر رہ گیا۔

بوڑھا سندباد جہازی کے کاندھوں پر مستقل ڈیرا جمائے رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے وہ بھی چمٹا رہا۔

کئی سال بعد جب گھر میں اکلوتا بھائی آیا تو میں نے بڑی بہن بننے کے بجائے اس کی ماں بن جانے کو ترجیح دی۔ وہ اور میں ہر وقت اکٹھے رہتے۔ مجھے یاد ہے جب وہ سال بھر کا تھا تو صبح صبح منہ اندھیرے اس کو بھوک لگا کرتی تھی۔ ہم دونوں اکٹھے سویا کرتے تھے، اس لئے وہ مجھے ہی جگایا کرتا تھا اور میرے چہرے پر ننھے ننھے بوسے مجھے نیند سے بیدار کیا کرتے تھے۔ میں ادھ کھلی آنکھوں سے اٹھتی، تھرماس میں سے گرم پانی لے کر اس کے لئے خشک دودھ بوتل میں گھولتی اور بوتل اس کے منہ سے لگا دیتی۔ وہ غٹا غٹ دودھ پیتا رہتا اور میرا ہاتھ اس کے ننھے منے وجود کو تھپکتا رہتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے وجود کے آگے میرا وجود نقطہ بن کر سکڑنے لگا۔ اس نے اب بوتل کی جگہ منہ میں سگریٹ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کا قد مجھ سے لمبا اور شخصیت جاندار اور رعب دار ہو چکی تھی۔ اب ہم اکٹھے سوتے بھی نہیں تھے۔

ایک بار جب میں نے اسے سگریٹ پیتے دیکھ کر بچپن کی طرح اسے ہولے سے چپت لگانے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور سرزنش کی تو وہ خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھ کر ناگواری سے بولا "آپا، آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ میری لائف میرا بزنس ہے۔ میں جو بہتر سمجھوں گا کروں گا۔ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ ویسے بائی دی وے، آپ کا دوپٹہ اتنا چھوٹا کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ اور صبح کس سے فون پر ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں؟"۔

میں نے اپنے سینے کی طرف دیکھا اور اپنے چھنے ہوئے دوپٹے کو پھیلانے کی کوشش کی مگر اس کمبخت نے بھی شاید میری شرمندگی کو بھانپ لیا تھا۔ مزید سکڑتا ہوا نیچے جا گرا۔ میں نے خود کو ننگا سا محسوس کیا۔ اسی لمحے میرا ساتھی خوف مجھ سے ایک بچھڑے دوست کی طرح آ چمٹا۔ مضبوطی کے ساتھ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی۔

سندباد جہازی بوڑھے کو کاندھوں پر اٹھائے چلتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ مجبوری تھی۔

فیصل اور میں کالج کے زمانے سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ہم نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کا بھی منصوبہ بنا رکھا تھا، اور اس سے پہلے کہ ظالم سماج ہمارے درمیان آتا، گھر والوں کی رضامندی سے منگنی بھی کر رکھی تھی۔ میں فیصل کو بہت چاہتی تھی اور وہ بھی مجھے دنیا کی بہترین عورت سمجھتا تھا۔ میں اس کی محبت پا کر خود کو ساتویں آسمان پر اڑتا محسوس کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی وہ مجھے پا کر اپنے نصیب پر اتنا ہی رشک کرے جتنا میں کرتی تھی۔ میری قیمتی محبت کو اپنے سینے پر ایک اعزاز کی طرح سجا کر فخر کرتا پھرے۔ میری بے انتہا قدر کرے۔ میری محبت کے جواب میں اپنی محبت کا بھرپور انداز میں ذکر کرے مگر وہ اس معاملے میں ہمیشہ نالائق اور کنجوس واقع ہوا تھا۔

میں سراپا اظہار تھی اور وہ سراسر اسرار۔ مجھے محبت کی چھوٹی موٹی باتیں کرنے، رو ٹھنے منانے میں بہت مزا آتا تھا مگر وہ ان باتوں سے اجتناب کرتا تھا۔ لاپروا تھا۔ کورا تھا۔

میں سمجھتی ہوں محبت کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ جذبوں میں شدت اور لمس میں حدت اتنی ہو کہ روح تک پگھل جائے۔ آنکھوں میں پیاس اور چاہ میں مر مٹنے کے ارادے ہوں۔ وعدے ہوں، حکایتیں، شکایتیں ہوں۔ گلے شکوے، روٹھنا، منانا، یہ سب لوازمات اگر محبت میں شامل نہ ہوں تو محبت کرانے اور کرنے میں مزا نہیں آتا۔ شائل ادا اور چنچلتا محبت کو سجا دیتی ہے۔

میرا جی چاہتا تھا جب وہ چھٹیوں میں اپنے گاؤں جائے تو مجھے خوبصورت سے ہجر و فراق والے شعر لکھ بھیجے۔ میری جدائی میں درد میں ڈوبے لاتعداد خطوط لکھے جو اتنے زیادہ اور طویل ہوا کریں کہ میں نپولین کی بیوی جوزفائن کی طرح انہیں ایک کمرے میں ڈالنے لگ جاؤں

اور گھبرا کر اپنی خادمہ سے کہوں کہ میں بھلا کیسے اتنے خطوں کے جواب دے سکتی ہوں۔ ان پر پرفیوم تو نہ چھڑکا گیا ہو مگر ان میں سے پیار کی خوشبو آتی رہے۔ نپولین تو محاذِ جنگ سے جوزیفائن کو محبت بھرے خط لکھے جاتا تھا۔ مگر اُس نے مجھے خط کبھی نہ لکھا۔ وہ خط لکھنے میں بیلو نہیں کرتا تھا۔ اُسے غیر ضروری سمجھتا تھا۔ اُس نے کبھی سالگرہ یا کسی دوسرے موقعے پر کارڈ بھی نہیں دیا۔ اس کے باوجود وہ چاہت کا بھرپور مظاہرہ کرتا تو میں اُس سے ہر شکایت بھول جاتی۔ پیار میں ڈوب ڈوب جاتی۔ ایک بار میں نے ہولے سے ذکر کر دیا تو وہ خفگی سے بولا "میں مطالبے منوانا ہرگز پسند نہیں کرتا۔" ——— نرمی اور خلوص کا مجسمہ تڑک گیا۔ غصے میں آگیا "تم مجھ سے گن پوائنٹ پر محبت کروانا چاہتی ہو۔ استانی بن کر چھڑی سے راستہ دکھانا چاہتی ہو۔ میں جتنی محبت کر سکتا ہوں کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کی توقع مت کرو۔ آئی لو یو کہا یہ کافی نہیں؟"

میں سہم گئی۔

سندباد کے کاندھوں کے گرد خبیث بوڑھے نے اپنی سوکھی ہوئی مگر مضبوط لاتوں کا حلقہ تنگ کر دیا تھا۔ سندباد نے اسے پٹخنا چاہا مگر بوڑھے کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ بے بس ہو گیا۔ اب اُس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سندباد اُسے اپنے ساتھ ساتھ لیے، اس کا بوجھ اُٹھائے نگر نگر بھٹکتا رہا جیسے یہی اس کا مقدر رہو۔

میرا ساتھی خوف مجھ سے آن ملا۔ یہ خوف مسترد ہو جانے، ریجیکٹ ہو جانے کا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں نے پھر فیصل سے شکوہ کیا تو کہیں وہ مجھ سے محبت کرنا ہی نہ چھوڑ دے۔ میں خاموش ہو گئی۔ فیصل نے پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور میں نے بادلوں سے پرے آسمانوں پر پھر سے دھنک دیکھنی شروع کر دی۔

شادی ہو جائے تو میں اس کو سیدھا کروں گی۔ دیکھوں گی پھر کس طرح یہ مجھے خوفزدہ کرتا ہے۔ پھر تو ہم برابر ہوں گے۔ شریکِ حیات ہوں گے۔ پھر تو مجھے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہو گی نا۔ سندباد نے بوڑھے کو زور سے پٹخنی دینے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے دل ہی دل میں سکور برابر کرنے کے منصوبے بنا لئے تھے۔

یہ ہماری شادی کے پہلے سال کی بات ہے۔ ہم دونوں حسبِ توقع بہت خوش و خرم زندگی گذار رہے تھے۔ چندی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ ایک روز ہم دونوں بہنوں نے شاپنگ کا پروگرام بنایا۔ انارکلی میں کپڑے خریدتے، چاٹ کھاتے، گپیں مارتے، ہنستے کھیلتے ہم گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ شام کے سوا چھ بج چکے ہیں، حالانکہ فیصل سے شام چھ بجے تک پہنچ جانے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔

دیر سے آنے کی وجہ پوچھنے پر میں نے عقلمندی سے کام لیا۔ ہنس کر کہا "آپ کو پتہ ہی ہے، ہم دونوں آج کل سلو موشن میں چلتے ہیں۔ ہم دونوں امید سے تھیں۔

"یہ دیکھیں میں نئے سوٹ لائی ہوں۔ کیسے ہیں؟" میں نے کپڑے دکھانے شروع کر دیئے۔

فیصل کی ڈاڑھ میں درد تھا۔ آنکھیں خشمگیں تھیں اور موڈ زہریلا "مگر تم دیر سے کیوں آئیں؟ پندرہ منٹ لیٹ ہو تم۔"

میں نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا اور چولہا جلا کر چائے کی کیتلی اوپر چڑھا دی۔

فیصل نے کیتلی چولہے سے ہٹائی، میرے لائے ہوئے کپڑے، ایک ایک سوٹ جسے خریدنے میں مَیں نے گھنٹوں صرف کئے تھے، گیس کے چولہے کے حوالے کر دیئے۔ سب کچھ جلنے لگا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ میرا محبوب فیصل میرا مجازی خدا بن کر مجھے ڈانٹ رہا تھا۔ میرے نئے سوٹ جل رہے تھے۔ میں اپنی رگوں میں ایک سرد سیال مادہ بہتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دل دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ بے حد ڈر۔

"اور ہاں چندی سے بھی روز روز ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میرے خاوند نے حکم صادر کیا۔

"کیا؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں حیران ہو گئی، کیونکہ انھیں اچھی طرح پتہ تھا کہ جندی میری جند جان تھی۔ میری دوست بہن تھی۔

ہر شادی شدہ عورت کو چاہیئے کہ صرف اپنے گھر، میاں اور بچوں میں دلچسپی لے۔ اسی دائرے میں زندگی گزارے۔ ماں باپ، بہن بھائی اتنے اہم نہیں کہ اپ گھر کو نظر انداز کر کے گلچھڑے اڑاتی پھریں۔" وہ گرجا۔

فوراً ایک بار پھر خوف اور میں ایک دوسرے کے ساتھ گلے میں باہیں ڈال کر بیٹھ گئے۔ خوف نے مجھے ملفوف کر لیا۔ گھیر لیا۔ محفوظ کر لیا۔

سندباد نے سوچا اس بوڑھے کی قید سے شاید وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکے گا۔ شاید اسے ہمیشہ ہی اس کے ساتھ ساتھ رہنا ہوگا۔ اس کی تنگی، گھٹن، تکلیف زبردستی اُسے ہمیشہ برداشت کرنا ہوگی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی شاید نہیں تھا۔ اس کی قوت مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

جب نایاب پیدا ہوا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے ٹھان لیا کہ اس مرد کو میں بناؤں گی۔ اپنے ہاتھوں سے ڈھالوں گی اس کی تعمیر کروں گی۔ میں سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہی۔ میں اس کی ماں تھی اور وہ میرا احتاج تھا۔

پھر اس نے سکول بھی جانا شروع کر دیا۔ وقت کو نہ جانے کیا جلدی ہوتی ہے۔ بس دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی نایاب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے میں تھک جاتی مگر وہ نہ تھکتا۔ وہ سیماب صفت تھا۔ میں اس کو تکتی رہتی۔ وہ میرا لگایا ہوا پودا تھا۔ میرا اپنا تھا۔ میرا اس پر اختیار تھا۔ میرے اپنے آنگن کے پچھواڑے نظر آنے والا میرا ذاتی چاند تھا۔

رات کو میں اسے لوری سناتی اور آخری بار شب بخیر کہنے سے پہلے کتنی ہی بار وہ مجھ سے "اچھا بس ایک بار اور ایک بار اور" کہہ کر لوری سنتا چلا جاتا۔ میرے بھائی کی طرح میرے گالوں پر آخری بوسے دیئے جاتا۔ وہ میرا معصوم شہزادہ تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سو جاتا اور پھر میں ہاتھ چھڑا کر دبے پاؤں اس کے کمرے سے نکل آتی۔

ہم گاڑی میں باہر جاتے تو وہ پچھلی سیٹوں پر اپنی ننھی منی کھلونا گاڑیاں زوں زوں اور شوں شوں کر کے تیز تیز چلایا کرتا۔ اور میں بے خبر اپنے کار کے ٹیپ ڈیک سے اُٹھنے والی فریدہ خانم، نور جہاں اور مہدی حسن کے گانے سنتے ہوئے گاڑی اُڑائے چلی جاتی۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں مصروف ہوتا اور میں اگلے حصے میں۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ وہ پچھلی سیٹ سے اگلی سیٹ پر میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اس نے اب مجھے ڈرائیونگ کی ہدایات بھی دینا شروع کر دی تھیں۔ مجھے برسوں کے دیکھے بھالے رستوں پر گاڑی چلانا سکھانے لگا جیسے میں کوئی نو آموز ڈرائیور ہوں جیسے میں ان راستوں پر کبھی چلی ہی نہیں تھی۔

اب وہ کھلونا ڈنکی کاروں سے کھیلنا بند کر چکا تھا اور ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے اسے ڈرائیونگ کس طرح آگئی تھی۔ کس وقت آگئی تھی۔ نہ جانے اس کے سانولے سلونے نقوش والے چہرے پر ایک نئی سی سنجیدگی نے کب سے ڈیرے جمائے تھے۔ نہ جانے وہ کب اتنا بڑا ہو گیا تھا۔ کب اس کے بھرے بھرے لبوں کے اوپر ایک ہلکا ہلکا سرمئی سا سایہ نمودار ہو گیا۔ کون سے لمحے اتنا لمبا قد نکال لیا تھا کہ اب اسے ڈرائیونگ کرتے وقت میری جمائی ہوئی سیٹ کو لیور کے ذریعے پیچھے لے جا کر اپنی ٹانگوں کی لمبائی کی وجہ سے ایڈجسٹ کرنا پڑتا تھا۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بے خبری میں کہاں سے کہاں تک آگیا تھا۔ میں سوچ رہی جا رہی تھی کہ یہ کیسی دوڑ تھی؟ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اب جبکہ وہ ماشاءاللہ سترھویں سال میں قدم رکھ چکا ہے، میں اس کی حیثیت کو تسلیم کرنے لگی ہوں۔ اس کو بڑا ماننے لگی ہوں۔ اب

جب ہم گاڑی میں بیٹھتے ہیں تو وہ ڈرائیو کرتا ہے اور آرام سے مجھ سے پوچھے بغیر میری اردو گانوں کی کیسٹ نکال کر اپنی انگلش موسیقی کی کیسٹ لگا لیتا ہے جیسے اُسے اس کا مکمل حق حاصل ہو میں خاموشی سے دیکھتی رہتی ہوں، کچھ نہیں کہتی۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ بے پناہ بارش ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نایاب کو سکول سے پک اپ کرنے کے لئے ہوم اکنامکس کالج والے فوارے تک جا رہی تھی۔ وہاں سے دوسرے سکول سے مجھے اپنی بیٹی کو لینا تھا۔ چھٹی کا وقت تھا رش بہت زیادہ تھا۔ پانی میں گلبرگ کی مین بلیوارڈ تقریباً ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹریفک بمپر ٹو بمپر تھی۔

میں بڑی احتیاط سے ڈرتے ڈرتے بچا بچا انداز میں گاڑی چلا رہی تھی کہ کہیں گاڑی پھسل نہ جائے۔ کہیں انجن میں پانی نہ گھس جائے گاڑی کسی اگلی گاڑی سے نہ ٹکرا جائے کہ یکایک نایاب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "امی پلیز میری سیٹ پر آ جائیں اور مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے خفگی سے پوچھا۔

"آپ پانی کی وجہ سے نروس ڈرائیونگ کر رہی ہیں۔ ابھی گاڑی کو اگلی گاڑی سے ٹکرانے لگی تھیں۔" وہ سکون سے بولا۔

جی چاہا اپنے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کر دوں۔ آخر اس نے مجھے سمجھا کیا تھا۔ کیا میں نااہل تھی؟ اُس سے کمتر تھی؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک مرد تھا اور میں ایک عورت تھی اور اس سے عقل اور شعور میں کم تھی؟

لیکن میں خاموش رہی۔ اس سے کچھ نہ کہا۔ کیا خبر وہ کیسے ری ایکٹ کرے۔ کیا خبر یہ بھی مجھے ڈانٹ دے یا ایسی کوئی بات زبان سے نکال دے کہ میری دل آزاری ہو۔ میرا یہ بھرم قائم رہنا ہی چاہیئے۔ مجھے گہرے بادلوں کے اُس پار دھنک دیکھنے کی امید کی عادت ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

سندباد نے اس مکروہ سوکھی ٹانگوں والے بوڑھے کو ایک دن شراب پلا دی۔ نشے کی وجہ سے بوڑھے کی گرفت سندباد کی گردن کے گرد کچھ نرم ہو گئی تھی اور اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر سندباد نے اُسے ایسی پٹخنی دی کہ وہ دور جا گرا اور سندباد اس کی قید سے آزاد ہو گیا۔

مجھے پھر بھی کسی نہ کسی کا، کسی نہ کسی بات کا خوف ہمیشہ رہے گا۔ ڈر ہمیشہ میرا ساتھی رہے گا۔ میں اس سے کبھی نجات حاصل نہیں کر سکوں گی میں جانتی ہوں اور اس حقیقت کو قبول بھی کرتی ہوں۔ اس سے سمجھوتا اپنی مرضی اور خوشی سے کرتی ہوں۔

"اچھا بیٹا آپ ہی ڈرائیو کر لیں!" میں نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے کو گاڑی کی چابی دی اور باہر گرتی ہوئی بارش کا نظارہ کرنے لگی۔

دو کٹی ہوئی اُنگلیاں

یوسف چوہدری

لندن کے نواح میں واقع ایک ٹاؤن میں پلاسٹک فیکٹری کے اندر مشینوں پر کام کرتے ہوئے آپریٹر — نائٹ شفٹ بدل رہی ہے، صبح کے آپریٹر آکر چارج لے رہے ہیں۔ سرد خزاں آلود تاریک صبح ہے اور مشینوں کا اَن تھک، اعصاب شکن شور — ایک تیز انسانی چیخ نشتر بن کر شور کی رگیں کھول دیتی ہے۔

(۱)

اُسی دوپہر مشین نمبر ایک پر گفتگو . . . . .

"بس کچھ پتہ ہی نہ چلا یہ حادثہ کیسے ہُوا؟ وہ سات نمبر مشین پر کام کر رہا تھا۔ صبح والا آپریٹر بھی پاس کھڑا تھا۔ اُس نے نوزل کے پچھلے حصے کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر فالتو پلاسٹک آگے دھکیلنا چاہا — مگر پیچھے سے پلنجر آگیا، اور اُس کے دائیں ہاتھ کی شہادت اور اُس کے ساتھ والی اُنگلی کٹ کر پگھلتے پلاسٹک میں بس غائب — جوان آدمی ہے اور پھر ہمارا ہم وطن — شفٹ ختم ہوتے ہی اسپتال جاکر حال معلوم کریں گے — اکیلا ہی ہے پردیس میں، فیملی کے بغیر — اچھا تم ذرا یہاں سے کھسک جاؤ۔ وہ سامنے فورمین آرہا ہے۔ حادثے کی وجہ سے اُس کا موڈ آج بگڑا ہوا ہے۔"

(۲)

اُسی دوپہر مشین نمبر دو یہ مکالمہ سنتی ہے . . . .

"تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کہیں نشے میں تو نہیں تھا —؟"

"کیا بکتے ہو یار؟ وہ بڑا جی دار، چھریتلا جوان ہے۔ بس قسمت سالی خراب تھی بے چارے کی۔ اگر نشے میں انگلیاں کٹنے لگیں تو میں تمہارے سامنے آج سالم موجود نہ ہوتا! واہگورو کی سوں! پوری پوری بوتل پی کر مشینوں پر سر کھپایا ہے۔ کیا مجال جو کبھی اُنیس بیس کا فرق نکلا ہو؟ خیر آج فیکٹری میں سارے پاکستانی اُداس ہیں۔"

"تم بھی عجیب ہو! اُداس نہ ہوں گے تو اور کیا؟ — اُن کا بھائی بند جو ہُوا۔"

"یار تم سے کتنی بار کہا ہے۔ اس ولایت میں ہم سب بھائی بند ہیں — مزدور ہیں مزدور! یہ وطنوں کے جھگڑے وطنوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہاں تو گورے کا راج ہے — ذرا ایک کام تو کرتا جا — میرے تھرماس میں ایک کوارٹر وسکی تو ملا کر لے آ — واہگورو کی سوں — آج کام سخت ہے اور جی اُداس —"

"چپ کر سالے — پینے کے بہانے ہی ڈھونڈتا رہتا ہے!"

(۳)

اُسی دوپہر مشین نمبر تین پر کام میں منہمک آپریٹر کے ذہن کی سوچ ۔ ۔ ۔ ۔

"بیوقوف لڑکے کے ساتھ آج کیا بیتی ؟ واپس ویسٹ انڈیز میں میرا بڑا لڑکا بھی اسی کا ہم عمر ہوگا ۔ میں یہاں یونین کا شاپ سٹیورڈ ہوں ۔ وہ میرا ہم رنگ آدمی ہے ۔ میں اُس کی مدد کر دوں گا ۔ او گاڈ ! یہاں ہم سے کتنے کم پیسوں سے کتنی زیادہ مشقت لیتے ہیں ۔ سفید فام تو بہت کم یہاں ٹکتے ہیں ۔"

(۴)

مشین نمبر چار جو کہ آٹو میٹک ہے ۔ اس کے سامنے بیٹھا نیا چارج ہینڈ بڑبڑاتا ہے ۔

"یہ بیٹھے بٹھائے کیا فتنہ کھڑا ہوگیا ؟ او بھگوان ! کتنا مشکل ہے یہاں چارج ہینڈ بننا ؟ کہیں یہ حادثہ میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے ۔ افسرانِ بالا مجھے آگے رکھ کر اُلٹے سیدھے بیانات دینے یا دلوانے پر مجبور نہ کریں ۔ میں کہیں ایشیائی مزدوروں کی اعانت سے محروم نہ ہو جاؤں ۔ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا ۔ میں فیکٹری انتظامیہ کی مہربانی سے بھی ہاتھ دھونا نہیں چاہتا ۔ پچھلے سال مزدوروں کی ہڑتال تڑوانے میں میرا وزن اور وقار بڑھا تھا ۔ تبھی تو یہاں مزے سے بیٹھا ہوں ۔ بھگوان کی دیا سے تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے ۔ ۔ بس ذرا ڈر لگ رہا ہے ۔ آپریٹر نمبر چھ سوبارہ کی انگلیوں کے ساتھ میرا بھی پتہ نہ کٹ جائے کہیں ؟"

(۵)

اُسی دوپہر مشین نمبر پانچ پر لمبا تڑنگا سفید فام آپریٹر اپنے قریب کھڑی گرل فرینڈ کی پیٹھ پر دھپ جماتا ہے ۔

"کیا کرتے ہو جان ؟ سب اِدھر دیکھنے لگے ہیں ۔"

"اچھا نہیں کیا ؟ انہیں دکھانے کے لئے ہی تو کرتا ہوں ۔ ذرا سب کی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے ۔"

"تمہارے کا باتیں بیل کے گوبر سے بھی گندی ہیں ۔ چھوڑو ! سنا ہے تم صبح کے حادثے میں اُس کے ساتھ اسپتال گئے تھے ۔ وہاں کیا ہوا ؟ ۔ وہ کیسا ہے اب ؟ ویسے تمہاری اس حرکت کو دیکھ کر ایک دن اُس نے بھی میری پیٹھ پر دھپ جمادی تھی ۔ ناسمجھ بچہ ۔ ٹش ۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر بات سمیٹتی ہے ۔

"تم جانو ! اسپتال والوں نے اُس کی پیٹھ سے کھال اُتار کر اُس کی کٹی انگلیوں پر منڈھ دی ہے ۔ ویسے خون بہت ضائع ہوا ۔"

"اوہ گاڈ ! خون کا نام نہ لو ۔ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے ۔"

"اچھا ہے جو تم عورتیں فنشنگ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہو ۔ انگلیاں کٹنے سے تو بچی ہوئی ہیں ۔ ویسے یونین اور قانون کی مدد مل جائے تو ہمارے زخمی دوست کی کافی مدد ہو سکتی ہے ۔ خیر ان لوگوں کو ابھی اپنے حقوق کی پہچان بہت کم ہے اور تم سنو ! اب اگر کبھی وہ تمہاری پیٹھ پر دھپ جمائے تو خفا مت ہونا ۔ کیونکہ اُس دھپ میں یقیناً دو انگلیاں کم ہو چکی ہیں ۔"

(۶)

اُسی دوپہر مشین نمبر چھ پر پختہ عمر پولش آپریٹر کی پٹرول انسپکٹر سے گفتگو ۔ ۔ ۔ ۔

"تمہاری دانست میں فیکٹری انتظامیہ کا کیا ردِ عمل ہے؟"

"ردِ عمل — ردِ عمل کیا؟ لندن سے اڈیشنل انجینئر اور چیف انجینئر کو بلوا کر کچھ ہی دیر میں مشین کو او۔کے کروا دیا جائے گا — میں نے بھی اُڑتی اُڑتی سنی ہے۔ کسی سے کہنا نہیں۔"

"تم فکر نہ کرو — خیر وہ اگر میرا ہم مذہب ہوتا تو میں اس کے لئے مزید غمزدہ ہو سکتا تھا۔ کتنی خوش گوار حیرت کی بات ہے کہ پوپ کا تعلق پولینڈ سے ہے — ایں — کیا کہتے ہو؟ پٹرول انسپکٹر مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہے — تو پولش آپریٹر سرگرمی سے کام میں جُت جاتا ہے۔ اس کی پروڈکشن کا گراف آج کل نیچے آنے لگا ہے۔ پچھلے ہفتے بونس بھی کم ملا۔ پروڈکشن — پروڈکشن — !

(۷)

سات نمبر مشین گم سم۔ علامت زدگی کا شکار۔ بغیر آپریٹر نمبر چھ سو بارہ کے خاموش ہے۔ اُسے کئی عارضے لاحق ہیں۔ اُس کے برقی اعصابی نظام میں خلل آ رہا ہے اور کئی بار وہ اپنے آپ میں نہیں رہی۔ وہ باؤلی، پرانی مشین فیکٹری کا انجینئروں کی منتظر ہے جو اُسے او۔کے کا سرٹیفکیٹ دے کر نئی صحت کی نوید سنائیں گے — ریپوٹیشن — ! ریپوٹیشن — ! مشین اپنے پاس فرش پر خون کے جمے قطرے دیکھتی ہے — جو سیاہی مائل ہو چکے ہیں۔

(۸)

آٹھ نمبر مشین پر خرابی ہے — شفٹ ختم ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ سفید فام آپریٹر جو کہ بوڑھا اور خبطی مشہور ہے، ایک لحظہ فورمین کو مشین ٹول سیٹ کرتے دیکھتا ہے — اور کہتا ہے "نوجوان اور غیر تربیت یافتہ آدمی کو بھرتی کیا جائے تو ایسے ہی حادثے ہوا کرتے ہیں۔ ویسے بھی ان تارکینِ وطن کا سیلاب آیا ہوا ہے — پیسہ — پیسہ — پیسہ — تم مان لو کہ سفید فام نسل کا دماغ اعلیٰ ترین معیار کا ہے۔ ویسے مجھے اس کی انگلیاں کٹ جانے کا افسوس ہے۔ اُسے چاہیئے کہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔ آخر ایک دن ان سب کو یہاں سے جانا تو پڑے گا۔ خود چلے جائیں تو" فورمین ٹول سیٹ کر کے اُسے آگے پیچھے حرکت دے کر کہتا ہے "افسوس آج نازی ہٹلر زندہ ہوتا — تو تمہاری ہاں میں ہاں ضرور ملاتا۔ تمہارے دماغ کی فضیلت سے زیادہ مجھے اُس کے ہاتھوں کی مشقت زیادہ لطف دیا کرتی ہے — ہاں! اب ٹول گڑبڑ کرے تو تھوڑا سا بریکیٹ کر دینا۔ دماغ کا استعمال تو تم بخوبی جانتے ہو گے" فورمین آگے بڑھ جاتا ہے۔

(۹)

شفٹ ختم ہونے سے کچھ دیر قبل — مشین نمبر نو پر، تیزی سے کام کرتے ہوئے آپریٹر کے جسم کے تمام عضلات پھڑک رہے ہیں۔ اُس کے ذہن میں بھی سوچوں کے ہل کا پھل گہری لکیریں ڈال رہا ہے۔ آنے والے وقت میں ڈالے جانے والے بیجوں کا کچھ حال — "اچھا ہوا یہ حادثہ ہوا! مجھے نظر انداز کر کے مسٹر مہتہ کو چارج ہینڈ بنا دیا گیا۔ ہڑتال تڑوانے میں میری بھی کچھ کم کوشش نہ تھی۔ حادثے کا شکار شخص میرا ہم وطن ہے۔ میں یونین میں اُس کے حق میں اندرونِ خانہ آواز اُٹھاؤں گا۔ اُس کی راہنمائی کروں گا تاکہ کسی طور انتظامیہ میری قدر و منزلت پہچانے — کیا ہی اچھا ہو مشین کے نقص کی ذمہ داری چارج ہینڈ مسٹر مہتہ کے سر آئے۔ بہر حال میں حالات پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ کیا پتہ؟ دوسرے سیکشن میں سپروائزر کا جاب مل جائے۔"

(۱۰)

اُسی شام انتظامیہ کے وسیع کمرے میں میٹنگ . . . .

ڈیپارٹمنٹ کا سرپرستِ اعلیٰ کہتا ہے "حضرات! دونوں انجینئروں نے مشین کو بے ضرر اور درست قرار دیا ہے۔ ابھی اسی وقت کوئی آپریٹر مشین پر لگا دیا جائے۔ فیکٹری کے اندر صفائی اور حفاظتی اقدامات پر نگاہ رکھیں! کیا پتہ محکمہ ہیلتھ اینڈ سیفٹی کوئی مصیبت کھڑی کر دے۔ میں فیکٹری انشورنس سے رابطہ کئے ہوئے ہوں۔ آپ ہر حال میں فیکٹری کی ریپوٹیشن کو مدِ نظر رکھیں۔ شکریہ۔"

(۱۱)

ایک ہفتہ بعد — صبح دس بجے لیڈی ہیلتھ اینڈ سیفٹی انسپکٹریس فیکٹری معائنے کے لئے، حادثے والے سیکشن میں آتی ہے۔ اُس کے پیچھے فورمین، پرسنل مینجر، مینجر، سیفٹی آفیسر محتاط قدم رکھتے آ رہے ہیں۔ وہ سات نمبر مشین پر آ کر آپریٹر کو کام کرتے دیکھتی ہے: "یہ وہی مشین ہے، حادثے والی؟"

"جی ہاں میڈم!" فورمین مؤدب جواب دیتا ہے۔

لیڈی انسپکٹریس مشین کے پہلو سے چسپاں جاب کارڈ پڑھتی ہے اور آپریٹر کو مشین بند کرنے کا حکم صادر کرتی ہے۔

"مسٹر! اس کارڈ پر لکھا ہے کہ فالتو پلاسٹک علیحدہ تھیلوں میں ڈالے جائیں۔ تم اُس سوراخ میں کیوں ڈال رہے ہو؟"

آپریٹر گھبرا کر کہتا ہے "جی میڈم — فورمین صاحب کا یہی حکم ہے اور پھر میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔"

وہ فورمین کی جانب مڑتی ہے "کیوں مسٹر فورمین! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"میڈم — دراصل — دراصل آج کل میٹریل کی قلت ہے اس لئے ہم اس سوراخ سے فالتو پلاسٹک فیڈ بیک کرنے پر مجبور ہیں۔"

"چاہے اس کے ساتھ کسی انسان کی انگلیاں بھی فیڈ بیک ہو جائیں — کیوں؟"

فورمین کے بولنے سے قبل پرسنل مینجر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ "دیکھئے میڈم! اس سے قبل بھی آپریٹر یہاں سے مشین کو فیڈ بیک کرتے رہے ہیں۔ کبھی کوئی حادثہ نہ ہوا — یہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔"

وہ اس کی سُنی اَن سنی کر کے خود مشین کے اوپر چڑھ کر سوراخ میں ہاتھ ڈال کر نیچے اُترتی ہے "کیسے لوگ ہو تم؟ یہاں اندر کوئی سیفٹی گارڈ تک موجود نہیں۔ مجھے کوئی حیرت نہ ہوگی۔ انگلیاں تو کیا ہاتھ تک گم ہو سکتا ہے۔ میں یقین کرتی ہوں کہ تم فیکٹریوں کے حفاظتی ایکٹ سے بخوبی آگاہ ہو۔"

مینجر تھوک نگل کر بولتا ہے "پتہ نہیں یہ سب کیوں کر ہوا؟ لڑکے کی بس تھوڑی سی انگلیاں . . . ."

"تھوڑی سی انگلیاں! مسٹر مینجر!" — وہ بات کاٹ کر زہرخند سے بولتی ہے۔ "مت بھولو مسٹر مینجر — جو کچھ بھی تمہارا نام ہے یہ دو انگلیاں سلامت ہوں تو مسٹر چرچل کے ہاتھ میں فتح کا نشان بناتی ہیں۔ تمہارے پاس موجود ہیں کہ تم ان کی مدد سے سگریٹ پی رہے ہو — یہ ابھی تک میرے پاس بھی ہیں جو قلم تھام کر اس فیکٹری کے غیر تسلی بخش انتظامات کی رپورٹ لکھیں گی۔ سنو! اس مشین کو تا حکمِ ثانی بند رکھا جائے، جب تک ہمارا محکمہ دوبارہ آ کر چیک نہ کر لے۔ اس پرانی مشین کا یہاں کیا جواز؟ — اچھا جنٹلمین گڈ بائے اینڈ گڈ ڈے —"

جب لیڈی انسپکٹر ڈلیس مشین نمبر تین کے ویسٹ انڈین آپریٹر کے قریب سے گزرتی ہے تو وہ مسرت سے سرشار چلاتا ہے "یسوع مسیح کی قسم! دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت عورت کوئی اور نہیں۔ آئی لو ہر!" (I LOVE HER)

(۱۲)

ٹاؤن کے شاپنگ سنٹر میں واقع سالسیٹر کا گرم آرام دہ کمرہ — چند ہفتوں بعد۔

سفید فام سالسیٹر اپنے سامنے بیٹھے موکل کو دیکھ کر فائلیں سمیٹتا ہے اور شستہ آواز میں جادو پھیلاتا ہے "مسٹر خان! میری مخلصانہ رائے میں آپ کو فیکٹری انشورنس معقول رقم کے علاوہ اُسی فیکٹری میں آسان سی ملازمت بھی آفر کر رہی ہے۔ ذرا لوکل اخبار کا یہ تراشہ پڑھیں جو آپ کے کیس کو مضبوط بنا گیا ہے۔" پھر سالسیٹر خود ہی تراشے کی سرخی پڑھتا ہے "ٹریڈنگ اسٹیٹ کی ایک فرم پر سو پونڈ جرمانہ"۔ تفصیلات میں اس لئے نہیں جاؤں گا کہ یہ جرمانہ آپ کی فیکٹری پر ہوا ہے۔ یہ آپ کے حق میں اچھا ہوا ہے۔ میری مانیں تو آفر قبول کر لیں۔ اگر کوئی احباب ہیں تو ان سے بھی مشورہ کر لیں تاکہ میں اس مسئلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔ گڈ ڈے اینڈ گڈ لک — مسٹر خان" وہ اٹھ کر موکل سے رخصتی ہاتھ ملاتا ہے۔

(۱۳)

ٹاؤن کے رہائشی علاقے میں واقع ایک مکان کی خواب گاہ میں رات کے تیسرے پہر آپریٹر نمبر چھ سو بارہ بھیانک سپنے سے جاگ کر اٹھ بیٹھتا ہے اس کی آنکھیں تنی تنی ہیں اور کانوں میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ کا شور ہے۔ وہ ایک ایسے سپنے سے جاگا ہے جس میں اُس کے جسم پر بے شمار انگلیاں باقاعدہ آہنگ کے ساتھ مارچ کرتی گزر رہی ہیں۔ وہ اُن میں سے دو انگلیاں پکڑ کر ہاتھ سے چپکا لیتا ہے اور بنسری بجاتا ہے۔ مگر یہ کیا؟ بنسری کے سوراخوں سے شور اور سانپ نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے تو ایکا ایکی وہ جاگ پڑتا ہے۔ بستر کے قریب تپائی پر رکھی وٹامن کی گولیاں نکال کر نگلتا ہے۔ اس تیقن کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے وٹامن جسمانی نشوونما کے علاوہ اس کی کٹی انگلیوں کو دوبارہ جڑ سے اُگا دیں۔ وہ سرہانے رکھی بنسری کو شرمندہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور میز پر رکھی کیسٹ ریکارڈر کو آن کر دیتا ہے۔ وہ اپنی وہ ریکارڈ شدہ آواز سنتا ہے جو اُسے خود بھی اجنبی لگتی ہے آواز کے پس منظر میں مشینوں کا شور جاری رہتا ہے "ہیلو — ہیلو — ابا — اماں جان — میں — میں خیریت سے ہوں" پھر چند بے تاب، بے قابو سانسوں کا وقفہ "میرا — یہاں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ٹھیک ہوں جیسا کہ آپ کو علیحدہ خط میں بھی لکھا ہے۔ ہاں چھوٹے بہن بھائیوں کو پیار۔ یہ بتائیں — یہ کہ — کیا گاؤں میں اب بھی سرسوں پھولتی ہے؟ کیا چاندنی اب بھی صحنوں میں آکر آنکھ مچولی کھیلتی ہے؟ اور — اور درختوں کے تنوں پر گلہریاں اب بھی زقند لگا کر چڑھتی ہیں؟ میں واپس آکر انہیں ضرور پکڑوں گا — ضرور" — کیسٹ آواز کی حدود سے آگے سرسرانے لگتی ہے تو وہ بٹن دبا کر کیسٹ بند کر دیتا ہے۔ بستر پر واپس پلٹ کر وہ کانوں میں بجنے والے مشینی شور سے قطع نظر بنسری بجانے کی ناکام سعی کرتا ہے۔ زچ ہو کر اُسے پرے پھینک دیتا ہے اور بلک بلک کر روتا ہے۔ "میں بہت کمزور ہو گیا ہوں، بنسری بجا سکتا ہوں نہ گلہری پکڑ سکتا ہوں۔ یہ شور سا کیسا آ رہا ہے — خدایا — خدایا۔"

(۱۴)

ٹاؤن میں واقع ڈاکٹر کی سرجری — چند دن بعد —

ڈاکٹر مریض کو ہمدردی سے دیکھتا ہے۔ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آپ کٹی انگلیوں کے بارے میں کم سوچا کریں۔ لوگوں کے تو پورے پورے اعضاء کٹ جاتے ہیں اور خوشدلی سے زندہ رہتے ہیں۔ حادثے کا ذہن پر کافی دباؤ ہے۔ یہ کمزوری اور تھکاوٹ

اُسی دباؤ اور خوف کا نتیجہ ہے۔ آپ کی عمر میں جنسی کمزوری بے معنی ہے۔ یہ ادھیڑ عمر لوگوں کے مسائل ہوا کرتے ہیں۔ خود کو کارآمد سمجھئے۔ دیکھئے نا ۔ فیکٹری نے بھی تو آپ کو کارآمد سمجھ کر، معاوضہ دے کر دوبارہ ملازمت دے دی۔ یہ گولیاں لکھے دیتا ہوں۔ باقاعدگی سے لیں۔ چند دنوں بعد طبیعت کا حال کہنے آئیے گا۔ ویسے بھی عورت کے بغیر جنسی کمزوری کا کیسے پتہ چل سکتا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

(۱۵)

چند دن بعد پکاڈلی سرکس کے بدنام علاقے میں واقع ایک ماڈل گرل کے فلیٹ میں ۔

سفید فام ماڈل گرل اپنا برہنہ جسم سمیٹ کر اُس رنگ دار نوجوان کو ہلکے سے پرے کرتی ہے۔ "کیا تم نشے میں ہو؟"

"نن ۔ نہیں۔"

"کہیں تم اینٹی بائیوٹک دوائیں تو نہیں استعمال کر بیٹھے ۔ ہیں؟"

"نہیں! تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"تو پھر کیا معاملہ ہے؟ تم ۔ تم شادی شدہ ہو کیا؟"

وہ خجالت اور اداسی سے بولتا ہے "نہیں ۔ نہیں ۔ بس مجھے بہلاؤ نہیں ۔!"

وہ اس کے قریب آ کر ترشی سے کہتی ہے "تلخ نہ بنو! پیسے واپس نہیں ہوں گے ۔ تمہارے ساتھ کچھ معاملہ ہے؟ بہت سوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، تم ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ جب شادی یا ۔۔۔"

وہ بات چھین لیتا ہے ۔ "یا کیا؟"

وہ عجیب تیقن سے کہتی ہے "یا سچا پیار مل جائے۔"

وہ پھر تلخی کا ہم نوا بنتا ہے ۔ "واہ! دنیا میں تم ہی ایک سچی دانشور رہ گئی ہو ۔" پھر وہ آنکھوں کے اُوپر بھنویں سکیڑتا ہے کہ اُس کی پیشانی کی درمیانی لکیر سے اضطراب آبشار کی طرح گرتا ہے ۔ "مجھے صرف شور تنگ کرتا رہتا ہے مشینوں کا شور ۔ مجھے شک پڑتا ہے، یہیں کہیں سے بھی شور سن رہا ہوں میں ۔"

وہ ہلکی سی حیرت سے پوچھتی ہے ۔ "تم فیکٹری ورکر ہو کیا؟"

وہ جواب دیئے بغیر سیڑھیاں اتر کر غائب ہو جاتا ہے۔ تو وہ گھوم کر کمرے کی دیواروں کو جو کیٹنوں کی طرح اُسے گھورتی ہیں، مخاطب ہوتی ہے ۔ "جذبات مرا نہیں کرتے ۔ صرف وقتی طور پہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں ۔ قصور اس کنوارے نوجوان کا یہ کہ وہ خود ایک دوسرے زنگ آلود جسم سے چمک لینے آیا۔ ٹھیک ہو جائے گا ۔۔ میری تو آج کی رات خوب رونقیں ہوں گی۔ آخر میرے کوٹھے پر جو سب سے پہلے آیا ۔۔ وہ ایک بابرکت معصوم کنوارہ ہی تو تھا ۔ ہاں تو ۔ ۔ ۔ ۔"

(۱۶)

وہی پلاسٹک فیکٹری اور رات کی شفٹ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کے جالی دار کیبن سے قطار در قطار کھڑی شور مچاتی مشینوں کو خوفزدہ انداز میں دیکھتا ہے۔ اور جیب سے روئی کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر کانوں میں ٹھونس کر اپنی جیب سے سکون آور گولی نکال کر نگل لیتا ہے۔ اُس کے ذہن کی سکرین پر سوچوں کی سلائیڈ چلتی ہے ۔ "یہ شور میری جان لے لے گا۔ اُدھر گھر سے جوابی خط میں جلد واپس آنے کا کہا

گیا ہے — شادی کے لئے — بچپن کی منگیتر اور گاؤں — کیا میں شادی کے قابل رہ گیا ہوں ؟ وہ داہنے ہاتھ کی کٹی انگلیوں کو دیکھتا ہے " اُف ! مر جانا اور خودکشی کرنا کتنا عجیب پراسرار اور شاید — یہ کیا ہیبت ناک سوچیں آرہی ہیں ۔ مجھے زندگی کی ضرورت ہونا چاہیئے ۔ مگر زندگی کہاں ہے ؟ — میرے تو احباب بھی اب مجھ سے کترانے لگے ہیں — ذرا ان مشینوں کو تو دیکھو ۔ زمانہ قبل از تاریخ کی بلائیں چنگھاڑ رہی ہوں جیسے ! اور اُن کے سامنے کام کرنے والے آپریٹر ، گویا اُن کے جبڑوں میں دبی ہوئی لاشیں — کیا زندگی نام کی کوئی چیز وطن میں مل جائے گی — کیا واقعی ؟ "

(۱۷)

چند دنوں بعد — پاکستان کے صوبہ پنجاب میں واقع ایک گاؤں میں دعوت کا منظر ۔ شام ڈھل چکی ہے ۔ موسم اپنا نام بہار بتاتا ہے ۔ وسیع دیہاتی حویلی کے باورچی خانے میں کھانا تقسیم کرتے ہوئے وہ عورت اُداس بھی ہے اور خوش بھی — بیٹے کا حادثے والا ہاتھ دیکھ کر اُس کے کلیجے کو ہاتھ پڑ گیا تھا ۔ بیٹے کو اب پاس دیکھ کر دل میں مسرت ناچ اٹھی ہے — صحن میں بچھی دری کے ایک کونے پر وہ بیٹھا اپنی کٹی اُنگلیاں قدرے چھپائے عزیز و اقارب کا شور سنتا ہے ۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن سب کی نرم ، کھُردری ، چھوٹی ، موٹی اور لانبی انگلیوں کی کارکردگی جانچتا ہے ۔ انگلیاں جو روٹی توڑ کر چلتے جبڑوں کے اندر دھکیل رہی ہیں ۔ اس کا باپ ٹھوکا دیتا ہے " کن مسئلوں میں گم ہو ؟ تم بھی کھاؤ بیٹو ! کیا کھانا پینا بھول گئے ؟ ہا ہا ہا — ' باپ یہ کہہ کر دوسروں کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے ۔ تو وہ کھانے کے برتنوں کی جانب پُر جھجھک انداز میں کبھی دایاں ، کبھی بایاں ہاتھ بڑھانے لگتا ہے ۔ لوگوں کے چلتے جبڑوں ، دانتوں اور حلقوموں کے اندر گھلی غذا کی جیخیں اُسے گھیر لیتی ہیں ۔ " کیا کرتے ہو بیٹا ؟ ولایت جا کر داہنے ہاتھ سے کھانا ہی بھول گئے ۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ — دائیں سے — برکت ہوتی ہے ۔ " باپ کی تنبیہہ پر بلا ارادہ یا بے ساختہ اس کا دایاں ہاتھ آگے بڑھ کر ننگا ہو جاتا ہے تو باپ چند لمحلے سُن ہو کر اپنی نصیحت کی غلطی محسوس کرتا ہے ۔

پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہتا ہے " بس ! اب تمہاری شادی ہو جانا چاہیئے ۔ بہت جلد ! "

لوگوں کے چلتے جبڑوں سے مشینوں جیسی گڑگڑاہٹ آنے لگتی ہے ۔ اُسے . . .

(۱۸)

کچھ روز بعد ایک رات ، اپنا نام سہاگ رات بتاتی ہے ۔ دولہا دلہن کا عروسی کمرہ جگمگاتا ہے ۔ سانولی سلونی دیہقانی دلہن تمام رات پردیس سے آئے دولہا کی عجیب و غریب حرکات دیکھ کر متذبذب ہے ۔ اُس کے ذہن میں چھپی سوچیں پڑھی جا سکتی ہیں ۔ " جس ملک سے آتے ہیں وہاں عورتیں کیا مجھ سے زیادہ سمجھدار ، صحت مند اور خوبصورت ہیں ۔ جیسا کہ اکثر باہر ملکوں سے آنے والے کہتے ہیں ؟ میں کہیں زبردستی تو اُس کے پلے نہیں باندھ دی گئی ۔ آخر بچپن کا ناتا ہے ۔ اُسے میری چاہت یا طلب ہوتی ۔ تو اب تک — ؟ اب تک — ؟ یہ شخص تو اپنے آپ میں مگن ہے ۔ ایک آدھ بات کر کے چھت اور دیواروں کو گھورنے لگتا ہے ۔ کیا دیواریں اور چھت مجھ سے زیادہ اہم ہیں ۔ کہیں اس کے دل میں کوئی اور تو نہیں بس رہا ؟ کہیں واقعی میں بدصورت اور بھدی تو نہیں ؟ خدایا ! کیا ہوگا ؟ ۔ اس رات کے بارے میں سہاگنوں کی کہی سُنی باتیں کتنی برعکس ثابت ہو رہی ہیں ۔ ذرا دیکھو ! کروٹ پر کروٹ بدل رہا ہے ۔ کمرے میں بلا وجہ اِدھر سے اُدھر گھومنے لگتا ہے ۔ اے لو وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ہے ۔ ہیں ! یہ کیوں کانوں میں روئی ٹھونس رہا ہے ۔ کہیں کان میں درد تو نہیں ؟ کبھی کبھی منہ میں خدا معلوم کیا بڑبڑاتا ہے ؟ لو وہ پھر جیب سے شیشی نکال کر کوئی گولی کھا رہا ہے ۔ یہ میری طرف پوری قوت سے توجہ کیوں نہیں دیتا ۔ مجھے ہمت کر کے پوچھنا چاہیئے ۔ آخر اُس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے ۔ چلو وہ مجھے پسند کرے یا نہ کرے ۔

مَیں تو اُسے اپنا خاوند مانتی ہوں۔ ماں کہتی ہے ذرا صبر اور پیار سے پیش آؤں۔ وہ برسوں پرائے وطن میں اکیلا رہا ہے۔ کیا اکیلے رہنے والے لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں؟ یہ لو وہ اُٹھ کر میرے پاس آیا چاہتا ہے۔ اُدھر پہلے بھی ایک دو بار سرسری باتیں کر کے پرے چلا گیا تھا۔ اوہ میرے خدا! اب تو وہ میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا ہے۔"

دیہاتی دلہن کا دل مسرت اور انجانے جذبے سے دھڑکتا ہے۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہ سوچتی ہے۔ اُس کا ہاتھ کیوں کپکپاتا ہے؟ ہائیں! وہ کچھ کہہ رہا ہے شاید۔ ذرا سنوں تو ــــ وہ اپنے اندر کی دہلیز سے باہر آ جاتی ہے۔ سنتی ہے اُسے۔ "تم ــ تم اتنے برسوں اس شادی کا انتظار کرتی رہیں۔ کہیں اور کر لی ہوتی۔ میری بات کو دل سے نہ لگانا! میں آج رات اپنے آپ میں نہیں۔ پتہ نہیں کیا اول جلول بکنے لگا ہوں؟"

وہ لرزتی آواز میں بولتی ہے۔ "یہاں ــــ یہ رشتے ناتے ہم لڑکیوں کے بس میں کہاں ہوتے ہیں بھلا ــــ ماں باپ جہاں خوش ــ ہم خوش ــ اور پھر ہم جس کے نام لگ جائیں اس کے انتظار کو عبادت سمجھتی ہیں۔"

وہ اس کے بستر پر لیٹ کر کہتا ہے "کیا میں یقین کر لوں کہ تم نے خود بھی ــــ میرا مطلب ہے خود بھی دل و جان سے ہاں کہا ہے۔ یا ــ یا ماں باپ کی مرضی پر رضامند ہوئی ہو ــ بولو ــ"

دیہاتی دلہن روہانسی ہو جاتی ہے۔ "خدا کے لئے ایسے سوال کیوں کرتے ہیں؟ مجھے پتہ ہے آپ خوبصورت امیر عورتوں کے ملک سے آئے ہیں۔ مجھے صرف اتنا بتا دیں ــ ایک بار بس کر دیں ــــ میں آپ کو کیسی لگی؟ آپ نے تو ابھی تک میرا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ کہیں **آپ مجھ سے نفرت** تو نہیں کرتے؟ بچپن کی منگیتر کئی لوگوں کو پسند نہیں آیا کرتی۔ میں مر جاؤں گی مگر یہاں سے ہرگز نہ جاؤں **گی۔ میں ــــ مجھے** بھی معاف کریں ــ شاید آج رات آپ کی طرح میں بھی اپنے آپ میں نہیں۔"

وہ چپ ہوتی ہے تو وہ ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنا کٹی انگلیوں والا ہاتھ اس کے چہرے کے سامنے لہراتا ہے۔ "یہ مشین میں آ کر کٹ گیا تھا وہاں ــ دیکھو تو کتنا بدنما اور ادھورا سا لگ رہا ہے ــ ہے نا۔ ہے نا ــ کیا پتہ باقی زندگی یہ کیسے ساتھ دے؟ سب کے کہنے پر میں اسے چھپاتا رہا ــ لو میں نے اسے تمہارے سامنے ننگا رکھ دیا ہے۔ تمہیں یہ بہت برا لگ رہا ہوگا۔ جب یہ کٹ گیا تھا نا تو مجھے راتوں کو شور اور خواب ڈرایا کرتے تھے۔ میں راتوں کو اکثر دُھلے برتن دوبارہ دھوتا۔ اپنا کمرہ اور اس میں رکھی اشیاء کو بار بار صاف کرتا۔ جنبری بجانے کی کوشش کرتا تاکہ رات کٹے اور صبح آئے۔ کبھی کبھی ہلکی بیزار کن غنودگی میں میری دونوں کٹی انگلیاں میرے سر کو ٹٹولتیں، شانوں پر رینگتیں ــ میرے ہاتھ میں آ کر خود بخود جڑ جاتیں۔ مگر جب ہوش آتا ــ تو ــ خیر تم یہ میرا ہاتھ تھام لو ــ دیکھو تو کتنا خوفناک کھلونا لگ رہا ہے میرا ہاتھ ــ ذرا دیوار پر اس کا بدوضع سایہ تو دیکھو کیا کہتی ہو؟"

وہ کچھ نہیں کہتی۔ گھونگھٹ اُلٹ کر اُس کی کٹی انگلیوں پر سُرخی لبے لب رکھ دیتی ہے۔ ساتھ ہی محبت کے قاصد بن کر دو آنسو آنکھوں سے بہہ کر ہاتھ تر کر دیتے ہیں۔

انگلستان میں مقیم شدہ سابقہ آپریٹر نمبر چھ سو بارہ اب وطن میں مقیم مسمی محمد خان اپنے جسم میں رنگ، توانائی اور نور کی لہریں تڑپتے پاتا ہے۔ وہ اپنی دیہاتی دلہن کو آغوش میں لے کر عروسی کمرے کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ دلہن ڈھیروں جہیز لائی ہے۔ وہ کمرے کے ایک کونے کی جانب کٹی انگلیوں والا ہاتھ بڑھا کر اشارہ کر کے کہتا ہے ــ "تم ــ تم بہت اچھی ہو ــــ مجھے اپنی ماں کی قسم! تم بہت اچھی ہو ــ لیکن ــ مجھے خوش اور زندہ دیکھنا چاہتی ہو ــ تو ــــ بس ــ بس ــ یہ سلائی مشین جو تم ساتھ لائی ہو کہیں دور پھنکوا دو۔"

پیلی سرسوں

• ایوب احتق

ہمارے محلے میں بہت سے گھر ایسے ہیں جن کے سربراہ سمندر پار کے ملکوں میں نوکریاں کر رہے ہیں۔ ان سب کے اپنے مکان ہیں۔ بیوی، بچے یہاں خوش ہیں۔ گھر سامان سے اور بنک پیسوں سے بھر رہے ہیں۔ بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ کل انکل عظمت بیگ کی بیگم ہمارے گھر آئیں تو بڑی خوش تھیں۔ کہنے لگیں کہ گڈو کے ابا کے ایگریمنٹ کی معیاد بڑھ گئی ہے چنانچہ اب وہ مزید دو سال سعودی عرب رہیں گے۔ پھر ہم یہ والا مکان کرایے پر چڑھا دیں گے اور "ہارلے اسٹریٹ" میں اچھی سی کوٹھی بنوائیں گے۔

آنٹی تو چلی گئیں لیکن میں تادیر بیٹھا ماضی کے ان لمحوں میں بھٹکتا پھرا جن کی یاد آتے ہی میں گہرے پانیوں میں پتھر کی طرح گرتا محسوس کرتا ہوں۔ یہ وہ دن تھے جب کالج سے چھٹیاں ہوئیں اور میں گاؤں جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ شہر سے دور پہاڑوں پر آباد اس گاؤں میں جہاں میرے نانا، نانی کی شفقتیں اپنے خلوص کے بازو کھولے مجھے اپنے سینے سے چپکا لیتی تھیں۔

جب میں گاؤں میں ہوتا تو حبس گھر بھی جاتا، وہاں کے لوگوں کے چہرے محبت سے کھل اٹھتے۔ میں ان کے سچے پیار اور بکھرے جذبوں کو سمیٹ کر اتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا کہ دل شہر کی بوجھل، تکلف بھری اور کاروباری دنیا سے اُچاٹ ہو جاتا اور یہی جی چاہتا کہ یہیں رہنا شروع کر دوں۔

جب بیریوں پر بیر آتے تو میں اور میرے ساتھی سارا دن جنگل میں بیر کھاتے، گھومتے پھرتے، تھک جاتے تو انہی گھنی بیریوں تلے چادریں تان کے کھیتوں کے دھڑوں پر سو جاتے۔ شام کو گھر لوٹتے تو نانا، نانی اور ماسیاں خوب لعن طعن کرتیں۔ رات ہوتی تو اِدھر اُدھر کی ڈھوکوں سے عورتیں، مرد اور بچے لالٹینیں اُٹھائے آ پہنچتے اور پھر آگ کے الاؤ کے گرد ہم رات گئے تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ مردوں کے ساتھ بعض عورتیں بھی حقے کے کش لگاتیں اور کمرہ تمباکو اور لکڑیوں کے دھوئیں سے بھر جاتا۔

ماسی اعظماں ہتھیلیوں پر تمباکو رگڑ کر اور ذرا سا گُڑ چبا کر اس میں ڈالتی اور حقے کی ٹوپی میں بھر کر حقہ دادی بھاگاں کو دیتی اور کہتی "ماں ! پی۔ تجھے پتہ چلے کہ ہاتھوں میں بھی مٹھاس ہوتی ہے۔ پتہ نہیں تو کیسا تمباکو بھرتی ہے گلا دُکھنے لگتا ہے۔"

انہی ڈھوکوں پر ایک لڑکی رہتی تھی۔ جس کی شادی ہوئے اُس وقت یہی کوئی ایک برس ہوا ہوگا۔ شادی کے دو ماہ بعد اس کا گھروالا انگلینڈ چلا گیا تھا۔ یہ لڑکی، شادو، مجھے بہنوں کا سا پیار دیتی اور کہتی "اختر، تو کچھ عرصہ اِدھر ہی رہ ہمارے پاس۔ دودھ، مکھن کھائے گا تو خوب گبھرو نکلے گا۔ تجھے لسی پلاؤں گی اور میٹھے روٹ بھی کھلاؤں گی۔"

اور میں کہتا "شادو! تم خود تو اتنی کمزور ہو، تمہارا تو رنگ بھی ہلدی ہوتا جا رہا ہے۔ تم خود بھی کچھ کھایا پیا کرو۔"
شادو مسکرا کر چُپ ہو جاتی۔

میں اُس وقت بچہ تو نہ تھا تاہم مجھے پتہ نہ چل سکا کہ آخر اتنی تندرست شادو کی صحت روز بروز کیوں گر رہی ہے۔ اس نے آخر کون سا ایسا دُکھ پال رکھا ہے جو اس کی صحت کو کھائے جا رہا ہے۔

ایک دن جب وہ گدھوں پہ لدی جندریوں میں گھڑے رکھ رہی تھی، میں نے کہا "پانی بھرنے جا رہی ہو شادو؟"
کہنے لگی "ہاں پر تو اِدھر ہی رہ ماہی کے پاس۔ پانی دُور ہے تُو تھک جائے گا۔" مگر میں نے ضد کی تو مان گئی۔
میں نے راستے میں اُس سے پوچھا "شادو! کیا بات ہے؟ تو اتنی کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ تو ہر وقت بُجھی بُجھی سی کیوں رہتی ہے ــــ تُو تو بڑی ہنس مکھ ہوا کرتی تھی؟"

وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھنے لگی اور بولی "تو کسی کو بتائے گا تو نہیں؟"
میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں نے کہا، "اس کے ساتھ ہی میں کوشش کروں گا کہ تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"مدد وَدد تو خیر کیا کرے گا۔ بس کسی سے کہنا نہیں، تجھے پتّے قرآن جو تو کسی کو بتائے . . . . ٹھیک ہے؟"
میں نے کہا "ہاں . . . . ٹھیک ہے۔"

وہ بولی "اختر! شادی کے دو مہینے بعد ہی تیرا بھائی غلام حسین انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے اُسے بہت روکا کہ انگلینڈ نہ جا۔ آخر ایسی کیا ضرورت ہے۔ گھر کا خرچہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ فصل اچھی ہو جاتی ہے، دودھ، مکھن گھر کا ہے اور پھر بھوسہ ہر کٹائی کے بعد اتنا ہو جاتا ہے جسے بیچ کر تین ماہ تو اسی کے خرچ پر گھر کا دال پانی چل جاتا ہے۔ پھر تیری تنخواہ بھی تو ہے، گھر بھی پکے کوٹھوں کا ہے، بارشیں جتنی بھی ہوں آج تک ایک قطرہ چھت سے نہیں ٹپکا۔ تو کیا لوڑ پڑی ہے جو تو دوسری بادشاہیوں میں رُلتا پھرے گھر سے دور، اختر! میں نے اپنی ماں اور باپ سے لڑ جھگڑ کر "صابے والے فقیر" کے مزار پر جا کر دُعائیں اور منتیں مانگ مانگ کر اس سے شادی کی ہے اور یہ ساری برادری والوں کو بھی پتہ ہے میں نے اسے اپنے پیار کے واسطے دیے پر وہ نہ مانا۔ اُس پر تو جیسے انگلینڈ جانے کا بھوت سوار تھا۔ کہنے لگا "شادو! بس ایک دو سال کی بات ہے پھر ساری عمر ادھر ہی تو رہنا ہے۔ تو کملی ہے بالکل، تجھے تو پتہ ہی نہیں ہے کچھ۔ آج کل انگلینڈ جانا کون سا آسان کام ہے۔ میری تو یوں سمجھ لو لاٹری نکل آئی ہے۔ میں لاہور میں جس فرم میں کام کرتا ہوں وہاں ہمارا بڑا افسر انگریز ہے اور وہ خود مجھے باہر بھیج رہا ہے میرے کام سے خوش ہو کر۔ وہ کہتا ہے وہاں تمہیں اور بھی کام سکھلائیں گے اور جب میں وہاں سے مڑ کے آؤں گا تو میری تنخواہ بھی بڑھ جائے گی۔" اور پھر ایک دن غلام حسین کی چٹھی آئی کہ وہ گیارہ کو انگلینڈ جا رہا ہے، اس لئے وہ نو کو گھر آئے گا اور رات رہ کر دس کو واپس چلا جائے گا۔ وہ جب چھٹی آیا تو میں نے پھر بھی ہاتھ جوڑ کے کملے میری بات مان اور نہ جا پر وہ نہ مانا۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ میرا دماغ چل گیا اور میں روٹھ کر ماں کے گھر آ گئی۔ وہ ہمارے گھر آیا اور میں نے اُس کو خوب سنائیں کہ جا تو انگلینڈ جا یہاں کیا لینے آیا ہے۔ وہیں سے کوئی لے آنا جو تیرے ماں باپ کی روٹیاں پکا لے۔ اُس نے بڑا زور لگایا ــ میرے ماں باپ نے مجھے سمجھایا مگر میرا تو دماغ اُلٹ چکا تھا۔ کوئی بھی بات دھیان نہ پڑتی تھی۔ شام کو بابا ــــ اُس کا باپ آ گیا، کہنے لگا۔

یہ اچھی بات نہیں ہے شادو! تم اپنے گھر والے کو ہنسی خوشی رخصت کرو۔ میں جب لام پہ گیا تھا تو تیری ماسی نے مجھے بڑے پیار سے رخصت کیا تھا اور مجھے رومال دیا تھا جس پر اُس نے اپنے ہاتھوں سے پھول بوٹے کاڑھے تھے اور تجھے تو پتہ ہے وہ رومال میں نے فریم کرا کے رکھا ہوا ہے اور پُتر تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ ہم آپس میں کبھی بھی نہیں لڑے جھگڑے اور تُو بھی تو ہماری بیٹی ہے۔ آج اگر تو ہمارے ساتھ اپنے گھر نہیں جاتی تو خاندان والے کیا کہیں گے کہ بابے سلطان اور اس کی زنانی نے شادو کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ہماری ناک کٹ جائے گی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ اور پُتر کسی کی زبان کون روک سکا ہے؟ اور پھر لوگ تو چڑی کا کاں بناتے ہیں۔ دماغ سے کام لے اور چل میرے ساتھ۔ میں چٹی داڑھی والا تجھے لینے آیا ہوں؛" بابے کی باتوں سے میں پگھل رہی تھی۔ فوراً اٹھی اور کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھا کر لیٹ گئی۔ بابا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد غلام حسین پھر آ گیا، اور کہنے لگا۔ "دروازہ کھول!" میں نے جواب دیا "میں کبھی نہ کھولوں گی اور اگر تم نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی تو جان دے دوں گی۔" وہ بھی غصے میں آ گیا اور یہ کہہ کر چلا گیا "ٹھیک ہے اگر تیری یہی مرضی ہے تو پھر تجھے کوئی حق نہیں جو تُو اُس گھر میں قدم رکھے۔ اب ساری عمر یہیں پڑی رہنا۔ اب کوئی بھی تجھے لینے نہ آئے گا اور میری ماں کے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنے اور بابے کے لئے دو وقت کی روٹی پکا لے گی اور انگلینڈ سے واپس آ کر تیرا فیصلہ بھی کر دوں گا اور سُن! اُس وقت پنڈ کی بہت سی لڑکیاں میرے ساتھ بیاہ کرنے پر خوش ہوں گی۔" اور اس طرح غلام حسین غم، غصے اور غضب میں بھرا انگلینڈ جا پہنچا۔ اُسے گئے ابھی دس بارہ دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ مجھے اُس کی یاد ستانے لگی اور اپنی غلطی کا احساس ہر وقت مجھے پریشان رکھنے لگا۔ جی چاہتا ابھی جا کر ماسی اور بابے کے پیر پکڑ لوں اور اُن سے اپنی غلطی کی معافی مانگ کر اپنے گھر رہنے لگوں۔ مگر پھر مجھے اپنی ہٹ دھرمی اور بابے کی باتیں یاد آتیں تو ہمت نہ پڑتی اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ شگفتہ کو تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں میاں بیوی میں بڑا سلوک ہے۔ ریاض اُس کا گھر والا پشاور میں بڑے سرکاری ہسپتال میں ملازم ہے۔ اُنہی دنوں وہ پورے چھ ماہ بعد ایک ہفتے کی چھٹی آیا تو رات ساری ڈھولکوں والے اُس کے گھر گئے۔ ماں نے مجھے بھی چلنے کو کہا مگر میں سر درد کا بہانہ کر کے بیٹھ گئی۔ اگلے دن شگفتہ ملی تو بڑی ناراض تھی۔ کہنے لگی۔ "رات سارے آئے اور تم نہیں آئیں۔ میں نے رات سب کو چینی کی چائے پلائی تھی۔ ریاض پشاور سے سوکھی خوبانیاں اور بڑا مزیدار میوے والا گڑ بھی لایا تھا۔ وہ بھی میں نے سب کو بانٹا، میری ساس تو مجھے کھا جانے والی نظروں سے تک رہی تھی۔ پر شادو! جو مل بیٹھ کر کھانے پینے میں مزہ ہے وہ اکیلے میں کہاں اور پھر اس کی تو برکت بھی بڑی ہوتی ہے۔ رات جب ہم سونے کے کمرے میں گئے تو ریاض پوچھ رہا تھا کہ آج تیری سہیلی شادو نہیں آئی۔ کہیں کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔ مجھے تو پتہ تھا کہ تو کیوں نہیں آئی۔ میں نے ساری بات جب ریاض کو بتائی تو وہ یقین نہیں کر رہا تھا۔ کہنے لگا "شادو تو ایسی نہ تھی یہ تو اُس نے حماقت کی ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ غلام حسین ہمیشہ اُس کی تعریفیں کیا کرتا تھا اور اگر غلام حسین نے یہ کہا ہے کہ وہ اس کا فیصلہ کر دے گا تو یہ سوچنے کی بات ہے کیونکہ غلام حسین کی بات اٹل ہوتی ہے۔" شگفتہ کی ان باتوں سے میں اور پریشان ہو گئی۔ شگفتہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں پر مجھے ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کل دوپہر کو تو میرے ساتھ چلنا۔ میں بابے اور ماسی سے معافی مانگ لوں گی اور مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے معاف بھی کر دیں گے۔"

شادو بولتی چلی گئی۔ "اگلے دن میں جب شگفتہ کے گھر گئی تو شہر سے بھی عورتیں آئی ہوتی تھیں۔ وہ شگفتہ کو مسکراتے ہونٹوں اور ہنستی آنکھوں سے دیکھتیں، مبارک دیتیں اور مہمانوں میں جا بیٹھتیں۔ شگفتہ کا چہرہ خوشی اور شرم سے سُرخ ہو رہا تھا۔

وہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئی " شادو! تو ابھی سے آگئی۔ یہ عورتیں آئی بیٹھی ہیں۔ اُٹھ کر جاتی ہیں تو ہم بابے سلطان کے پاس چلیں گی۔ میں نے پتہ کرایا ہے۔ ماسی تو آج اپنے نواسے برکت کے گھر گئی ہے اُسے کل رات سے بخار ہے۔" پیشی کی بانگ ہلی تو عورتیں اُٹھیں۔ شگفتہ نے اپنی ساس سے اجازت لی اور ہم بابے کی طرف چل دیں۔ بابا گھر کے باہر چھپر تلے چارپائی پر سرہانے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بابے نے ہمیں دور سے آتے دیکھ لیا اور اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں نے شگفتہ سے کہا کہ بابا ہمیں دیکھ کر اندر چلا گیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ بابا معاف نہیں کرے گا۔ شگفتہ ابھی کوئی جواب دینے کو ہی تھی کہ بابا چارپائی اُٹھائے آتا دکھائی دیا۔ تب تک ہم بھی وہاں پہنچ گئیں۔ بابے نے بڑے پیار اور دعاؤں کے ساتھ ہمارے سلام کا جواب دیا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد شگفتہ نے بابے سے کہا۔ " بابا! شادو اپنے کئے پر بہت نادم ہے اور بابا! تُو تو ساری ڈھوکوں کے سردار ہے ہمیں تجھ پر بڑا مان ہے اور تیری رحمدلی سے بھی سارے واقف ہیں۔ تجھے تو پتہ ہے ہم دونوں بچپن کی سہیلیاں ہیں اور بڑا پیار ہے ہمیں ایک دوسرے سے۔ اس نے رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لی ہے۔ تو اسے دل سے معاف کر دے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دے۔"

اور اختر! میں اُس وقت حیران رہ گئی جب بابے نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو موٹے موٹے قطرے بابے کی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ میں فوراً بابے کے پاؤں پڑ گئی اور بابے کے پاؤں اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے۔ بابے نے بڑی شفقت سے مجھے اُٹھایا اور سامنے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا تو شگفتہ نے مجھے سنبھالا دے کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ بابا سرہانے کے نیچے ہاتھ مارنے لگا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔" شادو بیٹی! جا بڑے کمرے سے تمباکو کی تھیلی لے آ۔ گندم والی سکار کے اوپر پڑی ہو گی۔" میں ایک انجانی خوشی سے بھاگی بھاگی گئی اور تمباکو کی تھیلی اُٹھا لائی۔ بابے نے تمباکو بھرا تو میں خود ہی حقے کی ٹوپی پر آگ رکھ کر لے آئی۔ بابے نے لمبا کش لیا اور کہنے لگا " بیٹی! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اُس کو دہرانے کا کیا فائدہ۔ میں کل بھی شہر گیا تھا۔ رمضان دوکاندار سے پوچھا تھا کہ میری کوئی چٹھی تو نہیں آئی؟ وہ کہہ رہا تھا چاچا ابھی تو نہیں آئی جب آئے گی تو تیری ڈھوک کے اسکولی لڑکوں کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ تو بالکل چنتا نہ کر۔ اب جب بھی غلام حسین کی چٹھی آئی تو میں اُسے لکھوا بھیجوں گا کہ شادو اپنے گھر آ گئی ہے، وہ تجھے معاف کر دے گا۔ میں تم دونوں کی ضد سے واقف ہوں۔ غلام حسین نے اگر تجھے کچھ کہہ دیا ہے تو غصے اور رنج سے کہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے اور تمہیں تو پتہ ہے شادی والے دن بھی اس نے مہندی نہیں لگائی تھی۔ لڑکیوں بیچاریوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا میں نے بہتیرا سمجھایا بھی اور کہا کہ "پُتر! یہ ان کے ارمان ہیں، شگن ہیں۔ انہیں آج اپنی من مانیاں کر لینے دے اور مہندی لگانے دے۔" تب غلام حسین بولا " بابا! ایک بات کہوں، ڈانٹے گا تو نہیں؟" میں نے کہا" چل۔ کہہ۔" اس کی آنکھیں جھک گئیں اور بڑی کمزور آواز میں شرماتے شرماتے بولا، بابا! چاچے کرمو کے لڑکے قدوس کی شادی پر میں نے بھی ذرا سی مہندی ہاتھوں پر لگائی تھی، تو شادو نے کہا تھا " غلام حسین! مردوں کے ہاتھ صاف ہی اچھے لگتے ہیں۔ مہندی تو عورتیں اور لڑکیاں لگاتی ہیں۔ مجھے تو ذرا بھی اچھے نہیں لگ رہے تیرے ہاتھ، نہ لگایا کر۔" اور بابا تب سے میں نے مہندی نہ لگانے کی قسم کھالی تھی۔ بابا! تو نے بھی تو رومال فریم کرا کر رکھا ہوا ہے۔ کیا میں شادو کی پسند، ناپسند کا پاس نہ رکھوں؟ اور بابا کل جب میں اُسے ملوں گا تو میرے مہندی والے ہاتھ دیکھ کر وہ کیا کہے گی؟" غلام حسین کی بات میرے پلے پڑی تو میں نے لڑکیوں کو بلا کر انہیں سمجھا دیا کہ غلام حسین کو ڈاکٹر نے مہندی لگانے سے منع کر رکھا ہے اس لئے تم اسے مجبور نہ کرو۔ پر لڑکیاں کہاں ماننے والی تھیں۔ رات سوتے میں غلام حسین کے ہاتھوں پر مہندی لگا دی۔ صبح جب غلام حسین اُٹھا تو آگ بگولا ہو گیا۔

اُسی وقت شہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھ بالکل صاف تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے کیا لگایا۔ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ ان ہاتھوں پر مہندی لگی تھی۔ رہ گئی بات تیری ماسی کی تو وہ تجھے دیکھتے ہی سارا غم، غصہ بھول جائے گی۔ اُسے تو جیسے آنے والے دنوں کے احوال پہلے سے ہی پتہ چل جاتے ہیں۔ برکت کو دوا دینے جانے سے پہلے مجھے کہنے لگی۔" اگر شادو بیٹی آجائے تو اُسے کچھ نہ کہنا، ضد کر گئی تھی، بہت پیار کرتی ہے غلام حسین سے اور جب اُس نے شادو کی بات نہ مانی تو وہ روٹھ کر یہاں کے پاس چلی گئی۔ مجھے پتہ ہے وہ خوش نہیں ہے اس لئے کہے جا رہی ہوں کہ اگر میری بیٹی آئے تو اُسے کچھ کہنا وہنا نہیں۔"

ایک لمبی سانس لے کر شادو بولی۔" چھپر تلے آج پانی کا گھڑا نہیں رکھا تھا۔ میں پانی پینے اندر گئی تو شگفتہ بھی میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ کمرہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہم پانی پی کر وہیں چارپائیوں پر ڈھیر ہو گئیں۔ ماسی شام کو گھر آگئی۔ مجھے دیکھا تو دور سے ہی میری بلائیں لینے لگی اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں مارے شرم کے زمین میں گڑی جا رہی تھی پر ماسی کے پیار اور شفقت نے مجھے اک نیا حوصلہ دیا۔ میں نے ماسی کے پاؤں پکڑ لئے۔ ماسی نے چادر کے پلو سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا" تو کیوں روتی ہے میری بچی۔ اب ایک آنسو بھی تیری آنکھ سے گرا تو میں بھی رو دوں گی۔ ہاں!" اور میں نے ماسی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ماسی میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی۔ بولی" چل پگلی ــ کون سا ایسا قصور ہوا ہے تجھ سے جو ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ ابھی تو تم بچے ہو اور بچے تو لڑتے جھگڑتے اور روٹھتے رہتے ہیں۔ اور روٹھنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ روٹھتے تو وہ ہیں جو معصوم ہوتے ہیں جن کے جذبے سچے، سُچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ پر بچے اب تم لوگوں کی نظر میں بچے نہیں ہو۔ اس لئے اگر تم کوئی غلطی کرو گے تو لوگ یہ نہ کہیں گے کہ بچے ہیں ــ وہ تو خوش ہوں گے، باتیں بنائیں گے، مذاق کریں گے اس لئے جو ہوا سو ہوا اُس کو بھول جاؤ اور پھر ایسا نہ کرنا" چند روز بعد غلام حسین کی چٹھی آئی ــ ماسے نواز کے پُتر غلام محمد نے پڑھ کر سنائی، لکھا تھا۔ "میں یہاں پر خوش ہوں، نوکری اچھی ہے اور آسان بھی۔" اور یہ بھی لکھا تھا کہ" شادو اور اُس کے گھر والوں سے سلام دعا اور لین دین بالکل بند رکھیں میں آتے ہی اُس کا فیصلہ کر دوں گا۔" بابے نے چٹھی سُنی تو غلام حسین کو بُرا بھلا کہنے لگا اور مجھے تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ توے پر روٹی جل کر کوئلہ ہو گئی۔ بابے نے دیکھا تو میرے پاس آبیٹھا اور مجھے دلاسہ دینے لگا اور پھر ماسی کو روٹیاں پکانے کا کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چھپر تلے لے گیا اور کہا" بیٹی! جوان لڑکا ہے ابھی غصہ گیا نہیں پر تو بالکل چنتا نہ کر۔ میں اُسے سمجھا دوں گا۔ میری اجازت کے بغیر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر اس گھر میں وہ اکیلا ہی رہے گا، ہم نہیں ہوں گے۔"

شادو نے آنسوؤں پر ضبط کرتے ہوئے کہا" بابے نے اُسی وقت غلام محمد سے چٹھی لکھوا کر اُسے دے دی کہ وہ کل اسکول جاتے ہوئے ڈاک والے ڈبے میں ڈال دے اور پھر غلام حسین کی چٹھی آنا ہی بند ہو گئی۔ بابا روز سکولی لڑکوں سے پوچھتا کہ کوئی چٹھی تو نہیں آئی؟ ماسی نے تو سر پہ پٹی باندھ لی تھی۔ وہ تو برکت کے نام غلام حسین کی چٹھی آئی تو ذرا حوصلہ ملا کر چلو ہے تو خیریت سے۔ اختر! میں تو ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں کہ کسی دن اچانک غلام حسین آگیا تو پتہ نہیں کیا سلوک کرے گا میرے ساتھ۔ یہ گھر جو پیار سے چھلک رہا ہے، کہیں غم اور غصے کی بھٹی نہ بن جائے۔ بس یہی وہ سوچیں ہیں جو دن رات مجھے گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں اور مجھے اتنا کمزور کر دیا ہے۔ میرے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ میں تو کسی سے فالتو بات کبھی نہیں کرتی ہوں۔ تو میرا بھائی ہے اس لئے یہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ تجھ سے میرا بچپن کا پیار ہے۔"

میں نے شادو کو یقین دلایا کہ اُس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ غلام حسین کو چٹھی بھیجوں گا اُسے سارے حالات لکھوں گا اور وہ جب آئے گا تو اسے وہی پیار دے گا جس کی وہ حقدار ہے۔

میری چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں اس لئے بادلِ نخواستہ راولپنڈی آتے ہی میں نے غلام حسین کو خط لکھا اُسے ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی اور شادو کی صداقت کی قسمیں کھائیں اور خاصا پُر اُمید ہو کر غلام حسین کے خط کا انتظار کرنے لگا۔

دو تین ماہ گزر گئے غلام حسین کا کوئی خط نہ آیا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ میں نے ایک خط بابے سلطان کو لکھا کہ غلام حسین کا کوئی خط آیا ہو تو لکھیں۔

چند دنوں کے بعد بابے سلطان کی طرف سے غلام محمد کا لکھا ہوا خط مجھے ملا۔ لکھا تھا "تمہارے خط سے چند دن پہلے غلام حسین کا خط آیا ہے۔ وہ اگلے ماہ کی پچیس کو واپس آرہا ہے"۔

بابے کا خط پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ چلو خیریت کی اطلاع تو ملی مگر اصل پریشانی ابھی موجود تھی۔ غلام حسین نے عجیب تجسس میں ڈال دیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ ممکن ہے میرا خط غلام حسین کو ملا ہی نہ ہو۔ میں نے کالج سے چار پانچ روز کی چھٹیاں لیں اور گاؤں پہنچ گیا۔ ماسی، بابا اور شادو میرے آنے سے بڑے خوش ہوئے مگر شادو کے چہرے کی زردی اور اداسی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

شام کی چائے کا وقت ہوا تو شادو نے چائے کے برتنوں والا ٹوکرا لا کر چولہانے میں رکھا اور لکڑیاں جلانے لگی تو ماسی نے آکر اُسے کہا "شادو بیٹی! آج تو تیرا بھائی آیا ہے تو جا اُس سے باتیں کر میں چائے بنا کر لے آتی ہوں"۔ اور جب بابے نے بھی اصرار کیا تو شادو میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک دو بار اُس کی طرف دیکھا مگر وہ چُپ چاپ بیٹھی دور نہ جانے کیا تک رہی تھی۔

چھپر کے سامنے دور تک پھیلے سرسبز خطے، پہاڑ، جھاڑیاں، درخت اور سرسوں کے پیلے پھولوں سے بھرے لہلہاتے کھیت بہت بھلے لگ رہے تھے اور میری نظریں بار بار سرسوں کے پیلے پھولوں پر جا رُکتیں۔

شادو کی آواز نے مجھے چونکا دیا "بہت تھک گئے ہو نا۔ چائے پی کر ذرا آرام کر لینا۔ رات تمہیں ملنے سب ڈھولوں والے آئیں گے تو تمہیں نیند نہ آرہی ہو"۔

اگلے دن جب شادو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھی تو میں نے اُسے خوش کرنے کے لئے کہا "غلام حسین کو لینے ماسی اور بابے کے ساتھ تو بھی اڈے پر آنا، دو چوٹیاں بنانا اور وہ سبز رنگ والا سوٹ پہن کر آنا جو غلام حسین کو بہت پسند ہے"۔

میری بات سُن کر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے اُسے بہت دلاسے دیئے اور یقین دلایا کہ غلام حسین تم سے ناراض نہیں ہے تم دیکھنا وہ تمہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔

پچیس تاریخ کو ہم سب اڈے پر کھڑے غلام حسین کا انتظار کر رہے تھے بس کا ہارن سنائی دیا تو سب کی نظریں سڑک کے موڑ پر جم گئیں۔ شادو کا چہرہ خوشی اور گھبراہٹ سے سُرخ ہو رہا تھا۔

بس آکر رُکی تو سب کی نظریں بس کے دروازے پر جم گئیں۔ شادو میرے بالکل ساتھ کھڑی تھی پہ مجھے غلام حسین کا ہنستا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا تو شکر اور شادمانی کی کیفیات سے بے اختیار ہو کر میں نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو آنکھیں بھینچ لیں۔

اچانک میرے وجود پر ایک بوجھ آن گرا۔ میں چونک پڑا، "ارے کیا ہوا شادو؟"

میں نے اُسے سنبھالتے ہوئے ایک نظر بس کی جانب دیکھا۔ غلام حسین کے ساتھ نیلی آنکھوں والی ایک میم اس کا ہاتھ تھامے چلی آرہی تھی۔

ناٹے پتھر — (ایک مونولاگ)

روبینہ راجہ

آج رات آرٹ کونسل میں میوزک پروگرام تھا۔ سب روکتے رہے کہ جانے پھر کب مل بیٹھنے کا موقع ملے سب کا مسلسل اصرار تھا مگر میری ایک ہی رٹ کہ مجھے تو جانا ہے اور آج ہی جانا ہے۔ میرا جی اچھا نہیں ہے اور اچھے جی کے بغیر سب۔ کس طرح اچھا لگ سکتا ہے۔

درخت اور کھمبے اور جھاڑیاں سب دور سے وارفتگی کے ساتھ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آتے ہیں جیسے انھیں ہمارا ہی انتظار تھا۔ ہمیں دیکھ کر مایوسی کے سوا اُن کے ہاتھ کیا آتا ہوگا؟ اب وہ کسی اور کی دارفتہ پذیرائی کے لئے ہمت جمع کر رہے ہوں گے!

ایک سنگ میل گزرا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ میں نے سوچا یہ سنگ میل —— ایک جیسے پتھر —— ناٹے سے —— کیا یہ ایک دوسرے کے لئے اداس نہ ہوتے ہوں گے؟ کیا یہ ناٹا پتھر اپنے ہی جیسے دوسرے پتھر سے مل سکتا ہے؟ ان کے درمیان پھیلے اس فاصلے کو کون پاٹے گا؟

جو فاصلے میرے اور تمہارے درمیان ہیں، انھیں کون پاٹے گا؟ کیا یہ فاصلے ختم ہو سکتے ہیں؟ —— اس نے ڈپٹ کر کہا نہیں ہم انسان ہیں ہم حرکت پر قدرت رکھتے ہیں۔ ہم جامد پتھر نہیں ہیں یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں نہیں آتی؟ اس نے یہ سب کچھ خاصے تیز لہجے میں پوچھا۔

میں اور سہم جاتی ہوں۔ میں اس وقت سے ڈرتی ہوں جب وہ مجھ سے کہے کہ تمہارے دو انچ ماتھے کے پیچھے اتنا سا چٹکی بھر کا بھیجا ہے میں اس توہین سے ڈرتی ہوں۔ میں اپنی بد دماغی سے ڈرتی ہوں۔ میں ہر بات کی واقفیت سے ڈرتی ہوں ——!

گاڑی نے ایک ہچکولا کھایا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے لمبے سبز درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ قریب آتا گیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا گزر گیا۔

انھوں نے پھندنے والی ٹوپیاں اوڑھ رکھی ہیں۔ میں نے مڑ کر انھیں دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ بہت دور تک میں انھیں دیکھتی رہی۔ پھر انھوں نے ایڑیاں اٹھالیں۔ میں نے گردن سیدھی کی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں —— مجھے رونا نہیں چاہئے —— اپنے بارے میں کی گئی پیش گوئیاں غلط ثابت کرنے میں بہت لطف آتا ہے مجھے۔ میں نے خود کو یاد دلایا —— مجھے کبھی بھی نہیں رونا۔ میرے حلق میں اس فیصلے نے جیسے مٹھی بھر ریت ڈال دی ہو —— میں نے تازہ سانس کے لئے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ زمین پر پانی کی ٹکڑیاں نظر آئیں —— باہر سیم اور تھوہر —— اندر سیم اور تھوہر۔

اس دن پرچیاں کھیلتے ہوئے وہ سپاہی بنا اور میں چور۔ پھر وہ مجھے مارنے کے بجائے چپ ہو کر بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا بازو اس کے ہاتھ میں دیا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پھر اس نے کہا: میں نہیں مارتا جبکہ میں نے اس کو وارننگ دی کہ میری باری آئی تو میں معاف نہیں کروں گی، اس نے کہا، نہ کرنا، اور اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے —— سب شور کرنے لگے —— بے ایمانی —— جانب داری!

میں نے اس سے کہا۔ کل تمہارے ہاتھ کیوں لرز رہے تھے؟ بولا۔ دیکھ لینا میں تم سے زیادہ حسین لڑکی سے شادی کروں گا۔ تم

دیکھ لینا۔ وہ جیسے غصے سے پھٹ پڑا۔

ہاں تمہیں یہاں تک ہی سوچنا آتا ہے ـــــ جہاں کوئی لڑکی دیکھی تم لوگ ہو گئے لٹو۔ مگر خاطر جمع رکھو۔ وہ جتنی بھی حسین ہو بہر حال مجھ ایسی نہیں ہوگی۔ میں نے نہایت غصے اور تکبر سے کہا۔

تم خود سوچو! تم ایسے کیوں کرتی ہو؟ جب تم جانتی ہو تم ایسی دنیا میں کوئی لڑکی نہیں ہے پھر تم ایسے کیوں کرتی ہو؟
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس کے آنسو دیکھ کر میرا دل رنج سے بھر گیا۔ اس کو کبھی یہ بات سمجھ نہیں آئے گی۔ اپنا اچھوتا پن مجھے کتنا عزیز ہے۔ مجھے تحیر اچھا لگتا ہے۔ اسے کون بتائے مجھے خوف آتا ہے اس وقت سے جب میں خود کو چھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح محسوس کروں۔

گاڑی ایک جھٹکے سے کچے میں اتر گئی۔ دن دے تھا۔ ویگن کو راستہ دینے کے لئے گاڑی کچے میں اتری تو مسافروں سے بھری ویگن پاس سے گزری اور لوگوں نے اپنی ناکیں شیشوں سے چپکا دیں۔ مضحکہ خیز ـــــ! میں نے منہ پھیر کر اس شخص کو گھورا جو اسٹیرنگ پر بیٹھا تھا اور جس کو ڈی سی نے کہا تھا، تم اتنے ڈرپوک ہو کہ تم زمیندار لگتے ہی نہیں۔ پھر اس نے اچنبھے سے پوچھا تھا، کیا واقعی تم زمیندار ہو؟

کچھ لوگ واقعی وہ نہیں لگتے۔ جو وہ ہوتے ہیں، کچھ لوگ واقعی انسان نہیں ہوتے۔ کچھ واقعی زندہ نہیں ہوتے۔

کوئی یقین کیوں نہیں کرتا کہ کچھ لڑکیاں واقعی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ لوگ کیوں نہیں سمجھ پاتے اس بات کو۔ میں نے سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں کھولیں۔ ترچھے شیشے سے باہر دیکھا۔ آسمان پر پورا چاند ٹھنڈی رسیلی چاندنی بکھیر رہا تھا۔ چاند جیسے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا ہچکولوں سے اور قریب آجاتا تھا۔ میرے دل میں جھانکنے کی کوشش کرتا تھا ـــــ وہ جانتا تھا کتنے لوگ وقت کے کنارے میں آگر خلا برد ہو گئے ہیں کتنے لوگ وقت کے گہرے پانیوں میں اس غوطے کے بعد ابھر کر سامنے آئیں گے۔

چاند میرے دل پر رکھے پہاڑ کو دیکھ سکتا ہے ـــــ میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا ـــــ مجھے چاند جانتا ہے ـــــ! بے اعتنائی اور گمنامی کی گرد جھڑنے لگی ـــــ مجھے چاند جانتا ہے ـــــ!

ایک سانپ میرے دل میں رینگا۔ پھر اس نے سرک کر دوسرے کے لئے جگہ بنائی۔ وہ شک کا زہر پھیلانے لگے ـــــ زہر کہ چاند کچھ نہیں جانتا ـــــ چاند تو یہ تک نہیں جانتا کہ چکور اس کے لئے کتنا بے قرار ہے اور اس کی روشنی سمندر کا کیا حال کرتی ہے۔

نہیں۔ چاند کچھ نہیں جانتا۔

باہر سے ٹھنڈے اور کبھی گرم ہوا کے جھونکے آرہے ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ آخری تاریخوں کا چاند آہستہ آہستہ اوپر آرہا ہے۔ ترچھا اور اداس جیسے کوئی کشتی بدبختی میں پھنسی ہو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کمرشل پائیلٹ نے حیرت کے ساتھ مجھ سے پوچھا،

واقعی آپ کو سگریٹ اچھے نہیں لگتے؟ آپ کو دیکھ کر تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ شغل بھی فرماتی ہوں گی ـــــ!

آپ مردم شناس بالکل نہیں ہیں، میں نے کہا۔

مردم شناس! میں عورت شناس ہوں۔ اس نے عجیب زاویے پر پلکیں روک کر ایک ساں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
آپ وہ بھی نہیں ہیں۔

یہ شخص اپنے حسن کو کیش کراتا ہے۔ اس کی آنکھیں تمام گر جانتی ہیں۔ وہ بیسیوں عورتوں کو انتہا پرلے جا چکا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ اور وہی عورت شناس ہونے کے زعم میں مبتلا ہے۔ وہی کمرشل پائیلٹ خود سے منسوب ہونے والی عورت کے لئے دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ ذہنی عفت کا بھی خواہاں ہے ـــــ! حرامزادہ ـــــ!!

باہر بارش ہو رہی ہے۔ کھڑکیاں بند کرو! آواز گونجتی ہے۔ مختلف ہاتھ کھڑکیاں بند کرتے ہیں۔ کیوں لوگوں کے لہجے کی دھمک حوصلے کوٹ دیتی ہے، اور پہاڑ دل کی طرف سرکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس آواز کے ساتھ ہی میرے سر میں دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ یہ اس شخص کی آواز تھی جس کو ڈی سی نے بزدل کہا تھا ___ بزدلوں کی غراتی ہوئی آوازیں۔ معصوم آوازیں ___ وحشی آوازیں ___ منتظر آوازیں ___ آوازیں ہی آوازیں ___!

پردہ کرو ___ آدمیوں کا کھانا ___ جست، سٹیل، کرسٹل کے برتن ___ بلیاں، بورے میں بند کرا دو۔ غاؤں غاؤں۔ نگرانی ٹی سی میں چھپی مکھن کی ڈبی برآمد کرو ___ ڈھور کا بچہ، جونی والی بھینس ڈی سی کے سامنے کھول کرلے آیا، وہی اس کو دینی پڑ گئی ___ بھونکار بند کرو۔ بچے کو نمونیہ ہے تو ہم کیا کریں۔ اپنا کام مکمل کرو ___ سلاخوں سے جھانکتی ہوئی بندوق کی نال کو کوؤں نے دیکھ لیا، کائیں کائیں ___ بانجھ انصاد والوں نے پانی چرانے والی ٹیوب پکڑ لی، اُن کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا ___ دیکھو اپنے لاڈلے کا حال۔ کھیت میں گھسنے والوں کی ٹانگیں میں نے بیچ بیچ توڑنے کا تو نہیں کہا تھا ___ فلاں جرنل ___ فلاں وزیر ___ بکرے ذبح کرا دو۔ تم تم میں ___؟ تم تم میں ___؟ ہاں ہاں اور میں بھی ___!

آنسو بھری آواز سن کر گاڑی رُک گئی ___ تم بھی زندگی کے راستے میں ہر بات سہنے کے لئے ہو اور میں بھی ___ زنجیریں میرے دونوں پاؤں میں ہیں، میں نے ننھے پتھر کے کان میں کہا۔

میں نے اس کو چوما، گلے سے لگایا۔ اس کا دل سہمی ہوئی چڑیا کی طرح دھڑک رہا ہے، جیسے پتھر توڑ کر باہر آ جائے گا میرے ہاتھ میں۔

بارش تیز ہو گئی ہے اور گاڑی جو غصے سے کھول رہی ہے ایک جھٹکے سے اصل راستے پر مڑ گئی ہے۔

عزیز حامد مدنی

○

رقصِ وحشت کے جلو میں بام و در آتے رہے
بادیہ پیما بگولے سے نظر آتے رہے

کل چمک سے جن کی لرزاں تھا کفِ گوہر فروش
خاک کی تہ میں وہی لعل و گہر آتے رہے

دشت و در میں کھو گئی آشفتگانِ دل کی خاک
بے سروساماں محبت کے سفر آتے رہے

پھول سے کھلتے رہے کیا کیا جنوں کی آنکھ میں
ریزہ ریزہ خواب با مژگانِ تر آتے رہے

ہم نے بھی دیکھیں حریفانہ سبو کی گردشیں
شورشیں اٹھتی رہیں، دَورِ قمر آتے رہے

خواب کے آئینہ گرداں نے کی صورت گری
تیرے رُخ کے زاویے کیا کیا نظر آتے رہے

شبنم آسا خنکیوں میں سو رہی تھی روحِ شہر
کچھ گلِ دیوار میں شعلے سے در آتے رہے

وقت کی تازہ رخی کی رَو میں آخر، روتے یار!
تیرے افسانے بہ عنوانِ دگر آتے رہے

قیدِ موسم نخلِ بارآور پہ لگ سکتی نہ تھی
سلسلے ذوقِ نمو کے کارگر آتے رہے

اپنی خاکستر سے نَو قالب رہی دنیا تمام
اک نئی فرہنگ لے کر دیدہ ور آتے رہے

عالمِ فردا! تری بینا رصد گاہوں کی خیر
جن کی زد پر آفتابِ تازہ تر آتے رہے

قتیل شفائی

○

ساری بستی میں یہ جادو نظر آئے مجھ کو
جو دریچہ بھی کھُلے، تُو نظر آئے مجھ کو

جھانکنا سیکھ لیا میں نے دلوں کے اندر
پھُول کو دیکھوں تو خوشبو نظر آئے مجھ کو

جب بھی مجھ سے مرے حالات نے آنکھیں پھیریں
تیرے پھیلے ہوئے بازو نظر آئے مجھ کو

تُو اُڑی جائے صداؤں کی پہن کر پائل
تیرا نغمہ، رمِ آہو نظر آئے مجھ کو

بند آنکھوں سے کیا کرتا ہوں محسوس تجھے
جب بھی خالی مرا پہلو نظر آئے مجھ کو

میں تو بن جاتا ہوں کچھ دیر کو اس کا بھی غلام
جس کسی میں تری خُو بُو نظر آئے مجھ کو

چاندنی رات میں تیرا یہ مہکتا پیکر!
تو مجسّم گلِ شب بُو نظر آئے مجھ کو

جی میں آتا ہے، وہاں اک نیا میخانہ کھُلے
جس جگہ واعظِ بدخُو نظر آئے مجھ کو

اُس سے مل کر جو خوشی سے کبھی چھلکے ہیں قتیلؔ
موتیوں جیسے وہ آنسو نظر آئے مجھ کو

ضیا جالندھری

○

خون کے دریا بہہ جاتے ہیں خیر اور خیر کے بیچ
اپنے آپ میں سب سچے ہیں مسجد و دَیر کے بیچ

لاگ ہو یا کہ لگن ہو، دونوں ایک دیے کی لویں
ایک ہی روشنی لہراتی ہے پیار اور بَیر کے بیچ

دل میں دُھوپ کھِلے تو اندھیرے چھٹ جاتے ہیں آپ
اب ہم فرق روا نہیں رکھتے یار اور غیر کے بیچ

سوچ سمجھ سب سچ ہے لیکن دل کی بات ہے اور
دُور تھی یوں تو آنکھ بھنور کی، پہنچا تَیر کے بیچ

جاتے ہو، پہ قدم اُٹھنے سے پہلے دھیان رہے
عمر کا فاصلہ ہو سکتا ہے پیر اور پَیر کے بیچ

دیکھتی آنکھ ضیاؔ حیراں ہے دیکھ کے دہر کے رنگ
پل کی پل میں بدل جاتے ہیں منظر سَیر کے بیچ

احمد ظفر

○

جب کوئی خیال بولتا ہے
دروازہ قفس کا کھولتا ہے

منظر کو بدل رہی ہیں آنکھیں
دریا میں سفینہ ڈولتا ہے

تدبیر کے جام میں وہ کیسے
تقدیر کا زہر گھولتا ہے

پتھر کی طرح جمی ہوئی ہیں
آنکھوں کو لہو ٹٹولتا ہے

دِل نام ہے جس کا" وہ پرندہ
چُپ رہ کے بھی کیسے بولتا ہے

ایسے بھی ہُوا ہے، کوئی آنسو
دروازہ خوشی کا کھولتا ہے

فاقے ہیں ظفرؔ نصیب اس کا
موتی جو سخن کے رولتا ہے

محب عارفی

○

بجھی نہ شمعِ شبستاں اگر نہ آئے گا
وہ آ تو جائے مگر کچھ نظر نہ آئے گا

نہ لائے گا بس اُسی کی خبر مرا مخبر
نہیں کہ لے کے وہ کوئی خبر نہ آئے گا

دہن پہ اُس کے مچلتی تھی میری تشنہ لبی
وہ دَور آہ کہ اب لوٹ کر نہ آئے گا

مکان چیخ رہا ہے، یہاں نہیں ہے کوئی
یقین حسرتِ دل کو مگر نہ آئے گا

کچھ اس ادا سے لبھایا گیا ہے دل کو مرے
کہ حرفِ تمکنتِ حسن پر نہ آئے گا

ملالِ عمر ہے جو آرزو بَر آئے گی
قرارِ جاں ہے وہ مطلب جو بر نہ آئیگا

یہ جاننا کہ نہیں ہوں یہ ماننا بھی کہ ہوں
کسی کو میرے سوا یہ ہنر نہ آئے گا

وہ ایک لمحہ مری زندگی کا حاصل ہے
جو میرے ہاتھ کبھی عمر بھر نہ آئے گا

خیال جس تپشِ دل سے کھول اُٹھے گا محبؔ
بھلا کلام میں اس کا اثر نہ آئے گا!

○

روئے زیبا میں کہ دنیا ہے تمنّا کی تمام
آگئی ہے کھینچ کے رعنائی سراپا کی تمام

کب مِلا مجھ کو نشانِ جلوہ گاہِ دیدنی
ہو چکی جب مقدرت ذوقِ تماشا کی تمام

ہائے وہ شعلے سے اقدامِ ہم آغوشی مرا
خاک ہو کر رہ گئی میری ہوسناکی تمام

اُس کو پاؤں بھی نہیں، دامن چھڑاؤں بھی نہیں
کارفرمائی یہی ہے اس کے ایما کی تمام

میری آغوشِ نظر میں ہے اُسے آنے سے عار
جس میں آنِ دلبری ہیں نے ہی پیدا کی تمام

رنگ و بُو سے اُن کے اپنے گھر سدا خالی رہے
جن گلوں نے باغ کو رونق مہیا کی تمام

خود کو مِٹتا جاؤں، بنتا جاؤں، مِٹتا ہی رہوں
ناتمامی چادرِ ہستی ہے دریا کی تمام

خاک ذرہ جانتی ہے، نور کہتا ہے کرن
میرا سکر ہے جہانِ نوری و خاکی تمام

کیا نہ ترسو گے محبؔ اک اور دنیا کے لیے
نعمتیں تم کو اگر مل جائیں دنیا کی تمام

سیّد منیر

○

یہ نہ سمجھو کہ فقط اہلِ سفر پر گزرا
سانحہ ترکِ ملاقات کا گھر گھر گزرا

سبزہ و گل پہ شجاعت کے نشاں ملتے ہیں
پھر مرے شہر کے باغات سے لشکر گزرا

ظرف تھا منتظرِ مے، متقاضی تھی زمیں
ہر نیا شعر مری پیاس بجھا کر گزرا

میری تخریب میں مضمر تھی رہائی میری
زلزلہ شہر کا زنداں کو گرا کر گزرا

خاک پر بادۂ رنگیں کے نشاں عام ہوئے
کس کے وعدوں سے چھلکتا ہوا ساغر گزرا

تیز منجدھار میں بہتے ہوئے کشتی گزری
ساتھ کشتی کے اٹھایا ہوا لنگر گزرا

پھر مجھے زیست کے اسرار سمجھ آنے لگے
پھر مری خانقہِ دل سے قلندر گزرا

حرصِ انسان کے شعلوں کا جہنم نہ بجھا
یوں تو ہر آگ سے پانی کا پیمبر گزرا

موسمِ گل بھی نہ تھا، تم بھی مرے پاس نہ تھے
پھر بھی یادوں سے ہر اک لمحہ معطر گزرا

رات پھر شوق نے پامال کیا مجھ کو منیرؔ
رات پھر دل سے تمناؤں کا لشکر گزرا

سید منیر

○

پہلے نظامِ سلطنتِ غم بہم کروں
پھر حرف حرف رنجِ اطاعت رقم کروں

ڈرتا ہوں میرے دل میں چھپا بھید کھل نہ جائے
لفظوں کو طول دوں کہ ملاقات کم کروں

پہچان لوں اُسے تو زباں سوچنے لگے
بے چہرگی ملے تو قصیدے رقم کروں

تقلیدِ کسبِ فیض ہے عادت نہیں مری
عقدہ کھُلے تو میں سرِ تسلیم خم کروں

تکریمِ ہجر شعر و تصوّف میں عام ہے
جی چاہتا ہے، وصل کو بھی محترم کروں

دُوری تو اک مقامِ تحیّر ہے دوستو
ملتا رہوں تو فیصلۂ مدح و ذم کروں

(ق)

کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی وفا کو میں
رسماً سپردِ قبضۂ دیر و حرم کروں

انسان ہوں کہ مجھ کو گوارا نہیں یہ بات
کیوں نصبِ شہرِ دل پہ کوئی بھی علم کروں

یہ بندگی کی رسم بھی مٹ جائے تو منیرؔ
نقشِ جبیں کو شاملِ نقشِ قدم کروں

○

درد میں ڈوبے دلوں سے آشنائی کیجیے
کوچۂ قصرِ سخاوت میں گدائی کیجیے

محفلوں میں اس قدر مصروفیت اچھی نہیں
موت سے پہلے بھی کچھ مشقِ جدائی کیجیے

ہم چلے آتے تھے رسماً کوئے الفت کی طرف
آپ کا بھی حق ہے، رسماً بے وفائی کیجیے

ڈوبنے والوں میں کوئی پار اُترنا چاہیے
جب خدائی کیجیے، کچھ ناخدائی کیجیے

وضعِ یارانِ ہوس، ہم رنگِ اہلِ درد ہے
پہلے دل پہچانیے، پھر دلربائی کیجیے

ذات کی دریافت کو لازم ہے ترکِ انحصار
خود کو لوں پہچان، یوں بے اعتنائی کیجیے

دلبری کا چاند جب گھٹنے لگے جانِ منیرؔ
پڑھیے ان اشعار کو اور جاں فزائی کیجیے

گوہر ہوشیارپوری

○

خوشبوؤں میں بے طرح ڈوبا ہُوا
خواب دیکھا پھر کوئی دیکھا ہُوا

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ گیا
ایک جگنو اس طرف جاتا ہوا

اُس کے کھو جانے کا دُکھ کس کو نہیں
پھر بھی اے دل جو ہُوا اچھا ہوا

تم تو پھر طولِ سفر سے تھک گئے
تھک گیا اِک شخص گھر بیٹھا ہوا

اَن گنت ویران شاموں کا جواب
اِک دیا، اِک طاق میں رکھا ہوا

کیسی کیسی وارداتیں دب گئیں
اِک ذرا سی بات کا چرچا ہُوا

اور پھر صبرِ مسلسل رُک گیا
ایک دن کرنا خُدا کا کیا ہوا

○

اے شفاف ندی کے پانی
چھیڑ گیا، کیا بات پرانی

درد کی پہلی موج، کنارا
دوسری موج نہ مانگے پانی

لہجہ، باس مٹھاس گلوں کی
بات، سو رنگا رنگ معانی

کتنی شامیں، پیاری شامیں
لیکن وہ اِک شام سہانی!

کتنی صبحیں، روشن صبحیں
لیکن اُس جیسی نورانی!

اے دل اِس مصروف صدی میں
لے آیا کیا رام کہانی

کون سُنے دُکھ درد کی باتیں
سہلائے شب بھر پیشانی

صبا اکبر آبادی

○

تری نظر ہے، مرا دل ہے، کیا کیا جائے
جنوں خرد کے مقابل ہے، کیا کیا جائے

یہ احترامِ روایت تو کم نہیں ہوگا
ہمارے خون میں شامل ہے، کیا کیا جائے

غبارِ دشت کے پیچھے ہے قیسِ دیوانہ
فریب خوردۂ محمل ہے، کیا کیا جائے

یہ کیسی بھول بھلیوں میں عشق لے آیا
نہ راستہ ہے نہ منزل ہے، کیا کیا جائے

یہ ایک داغِ محبت کہاں چھپا رکھوں
تمام عمر کا حاصل ہے، کیا کیا جائے

جمالِ دوست سے نظریں ہٹاؤں کیسے صبا
مرے نصاب میں شامل ہے، کیا کیا جائے

○

بات کو تول رہا ہو جیسے
عشق لب کھول رہا ہو جیسے

ہمہ تن گوش ہوا جاتا ہے عشق
حسن سچ بول رہا ہو جیسے

شاخ پر کھلتا ہے غنچہ ایسے
زخم لب کھول رہا ہو جیسے

اُن سے دوری میں ہوئیں یوں باتیں
دل سے دل بول رہا ہو جیسے

اُس کے آتے ہی یہ محسوس ہوا
وقت پر تول رہا ہو جیسے

تیرے اشعار میں پایا ہے صبا
لفظ خود بول رہا ہو جیسے

محشر بدایونی

○

تفرقہ ڈالنا اور آگ لگاتے رہنا
اپنے گھر کی بھی مگر خیر مناتے رہنا

ہُوا یہ، فصل سے اک دانہ ہمیں خود نہ مِلا
کام تھا اپنا پرندوں کو اڑاتے رہنا

ہم درِ شہر بھی وا رکھتے تھے اور اب ہے شعار
قریۂ دل میں ہی دیواریں اُٹھاتے رہنا

ذائقہ نوشی کی توفیق مِلے یا نہ مِلے
کوزہ گر کی تو لگن کوزے بناتے رہنا

اسی حکمت سے ہے دریا کے امینوں کا بھرم
بند بھی باندھنا، طوفان بھی اٹھاتے رہنا

اِن گدایانِ ہُنر پیشہ کا ہے وصف ہی کیا
ایک دو سکّوں سے کاسے کو بجاتے رہنا

دیکھنا محشرؔ اسی راہ سے دن ہوگا طلوع
شب کو شب کہہ کے اندھیروں کو جلاتے رہنا

○

ہمیں ہے فکر یہ ناوک کہاں سے آتے ہیں
سو ہم یونہیں نہیں باہر مکاں سے آتے ہیں

زمیں خدا سے ہو سرکش تو وقت شاہد ہے
بڑے عجیب عذاب آسماں سے آتے ہیں

کوئی تو بیچ ہے جو اس کی شفقتوں کے اسیر
جب اُس سے ملتے ہیں کچھ سرگراں سے آتے ہیں

دلوں کے شر نہیں رَد ہوتے تیغ و خنجر سے
یہ انقلاب تو جہدِ زباں سے آتے ہیں

بساطِ بحر پہ سب بادباں خمیدہ نہیں
ہَوا میں بیچ بھی اک بادباں سے آتے ہیں

رَوا ہے اوروں کے دُکھ اپنے دُکھ بنا لینا
سو یہ سلیقے بھی تہذیبِ جاں سے آتے ہیں

بنے جو داغِ وفا، دیکھیے وہ ہجر زدہ
کب اپنے دیس میں قیدِ گراں سے آتے ہیں

جلیل حشمی

○

دیوار سے آدمی بڑا ہے
بادل پہ بھی اس کا نقشِ پا ہے

وہ دشتِ وجود جہاں بیٹھا
تُو اس کو یہیں پہ سوچتا ہے

صحرا ہے کہ تشنگی کا دوزخ
دریا تہِ ریگ بہ رہا ہے

جاتی ہوئی رُت کی اک جھلک تھی
یا پاس سے وہ گزر گیا ہے

بج اُٹھا طبق طبق زمیں کا
اک پتا جو شاخ سے گرا ہے

دیکھی نہیں جس نے میری آنکھیں
وہ شخص بھی میرا آشنا ہے

چلتے ہوئے کیوں ٹھہر گیا ہوں
یہ تو مری اپنی ہی صدا ہے

روشن ہے وہ شخص طاقِ جاں میں
جو یاد سے محو ہو چکا ہے

لوٹ آئیے اب تو گھر کو حشمی
کیا چاند کے ساتھ ڈوبنا ہے!

○

خوش ہو گئے ہیں نا زمانے والے!
سو گئے دھوم مچانے والے

نام تیروں پہ لکھے ہوتے ہیں
پڑھ لیا کرتے ہیں کھانے والے

تیری مٹھی میں اگر ہو پتھر!
دُور سے کانچ دکھانے والے!

شہسواری کے یہ انداز نہیں
راہ میں گرد اڑانے والے!

تیری دیوار پہ چھاؤں لکھ دوں
اے مجھے دھوپ میں لانے والے!

سر ہتھیلی پہ دھرا ہے ہم نے
آئیں دیوار اٹھانے والے

سر جھکا کر کہیں بیٹھے ہوں گے
آپ کے ناز اُٹھانے والے

نہ ڈرے کوئی مسافر ہم سے
ہم نہیں راہ دکھانے والے

ٹکڑیاں چھاؤں کی چن لو حشمی
آ گئے پیڑ گرانے والے

مظفر حنفی

○

ہم کہ مجرم دو ملاقاتوں کے ہیں
گھاؤ دل پر سیکڑوں باتوں کے ہیں

پھول، پتّے، پھل سبھی مٹّی ہوئے
پیڑ پر احسان برساتوں کے ہیں

کہکشاں پر ثبت ہیں میرے قدم
چاند پر دھبّے مرے ہاتھوں کے ہیں

وہ مسافر آندھیوں سے خوف کھائیں
جن پہ سائے مہرباں چھاتوں کے ہیں

سال بھر کی گرد آئینے پہ ہے
سامنے انبار سوغاتوں کے ہیں

چودھویں کے چاند کی مانند ہم
اور مہماں ایک دو راتوں کے ہیں

دل دُکھاتے ہیں مظفرؔ شعر سے
مستحق ہم لوگ صلواتوں کے ہیں

○

آنگن میں کبوتر جو ہمارے اُتر آئے
ہمسائے کی آنکھوں میں شرارے اُتر آئے

لَو میرے چراغوں کی تراشی گئی پیہم
آخر مری آنکھوں میں ستارے اُتر آئے

مانجھی کے لئے پھر وہی منجدھار، وہی ناؤ
جتنے بھی مسافر تھے، کنارے اُتر آئے

صد شکر کہ جھرنوں کو سمندر نے بُلایا
پستی میں سرافراز تمہارے اُتر آئے

انسان کھلونے سے نظر آتے تھے اُوپر
مینار سے ہم خوف کے مارے اُتر آئے

زینہ تو بلندی پہ پہنچنے کے لئے تھا
پاتال میں کیوں اس کے سہارے اُتر آئے

حزیں لدھیانوی

○

مشکل تر ہے فنکارِ آئندہ ہونا
غالبؔ آسا مر مر کے پھر زندہ ہونا

جیسے چاند گھٹا کو چیر کے باہر نکلے
یوں اندھیاری راتوں میں تابندہ ہونا

مجھ کو زہر پلانے والو! پچھتاؤ گے
مجھ کو راس ہے، زہروں کا نوشندہ ہونا

چڑھتے دریا سے مٹی کی خوشبو آئی
کچّے گھڑے کا دیکھ لیا پائندہ ہونا

اس کی فردِ عمل اب اس کے سامنے رکھو
ناکافی ہے، ظالم کا شرمندہ ہونا

ایک جواں کی، ایک پڑھے لکھے مفلس کی
مجبوری ہے، جاہل کا کارندہ ہونا

بیعتِ شب سے صاف انکار کا جوہر رکھنا
تب آئے گا مقتل میں رقصندہ ہونا

○

کب تک اس گاؤں کے گھر میں رہنا ہوگا
آخر شہر کے شور و شر میں رہنا ہوگا

میرے دل میں آنے والے! سوچ سمجھ لے
جانے کب تک آگ کے گھر میں رہنا ہوگا

مَیں تو حلقۂ درد کشاں میں خوش ہوں پیارے
تجھ کو ہالۂ اہلِ زر میں رہنا ہوگا

چاہے جھوٹ کی کتنی ہی یلغاریں آئیں
سچّے لفظو! میرے ہنر میں رہنا ہوگا

دھوپ پڑے، یا برف گرے، یا بجلی کڑکے
رکنا کیسا، اب تو سفر میں رہنا ہوگا

جمیل ملک

○

دل سے نگاہ تک وہ ریاضت سمیٹ لوں
میں ساری کائنات کی وسعت سمیٹ لوں

تزئین ذات ہی کے مظاہر ہیں چار سُو
بکھروں کچھ اس طرح سے کہ وحدت سمیٹ لوں

پھیلوں تو حرف وصوت کی شدت ہے میرا نام
سمٹوں تو اپنے دل میں قیامت سمیٹ لوں

منزل نہ مل سکے تو مَیں منزلِ نما بنوں
ہر ایک نقشِ پا میں مسافت سمیٹ لوں

ذرّے کو چیر کر میں تراشوں جہانِ نو
لمحے میں ڈوب کر ابدیت سمیٹ لوں

آہن کو بھی گداز کرے دستِ کار گر
محنت کی روشنی میں محبت سمیٹ لوں

کام و دہن کو ایک نیا ذائقہ ملے
یوں حسنِ نو بہار کی لذت سمیٹ لوں

کھُل جائیں ایک رنگِ سخن میں ہزار رنگ
میں رنگ و نور و حسن و صباحت سمیٹ لوں

جو دَرد لا دوا ہو وہ اکسیر ہو مجھے
ہر غم کی آگہی سے مسرت سمیٹ لوں

جرم و سزا سے روح بھی چھلنی، دماغ بھی
کہہ دو تو اپنے دل کی عدالت سمیٹ لوں

کٹ جائیں ہاتھ، پھر بھی لکھوں اپنے دل کی بات
تخلیقِ فکر و فن سے وہ قوت سمیٹ لوں

شہرت کے لاکھ رنگ ہیں، عظمت کا ایک رنگ
روحِ روانِ وقت سے عظمت سمیٹ لوں

یوں ہی ملے گی حسنِ حقیقت کی روشنی
پہلے جمیلؔ حسنِ صداقت سمیٹ لوں

محسن احسان

○

جس کی اڑائی خاک وہ صحرا ہی اور ہے
پیراک جس کے ہم ہیں، وہ دریا ہی اور ہے

ہم کو نہ ہے قبا کی نہ دستار کی طلب
اپنا فقیہہِ شہر سے جھگڑا ہی اور ہے

چاکِ قمیصِ یوسفِ کنعاں کی خیر ہو
اب کے گرفتِ دستِ زلیخا ہی اور ہے

اے چارہ گر: علاجِ دلِ مضطرب نہ کر
وارفتگیِ جاں کا مداوا ہی اور ہے

ہم مبتلائے فکرِ زمانہ رہے بہت
دیکھا درونِ ذات تو دنیا ہی اور ہے

محسنؔ رگوں میں جم گیا خونِ مدافعت
اب کے مزاجِ موسمِ سرما ہی اور ہے

○

بھڑکتی لَو کی بس اک آخری دُعا سُنتا
پھر اس کے بعد نہ کچھ موجۂ ہوا سُنتا

مجھے بھی لگتی کچھ آسان منزلِ دشوار
جو دوسروں کی صدائے نقوشِ پا سُنتا

کچھ اس قدر بھی زمانے میں قحطِ حرف نہ تھا
وہ آشنا تھا تو آوازِ آشنا سُنتا

بجز ذخیرۂ اوہام پاس کچھ بھی نہیں
یہ بات کاش وہ گردیدۂ انا سُنتا

اُسے پکار چکا، زندگی میں ہار چکا
مرا خدا تھا تو پھر میری التجا سُنتا

ہم ایک عمر سے محسنؔ خمارِ خواب میں ہیں
ہماری بات زمانے میں کوئی کیا سُنتا

محسن احسان

○

حیران زمانے کو بہت کر گئے ہم بھی
دشمن کو تو للکارا مگر ڈر گئے ہم بھی

یاروں کو شکایت تھی بہت تشنہ لبی کی
پیمانوں میں سب تن کا لہو بھر گئے ہم بھی

شاید کسی ملبوس کی خیرات ہی مل جائے
پیوند لگائے ہوئے در در گئے ہم بھی

خورشید نہ مہتاب، نہ جگنو، نہ ستارہ
جینے کی ہوس دل میں لئے مر گئے ہم بھی

دن بھر کے دکھوں کو لئے ہم اپنی بغل میں
محسنؔ ہوئی جب شام تو پھر گھر گئے ہم بھی

○

وہ قحطِ آبِ غم ہے کہ روتے بھی ہم نہیں
جس میں ہو دھوپ نرم وہ سائے بھی ہم نہیں

بالا ہر اک خطا سے ہوں، ہر جرم سے بری
اترے ہوئے فلک سے فرشتے بھی ہم نہیں

اپنی انا کے نشے میں کچھ اتنے مست ہیں
ٹھوکر بھی ہم نے کھائی ہے سنبھلے بھی ہم نہیں

ہم لوگ معجزات کی خوش فہمیوں میں ہیں
رکتے بھی ہم نہیں ہیں تو چلتے بھی ہم نہیں

نادیدہ منزلوں کی طلب تو ضرور ہے
لیکن سرابِ رہ سے نکلتے بھی ہم نہیں

اس کو گماں کہ ہم غمِ دنیا کے ہو گئے
اور اپنا حال یہ ہے کہ اپنے بھی ہم نہیں

آنکھوں کے سامنے سے کئی یار اٹھ گئے
لیکن وہ بےحسی ہے کہ روتے بھی ہم نہیں

بس یہ کہ رقص کرتے ہوائے سحر کے ساتھ
صد شکر شاخِ زرد سے ٹوٹے بھی ہم نہیں

محسنؔ کسی کے لقمۂ تر پر نظر رکھیں
ہر چند ہیں غریب، پر ایسے بھی ہم نہیں

شہزاد احمد

○

اے مرے دل کی تپش، اذنِ سفر دے مجھ کو
تیری قربت ہی کہیں خاک نہ کر دے مجھ کو

تیرے ہوتے، مرے اندر یہ خلا کیسا ہے
اپنی محرومی کے احساس سے بھر دے مجھ کو

کہیں میں بھی تو نہیں تیرے طرح ناموجود
تو اگر ہے، مرے ہونے کی خبر دے مجھ کو

میں گنہگار سہی، میری سزا پوری کر
اس زمیں پر وہی چھوڑا ہوا گھر دے مجھ کو

دیکھنے کے لیے اس دور میں رکھا گیا ہے
کچھ نہ جو دیکھ سکے ایسی نظر دے مجھ کو

دل سے دل تک کوئی جادہ نہ کوئی رستہ ہے
گھر سے گھر تک ہی کوئی راہگزر دے مجھ کو

شبنم رومانی

○

چُپ ہوں خود اپنے باب میں جیسے
آگ برسی ہو خواب میں جیسے

سب سخن، اُس لبِ سخن کے اسیر
سارے موسم گلاب میں جیسے

آئینہ آنسوؤں سے بھیگ گیا
عکس ہو جُوئے آب میں جیسے

زندگی کا سفر — عجیب سفر
کوئی چلتا ہو خواب میں جیسے

وہ نظر — وہ نظر ہے کتنی بلیغ
سادہ کاغذ جواب میں جیسے

خواہشوں کے تراشتا ہوں بدن
روح آزر سحاب میں جیسے

ربط کرتا ہوں زندگی میں تلاش
غلطی ہو کتاب میں جیسے

صمد انصاری

○

صورت گری کو حرفِ صنم گر کہا گیا
تیشے کو آزری کا مقدر کہا گیا

نشوونما اُسی میں ہوئی مہر و ماہ کی
اک روز جس زمین کو بنجر کہا گیا

تھے بے نوا وہ جن سے متاعِ غنا ملی
وہ لامکاں ہوئے جنہیں بے گھر کہا گیا

کرنوں بغیر چاند ستارے نہ ڈھل سکے
سورج کو روشنی کے برابر کہا گیا

ہم کو اُسی جہان نے تسخیر کر لیا
روزِ ازل سے جس کو مسخر کہا گیا

روشن رہا چراغ میں اک داغِ آرزو
پروانہ خاطری کو سخنور کہا گیا

نام اَوروں کے نام گئی نام آوری
شیشہ گری کو شانِ سکندر کہا گیا

لکھا گیا ہے بابِ صداقت صلیب پر
پیغمبری کو فنِ پیمبر کہا گیا

گہرائیوں سے فکر کو قدرِ سخن ملی
پانی کی آبرو کو سمندر کہا گیا

چاہت کی چاندنی بھی ہوئی ناروا صمدؔ
اک پیکرِ جمال کو پتھر کہا گیا

○

اک چراغِ صبح کی لَو کو سحر کس نے کیا
ایک دانے کی بلوغت کو شجر کس نے کیا

خود فراموشی تو مجھ کو دے گیا میرا لہو
عیب گو میرے مگر میرا ہنر کس نے کیا

پھر زمانے نے پکارا مجھ کو میرے نام سے
میری گمنامی کو آخر مشتہر کس نے کیا

کیوں طلوعِ صبح پر آئی دلیلِ آفتاب
میرے نقشِ پا کو حرفِ رہگزر کس نے کیا

کس نے پابستہ رکھا مجھ کو زمیں کے سحر میں
آسمانوں کو مری حدِّ نظر کس نے کیا

کس نے ٹھہرایا ہے مجھ پر راستوں کو سدِّ راہ
کور چشمی کو مری، میرا خضر کس نے کیا

قربتوں کے خون سے ڈھالے ہیں کس نے سنگ و خشت
شہر کو میرے، صمدؔ دیوار و در کس نے کیا

آفتاب اقبال شمیم

O

یہ وقتِ آساں کبھی عدو پہ گراں بھی ہو گا
وہ معجزہ جو وہاں ہوا ہے، یہاں بھی ہو گا

یہی سُجھائے ہمیں یہ ٹھہرا ہوا ستارہ
کہ جو بظاہر رُکا ہوا ہے، رواں بھی ہو گا

اگر سفر میں رہا نہ آگے سے اور آگے
تو پھر وہ شہرِ مثال ہم پر عیاں بھی ہو گا

اُداس مت ہو، خدا اگر واقعی خدا ہے
ضرور ان بستیوں پہ وہ مہرباں بھی ہو گا

چلو تو یاروں کی چاہتیں ساتھ لیتے جاؤ
کہ راستے میں قبیلۂ دشمناں بھی ہو گا

بگاڑ بیٹھے ہو دل سے ان دنیا داریوں میں
کہا نہ تھا ایسے فائدے میں زیاں بھی ہو گا

O

استطاعت سے زیادہ دل بڑا کرنا تو ہے
اُس کے کم ہونے کا کفارہ ادا کرنا تو ہے

مت کہو، ان دوریوں کے بعد بھی ہیں دُوریاں
پُر کسی شے سے یہ آنکھوں کا خلا کرنا تو ہے

اس لیے اس سے سلوکِ ناروا بھی ہے روا
زندگی کو ایک دن ہم سے دغا کرنا تو ہے

قتل کا الزام بھی مقتول پر ہی آئے گا
قاتلوں نے خود کو ثابت بے خطا کرنا تو ہے

ہم کہ ٹھہرے اپنی عادت میں تغیّر ناپسند
جو میسّر ہے اسی پر اکتفا کرنا تو ہے

ہم کہ تنہائی کے اک پُرہول سناٹے میں ہیں
کچھ نہ کچھ ایسے میں ہنگامہ بپا کرنا تو ہے

(بیجنگ)

رشید قیصرانی

○

میرے نام وہ جو لبِ افق پہ سحر کدوں کا پیام تھا، ترا نام تھا
شبِ تیرہ میں بھی وہ شب چراغ جو مجھ سے محوِ کلام تھا، ترا نام تھا

میرے ارد گرد تھے خیمہ زن، سرِ شامِ غم، کئی کہکشاؤں کے قافلے
میرے رتجگوں کے نظام میں مگر ایک ماہِ تمام تھا، ترا نام تھا

کوئی شمس رُو، کوئی زہرہ وش، کئی نام عرش مقام تھے، بڑے نام تھے
مگر ایک نام جہانِ اسم کا آخری جو امام تھا، ترا نام تھا

وہ تو اپنی اپنی شناخت کا، سرِ رہگزر کوئی ریزہ ڈھونڈنے آئے تھے
انھیں کیا خبر کہ ہر ایک منزلِ جستجو پہ جو نام تھا، ترا نام تھا

تجھے چھو کے پیکرِ وقت کے خد و خال سارے سنور گئے تو امر ہوئے
کوئی پل نقیبِ سحر ہوا، کوئی لمحہ محورِ شام تھا، ترا نام تھا

میرے ہست و نیست کے باب میں کئی پرت تھے جو ابھی تلک بھی کھلے نہیں
مگر اک کرشمہ، جو زندگی کا جواز تھا، سرِ عام تھا، ترا نام تھا

میں جدھر گیا، میں جہاں بھی تھا، مرے دن کٹے تری خوشبوؤں کے طواف میں
سرِ بزمِ حرف مرے سخن میں جہاں بھی حسنِ کلام تھا، ترا نام تھا

رشید قیصرانی

○

میں بکھر گیا ہوں کرشمہ گر! کوئی معجزہ، کوئی دَم کرو
کسی نام پر، کسی نام سے، مرا ریزہ ریزہ بہم کرو

میں تمہارے فہم سے بالا تر، مرے ناقدو! مجھے کم کرو
یہ زباں بُریدگی کچھ نہیں، مرے دست و پا بھی قلم کرو

میں وہ حرف ہوں جو لرز رہا ہے قلم کی نوک پہ آج تک
کبھی مجھ کو بھی مرے کاتبو! کسی لوحِ جاں پہ رقم کرو

میں تو تشنگی بھی ہوں، دھوپ بھی، مرے ابر! میرے شجر! سُنو
مرے دشتِ جاں کو اِرم کرو، مجھے اپنی ذات میں ضم کرو

نہ سجاؤ مسندِ عادلاں کہ میں خود صلیب بدوش ہوں
مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو، نہ ستم کرو، نہ کرم کرو

وہ جو ماورائے حروف تھی، جو صلیبِ لب کا نصیب تھی
درِ یار پر، مرے ہم سخن! مری وہ غزل بھی رقم کرو

○

منظر تو سامنے تھا، نظر ڈھونڈتے پھرے
ہم ہر سفر میں میرِ سفر ڈھونڈتے پھرے

قد بڑھ گیا ہے، پھر بھی قد آور نہ ہو سکے
دستار مِل گئی ہے تو سَر ڈھونڈتے پھرے

اپنی شباہتوں سے گریزاں تھے اس قدر
اپنا پتہ بنامِ دِگر ڈھونڈتے پھرے

معلوم تب ہوا ہے، لہو چشم جب ہوئے
کن پستیوں میں بامِ نظر ڈھونڈتے پھرے

ہم گُنگ موسموں میں برہنہ زباں رہے
اور حرف رُت میں حرفِ ہُنر ڈھونڈتے پھرے

چھوٹی نہ ہم سے رسمِ جبیں سائی عمر بھر
قریہ بہ قریہ ہم کوئی در ڈھونڈتے پھرے

اک مہر گُم شدہ تھا کہ صدیوں جسے رشید
ہم پا شکستہ، خاک بسر ڈھونڈتے پھرے

علامہ طالب جوہری

○

اس کی سرد حویلی تک، دھوپ کا تپتا صحرا تھا
ادٹ میں سوکھی جھاڑی کے، سایہ چھپ کر بیٹھا تھا
گونج رہی تھی جب یہ صدا اسمار کی تشریح کرو
بول رہا تھا صرف انسان، چار طرف سناٹا تھا
ماہی گیر اکیلا تھا، لوٹ کے کیسے گھر آیا!
ناؤ کے چپو ٹوٹے تھے اور سمندر گہرا تھا
ہم نے جو گھر بار تجا ایک ستارے کی خاطر
ان دیکھی دنیاؤں سے کون سا ایسا رشتہ تھا!
فطرت کی بے ظرفی بھی کیا کیا روپ بدلتی ہے
آگ لگی تھی جب گھر میں، بادل ٹوٹ کے برسا تھا
سایہ بانٹنے والا خود سائے سے محروم رہے
قسمت نے ان پیڑوں کو دھوپ میں جلنا لکھا تھا
کوزہ گروں کی بستی میں مٹی کی کمیابی سے
کوزے کتنے مہنگے تھے، پانی کتنا سستا تھا!
اک موہوم نشانی پر طالب ہم نے کوچ کیا
منزل بھی انجانی تھی، رستہ بھی ان دیکھا تھا

علامہ طالب جوہری

○

گاؤں کے اک چھوٹے سے گھر میں کچھ لمحے مہتاب رہا
لیکن اس کی یاد کا پودا برسوں تک شاداب رہا

اے مرے حال کی دشمن یادو! کیا اس کو تسکین ملی
ماضی میں جو شخص حریفِ تسکینِ اعصاب رہا

اپنی ساری گمشدہ بھیڑیں جمع تو کیں چرواہے نے
ان بھیڑوں کے پیچھے پیچھے پورے دن بے تاب رہا

فصلِ خزاں کی شاخ سے لپٹا بیلے کا اِک تنہا پھول
کچھ کلیوں کی یاد سمیٹے راتوں کو بے خواب رہا

بچھڑے تھے تو ساکت پلکیں سوکھے پیڑ کی شاخیں تھیں
اس سے بچھڑ کر دور چلے تو کوسوں تک سیلاب رہا

پچھلی رات کے پیاسے لمحے جن گلیوں میں بیت گئے
ان گلیوں کو چھوڑ کے پورے شہر میں قحطِ آب رہا

اس کی فطرت جاننے والے ترکِ ادب سے جیت گئے
کتنا تنگ نظر تھا طالبؔ، پابندِ آداب رہا

○

تنہا کب ہوں، میرا مقدر ساتھ میں ہے
ایک ہزیمت خوردہ لشکر ساتھ میں ہے

شہر بسانے والوں کی مجبوری تھی
اپنے پرائے دونوں کا گھر ساتھ میں ہے

بُت شکنی انجام ہے ہر بُت سازی کا
ذکرِ خلیل و شہرتِ آزر ساتھ میں ہے

کس کا دامن تھاموں، کس کو ترک کروں
اک شیطان اور ایک پیمبر ساتھ میں ہے

دھیرے دھیرے خشکی بھی دم توڑ گئی
ہم ہیں اور بے انت سمندر ساتھ میں ہے

اب ملاح ستارہ کیسے دیکھیں گے
گہرے ابر کی موٹی چادر ساتھ میں ہے

طالبؔ جس کو پچھلے نگر میں چھوڑا تھا
اس کا تصور سایہ بن کر ساتھ میں ہے

ادیب سہیل

○

اُس کے پیکر پہ نظر ٹھہرے تو کیوں کر ٹھہرے
آبگینے باندھ کر آیا ہے بدن پر اپنے

جسم کی اتنی بھی تزئین نہیں ہے اچھی
آدمی جس کی چکا چوند میں چہرہ بھولے

آئینہ خانے میں اس کو کبھی تنہا پاؤں
گزری اِک عمر یہی آرزو کرتے کرتے

ہم نے ہر آئینے میں دیکھا تمہارا پیکر
کیوں کوئی اور نظر آتا تمہارے ہوتے

بندِ آئینہ ہوئے تم پہ تمہاری خاطر
کوئی پھرتا ہے تحیّر لیے رستے رستے

ہاں ہر اک شخص، ہر اک شخص کا آئینہ ہے
یہ نہ ہوتا تو سبھی ہاتھ میں پتھر ہوتے

خود فریبی سے بچا لائے سہیل آپ کو ہم
کیسے آئینہ وہ اچھا ہے کہ ہم ہیں اچھے

خالد طور

○

ہر منفعت زیاں کی طرح دیکھتے رہے
تنکوں کو آشیاں کی طرح دیکھتے رہے

تم سے گِلہ کروں تو کروں کس نگاہ کا
تم بھی مجھے جہاں کی طرح دیکھتے رہے

جھلسی ہوئی زمیں پہ جھلستے بدن کے ساتھ
پیڑوں کو سائباں کی طرح دیکھتے رہے

عرفاں شعورِ ذات کی موجِ بلا میں تھا
خواہش کو بادباں کی طرح دیکھتے رہے

ظاہر مرا وجود رہا دشتِ غیب میں
تم گردِ کارواں کی طرح دیکھتے رہے

ہم پر لگا کے جرمِ محبت، زمانہ ساز
اک فردِ رائیگاں کی طرح دیکھتے رہے

حلیم قریشی

○

اب ترے وصل کا موسم بھی کہاں یاد آئے
بعد اُس کے جو اٹھا تھا وہ دھواں یاد آئے

اپنی دھرتی کی رگوں ہی سے مجھے خُون ملے
پیار سے گود میں لیتی ہے تو ماں یاد آئے

عرصۂ ہجر میں ہم خود سے بھی محروم رہے
تم ملے ہو تو ہمیں سارے زیاں یاد آئے

ساری خوش فہمیاں جب روند کے تو چھوڑ گیا
سب یقیں دُور ہوئے سارے گماں یاد آئے

ایک دھاگا سا مجھے کھینچتا جائے پیہم
جب کراچی میں حلیم اپنا "گراں" یاد آئے

○

لوگوں سے وہ کہتا ہوا ہر روز گزر جائے
"رستے میں جو بیٹھا ہے، کہو اُس کو وہ گھر جائے"

ہم جس کے لب و لہجہ سے ڈرتے ہوئے چپ ہیں
جب سحر ملاقات میں آئے تو بکھر جائے

وہ زورِ قلم ہو کہ جہاں شہر میں تم ہو
دیواروں کے پیچھے سے وہاں تک تو ہنر جائے

ہم نام و نسب اپنا بتا دیں گے تمہیں بھی
یہ کس کی سواری ہے، ذرا یہ تو گزر جائے

اُس موڑ سے پہلے وہ پلٹ آئے تو اچھا
بہتر ہے کہ بربادی سے پہلے وہ سنور جائے

ٹ "گراں" پنجابی میں گاؤں کو کہتے ہیں۔

اقبال کوثر

○

میں نے جو تصویر بنائی، آپ ادھوری رکھی ہے
جتنی قربت قدر نہ کھودے، اتنی دُوری رکھی ہے

پیار کے کتنے بھید ہیں لیکن اُس نے نقابِ رُخ کی طرح
کچھ گوشے تو کھولے مجھ پر، کچھ معذوری رکھی ہے

اک دُوجے بن آدھے ہیں ہم پر لفظوں کے خاکے میں
خود کو پُورا رکھنے کی گنجائش پُوری رکھی ہے

دھیان تمھارا آتا ہے تو بچّو! جینا پڑتا ہے
تم نے میرے مرنے میں بھی کیا مجبوری رکھی ہے

○

رات بھر کے شور میں شامل کوئی ایسا نہ تھا
جو زباں رکھتا سرِ محفل، کوئی ایسا نہ تھا

ہم سرابوں میں گھرے بہتے رہے بہتے رہے
ہم اُتر سکتے جہاں، ساحل کوئی ایسا نہ تھا

ہر طرف جسمِ عدالت ٹکڑے ٹکڑے تھا جہاں
سارے منصف تھے وہاں، قاتل کوئی ایسا نہ تھا

جس جگہ آتش بجھانا تیل پر موقوف تھا
اُس مقامِ عقل پر جاہل کوئی ایسا نہ تھا

شہر جلتا تھا مگر اپنے شبستانوں میں لوگ
باخبر بیٹھے تھے سب، غافل کوئی ایسا نہ تھا

سارے پتھر کی طرح جامد تھے شامِ شہر میں
موم کی صورت پگھلتا، دل کوئی ایسا نہ تھا

دِل نواز دِل

○

وہی بے نیاز وعدے، وہی بے نماز قسمیں
وہی سامنے بہانے، وہی ساز باز پس میں

کبھی رہبروں کو دیکھوں کبھی کارواں کی سوچوں
وہی دشمنی کے پردے، وہی کینہ ساز رسمیں

یہ ہے امن کی نشانی، وہ ہے جنگ کی علامت
یہی فاختہ قفس میں، وہی شاہ باز بس میں

نہ ہی عمر کا رنگ بدلا، نہ ہی لَے کا انگ ٹوٹا
وہی بانسری کی مستی وہی نَے نواز رس میں

کبھی لمس ریشمی ہے کبھی کُھردرے لبادے
وہی دکھ شدید حس میں، وہی غم گداز مَس میں

خورشید رضوی

○

یہ شہرت ہے کہ رُسوائی، مگر حد سے زیادہ ہے
میں خود آنا نہیں، سایہ مرے قد سے زیادہ ہے

مرے دِل کی گرہ باتیں بنانے سے نہیں کھلتی
کہ مجھ میں بستگی کچھ قفلِ ابجد سے زیادہ ہے

کسی کے پاس حرفِ دل نشین باقی نہیں ورنہ
قبول اب بھی دلوں کی خاک میں رد سے زیادہ ہے

سویدا کو مرے نسبت بہت ہے سنگِ اسود سے
مگر نقشِ کفِ پائے محمدؐ سے زیادہ ہے

یہ جانِ ناتواں میری یہ شوقِ بے اماں میرا
توانائی کفِ سیلاب میں سر سے زیادہ ہے

خلیل رامپوری

○

گھر چھوڑا تو منظر کتنے ساتھ تھے میرے
کتنی سوچیں، کتنے خاکے ساتھ تھے میرے

کل لوگوں کا ایک ہجوم تھا اسٹیشن پر
ریل چلی تو کتنے چہرے ساتھ تھے میرے

میں نے سفر میں تنہائی کا منہ نہیں دیکھا
دائیں بائیں کے نظارے ساتھ تھے میرے

اس کی باتیں سُننے سے جی خوش رہتا تھا
اس کی باتیں کرنیوالے ساتھ تھے میرے

جبتک سویا گھر کی چھت پر سُکھ سے سویا
گھر کے اندر سو ہنگامے ساتھ تھے میرے

تیرا چہرہ یاد آتا ہے تنہائی میں
کتنے جھلمل کرتے تارے ساتھ تھے میرے

کیا معلوم کہ کس نے وار کیا تھا مجھ پر
کیا بتلاؤں بھائی، سارے ساتھ تھے میرے

پتھر پانی ہو جاتے ہیں جن کے آگے
ایسی شان و شوکت والے ساتھ تھے میرے

شہر میں رہنے والے چہرے کم ملتے ہیں
خوش قسمت ہوں، ایسے چہرے ساتھ تھے میرے

○

چیتے کی کھال اوڑھ کے آیا ہے کس لیے
گیدڑ ہے، جانتا ہوں، ڈراتا ہے کس لیے

دولت ہے تیرے پاس تو دنیا پہ رحم کھا
دریا سے بے مثال کہ دریا ہے کس لیے

تو صاحبِ نظر ہے تو پہچان بھی کرا
یہ سوچ لے چراغ میں شعلہ ہے کس لیے

تقریریں جھاڑتا ہے بہت انقلاب کی
بھوبھل میں کچھ نہیں تو اڑاتا ہے کس لیے

بیزار خود سے ہے تو سمندر میں کود جا
گھر کی ہوا میں زہر ملاتا ہے کس لیے،

جو کہہ رہا ہے، سوچ کہ کیا کہہ رہا ہے تُو
دیوار اپنے گھر کی گراتا ہے کس لیے

باہر کا مال جو بھی ہے، باہر ہی رکھ میاں
آپس میں بھائیوں کو لڑاتا ہے کس لیے

جو کچھ ہے، آدمی کیلیے ہے یہاں خلیلؔ
دنیا کو پھر یہ آدمی روتا ہے کس لیے

عبداللہ جاوید

○

مٹّی پر کیا تیرا حق، کیا میرا حق
آ، مٹّی میں رل کر دیکھیں کس کا حق

جس دھرتی پر، جس کا جینا، مرنا ہو
اس دھرتی پر سچ پوچھو تو اس کا حق

کلہاڑے سے منوا لینا آساں ہے
ناحق سے ناحق ہو جاتا ہے جتنا حق

تم کو کرسی، تم کو طاقت حاصل ہے
غصب کرو یا چھینو چاہے جس کا حق

سب سے سچی، سب سے اونچی انساں ذات
انساں ذات کا ہر مٹّی پر پورا حق

پاکستان کا چپّہ چپّہ سب کا ہے
اس کے چپّے چپّے پر ہے سب کا حق

○

اندھیارے میں جوت جگانا پڑتا ہے
دیا مجھے تو خود جل جانا پڑتا ہے

اپنے دل کا درد بھلانا پڑتا ہے
اوروں کا سینے سے لگانا پڑتا ہے

راس آئے یا راس نہ آئے یہ دنیا
اس دنیا میں آنا جانا پڑتا ہے

جینا ہو تو جیتی جاگتی دنیا میں
موت سے پہلے ہی مر جانا پڑتا ہے

پل پل، سو سو، چھب دکھلاتی ہے دُنیا
مٹ مٹ، مٹ مٹ، مٹ مٹ جانا پڑتا ہے

اندر کا انسان بلک کر روئے جب
باہر کے انسان کو گانا پڑتا ہے

آنسو جب لفظوں میں ڈھلنے لگتے ہیں
شاعر کو تب شعر سنانا پڑتا ہے

مرنے والا تو مرتا ہے بالآخر
مارنے والے کو مر جانا پڑتا ہے

ہم زندہ جاوید بھلا کب مرتے ہیں
جیتے جی یہ سوانگ رچانا پڑتا ہے

ارشد ملتانی

○

وقت کی طغیانیوں میں گُم ہوئے
ہم انوکھے پانیوں میں گُم ہوئے

رات کی ظلمت میں جو بھٹکے نہ تھے
صبح کی تابانیوں میں گُم ہوئے

جن کے دم سے تھیں جواں مہنگائیاں
وقت کی ارزانیوں میں گُم ہوئے

کتنے جذبے آنسوؤں میں بہہ گئے
کتنے شعلے پانیوں میں گُم ہوئے

جاگتی جیتی شبیہیں مٹ گئیں
آئینے حیرانیوں میں گم ہوئے

فکر و فن کے کتنے زندہ معجزے
شعبدہ سامانیوں میں گم ہوئے

کس قدر مضبوط ساحل تھے مگر
کتنے گہرے پانیوں میں گم ہوئے

منزلوں کی مشکلوں سے جو بچے
راہ کی آسانیوں میں گم ہوئے

○

سنبھل سکے نہ ترا ذہنِ خود کفیل تو پھر؟
ترے خلاف ہی جائے تری دلیل تو پھر؟

غنیم وقت کے اک بے پناہ حملے میں
ٹھہر سکی نہ ترے شہر کی فصیل تو پھر!

تعینات سے طے مرحلے نہیں ہوتے
نہ آیا راہ میں کوئی بھی سنگِ میل تو پھر؟

معاملات ہیں محتاجِ گفتگو، لیکن
نکل سکی نہ ملاقات کی سبیل تو پھر؟

ہزار رنگ کے عشرت فروز جلوؤں میں
ترا مزاج ہی ثابت ہوا علیل تو پھر؟

بجا کہ تو ہے نجیب و عفیف و فہمیدہ
بگڑ کے سامنے آیا کوئی ذلیل تو پھر؟

حمید کوثر

○

رات آئی تو صحیفے کئی دل پر اُترے
چاند بن بن کے زمیں پر ترے پیکر اُترے

رات کیا رات تھی یارو شبِ ہجراں کہ وصال
میری پلکوں پہ ہزاروں مہ و اختر اُترے

کون اس طرزِ عنایت کی گواہی دیگا
داغ جو دل پہ نہ اترے تھے وہ سر پر اُترے

سارا عالم ترے جلووں کا تماشائی ہے
چاند دیکھوں تو نظر میں ترا منظر اُترے

کس کے عارض کی شفق لے کے سحر میں گھولوں
کس سے مانگوں وہ اجالا کہ جو گھر گھر اُترے

جب کسی درد کے مارے نے گواہی دی ہے
خیر خواہی کے لیے سینکڑوں پتھر اُترے

کیوں نہ ایمان رکھوں وحیِ خدا پر کوثر
رات آئی تو صحیفے کئی دل پر اُترے

سید نواب حیدر نقوی

○

فروغِ نورِ تجلّی جو آفتاب میں ہے
بہ وصفِ حسنِ طلب گردِ ماہتاب میں ہے

تلاشِ آبِ بقا کی مہم کو تیز کرو
کہ اک چمک سی ابھی دیدۂ حباب میں ہے

یہ میری فکر کی تصویر نا تمام سہی
بلا کا حسن مگر عالمِ خراب میں ہے

عُروجِ شام و سحر سے ذرا اُدھر دیکھو
ہے ایک عالمِ زریں، جو انقلاب میں ہے

ہر ایک ذرۂ صحرا ہے نوحہ خواں راہی
شہیدِ شوقِ طلب آج اضطراب میں ہے

کاوش بٹ

○

جن کی قسمت میں اندھیرے تھے، وہ گھر کھلنے لگے
روشنی پھیلی تو سارے بام و در کھلنے لگے

ہر شریف انسان خاموشی سے دن گنتا رہا
وقت نے جب دی صدا، سب معتبر کھلنے لگے

گھونسلوں میں ایک پل بھی چھپانا جرم تھا
ختم گیا طوفاں تو چڑیوں کے بھی پر کھلنے لگے

گنگناتے مسکراتے موسموں کو دیکھ کر
دور سے آتی ہواؤں کے بھی در کھلنے لگے

غمزدہ چہروں کو پھولوں کی سی شادابی ملی
ہر قدم پر جیسے خوشبو کے نگر کھلنے لگے

محمود رحیم

○

پیار دے ایسی وسعتوں جیسا
ہجر ہو مجھ کو راحتوں جیسا

دیکھنا بھی کسک ہے سینے کی
سوچنا بھی اذیتوں جیسا

بات کہنا نئے تناظر میں
عشق کرنا روایتوں جیسا

موت شاید مصیبتیں ٹالے
اپنا جینا مصیبتوں جیسا

آئینے میں تو عکس بے تاثیر
تیری آنکھوں میں قربتوں جیسا

خاک واپس بھی مانگ سکتی ہے
قرض اپنا، شناختوں جیسا

پھر کوئی بخشش بے تھکن منزل
پھر سفر دے رفاقتوں جیسا

سو روپے شرافتوں کے رحیم
ایک لہجہ بغاوتوں جیسا

(راس تنورہ۔ سعودی عرب)

امداد ہمدانی

○

پھر مداری کی کماں سے تیر جنبش کر گیا
بے ہدف کس رقصِ بسمل کی نمائش کر گیا

عشرتوں کی سب قبائیں چاک ہو کر رہ گئیں
گھر کا بھیدی جسم کی لنکا میں سازش کر گیا

میں بھی یوسف کی طرح اندھے کنویں میں ہوں اسیر
مجھ پہ اِک بھائی مرا کیسی نوازش کر گیا

خواہشوں کی بستیوں سے چاند جب گزرا مرا
تن کے بنجر کھیت میں جلووں کی بارش کر گیا

کرب کی برسات میں بھی آنکھ میری نم نہ ہو
مرنے والا مرتے مرتے کیسی خواہش کر گیا

خود کیا امداؔد نے تعمیر قصرِ آرزو
اور پھر اِک روز خود ہی نذرِ آتش کر گیا

جعفر شیرازی

○

مدام ربط ہے اور خوشبوؤں کے باب سے ہے
یہ کیسے لوگ ہیں، نسبت جنھیں گلاب سے ہے

ہوا کے لہجے میں خنکی نہ جانے کب آئے
فضا میں شور بہت آمدِ سحاب سے ہے

یقین کر کہ یہ سب حُسن زندگانی کا
مرے سوال سے ہے اور ترے جواب سے ہے

یہ کوئی خواب پریشاں نہیں، خیال تو کر
زمانہ زندہ ہمارے خیال و خواب سے ہے

انھیں تو خیر ہوا شہرتوں کا غم جعفرؔ
گلہ ہمیں بھی دلِ خانماں خراب سے ہے

آصف ثاقب

○

دُور کنارا اور ہے منظر انجانا
اُٹھتا طوفاں، اس پر سمندر انجانا

سر کی چوٹ انوکھی لذت والی ہے
کس جانب سے آیا پتھر انجانا

گھر کا مالک کل جو گیا بیرونِ وطن
آج مسافر لوٹا بن کر انجانا

میرے ساتھ یہ کیسا ساتھی رہتا ہے
باہر جاناں جاناں اور گھر انجانا

جیتے جی تو دھوم تھی ساری بستی میں
ثاقبؔ آج ہوا ہے مر کر انجانا

○

پری پیکر کوئی پر کھولتا ہے
اسی جنبش سے عالم ڈولتا ہے

مسافر شام کا جانے سے پہلے
مرے اشکوں میں صبحیں گھولتا ہے

بِنا دستک دیئے انجانے بن میں
کوئی دروازہ دل کا کھولتا ہے

ستارے آنکھ سے چلنے لگے ہیں
کوئی یادوں کے موتی رولتا ہے

وہ لوگوں میں بہت جھوٹا ہے ثاقبؔ
تمہارے سامنے سچ بولتا ہے

غلام حسین ساجد

○

قدم دھرا تو ہے سنگِ سیاہ پر مَیں نے
مگر ہلالِ زرِ تیغ چُوم کر مَیں نے

کسی کو خلعتِ دشمشیر سے نوازا ہے
کسی کو بخش دی اک موج میں سپر میں نے

کچھ اور گردشِ دوراں کو تیز تر کر کے
کیا ہے طولِ شبِ غم کو مختصر میں نے

تمام شہر مرا اعتبار کرتا ہے،
کہ ایک قول نبھایا ہے عمر بھر میں نے

فلک کے پار اُترنا تھا اور آخر کار
بنا لیا ہے اسی خاکداں پہ گھر میں نے

عجیب کیف سا محسوس کر رہا ہوں مَیں
نکال پھینکا ہے دِل سے ہر ایک ڈر مَیں نے

نظامِ دہر بہت خود کفیل ہے ساجد
مگر جو توڑ دی زنجیرِ بحر و بر مَیں نے

○

اگر وہ برشِ شمشیر پر یقیں رکھتے
تو اپنے دِل میں ہزیمت کا ڈر نہیں رکھتے

دھرے ہیں جس پہ کئی روز سے ہمارے خواب
چراغ ایک اُسی طاق پر کہیں رکھتے

ہمیں کچھ علم نہ تھا باغیوں کی طاقت کا
وگرنہ اپنے لیے بابِ واپسیں رکھتے

گریز کرتے ہوئے آسمان کے نیچے
ہم اپنے پاؤں تلے اور ہی زمیں رکھتے

جو بار پاتے کسی بزمِ ناز میں ہم لوگ
تو ساتھ اپنے وہی شمعِ اولیں رکھتے

بالآخر اپنی رعایا کو بیچ کھاتے ہیں
جو بادشاہ خزانے میں کچھ نہیں رکھتے

ہم اس کی جھیل سی آنکھوں کو چُوم کر ساجد
کفِ بہار پہ اک شاخِ یاسمیں رکھتے

صوفی عبدالرشید

○

سوچتا ہوں اس نگر کے اب کدھر ہیں راستے
راستے گھر بن گئے ہیں اور گھر ہیں راستے

ایک پل بامِ فلک پر، ایک پل پاتال میں
فکرِ انساں کے بڑے ہی مختصر ہیں راستے

مجھ کو دکھلاتے ہیں کیا کیا زندگی کے پیچ و خم
چشمِ بینا کے لیے آئینہ گر ہیں راستے

آدمی ہے گامزن نادیدہ منزل کی طرف
اور اس کے ساتھ ہی گرمِ سفر ہیں راستے

راس آتا ہے مری ہمت کو وہ دریا جہاں
موجِ طوفاں راہبر ہے اور بھنور ہیں راستے

ایک صحرائے طلسمِ بے اماں میں قید ہوں
لے چلو مجھ کو اُدھر یارو، جدھر ہیں راستے

○

سرِ شب جو بام پہ کھل گئی کسی خوش خصال کی چاندنی
تو پلٹ کے آگئی دفعتہً مرے گزرے سال کی چاندنی

شبِ ہجر روزِ وصال تھی، مری زیست وقفِ جمال تھی
مری فکر سے جو ملی ہے آ کے ترے خیال کی چاندنی

یہ تضادِ رنگ بھی دیکھیے، جو گزر ہو دشتِ فراق سے
کہیں دھوپ قہر و جلال کی، کہیں عرضِ حال کی چاندنی

کبھی نور نور تھے راستے، سبھی طور طور فضائیں تھیں
مرے ساتھ ساتھ چلی تھی جب کسی مہ جمال کی چاندنی

وہ بھی شب تھی جبکہ چمک گیا کوئی چاند شاخِ کمال پر
سبھی آنکھوں میں کھلی ہوئی تھی بڑے کمال کی چاندنی

وہ جو سروِ باغِ وصال تھا، جو مری شبوں کا جمال تھا
مرے دل میں اب بھی چٹک رہی ہے اسی نہال کی چاندنی

الفت رسول

○

تو سمجھتا ہے کہ یوں مجھ کو سزا دیتا ہے
یہ رویّہ تو ترا اور مزا دیتا ہے

جس کو دیتا ہے وہ اُسے ڈالتا ہے بے مانگے
مانگنے والے کو بس دستِ دُعا دیتا ہے

سفرِ زیست میں ہو جاتا ہے یوں بھی اکثر
اجنبی کوئی، مجھے مجھ سے مِلا دیتا ہے

دیکھا جائے تو نئی بات کہاں ہے کوئی
رخ ہی، ہر بات کو انداز نیا دیتا ہے

جھوٹا موٹا ہو تو کالا ہے سیہ رات سے بھی
ہاں اگر جھوٹ بڑا ہو تو ضیا دیتا ہے

ناگزیر ایسا بھی خود کو نہ سمجھ میرے لیے
بھولنے والا خدا کو بھی بھلا دیتا ہے

اب تو یہ حال ہے دل کا کہ کسی شخص کے ساتھ
جو بھی رشتہ ہوا اسے پیار بنا دیتا ہے

کیسے رہ سکتا تھا خاموش کہ آخر دل ہے
ٹوٹتے وقت تو پتھر بھی صدا دیتا ہے

وقت آرام کا لمحہ نہیں دیتا الفت
دکھ کے دوران میں وقفہ سا ذرا دیتا ہے

○

یہ مرے دل کے جو اندر کچھ ہے!
یہ تو احساس سے بڑھ کر کچھ ہے!

میں سمجھ سکتا نہیں سب کچھ کیا؟
کیوں سمجھ سے مری باہر کچھ ہے!

اس طرح کا ہے کوئی نام اس کا
رنگ، خوشبو کہ گل تر، کچھ ہے!

میں نہیں مانتا اس دنیا میں
دل دکھا دینے سے بدتر کچھ ہے

اس کو کیا دیکھے ترا حُسنِ نظر
مجھ میں جو مجھ سے بھی برتر کچھ ہے

مانتا ہی نہ کہیں پڑ جائے
کچھ اگر ہے تو یہاں زر کچھ ہے

نیتِ راہرواں ہے جیسی
ویسی ہی مرضیٔ رہبر کچھ ہے

رشک خلیلی

○

خلوص و مہر کا اظہار کون کرتا ہے
کسی کے واسطے ایثار کون کرتا ہے

سب اپنی اپنی نگاہوں کو آزماتے ہیں
حسین چہروں کا دیدار کون کرتا ہے

سبھی مسلح ہیں، کیا دوست اور کیا دشمن
یہ دیکھنا ہے کہ اب وار کون کرتا ہے

میں چاہتا ہوں ذرا سوچ کر کروں اقرار
خدا کی ذات سے انکار کون کرتا ہے

شکستِ خواب جگا دیتی ہے ہمیں ورنہ
کسی کو نیند سے بیدار کون کرتا ہے

ہر انجمن میں جو رونق تھی قربتوں کی تھی
نہ جانے یاروں کو بیزار کون کرتا ہے

میں خود سناتا ہوں لوگوں کو ماجرا اپنا
بیانِ حال پہ اصرار کون کرتا ہے

سکوں اساس ہے تعمیر کا جنوں شاید
وگرنہ دشت میں دیوار کون کرتا ہے

ہماری لغزشِ پیہم کو رائیگاں نہ سمجھ
یہ سوچ، راہ کو ہموار کون کرتا ہے

تو بے خبر ہی نہیں رشکؔ بے ادب بھی ہے
خدا سے شکوۂ آزار کون کرتا ہے

○

برائے نام سہی بام و در تو ہوتے ہیں
ہر ایک شہر میں کچھ ایسے گھر تو ہوتے ہیں

یہ اور بات کہ تیرِ ستم خطا ہو جائے
ہم اُس کے سامنے سینہ سپر تو ہوتے ہیں

تمام عمر بھلانا محال ہوتا ہے
حسین لمحے بہت مختصر تو ہوتے ہیں

بھنور کی آنکھ ہے درکار ڈھونڈنے کیلیے
سمندروں کی تہوں میں گہر تو ہوتے ہیں

مگر نہ آیا ہمیں روز و شب بسر کرنا
ہمارے سامنے شام و سحر تو ہوتے ہیں

کسی کی نفرت و الفت کا ذکر کیا کرنا
ہر آدمی میں یہ عیب و ہُنر تو ہوتے ہیں

ہر آئینہ نظر آتا ہے محوِ نظّارہ
جہاں حسیں ہوں وہاں دیدہ ور تو ہوتے ہیں

کسی سے مِل کے بچھڑنے پہ رشکؔ کیوں ہو اداس
یہ حادثات سرِ رہگذر تو ہوتے ہیں

۱

سیّد عطاؔ جالندھری

○

مرے اپنے کیے کی یہ سزا ہے
پسِ دیوار جو کچھ ہو رہا ہے

خبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر ہوں
کہ یہ بھی ایک معیارِ وفا ہے

وہی کچھ میں اُسے لوٹا رہا ہوں
زمانہ نے مجھے جو کچھ دیا ہے

کہیں میرا مقدر بن نہ جائے
فصیلِ شہر پر جو کچھ لکھا ہے

ترے لہجے کی لرزش کہہ رہی ہے
غلط ہے تو نے جو کچھ بھی کہا ہے

وفا اگر قابلِ تعزیر ٹھہری
تو پھر یہ جرم میں نے بھی کیا ہے

ستم تیرا کہاں تک ہو گوارا
زباں چُپ ہے مگر دل بولتا ہے

سخن فہمی کی دی توفیق جس نے
اسی کی یہ سخن گوئی عطاؔ ہے

○

راس آئی نہیں اب تک یہ مسافت ہم کو
کیسے آوارہ لئے پھرتی ہے ہجرت ہم کو

داغِ حسرت دیا، الزامِ شناسائی دیا
اور دیتی بھی تو کیا ان کی محبت ہم کو

اِن سے مل کر بھی یہ احساسِ جدائی کیوں ہے؟
ایک آزار ہوئی ہے یہ رفاقت ہم کو

حرفِ حق لب سے جو نکلا سرِ مقتل لایا
کتنا مہنگا پڑا اعلانِ صداقت ہم کو

آگہی بن نہ سکی زخمِ انا کا مرہم
سرگراں رکھتی ہے ہر لحظہ یہ حسرت ہم کو

ہم نے تو وقت کو آئینہ بنا کر رکھا
کتنے انداز عطاؔ کرتی ہے حیرت ہم کو

(برمنگھم، برطانیہ)

احمد ندیم قاسمی

O

ہر تغیّر سے ماوراء ہونا
کتنا دشوار ہے خدا ہونا

کوئی کہتا نہیں بُروں کو بُرا
کتنا اچھّا رہا، بُرا ہونا

پیار بھی جب ہو جنسِ بازاری
اِک عجوبہ ہے باوفا ہونا

مجھ کو پاسِ گناہِ آدم ہے
سہل تھا ورنہ پارسا ہونا

قتل کے حادثے سے کم تو نہیں
پھُول کا شاخ سے جُدا ہونا

اِک بغاوت ہے، ایک نیکی ہے
حبس میں موجۂ ہوا ہونا

میرے فن سے ندیمؔ ثابت ہے
میری مٹّی کا کیمیا ہونا

۱

خوش گفتار

ممتاز مفتی

وفات سے چار ایک سال پہلے ایک دن قدرت اللہ شہاب نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگے "مفتی صاحب کل آپ فارغ ہوں گے کیا؟"

میں نے پوچھا "بات کیا ہے؟"

بولے "اگر آپ کو فرصت ہو تو کل ضیا جالندھری سے مل آئیں۔"

میں نے کہا "کس خوشی میں؟"

بولے "I want to pay homage to him"

میں حیران ہوا۔ پوچھا "کس بات پر؟"

بولے "مجھے شعور نہیں تھا کہ وہ بڑا شاعر ہے۔ آج شدت سے احساس ہوا ہے۔"

اس رات میں نے ضیا کا مجموعہ تلاش کیا۔ اسے پھر سے پڑھتا رہا اور مجھے احساس ہوا کہ شہاب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

یہ تو مجھے پتہ تھا کہ ضیا اونچے شاعروں میں سے ہے۔ لیکن اتنا بڑا میں بھی نہیں سمجھتا تھا۔

صاحبو! اللہ کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ کیسی کیسی ادا سے دیتا ہے۔

ایک کو دیتا ہے تو حکم چلا دیتا ہے کہ ساتھ نوبت بھی بجا دو۔ ایک کو دیتا ہے تو کہتا ہے "دین بھرپور ہو لیکن واہ واہ دبی دبی رہے۔"

ایک کو دیتا کچھ نہیں۔ کہتا ہے "خالی ڈھنڈھورا پیٹ دو۔"

ضیا کو دیا تو بھرپور ہے لیکن ساتھ ہونٹوں پر انگلی رکھ لی —— نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی سوجھ بوجھ والے قاری کو بیٹھے بٹھائے دفعتاً احساس ہوتا ہے ارے یہ تو بڑا شاعر ہے! یوں بات زیر لبی ہی رہتی ہے۔ البتہ جنھیں قدرت اللہ کی طرح عمل کی توفیق عطا ہوتی ہے وہ چپکے سے ہومیج ادا کرنے کے لئے ضیا یاترا کر لیتے ہیں۔

جناب والا! جالندھر نے بڑی بڑی عجیب و غریب شبیہیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً میرے دوستوں میں حفیظ تھا۔ کلیم ہے۔ فیضی ہے۔ ایچ یو بیگ ہے۔ مجید ہے۔ حافظ ہے۔ مسعود ہے۔ ایک سے ایک نہیں ملتا۔ لیکن جالندھریت کی وجہ سے سب ملتے ہیں۔ ملتے رہتے ہیں۔ اتفاقاً نہیں التزاماً۔ باقاعدہ۔

جالندھریے کو میل جول کا عارضہ لاحق ہے۔

جالندھریہ اجلا نہیں ہوتا۔ لکس صابون سے منہ دھو کر آئے تو بھی میلا میلا لگتا ہے۔ کلف زدہ نہیں ہوتا۔ دھوبی سے دھلے کپڑے پہنے تو بھی لگتا ہے جیسے گھر کے دھلے ہوں۔ جالندھریے میں ٹین نہیں ہوتی۔ مونچھیں ہوں تو ہوں ان میں اکڑ نہیں ہوتی۔ لٹکی لٹکی رہتی ہیں۔

ضیا کو دیکھئے۔ اس میں لاہور ہے۔ کراچی ہے۔ اسلام آباد ہے لیکن جالندھر نہیں ہے۔ خود کو جالندھری کہتا ہے اس لئے ہم مانے لیتے ہیں۔ ورنہ جالندھر کا رنگ نہیں ہے۔

میرا ایک چھڈیار دولت مسعود قریشی تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا بولا "خبردار جو تو نے جالندھر کی شان میں گستاخی کی تو ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جالندھری ہو اور اندر جالندھر نہ ہو۔ میاں جالندھر بڑا زود اثر شہر ہے۔ ہڈیوں میں رچ بس جاتا ہے۔ اپنی مہر لگا دیتا ہے۔"

میں نے کہا "بھائی میرے، غصہ نہ کھاؤ۔ یہ لفافہ تو جالندھر کے ڈاک خانے سے مہر لگے بغیر نکل گیا۔"

مسعود غصے میں چلایا "کیا وہ ٹیلنٹڈ نہیں ہے؟"

میں نے کہا "ٹیلنٹ ہے ضرور ہے لیکن ٹیلنٹ تو سیالکوٹی میں بھی ہوتی ہے۔"

بولا "خوش شکل نہیں کیا؟"

میں نے کہا "خوش شکلی تو امرتسریوں کا وصف تھا۔ جالندھریوں میں خوش شکلی کہاں سے آ گئی۔ وہ تو عوامی ٹھپتے والا شہر ہے۔"

بولا "جذبات کی بھیگ تو ہے نا۔"

میں نے کہا "بھائی میرے، وہ تو عقل کا مارا ہوا ہے۔ سوکھا کاٹھ۔ اور پھر ذرا میلا نہیں۔ اتنا اُجلا جالندھریہ ہو سکتا ہے کیا؟"

باہر سے دیکھو تو ضیا کی شخصیت بالکل سپاٹ ہے جیسے دو رویہ روشن بتیوں تلے دوڑتی ہوئی سیدھی ہموار سڑک ہو۔ نہ اچان نہ نچان۔ نہ جوڑ نہ موڑ۔

اس کی شخصیت میں چار خصوصیات نمایاں ہیں ـــــ خوش شکل، خوش پوش، خوش گفتار، خوش مزاج۔ اُس خاتون کی طرح جاذب نظر جس کی تصویر کشی راگ ودیا کے ایک بول نے کی ہے:

مکھ موڑ موڑ مسکات جات

بے نک مسکان دور کھڑے کو لوٹ لیتی ہے۔ دعوت دیتی ہے۔ پاس بلاتی ہے۔ لیکن قریب جاؤ تو بھید کھلتا ہے کہ پاس روک نہیں سکتی۔ اپنا بنا نہیں سکتی۔ شاید اس لئے کہ اپنا بنانے کے لئے خالی مسکان کافی نہیں ساتھ تیوری کا امتزاج ضروری ہے۔ سیانے کہتے ہیں دوستی کی گٹھڑی ٹانگنے کے لئے سیدھا کیل کام نہیں آتا۔ ٹھڑا جھڑا ہک درکار ہوتا ہے۔

ضیا کی خوش گفتاری بظاہر بہت بڑی دین ہے۔ لیکن درپردہ بڑی محرومی ہے۔

ضیا باتوں سے یوں بھرا پڑا ہے جیسے شہد مٹھاس سے بھرا ہوتا ہے، یا جیسے عوام سرکار کے خلاف شکایات سے بھرے ہوتے ہیں۔ آپ ضیا سے کسی موضوع پر بات کریں۔ ہر موضوع پر اس کے پاس کہنے کے لئے ایک بات موجود ہے۔ اس کا حافظہ اس قدر چوکس رہتا ہے جیسے Quizz پروگرام میں نعیم بخاری کے ہتھے چڑھا ہوا ہو۔

موقعہ اور مناسبت کے لحاظ سے ضیا کی بات عین موزوں ہوتی ہے۔ انداز بیان اتنا شگفتہ کہ سامع بور نہیں ہوتا چاہے بات پہلے کی سنی ہوئی ہو۔

اس کی رواں باتیں سن سن کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ بار بار اسے کہتا رہا کہ یار تو اپنی یادداشتیں کیوں نہیں لکھتا۔ میں سمجھتا رہا کہ نثر اس کی زبان کی لونڈی ہے۔ پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا۔ ارے ضیا تو منہ زبانی ہے، صرف منہ زبانی۔

صاحبو، پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے لیکن ایسے ہوتا ہے کہ خوش گفتار لوگ منہ زبانی پھول پتیاں برساتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چلاتے ہیں لیکن قلم ہاتھ میں اٹھائیں تو قبوز ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلا منہ زبانی جس کی شخصیت نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا، محمود نظامی تھا۔

محمود نظامی باتیں نہیں کرتا تھا پھلجھڑیاں چلاتا تھا۔ اس کی ہر بات مزاح کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ قہقہہ لگاتا تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اتنی بھیگ کہ لگتا جیسے آنکھ سے اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔

یوں قہقہے اور آنسو کے تعلق کا بھید کھل جاتا۔

محمود نظامی سے مل کر جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ منہ زبانی ہے۔ ضیا سے مل کر مجھے شعور نہ ہوا۔ سمجھتا رہا کہ اس میں نثر نگاری کی بھرپور اہلیت موجود ہے لیکن جسے شعر و سخن کی دین حاصل ہو وہ نثر نگاری کی طرف توجہ کیوں کرے۔ گاجر کا حلوہ ہو تو گڑ کون کھاتا ہے۔

ویسے بھی ضیا جالندھری میں جسم کے اجلے پن کے علاوہ ذہنی اجلے پن کا احساس بھی موجود ہے۔ ذرا سا احساس برتری۔ تھوڑی سی اونچائی۔ تھوڑی سی ہیں — لیکن ضیا بہت چالاک ہے۔ اس احساس برتری کو دکھنے نہیں دیتا، سمیٹے رکھتا ہے۔ جناب والا، اجلے پن کا احساس چاہے کیسا بھی ہو، جسمی ہو، ذہنی ہو، روحانی ہو، دکھے بغیر نہیں رہتا۔

صاحبو، اللہ نہ کرے کوئی اجلا ہو۔

ساری دنیا میلی ہو جاتی ہے۔

بہر حال ایک روز بھید کھل گیا۔ میں نے جان لیا کہ وہ منہ زبانی ہے۔ نثر نہیں لکھے گا۔ نہ ہی لکھے تو اچھا ہے۔

دوستوں نے مجبور کر کے محمود نظامی سے ایک کتاب لکھوا دی تھی۔ لکھتے ہوئے نظامی کتابی بن گیا۔ کتاب کا رعب چھا گیا۔ نہ نظامی رہا نہ اس کی بات رہی۔ نہ قہقہہ رہا نہ آنسو صرف کتاب ہی کتاب رہ گئی۔

صاحبو، دعا کرو اللہ کتاب سے بچائے رکھے۔

ہلکی پھلکی بات کرنے نہیں دیتی۔ سیدھی بات کو الجھا دیتی ہے۔ لطافت میں کثافت گھول دیتی ہے۔ جذبات کی رنگینیوں کو تج کر سوچ کی گھمن گھیریوں میں ڈال دیتی ہے۔ عقل سکھاتی ہے بڑے بڑے بڑے شاعر آئے مفکر آئے فلسفی آئے۔ انھوں نے ہمیں خبردار کیا کہ بھائیو، عقل ناقص چیز ہے اس پر بھروسہ نہ کرنا۔

بہتے ان کی بات پر واہ واہ تو کی لیکن اعتبار نہ کیا۔ آج بھی ہم عقل کی لاٹھی کے سہارے کے بغیر قدم دھرنے سے ڈرتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی جواب نہیں۔ یہ سارا تماشا انھوں نے لگا رکھا ہے۔ ایک طرف چھپنے کا شوق ہے۔ ڈال ڈال پات پات میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف ظاہر ہونے کا شوق ہے۔ ڈال ڈال پات پات میں ظاہر ہیں۔

حسینوں کی طرح: صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

انھوں نے انسانی شخصیت بھی اپنے رنگ میں رنگی ہے۔ انسانی شخصیت ظاہر بھی ہے مستور بھی۔ یک رنگی نہیں۔ تضادات کی دھجیاں جڑی ہفت رنگی ہے۔ تضادات میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس ست رنگے پرزم کو یوں گھما رکھا ہے کہ صرف ایک رنگ دکھتا ہے۔

ضیا کی دو رنگی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

آپ اس کا کلام پڑھیے، پھر اس سے ملیے۔ اس کی باتیں سنیے۔ فرق صاف ظاہر ہو گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ وہ ایک نہیں دو فرد ہیں۔ ایک شاعر، دوسرا فرد۔ شاعر کا رنگ اور ہے، فرد کا اور

شاعر گہرا ہے۔ ڈونگا۔ فرد، ٹریول لائٹ

شاعر دکھ ہے، فرد خوش باش۔

شاعر آنسو ہے، فرد قہقہہ

شاعر عاشق ہے فرد محبوب

فرد عقل کا مارا ہوا، شاعر اڑان کا رسیا۔

شاعر بے نیاز۔ فرد دنیادار

شاعر کہتا ہے:

یہاں پہ میں ہی نہیں ہوں
مجھ سے کئی ہیں
یہ کھوکھلے چہرے، جن کی نظریں
فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں

یہ لوگ ہنستے ہیں لیکن ان کی ہنسی میں رنگ طرب نہیں ہے فرد کی جانب دیکھئے چہرا بھرا۔ نگاہیں جاذب اور طرب سے بھرپور قہقہہ۔

شاعر کہتا ہے:

ہنسو اور اتنا ہنسو تم برس پڑیں آنکھیں
پھر ان سلگتے ہوئے آنسوؤں میں بہہ جاؤ

وہ درد اور وہ دوری جو قہقہوں میں ہے، صاحبو میں تو نثر نگار ہوں۔ ہم نثر نگار تو بیلی سوار ہیں، ہم اڑن کھٹولے میں سوار شاعروں کے بارے میں کچھ کہنے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ ہی فیصلہ کریں۔ فرد کی طرف دیکھئے۔ نہ درد نظر آتا ہے نہ آنسو اور دوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرب ہی قرب ہے۔

تقسیم سے پہلے کی بات ہے جب میں ضیا سے متعارف ہوا تھا۔ ماہنامہ "ہمایوں" جو اُن دنوں ادب کا ٹاپ ناچ ہائی برو پرچہ تھا، جس کا ایڈیٹر حامد علی خاں ادب کا بیوروکریٹ تھا۔ جو نئے ادیبوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ پیچھے ہٹ کر بات کرو۔ اس پرچے میں ضیا کی چھوٹی چھوٹی جذبات سے رچی بسی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ یہ نظمیں منفرد تھیں جاذب توجہ تھیں۔ پھر "ہمایوں" میں اس کی تصویر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی یہ کیسا شاعر ہے۔ اتنا قبول صورت۔ شاعر تو ننگے چٹے ہوتے ہیں۔ اور میرے علم کے مطابق، لازم تھا کہ ہوں۔

قبول صورتی کا معمہ تو حل نہ ہوا۔ کلام کا مداح بن گیا۔ آج تک ہوں۔ پھر پارٹیشن کے بعد راولپنڈی میں پہلی مرتبہ میں نے ضیا کو دیکھا۔

صدر میں بابو بازار کی نکڑ پر ایک بڑی میلی حلوائی کی دوکان تھی در و دیوار چکٹ تھے مٹھائیوں کے تھال اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ دکان کے سامنے بنے سجے ہارڈ کالر اور ٹائی میں ملبوس دو فرد ہاتھوں میں مٹھائی کی پلیٹیں اٹھائے باتوں میں محو تھے۔ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

انھیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اتنے اپٹوڈیٹ لیکن گردوپیش سے اتنے بے نیاز! اسٹیٹس کانشنس سے اتنی بیزاری!

میں نے اپنے ساتھی عزیز ملک سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟"

ملک بولا "یہ ضیا جالندھری اور اس کا دوست خورشید ہے۔"

"کرتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سول سروس میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا ـــــ اتنی جرأت!

مجھے قدرت اللہ شہاب یاد آ گئے۔

ایک دفعہ میں نے قدرت سے کہا "آپ کا اور میرا ساتھ مشکل ہے۔"

بولے "کیوں؟"

میں نے کہا آپ۔ آپ بیوروکریٹ ہیں اور میں عوامی۔"

"کیا مطلب ؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "آپ پابند ہیں اور میں آزاد"

بولے "میں بھی تو آزاد ہوں"

میں نے کہا "اگر آپ آزاد ہیں تو چلیے کراچی کے کسی پاش ایریا میں گنڈیریاں چوستے ہوئے ٹہل لگا کر دکھا دیجیے"

یہ سن کر شہاب خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد بولے "مشکل کام ہے لیکن چلیے کوشش کرتے ہیں"

ضیا اور خورشید کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ ایک مشکل اور جرأت آزما کام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ اس میلی چیکٹ دوکان پر یوں ایٹ ہوم محسوس کر رہے تھے جیسے انٹرکان کے بار باکیو پر کھڑے ہوں۔

پھر اس بلبل جوڑے کو کئی ایک بار دیکھا۔ وہی کتر کتر باتیں۔ وہی بھرپور قہقہے۔ وہی گردو نواح سے بے نیازی۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ یا اللہ یہ ضیا کیا چیز ہے۔ نہ شکل و صورت سے شاعر ہے نہ برتاؤ سے۔ لیکن ہے شاعر۔ بانکا شاعر۔

پھر ضیا ٹیلی ویژن کا منیجنگ ڈائرکٹر بن کر اسلام آباد آ گیا۔ اس کے آتے ہی ٹیلی ویژن کے چھتے میں بھن بھن کا طوفان آ گیا۔

ایک بولا "سولہ آنے ڈاک خانے کا کلرک ہے۔ افسری کرنی نہیں آتی"

دوسرا بولا "بھئی یہ تو دو اور دو چار گنتا ہے۔ بالکل اکاؤنٹنٹ ہے۔ اسے تو اے جی پی آر میں بھیجنا چاہیے تھا"

تیسرا بولا "میں نہیں مانتا کہ یہ شاعر ہے۔ کبھی شاعر بھی اصولوں کے پابند ہوتے ہیں"

چوتھے نے کہا "یار یہ تو کرکٹ کے اوپنر کی طرح خالی ٹھپ ٹھپ کرتا ہے۔ ٹی وی میں تو سلیم اظہر جیسا باؤنڈریاں لگانے والا چلتا ہے"

پانچویں نے کہا "ہاتھ کا بڑا تنگ ہے دونوں مٹھیاں بھینچ رکھی ہیں۔ انھیں کھولتا نہیں"

چھٹا بولا "یار کمال آدمی ہے۔ اندر سے بڑا سٹیٹس کانشس ہے لیکن ظاہر ہونے نہیں دیتا۔ کریو جو کرنا ہے!"

صاحبو، آپ ٹی وی کو جانتے ہیں۔ ٹی وی کے عملے کو نہیں جانتے۔ ٹی وی ننگا پراپیگنڈا ہے۔ عملہ سُقل پراپیگنڈا۔ ٹی وی شور مچا کر بھید کھول دیتی ہے۔ عملہ زیر لبی چلاتا ہے۔

ٹی وی جاٹ ہے اور عملہ دانشور۔

ٹی وی گلیمر ہے اور عملہ شہزادے۔

یہ عملے کا قصور نہیں، پروفیشن کا اثر ہے۔

شو بزنس کامیوں کو شہزادے بنا دیتا ہے۔

ضیا کی آمد پر عملے نے ایسی وسپرنگ کمپین چلائی کہ ضیا کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی۔

جب سرگوشیوں کا گردو غبار چھٹا تو عملے کے ذمہ وار لوگ بولے کہنے لگے "دونوں ہی مجبور ہیں۔ شہزادے اصول اور قانون کی پابندی میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ ضیا پوسٹ آفس سے آیا ہے۔ اصول اور قانون کی زنجیریں ساتھ لایا ہے"

اگرچہ ضیا نے ٹی وی کے عملے کو بونس دلایا اور اس قلاش محکمے کو بنک بیلنس سے نوازا لیکن وہ ان کی شہزادگی دور نہ کر سکا۔

جب ضیا آیا تھا تو ٹی وی پر ۴۰ کروڑ قرضہ تھا جو سالانہ ۲ کروڑ کے حساب سے بڑھتا جاتا تھا۔

جب وہ ٹی وی چھوڑ کر گیا تو تمام قرضہ ادا ہو چکا تھا اور ۲۰ کروڑ کی سالانہ آمدنی ہو رہی تھی۔

اور کارکنوں کو سال میں تین بونس مل رہے تھے۔

ٹیلی ویژن نے ادیبوں کو کبھی رائٹر نہیں سمجھا۔ انھیں صرف استعمال کرتے ہیں جس طرح پلکوں کو جاذب نظر بنانے کے لیے حسینائیں لوشن

استعمال کرتی ہیں، پروڈیوسر اپنے ڈائریکٹر خود بناتے ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے اور بنے بنائے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انھیں گھوڑے سے دلچسپی ہے، سوار سے نہیں۔ جب ضیاؔ ایم ڈی بن کر آیا تو ادیب امیدیں رچا کر بیٹھ گئے لیکن انھیں جلد پتہ چل گیا کہ ٹی وی کا ایم ڈی ایک ایڈمنسٹریٹر ہے، شاعر نہیں۔ گلہ شکوہ بے کار ہے کیونکہ اس نے ضیاؔ جالندھری شاعر کو بھی ہینگر پر ٹانگ کر سٹور روم میں رکھوا دیا ہے۔

صاحبو، ضیاؔ کی کہانی بہت سادہ اور مختصر ہے۔

ایک سخت گیر باپ نے ضیا کے بچپن اور جوانی کو تلخ بنا دیا۔ محبت سے محرومی بہت بڑی اذیت ہے۔ اگرچہ ضیا کی نانی نے بھرپور محبت دی لیکن ماں باپ کی محبت اور چیز ہے۔ باپ کی سخت گیری کی وجہ سے وہ مالی مشکلات میں گھرا رہا۔ باپ ریلوے میں ملازم تھے۔ وہ کیوں سخت گیر تھے، یہ بھید نہیں کھلتا۔

نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ جن کا تعلق حرکت کے پروفیشن سے ہے وہ سخت گیر نہیں ہوتے، رسمی اخلاق کے پابند نہیں ہوتے دل اور ہاتھ کے کھلے ہوتے ہیں۔ کھاؤ پیو اور جیو کے قائل ہوتے ہیں۔

مثلاً ایرلائینز کے لوگ خصوصاً پائیلٹ۔ ریلوے کے لوگ خصوصاً گارڈ۔ بس چلانے والے۔ ٹرک ڈرائیور۔ تانگابان۔ ان سب کو حرکت سے تعلق ہے۔

میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ تقسیم سے پہلے ریلوے گارڈ اپنے ریلیسٹ جنکشن کو سرکاری تار دیا کرتے تھے کہ میرے لئے دو ڈزن ایک لڑکی اور ڈبل بیڈ کا انتظام کرو میں آ رہا ہوں، اور اسے کوئی برا نہیں مانتا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ضیا کے والد ریلوے کے متحرک سٹاف میں ہوتے ہوئے اس قدر مراط مستقیمیے اور سخت گیر کیوں تھے۔

شاید ضیا کے والد محض ایک آلۂ کار تھے اور قدرت شاعر کی تخلیق کے لئے ضیا کو درد کی دھنکی سے رواں رواں کر رہی تھی۔ فن کار ایسے ہی نہیں بن جاتے۔ بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ سونا بننے کے لئے کٹھالی سے گزرنا پڑتا ہے۔

شاعر کی تکمیل کے لئے ضیا کو ایک طویل عشق سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک انوکھا عشق تھا۔ بچھڑی عشق۔ چونکہ ضیاؔ بنیادی طور پر محبوب طبیعت کا مالک ہے۔ اس عشق میں ایک ہی فرد بیک وقت عاشق بھی تھا اور محبوب بھی۔

کاش کہ میں آپ کو اس بچھڑی عشق کے کوائف سنا سکتا۔ بہرحال چونکہ شاعر کی تکمیل کے لئے تھا اس لئے ملاپ خارج از امکان تھا۔ مقصد ضیا کو درد کی دولت سے نوازنا تھا۔ صاحبو، درد اللہ کی بہت بڑی دین ہے۔ درد نہ ہو تو شاعر نہ ہو، ادیب نہ ہو، انسان نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو۔

پھر ضیا کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی انوکھی شادی تھی۔ گرم محبت اور کولڈ وار کا میدان گرم ہو گیا۔

محترمہ پشاور کی درسگاہ میں اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھی۔ ایم اے انگلش تھی، خدوخال سے آراستہ تھی۔ سوشل تھی گیٹس والی تھی۔ بات کرنا جانتی تھی۔ تعلیم میں، کھیلوں میں، تقریبات میں، تنظیمات میں اپنا لوہا منوا چکی تھی۔ ڈبیٹ میں، ڈکلیمیشن میں، ڈرامہ میں امتیاز حاصل کر چکی تھی۔ ادھر خوش شکل تھی، خوش گفتاری تھی، شاعری تھی، شہرت تھی، سول سروس تھی۔ محترمہ کو اپنی اچیومنٹس پر ناز تھا، ضیا کو اپنی شخصیت پر ناز تھا۔ دونوں کیل کانٹے سے لیس تھے۔ دونوں نے خود کو منوانے کا عزم کر لیا۔ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ شکر ہے بچہ آ گیا۔ اس نے دونوں کو بھگا کر سیز فائر کروا دیا۔

صاحبو، دعا کرو کہ میاں اور بیوی دونوں برابر کے گفٹڈ نہ ہوں ورنہ مشکل پڑ جاتی ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک میں حوالگی اور سپردگی کا جذبہ ضرور موجود ہو۔ ورنہ ازدواجی بیل چلتی نہیں ٹھس ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء)

۱

ہم نفس — ۴

مسعود مفتی

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو "فنون" بابت نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء)

اگلے روز چھ دن کی چھٹی کے بعد حملے کے شور و غوغا میں دفتر کھلا۔ خیال تھا کہ اس امنڈتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے آج کئی اقدام ہوں گے مگر دو بجے کی خبروں میں ہنگامی صورت حال کا نفاذ ہونے کے علاوہ اور کوئی اعلان نہ ہوا اور زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ڈھاکہ حسب سابق تھا، سوائے اس کے کہ بازار قدرے سنسان ہو گئے تھے مگر کوئی واضح حفاظتی تدابیر نظر نہ آتی تھیں۔ بیرونی اخباروں کے نامہ نگار البتہ اپنے اپنے اخباروں کو دھڑا دھڑ مراسلے بھجوا رہے تھے جن میں مقامی صورت حال پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش ہوتی۔ چوبیس نومبر کو مجھے اور بھولا کو ان مراسلوں کی نقول دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

ایک نامہ نگار نے لکھا تھا کہ جنگ کی ابتدائی جھڑپیں شروع ہو چکی ہیں۔ اور اس جنگ کے متعلق تین قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں پہلی یہ کہ ان جھڑپوں سے تنگ آ کر پاکستان فوراً ہی مغرب اور مشرق میں پوری جنگ چھیڑ دے اور اقوام متحدہ والے بیچ بچاؤ کروا دیں۔ اس طرح شاید پاکستان کی سالمیت قائم رہ جائے —— دوسری یہ کہ چند روز بعد ہندوستان بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے اور پاکستان جنگ پر مجبور ہو جائے مگر اس حالت میں ملک کی سالمیت برقرار نہ رہ سکے گی اور فیصلہ جنگ کے نتائج کے مطابق ہوگا —— اور تیسری یہ کہ جنرل یحییٰ مشرقی پاکستان کے گوریلوں کی موجودگی میں اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکتے اور گوریلوں سے ہار بھی نہیں مان سکتے اس لئے وہ ہندوستان سے مصنوعی جنگ (Mock Fight) کر کے جلد ہی ہتھیار ڈال دیں گے، کیونکہ مکتی باہنی کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے فوج کی اتنی بے عزتی ہوگی کہ مغربی پاکستان میں بھی ان کا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ مگر ہندوستان کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے ان کی اتنی بے عزتی نہیں ہوگی اور جنرل یحییٰ مغربی پاکستان میں اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں گے۔

یہ مراسلہ پڑھنے کے بعد بھولا بہت مضطرب تھا …… مجھ سے بار بار پوچھتا کہ تیسری قیاس آرائی کا امکان ہے یا نہیں —— مگر میں اس کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ تو مستقبل میں جنگ لڑنے کے انداز ہی بتائیں گے۔[1]

ریڈیو پاکستان نے بتایا کہ ہندوستانی حملے کا معاملہ سیکورٹی کونسل میں پیش کرنے پر پاکستان غور کر رہا ہے —— میں نے سوچا حملہ ہوئے دو دن گزر چکے ہیں اور ابھی تک غور ہی ہو رہا ہے۔

شام سوا پانچ بجے ریڈیو پاکستان نے بتایا کہ پندرہ منٹ بعد کرفیو لگ جائے گا۔

شام ڈھلی تو ڈھاکہ بلیک آؤٹ میں ڈوب گیا۔

لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ واقعی جنگ شروع ہو چکی ہے۔

---

[1] ۱۹۷۱ء کی جنگ جس انداز میں لڑی گئی، اس کا ہلکا سا عکس اس تحریر کے آخر میں ضمیمہ نمبر ۵ میں درج ہے۔

مگر گھنٹہ بھر بعد بلیک آؤٹ ختم کر دیا گیا۔
چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ آیا یہ بلیک آؤٹ تھا یا محض بجلی فیل ہوئی تھی یا پھر گوریلوں نے پاور ہاؤس پر حملہ کیا تھا
سول انتظامیہ کے متعلقہ افسروں سے پوچھا۔ مگر کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

واللہ اعلم۔
رات کسی وقت کرفیو بھی ختم ہو گیا۔ نہ معلوم کس وقت۔ صبح صبح زندگی کے معمول کی آوازوں سے آنکھ کھلی۔
اور پھر زندگی کا معمول ایسا لوٹا جیسے کہیں کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں۔
لوگ سڑکوں پر اسی بے حسی اور لاتعلقی سے گھوم رہے تھے جیسے بائیس نومبر سے پہلے گھومتے تھے۔ سول ڈیفنس کا شور و غوغا بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ بلیک آؤٹ پریکٹس کے لئے بھی نہ ہوتا تھا۔ کچھ روز پہلے شہر میں خال خال خندقیں کھدوائی گئی تھیں۔ مگر اب عجلت میں وہ بھی بھروا دی گئیں۔
کیوں؟؟؟ لوگ پوچھتے۔ سرحدوں پر حملہ ہے۔ شہروں میں گوریلے ہیں۔ دشمن بار بار للکار رہا ہے۔ ہر طرف جنگ کا شور ہے۔ مگر نہ صرف یہ کہ کوئی احتیاطی تدابیر نہیں بلکہ کوئی خاص تیاری بھی نظر نہیں آتی۔ نہ ہی لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ جنگ میں کیا کرنا چاہیئے۔
"تعجب ہے" بھولا اٹھائیس نومبر کو کہنے لگا "ان حالات میں بھی اسی رویے کا احساس قائم ہے کہ فوج یہ جنگ اکیلے ہی لڑنا چاہتی ہے اور قوم کو اس میں شریک نہیں کرنا چاہتی۔"
وہ اس دن بہت دلگیر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بڑے ہی احتجاجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "آج حملہ ہوئے چھ دن گزر گئے ہیں نہ تو پاکستان نے سیکورٹی کونسل میں شکایت کی ہے، نہ ہی مغربی پاکستان سے حملہ کیا ہے ـــــ حالانکہ ہمیں ہمیشہ یہی کہا گیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہو گا۔"
وہ گھنٹہ بھر سے اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا ـــــ کسی ایک موضوع پر جم کر بات نہ کرتا۔ بلکہ کبھی ایک احتجاج۔ کبھی دوسرا۔ کبھی تیسرا۔ جیسے کوئی ناراض عورت ہو۔
"میں نے پی ڈبلیو ڈی کے ایک افسر سے پوچھا" وہ پھر بولا "آج کل بہت مصروفیت ہو گی کیونکہ دھڑا دھڑ پل اڑائے جا رہے ہیں۔ سڑکیں اور ریلیں تباہ کی جا رہی ہیں۔ مگر وہ کہنے لگا کہ بالکل نہیں۔ ہم لوگ تو فارغ بیٹھے ہیں ـــ تم بتاؤ سول انتظامیہ کے وسیع وسائل آج کل بھی فالتو دھرے رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟"
میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ کیونکہ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا ـــــ اس لئے گفتگو میں وقفے پڑ جاتے جن میں ہم دونوں سوچتے رہتے۔ اور پھر ایک دم وہ کوئی بات کر اٹھتا۔
"بنگالی اور بہاری دونوں پوچھتے ہیں کہ ہم اس جنگ کا ایندھن بننے کو تیار ہیں، سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں کیونکہ ہمارے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ مگر ہمیں کوئی بتاتا ہی نہیں کہ ہم کیا کریں۔ کیسے قربانیاں دیں۔"
میں خاموش رہا ـــــ جیسے کوئی مجرم ہو۔
"تم نے آج پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹوریل پڑھا ہے؟" وہ پوچھنے لگا۔
"ہاں۔"
"وہ بھی یہی سوال پوچھتا ہے کہ اگر یہ جنگ ہے تو پھر مغربی محاذ پر حملے میں تاخیر کیوں ـــــ میں پوچھتا ہوں۔" وہ جوش میں کھڑا ہو گیا

"کیا مغربی پاکستان تماشہ دیکھ رہا ہے کہ مشرقی پاکستان مرنے میں کتنی دیر لے گا؟"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ سوال صرف بھولا کی طرف سے ہی نہیں ہے بلکہ سارے مشرقی پاکستان کی طرف سے ہے۔ اور کئی لوگ برملا پوچھ رہے ہیں۔

انتیس نومبر کو سارے مشرقی پاکستان میں ہندوستانی حملے کے خلاف ہڑتال تھی۔ اتنی مکمل کہ ٹیکسی رکشا بھی نہ چلا۔ ریڈیو پاکستان نے خبر دی کہ عوام دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان نے جارحیت کی ہے۔

مگر عوام بار بار پوچھ رہے تھے کہ حکومت خود اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں اٹھاتی تاکہ دنیا کو پتہ چلے۔

اگلے روز زندگی پھر معمول پر آگئی۔ ڈھاکہ میں یوں لگتا تھا جیسے جنگ کا کہیں وجود ہی نہ ہو۔

دن گذرتے گئے۔

ریڈیو پاکستان بتاتا رہا کہ ہندوستانی فوجوں کی موثر مدافعت کی جا رہی ہے اور مقابلہ کیا جا رہا ہے۔

بی بی سی۔ وائس آف امریکہ اور آسٹریلیا ریڈیو بتاتے رہے کہ ہندوستانی فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں۔

ہندوستانی ریڈیو بتاتا رہا کہ مکتی بھاہینی کا آزاد شدہ رقبہ بڑھ رہا ہے۔

بھولا اور دوسرے لوگ پوچھتے رہے کہ پاکستان یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیوں نہیں کرتا؟ اور مغربی پاکستان سے حملہ کیوں نہیں ہوتا؟ مغربی پاکستانی ہونے کے ناتے وہ ہمیں طعنے دیتے۔ مگر ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

نورالامین اور پروفیسر غلام اعظم جیسے لیڈر مغربی پاکستان سے حملے کا تقاضا کرتے رہے۔

سول ڈیفنس کا محکمہ سویا رہا۔

ڈھاکے کی بجلیاں چمک چمک کر جلتی رہیں۔ نہ بلیک آؤٹ۔ نہ کرفیو۔

وفادار بنگالی ہدایات ڈھونڈتے رہے کہ وہ کیسے اپنی جانیں قربان کرکے ملک کو بچا سکتے ہیں۔

سکولوں کالجوں کا مسلمان سٹاف مارچ کے فوجی ایکشن کے بعد ابھی مکمل طور پر واپس حاضر نہیں ہوا تھا مگر سارا ہندو سٹاف حاضر تھا اور بائیس نومبر کے بعد اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔

نومبر کی آخری رات تھی۔ دارالکباب سے کھانا کھانے کے بعد بھولا اپنی کار میں مجھے سرکٹ ہاؤس چھوڑنے آیا اور چائے پینے رک گیا۔ چائے کے دوران بھی وہ بار بار بے صبری سے وہی دو سوال دہراتا رہا کہ ہندوستانی جارحیت کا مسئلہ اقوام متحدہ میں کیوں نہیں اٹھایا جاتا اور مغربی پاکستان سے حملہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں کہیں سے بھی خبروں کے انتظار میں ہم نے ریڈیو لگا لیا۔

بالآخر خبریں شروع ہوئیں۔

مگر ایک دم بجلی بند ہو گئی۔

ریڈیو بیٹری پر بھی تھا اس لئے ہم اندھیرے میں ہی خبریں سنتے رہے۔

لیکن خبروں میں ان دونوں سوالوں کا جواب نہ تھا۔

خبریں ختم ہو گئیں۔

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں خاموشی سے ڈوبے رہے۔ فقط ریڈیو کی متفرق آوازیں اندھیرے میں ابھرتی رہیں۔

ا

نہ معلوم کتنی دیر ہوگئی۔

اچانک بجلی آگئی اور سب کچھ نظر آنے لگا۔

.... بھولا کا سر کرسی کی پشت پر لٹکا تھا ـــــ آنکھیں بند تھیں ـــــ اور اس کے پھولے ہوئے رخساروں پر آنسو دھیرے دھیرے بہہ رہے تھے۔

تین دسمبر بھی آگیا۔ مگر پاکستان نے ہندوستانی جارحیت کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش نہ کیا۔ وفادار بنگالی خاموش نظروں سے سوال کرتے:

"یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی"

ان دس دنوں میں میری ملاقات عطاء الحق سے ہر روز ہوتی تھی۔ مگر ملاقاتوں کی نوعیت بدل چکی تھی۔ اب وہ بحث سے بچتا تھا اور ملک کے حالات پر بات چیت کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ ہی یہ تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا ہوا ہے۔

"اگر یہ حملہ ہوتا تو پاکستان یقیناً اقوام متحدہ میں شور کرتا۔" اس نے ایک دفعہ معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ گفتگو پر آمادہ نہ تھا۔ مگر میرے ہماری ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا کہ عطاء الحق کو حملے کی خبر سب سے پہلے اسی ڈرائیور نے بتائی تھی۔ خبر سن کر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"اب دیکھنا!"

حملے کے دس دنوں میں ہمیں یقیناً تشویش تھی مگر وہ بڑا مطمئن نظر آتا تھا جیسے جام جمشید نے اس پر مستقبل آشکار کر دیا ہو اور اسے حالات کا پانسہ اپنے حق میں پلٹنے کا یقین ہو۔ مجھے یوں لگتا جیسے اس کی خاموش دل جمعی زبانِ حال سے ہمیں دھمکا رہی ہو۔

"اب دیکھنا!"

تین دسمبر کا دن ویسے ہی گزرا جیسے پچھلے دن تھے ـــــ شام ہوئی تو۔ ہم پانچ سات لوگ ٹی وی پر خبریں سننے لگے۔ خبروں کے بیچ میں اناؤنسر جلدی سے ایک فقرہ بول گیا۔

"آج مغربی پاکستان کی ساری سرحد کے ساتھ ساتھ ہماری ایڈوانس پوزیشن پر ہندوستان نے حملہ کیا۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔"

پوری طرح ذہن میں بیٹھنے سے پہلے ہی اگلی خبر شروع ہوگئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے بے صبری سے پوچھنے لگے کہ کیا ہم نے صحیح سنا ہے۔ اِدھر اُدھر فون کئے گئے مگر مزید تصدیق نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ ساڑھے آٹھ بجے اسلم اقبال کو ریڈیو پاکستان نے اطلاع دی کہ اسلام آباد سے ہدایات ملی ہیں کہ رزمیہ نغمے نشر کئے جائیں کیونکہ ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔ نو بجے کی خبروں میں ذرا کھل کر تصدیق ہوگئی۔

میں نے بھولا کو فون کیا۔

وہ خوش بھی تھا اور ناخوش بھی۔ حملے پر خوش تھا مگر تاخیر پر ناخوش تھا۔ کہنے لگا۔ "اگر حملہ کرنا ہی تھا تو چند روز پہلے کرتے تاکہ دوسرا محاذ کھلنے سے یہاں لڑنے والوں کی مدد ہو جاتی۔ لیکن اب جب وہ لڑلڑ کر ادھ موئے ہو چکے ہیں تو ادھر سے حملے کا کتنا فائدہ ہوگا ـــــ بہرحال اب دعا کرتے ہیں۔"

رات بلیک آؤٹ تھا ـــــ کرفیو تھا ـــــ اور چاند پورے جوبن پر تھا۔

ساڑھے تین بجے رات زوردار دھماکوں کے تسلسل سے آنکھ کھلی۔

ڈھاکہ ایرپورٹ بھرپور ہوائی حملے کی زد میں تھی۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ برآمدے سے نکل کر دیکھا تو طیارہ شکن توپوں کے گولے لال انگاروں کی شکل میں فضا میں سنسنا رہے

تھے۔ ہوائی حملے وقفے وقفے بعد رات کا باقی حصہ اور اگلا سارا دن (چار دسمبر) جاری رہے۔ صبح آٹھ بجے اُو۔ز ہاؤس ایک میٹنگ پر جانا تھا۔ ڈرائیور کی غیر حاضری میں خود ہی گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ کار کے ونڈ سکرین میں سے ہندوستانی مگ (Mig) اور پاکستانی سیبر (Sabre) طیاروں کو دیکھ رہا تھا جو پرندوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے بعض دفعہ بہت نیچے آجاتے تھے۔ ان کے سفید دھوئیں کی لمبی لکیریں نیلے آسمان پر لق و دق جلیبیاں سی بنا رہی تھیں۔ وہاں پہنچے تو میٹنگ ملتوی ہو گئی۔ ہوم سکرٹری منصور کاظم سول ڈیفنس کا ہیڈکوارٹر دیکھنے جا رہے تھے۔ میری درخواست پر وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

یادش بخیر! ——!!!

کنٹرول روم (جو مرکزی دفتر تھا) ایک ویران ریلوے سٹیشن کا نقشہ پیش کرتا تھا جس میں پٹڑی، پلیٹ فارم، سگنل، عمارت ہر شے اپنی جگہ موجود ہوتی ہے مگر اسے استعمال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بہت بڑے ہال کمرے کے باہر نواب حسن عسکری چیف وارڈن کی وردی پہنے کھڑے تھے مگر کمرے کے اندر صرف نقشے، بیسیوں ٹیلی فون اور پھیلا ہوا ساز و سامان قرینے سے پڑا تھا۔ قطار اندر قطار میزیں سجی تھیں جن پر مختلف کارندوں کی تختیاں تنظیم کے وسیع ڈھانچے کی نشان دہی کر رہی تھیں مگر ان میزوں سے چپکی ہوئی کرسیاں خالی پڑی تھیں —— اس کمرے میں ایک سو کے قریب میزیں تھیں مگر مشکل سے تین چار کے پیچھے متعلقہ رضاکار بیٹھے تھے۔ باقی سب خالی تھیں۔ درجن بھر کارکن قسم کے لوگ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے مگر کوئی بھی کسی واضح ڈیوٹی میں مصروف نہ لگتا تھا۔ ڈھاکہ شہر بھرپور ہوائی حملوں سے گونج رہا تھا مگر جو آدھا گھنٹہ ہم نے کنٹرول روم میں گزارا، اس میں ایک دفعہ بھی فون کی گھنٹی نہ بجی۔ نہ ہی باہر سے کوئی سگنل یا ہرکارہ آیا۔

کنٹرول روم کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس پتلے کا تصور ابھرا جو کسان پرندوں کو ڈرانے کے لئے اپنے کھیتوں میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ دو لکڑیوں کا کراس، اس پر پرانا کوٹ اور ٹوپی۔ نہ روح نہ جسم۔ نہ حرکت۔ ناسمجھ پرندوں کے لئے حقیقت، سمجھ دار انسانوں کے لئے دھوکا —— برعظیم میں ایک ہزار سال سے کفر سے نبرد آزما ہونے والے مسلمان بیسویں صدی کی جنگ اس انداز سے لڑ رہے تھے جیسے جنگ کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں۔ مجھے یوں لگا کہ کمرے کی خالی اور ویران فضا میں دس صدیوں کی سسکیاں گونج رہی ہوں اور ہمارے آباء کی روحیں بے کلی سے بین کر رہی ہوں۔

باقی لوگ ابھی وہیں تھے مگر میں گاڑی لے کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا اور راستے میں سوچتا رہا کہ ہزاروں وفادار بنگالی اور بہاری جان لڑانے کو تیار ہیں مگر سول ڈیفنس والے ان سے بھی کام نہ لے سکے۔

شاید امن کمیٹیوں والے ٹھیک ہی کہتے تھے کہ حکومت انھیں اپنے ساتھ شامل نہیں کرنا چاہتی۔

زمین بالکل سنسان تھی۔ خال خال پیدل مجبوری کا مارا ہوا ایک آدھ رکشا یا کار۔ فضا البتہ جہاز وں کے شور سے بار بار چنگھاڑ رہی تھی کبھی کبھی طیارہ شکن توپوں کی متواتر گھن گرج نقارے کے انداز میں گونجنے لگتی۔ پھر سائرن پکار اٹھتے۔ کبھی حملے سے چوکس کرنے کو اور کبھی خطرہ ٹل جانے کا دلاسہ دینے کو۔ دفتر پہنچا۔ چھٹی منزل پر اپنے کمرے میں گیا۔ باقی کمروں کا چکر لگایا۔ بہت کم لوگ آئے تھے۔ ایک دو لوگوں کو فون کر کے دفتر بلایا۔ پھر تصدیق کے لئے دوسرے لوگوں کے بھی فون آنے لگے اور آہستہ آہستہ لوگ پہنچنے لگے۔

ہمارا دفتر سکریٹریٹ کی عمارت کی چھٹی منزل پر تھا۔ عطاء الحق کا کمرہ عمارت کی بیرونی طرف تھا اور وہاں سے ایئر پورٹ صاف نظر آتی تھی۔ اس لئے جب ہوائی حملے کا سائرن ہوتا تو لوگ بھاگ کر اس کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور حملہ ختم ہونے تک وہیں رہتے۔ کمرے میں بیک وقت پندرہ بیس لوگ ہوتے۔ مغربی پاکستانی اور مشرقی پاکستانی۔ وطن دوست بھی اور وطن دشمن بھی۔ رفیق بھی اور

رقیب بھی...... ایر پورٹ پر جارحانہ لپکتے جھپٹتے ہندوستانی ہوائی جہاز، نیچے سے دفاعی توپوں کی چنگھاڑ، فضا میں گوناگوں دھماکے، کمرے میں دل گرفتہ لوگوں کا ہجوم، دلوں کی متضاد وابستگی، یہ تمام کوائف مل کر علامتی انداز میں برعظیم کی صورت حال کی مکمل تصویر پیش کرتے تھے۔ انتشار زدہ گھر میں خانہ جنگی کا تصادم، انتشار زدہ برعظیم میں دو قوموں کا تواریخی اور ازلی تصادم اور انتشار زدہ ذہنوں میں متضاد سوچوں کا تصادم۔ اس کمرے کی محدود فضا میں یہ لامحدود عناصر سمٹ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے وہاں عجیب قسم کا کھچاؤ تھا۔ ایر پورٹ پر دھماکہ کئی ردعمل پیدا کرتا تھا۔ یہاں جسموں میں قربت تھی مگر دلوں میں فاصلے تھے۔ شانہ بہ شانہ کھڑے ہوئے لوگ مخالفت میں شرابور تھے۔ اس مخالفت کی تسکین سامنے والے منظر سے ہوتی تھی۔ ہندوستانی جہاز غوطہ لگا کر بم گراتا اور توپیں دھڑا دھڑ فائر کرتیں۔ وہ بچ کر نکل جاتا تو ایر پورٹ پر گرنے والے بم کے دھوئیں کا بادل اس کی کامیابی کا پھریرا بن کر ابھرتا۔ اور ہمارے کمرے میں چند چہرے دمک اٹھتے اور چند ایک ماند پڑ جاتے۔ اگر کسی جہاز کو توپ کا گولا لگ جاتا تو کچھ لوگ اچھل پڑتے اور کچھ ڈھیلے پڑ جاتے۔ کمرے کے باہر گولے بارود کی جنگ تھی۔ کمرے کے اندر حرکات و سکنات کی جنگ تھی۔ باہر حریف آزادانہ گتھم گتھا تھے۔ اندر حریف منافقانہ متحمل تھے۔ باہر وقت کی کلائیاں مروڑ کر فیصلے کی کوشش تھی۔ اندر مناسب وقت کے انتظار میں انگلیاں چیخ رہی تھیں۔ باہر دشمن دست بگریباں تھے۔ اندر دشمن دوستوں کی طرح تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس ستم ظریفانہ تضاد کی وجہ سے کمرے کا چپہ چپہ طنزیہ انداز میں تمام چہروں کو گھور رہا تھا۔

میں بار بار کنکھیوں سے عطاء الحق کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بول رہے تھے۔ اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہ تھی کہ وہ ہم میں سے نہ تھا بلکہ مخالف فریق کے ساتھ تھا۔ اس کی امیدیں امنگیں ہندوستانی ہوائی جہازوں کے پرواز کے ساتھ ابھرتی ڈوبتی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن ہماری دھڑکنوں سے الٹ تھی۔ اور فتح و شکست کے متعلق اس کی دعائیں ہماری دعاؤں سے مختلف تھیں۔

•

دشمن نے بڑا حملہ کیا۔ پہلے چھ ہوائی جہاز دو دو کے گروپ میں آتے تھے۔ اس دفعہ بارہ ہوائی جہاز ایر پورٹ پر لپکے چلے آئے۔ نیچے سے بیالیس طیارہ شکن توپیں دھڑا دھڑ فائر کرنے لگیں۔

ایک جہاز غوطہ لگاتے لگاتے ایک دم اوپر اچھلا۔ اگلے لمحے شعلوں کا ایسا گولہ بنا تھا جیسے غالب نے کہا تھا:

اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

پھر یہ شعلہ لمبی لکیر بن گیا۔ اور ہوائی جہاز بظاہر فضا میں ہی جل کر تحلیل ہو گیا۔

"وہ مارا۔"

"نعرۂ تکبیر۔"

"شاباش۔"

ہم لوگ خوشی سے دیوانے ہو کر چلائے۔ جس کے منہ میں جو آیا نعرہ بن گیا۔ دو ایک بنگالی بھی خوش ہوئے مگر زیادہ تر خاموش رہے کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ بزم اٹھے گی تو نہ معلوم کیا رنگِ محفل ہو۔ بساط بچھی رہے گی یا الٹ جائے گی۔ ساقی مینا بدست ہو گا یا خاک بر سر۔ اس موقع پر نہ معلوم اہل بزم کا کیا بنے گا۔ اب کی تحسین اس وقت کا نالہ نہ بن جائے۔ چنانچہ خوشی اور مایوسی دونوں مصلحت کے غلاف میں چھپی رہیں۔

میں نے عطاء الحق کی طرف دیکھا۔ ہندوستانی ہوائی جہاز جلنے سے اس کا صدمہ صاف عیاں تھا۔ چھپانے کی کوشش میں اس نے

سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں لے کر لائٹر سے سلگانے لگا مگر ہاتھ اس بری کانپ رہے تھے کہ سگریٹ شعلہ نہ پکڑ سکا۔

اس نے زور سے لائٹر بند کیا، سگریٹ ہونٹوں سے باہر کھینچا اور پیٹھ موڑ کر باہر چلا گیا۔

اسلم اقبال سے میں درخواست کر چکا تھا کہ اگر ممکن ہو تو مجھے بھی ان بیرونی نامہ نگاروں کے گروپ میں شامل کر لیا جائے جو ان کے دفتر کی وساطت سے جنگ زدہ علاقے دیکھنے جائے گا ــــ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ان کا فون آیا۔

"جاؤ گے؟"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ایرپورٹ پر۔"

میں نے سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ مگر عقدہ کھلا کہ بیرونی جرنلسٹ وہ تباہ شدہ ہندوستانی طیارہ دیکھنے جا رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے ایرپورٹ پر فضا میں شعلہ بنا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ پونے ایک بجے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے روانگی طے پائی۔

ان کا فون بند ہوتے ہی بھولا کا فون آ گیا ــــ وہ اپنے دفتر سے بول رہا تھا۔

اس نے حسب معمول تابڑ توڑ سوال کئے کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اور میں کیا کرتا رہا ہوں۔ دروغ برگردن راوی ڈالتے ہوئے میں نے فون پر فوجی ذرائع سے اکٹھی کی ہوئی خبریں بتائیں کہ صبح سے ہندوستان کے دس جہاز ڈھاکہ پر گرائے جا چکے ہیں۔ مغربی پاکستان میں ساٹھ ہندوستانی جہاز گرائے گئے ہیں۔ امرتسر سے ہماری فوجیں چار میل دور ہیں اور پاکستانی فوج نے پونچھ اور حسینی والا فتح کر لئے ہیں[1]۔

بھولا فون پر ہی مسرور لگنے لگا مگر جب اسے پتہ چلا کہ میں ایرپورٹ جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں تو بہت ناراض ہوا۔

"وہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوائی حملے ہو رہے ہیں۔ بمباری کے علاوہ بھی ارد گرد کی آبادی میں لوگ جہاز سے فائرنگ کی وجہ سے زخمی ہو رہے ہیں اور تم وہاں جانا چاہتے ہو!"

"دیکھو بھولا" میں نے جواب دیا "اول تو ان حالات میں ہمارے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ دوسرے ہوائی بمباری میں چھٹی منزل پر دفتر کا کمرہ کون سی محفوظ جگہ ہے!"

"بچنے کی تو مری بھی امید نہیں،" وہ بھنا کر بولا "مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خود آگ میں کود پڑوں!"

پھر وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر جب میری طرف سے بحث جاری رہی تو قریباً چیخ کر بولا "میری طرف سے جہنم میں جاؤ" اور فون پٹخ دیا۔

میں نے سوچا۔ بالآخر بھولا کے بھی اعصاب چٹخنے لگے ہیں۔ مغربی پاکستان کے محاذ سے کوئی اچھی خبر آئے گی تو حوصلے ٹھیک ہوں گے۔

گاڑی سٹارٹ کرتے کرتے مجھے خیال آیا کہ کیمرہ تو ساتھ لایا ہی نہیں، چنانچہ گاڑی کا رخ سرکٹ ہاؤس کو پھیرا۔ بھاگم بھاگ کیمرہ اٹھایا۔ اور لپک جھپک کر انٹر کانٹی نینٹل جا پہنچا ــــ اس میں کچھ وقت لگ گیا۔

چند منٹ تاخیر کی وجہ سے اخبار نویسوں کی پارٹی روانہ ہو چکی تھی۔ اسلم اقبال کے محکمہ کے ایک صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو گاڑی میں بٹھایا اور ایرپورٹ کی جانب لپکا۔

سیدھی سڑک بالکل سنسان تھی ــــ گاڑی ساٹھ میل کی رفتار سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی ــــ ایرپورٹ اب صرف ایک فرلانگ دور رہ گئی تھی، جب اک دم جبلی عمل میں لاشعوری طور پر میرے پاؤں نے بریک کو اتنا دبایا کہ پہیے چیخ اٹھے۔ اور گاڑی ایک

---

[1] درحقیقت یہ سب خبریں غلط تھیں۔ مگر یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔

بھاری گھسیٹ اور دھکے سے رک گئی۔

زمین سے صرف ایک سو یا ڈیڑھ سو گز اوپر ہندوستانی مگ (Mig) جہاز بائیں جانب سے عمارتوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ جو نیچے کو گر رہا تھا اور اس کی دم شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ فوراً پیچھے پاکستانی سیبر (Sabre) گولیاں برساتا ہوا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ دونوں سڑک پار کر رہے تھے۔ سیبر اوپر اٹھ گیا مگر مگ دائیں جانب درختوں کے پیچھے ڈوب گیا۔

فضا میں دھماکوں کا اتنا شور تھا کہ جہاز گرنے کے دھماکے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔

ہم دونوں کار کے ونڈ سکرین (Wind Screen) میں سے یہ منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے —— اور بالکل مجذوب تھے۔ ایک دم طیارہ شکن توپوں کی نئی باڑ نے ہمیں جگا دیا —— گاڑی موڑ کر ایک درخت کے نیچے کھڑی کی اور خود ایک مکان کے برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔

چند منٹ بعد توپیں خاموش ہوئیں تو کانوں کو جیسے سکون مل گیا۔ بھاگم بھاگ ایرپورٹ پہنچے۔ اکا دکا سنتری سے غیر ملکی نامہ نگاروں کا پتہ پوچھتے پوچھتے ہم ہوائی جہازوں کے ایک بہت بڑے ہینگر تک جا پہنچے جس کے آدھے حصے میں آگ لگی تھی۔ ہم گاڑی کھڑی کر کے اتر نے ہی لگے تھے کہ اسلم اقبال اور آٹھ دس جرنلسٹ بھاگتے ہوئے اسی ہینگر سے نکلے۔ ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا، پلک جھپکنے میں گاڑی میں بیٹھے اور واپس ہوٹل کو پوری رفتار سے لپکے۔

طیارہ شکن توپیں پھر گرجنے لگ گئیں۔ اور ہوائی جہاز بھی گرج گرج کر غوطے لگانے لگے۔

بعد میں اسلم اقبال نے بتایا کہ وہ ایرپورٹ پر پہنچے تو ہوائی حملہ ہو گیا۔ ان سب نے اسی ہینگر میں پناہ لی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک راکٹ دروازے پر گرا جس سے دھماکا ہوا اور آگ بھی لگ گئی۔ اخبار نویسوں نے گھبرا کر واپسی کا تقاضا کر دیا۔

ہوٹل میں دوپہر کے کھانے پر "پارک۔ شائر پوسٹ" کے چیف ایڈیٹر اور اے پی پی کے دو نمائندوں (الطاف یاور اور اقبال علی خاں) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ غیر ملکی اخبار نویس حیران ہو رہے تھے کہ Sam میزائیل کے زمانے میں متروک قسم کی طیارہ شکن توپوں سے پاکستانی سپاہی میزائیں سے بہتر نتائج حاصل کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد ہوٹل کی چھت پر چلے گئے جہاں غیر ملکی فوٹوگرافر ٹیلی کیمرول سے ایرپورٹ پر جنگ کی فلمیں لے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بتایا کہ تیرہ جہاز گرائے جا چکے ہیں، کسی نے پندرہ کہا اور کسی نے سترہ۔

شام پانچ بجے کے قریب بھولا چند منٹ کے لیے سرکٹ ہاؤس آیا تو یہ ساری باتیں سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ جیسے سرور میں تھا۔

"خدا کے لئے اب ایرپورٹ کی طرف نہ جانا۔" مجھے فہمائش کرتے ہوئے اس نے چابی گھمائی۔

رات کو ہوائی حملوں کے سائرن تو ہوتے رہے مگر طیارہ شکن توپیں خاموش رہیں کیونکہ ہندوستانی جہاز ان کی زد سے دور رہ کر بلندی سے بم پھینک رہے تھے جن سے ساری فضا چمک اٹھتی اور دھماکوں سے کھڑکیاں اور دروازے لرز جاتے۔

پانچ دسمبر کو کئی بار سائرن بجے مگر ایرپورٹ پر ہوائی حملے نہ ہوئے۔ سوائے اس کے کہ ہمارے چند ساتھیوں نے فضا میں مگ اور سیبر طیاروں کی جھڑپیں دیکھیں جس سے یہ تسلی ہوئی کہ ابھی تک ہماری ایرپورٹ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ شہر میں ٹریفک نظر آنے لگی۔ اکا دکا دکانیں بھی کھل گئیں۔ چھ دسمبر کو البتہ سارا دن ایرپورٹ پر ہوائی حملوں کی شدت رہی۔ بھولا سے ملاقات ہوئی تو وہ مطمئن نظر آتا تھا۔ اور اس کی پیشانی سے تشویش کی گرد دھلی ہوئی لگتی تھی۔ وہ دیر تک ان حالات کا تجزیہ کرتا رہا جو سکورٹی کونسل میں روس اور چین کے ویٹو سے پیدا ہو سکتے تھے یا ہندوستان کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے ہو رہے تھے۔

مگر ذہنی اطمینان کا یہ موڈ صرف دو ہی دن قائم رہا۔ ایرپورٹ کے نقصان کی وجہ سے چھ دسمبر کی سہ پہر سے ہمارے جہاز اُڑنے سے بند ہو گئے تھے۔ سات دسمبر کی رات کو سنا کہ برہمن باڑیہ، جیسور اور سلہٹ پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا ہے اور باخبر لوگوں نے بتایا کہ فوجی کمانڈ کے مشورے سے گورنر کی طرف سے جنرل یحییٰ کو پیغام بھیجا گیا ہے کہ حالات بہت تشویشناک ہیں۔ اگر فوری طور پر کوئی بڑی طاقت مدد کو نہیں آتی تو مجیب سے سمجھوتہ کر کے ہندوستان کی بات مان لی جائے۔[۱]

اس پیغام کی خبر ہمارے اوسان پر اس دھماکے سے گری جو پچھلے تین دن کی ساری بمباری سے بھی زیادہ تھا۔ بھولا تو جیسے نیم پاگل ہو کر احتجاج کر رہا تھا "ہم پاگل ہیں کیا؟ جنگوں میں کیا کیا نہیں ہو جاتا اور قومیں لڑتی رہتی ہیں —— روسی دشمن کو لینن گراڈ تک آنے دیتے ہیں اور ہتھیار نہیں ڈالتے۔ اور ہم تین سرحدی شہروں کے جانے سے ہمت ہار چلے ہیں —— اور شہر بھی صرف بارڈر کے ——"

وہ بار بار سرحد کے شہروں پر زور دیتا رہا۔

"اور ایرپورٹ میں شگاف ہوئے تو کیا۔ اللہ قسم ایک آواز پر سینکڑوں ہزاروں بنگالی اور بہاری مرمت کرنے نکل آئیں گے۔ کوئی آواز تو دے —— وہ جان لڑا دیں گے —— بموں کی بارش میں کام کریں گے —— ہمیں کوئی آزمائے تو سہی۔" وہ کمرے میں بے چینی سے گھومتے ہوئے پاؤں پٹخ رہا تھا۔

"مگر بھولا ہندوستانی فوج کا ساتھ دینے والے بھی تو بنگالی ہی ہیں نا۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" وہ دہاڑا "یہ خانہ جنگی ہے اور خانہ جنگی میں دونوں طرف بنگالی ہی ہوں گے۔ امریکہ میں خانہ جنگی نہیں ہوئی تھی کیا۔ وہاں دونوں طرف امریکی نہیں لڑ رہے تھے کیا —— مگر اتحاد کے حامیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تو ملک متحد رہا —— چند لوگوں کی بے وفائی کی سزا میں تم باقی سارے وفاداروں کو تو آگ میں نہیں جھونک دو گے —— اگر تم لوگ ہمت ہار دو گے تو وہ کس سے وفا کریں گے؟" وہ پھر کمرے میں گھومنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ کونے میں رک کر دونوں دیواروں کے سنگم کے آگے فریاد کناں ہوا۔ وہ غصے اور مایوسی سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم واپس مڑا۔ اور میری طرف انگلی کر کے کہنے لگا "تم لوگ ہمیں علیحدگی کی طرف دھکیل رہے ہو —— مشکل وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہو —— اور وہ رونے لگ گیا۔

میں ایک دم سن سا رہ گیا۔ مگر اس سناٹے میں بھی ذہن یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ بھولا پہلی دفعہ ہم اور تم کے انداز میں بات کر رہا تھا —— ملک واقعی ٹوٹ رہا تھا —— اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔

ہم دونوں کو اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

شکست —— سرنڈر —— مجبوری —— مقابلہ ناممکن —— لوگ ہمارے ساتھ نہیں —— اکیلی فوج کیا کرے —— اس قسم کے جملے فوجی اور سرکاری گفتگو میں گونجنے لگے —— سننے والوں میں سے اکثر انگشت بدنداں تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمت کے زور پر ہم نے ملک بنایا تھا۔ ریت کا گھروندا تو نہیں بنایا تھا جسے دشمن ایک ٹھوکر سے گرا دے۔ کدھر گئی ہماری وہ ہمت اور دعوے —— اور وہ خوش فہمیاں کہ ایک مسلمان سو کافروں پر بھاری ہے —— یا یہ کہ دنیا بھر میں ہماری بہترین فوج ہے۔

میرے لیے تو شکست کا آغاز آٹھ دسمبر کو ہی ہو گیا تھا جب ہمیں سہ پہر کے وقت سرکٹ ہاؤس سے گورنر ہاؤس میں منتقل ہونا پڑا۔

---

[۱] بعد ازاں اس کی تصدیق صدیق سالک کی کتاب سے ہوئی (میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۹۲)

جس کے وسیع لان سے ملحق دو طرف اونچے مکان تھے اور ان کی کھڑکیوں سے مکتی بھاہنی والے اپنی بندوقیں دکھاتے رہتے تھے۔

وہاں پہنچنے کے بعد شام کو میں نے فون پر بھولا کو بتایا تو وہ ایک دم چپ سا ہو گیا۔ فقط اتنا کہا "خدا ہماری مدد کرے (GOD Help us) ۔ اور فون بند کر دیا۔

اگلے چند دن قیامت کے دن تھے۔

شدید بمباری کے دن، بے پر کی حوصلہ شکن افواہوں کے دن، مہمل اور مضحکہ خیز قیاس آرائیوں کے دن، جو صلوں اور مایوسی کے مد و جزر کے دن۔ دعاؤں کے دن۔ خدا سے شکووں اور خود ملامتی کے دن — خبریں۔ افواہیں اور قیاس آرائیاں آندھی کے مرغولوں کی طرح ایک دوسری کو روندتی پھر رہی تھیں — ہمارے جسم بے جان اور مضمحل تھے۔ مگر اعصاب کی چیخ بلند بانگ تھی۔ اور تشویش کا تناؤ جان لیوا تھا — گورنر ہاؤس کا نظام درہم برہم تھا۔ ہیں بلڈنگ سے ملحق جس مکان میں ہم تھے وہاں عجب بے سروسامانی کا عالم تھا موم بتیوں کی روشنی میں فرش پر لیٹے لیٹے، رات سوتے جاگتے، اونگھتے اور مچھروں سے لڑتے گزرتی۔ اور کان ہوائی جہازوں کی آواز پر لگے رہتے۔ جو بظاہر معمولی ٹرانسپورٹ قسم کے جہاز لگتے تھے مگر گھوں گھوں کرتے گھنٹوں تک ڈھاکہ پر آزادی سے گھومتے رہتے اور مرضی کے مطابق جہاں دل چاہتا بھاری بم پھینک دیتے جس سے کمروں کے فرش اور دیواریں لرز جاتیں — دن کو ہم دفتر چلے جاتے۔ مگر وہاں بھی زیادہ وقت ایرپورٹ پر بمباری دیکھتے، ریڈیو سنتے یا فون پر خبریں اکٹھی کرتے گزر جاتا — ہمارے ریڈیو کی خبریں بالکل مہمل لگتی تھیں کیونکہ وہ مشرقی پاکستان کے متعلق صرف یہی بتاتا تھا کہ سرحد کے فلاں فلاں شہروں پر ہماری فوجیں دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں مگر یہ نہ بتاتا کہ ان محاذوں کے درمیان سے ہندوستانی فوج اندر گھس گئی ہے اور اب ڈھاکہ پہنچنے کو ہے۔ یہ بات البتہ دنیا بھر کے ریڈیو چیخ چیخ کر بتا رہے تھے۔ ہندوستان ریڈیو بڑھا چڑھا کر بتا رہا تھا اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے اپنے کانوں سے اس پیش قدمی کی گھن گرج سن رہے تھے جس کا مغربی پاکستان والوں کو علم تک نہ تھا — ڈھاکہ میں رہنے والوں کا نہ ریڈیو پاکستان پر اعتماد رہا تھا، نہ اب حکومت پاکستان پر باقی رہا تھا، نہ اپنی فوج یا لیڈروں پر تھا۔ اب وہ مقام آ رہا تھا کہ خدا پر سے بھی ایمان ڈولنے لگا تھا اور اسلام کے نام پر بلند آہنگ مفروضوں کے سحر ٹوٹ رہے تھے — تابڑ توڑ افواہیں مزید غضب ڈھا رہی تھیں۔ ہندوستانی فوج ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان کے آگے بیس ہزار مکتی بھاہنی ہے۔ ہندوستانی فوج ڈھاکہ سے دس میل دور رہ گئی ہے۔ مکتی بھاہنی والے سارے شہر میں مناسب جگہوں پر جم گئے ہیں۔ اب بیک وقت کئی حملے ہوں گے۔ فلاں مارا گیا۔ فلاں اغوا ہو گیا۔ فلاں زخمی ہو گیا۔ جس سے بات کرتے وہ نئی افواہ سناتا تھا۔

جوٹ بورڈ کے ممبر فنانس عبدالخالق کو مکتی بھاہنی کے آٹھ مسلح افراد نے دن دہاڑے دفتر سے اغوا کر لیا مگر ہم دفتر جاتے رہے — اس لئے کہ خطروں سے چھپ کر اکیلے میں خوف سے سہمے رہنا زیادہ جان لیوا تھا۔ اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے گلیوں میں گھومتے رہنے میں کم گھبراہٹ تھی۔ اس ذہنی کیفیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو زندگی سے مایوس ہو کر مخالف ماحول میں سانس لینے پر کبھی مجبور ہوئے ہوں۔

نواب پور روڈ کو جانے والے سب راستوں پر ڈھاکہ چھوڑ کر جانے والوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ پیدل اور سوار سبھی آج کے سامان اور کل کے خوف تلے دبے جا رہے تھے۔

ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کو ریڈ کراس نے لے لیا۔ اور Neutral Zone یا علاقہ امن بنا دیا۔ یہ گویا اعلان تھا کہ جنگ شہر میں پہنچا چاہتی ہے۔

گورنر ہاؤس ڈھاکہ اور پریذیڈنٹ ہاؤس اسلام آباد میں عجیب قسم کی آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ گورنر عبدالمالک صدر یحییٰ سے فون پر بات کرنا چاہتے تو وہ ملتے نہ تھے۔ آئندہ طرز عمل کے متعلق مشورہ مانگتے تو جواب ملتا کہ تم مختار ہو، جو چاہو کرو۔ جنرل یحییٰ کی منظوری سے اقوام متحدہ کو جنگ بندی کی پیش کش بھجوائی گئی تو صدر یحییٰ نے اسے واپس منگوالیا۔ اسلام آباد سے بیرونی امداد کے دلاسے، ڈھکے چھپے اشارے اور مہمل سے وعدے اس انداز میں پھینکے جا رہے تھے، جیسے بلی ادھ موئے چوہے سے کھیل کر مزہ لیتی ہے۔

میں روزانہ دفتر جاتا۔ فائیلوں کی آمد و رفت قریباً قریباً بند ہو چکی تھی۔ میں کبھی کرسی پر سر تھامے بیٹھا رہتا، کبھی ریڈیو پر خبریں سنتا اور کبھی عطا کے کمرے سے ایرپورٹ پر گولہ باری دیکھتا۔

اب ماحول میں تبدیلی کی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ ماضی سے رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ حال میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور ایک بالکل مختلف مستقبل جھانک رہا تھا۔ ایسے میں لوگوں کا ضبط خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ ان کے محتاط انداز چھوٹ گئے۔ اور رائے کا اظہار برملا ہونے لگا۔ اس لئے ہم دونوں کی گفتگو میں بھی حالات حاضرہ پھر سے نمودار ہونے لگے۔ بغیر کسی شعوری ارادے کے باتوں کا دھارا اس طرف چلنے لگا جیسے ہوا کا رخ بدلنے سے پتوں کے ہلنے کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ اب اصولی بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ ہم یہ قیاس آرائی کرتے تھے کہ کیا بنگلہ دیش آزاد رہے گا یا ہندوستان کا ایک صوبہ بن جائے گا۔

ان دنوں وہ بہت فکر مند تھا۔

"اگر بنگلہ دیش پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا تو یہ بہت برا ہوگا۔ ہم اس کے دوست رہنا چاہتے ہیں۔ مگر غلام نہیں بننا چاہتے..... ہم ہندوستان کی پناہ میں رہنے کو بھی برا نہیں سمجھتے مگر ان کی غلامی میں نہیں جانا چاہتے۔"

"پناہ اور غلامی میں تھوڑا ہی فرق ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر خاموش رہا جیسے میرے ساتھ متفق ہو مگر اظہار کرنے سے گھبرا رہا ہو۔ پچھلے سات ماہ کے مسلسل اختلاف کے بعد اب اتفاق کرنا خاصا مشکل تھا۔

گیارہ دسمبر کو صوبائی کابینہ نے یونیورسٹی تعلیم کی اصلاح کے لئے اس کمیٹی کی رپورٹ منظور کی جس کے صدر ڈاکٹر سجاد حسین (ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر) تھے۔ میٹنگ سے واپسی پر دفتر میں اس کے متعلق نوٹ بناتے ہوئے میں سابقہ نظام تعلیم سے جنم لینے والی بیماری کے دھماکے سن رہا تھا جیسے دھماکے نہ ہوں بلکہ وقت کا گھڑیال گن گن کر یاد دلا رہا ہو کہ اس کام میں قومی تساہل نے چوبیس قیمتی برس گنوا دیئے تھے جس کی سزا آج مل رہی ہے۔

بجھے ہوئے دل سے دفتر سے اٹھا۔ گورنر ہاؤس پہنچا تو وہاں سرگوشیوں کی عید تھی کہ اسلام آباد نے پکی اطلاع دی ہے کہ چین کی فضائیہ مشرقی پاکستان کے اردگرد ہندوستان کے تمام ہوائی اڈوں پر بمباری کرنے والی ہے اور چین کا ایک بریگیڈ آج کسی وقت پیراشوٹوں کے ذریعے اترے گا۔

ہم سب کی انگلیاں ریڈیو کے بٹنوں پر، کان ریڈیو کی آوازوں پر اور آنکھیں آسمان پر لگ گئیں۔ ہوائی حملوں کے سائرن ہوتے رہے۔ ہندوستانی مگ چنگھاڑتے رہے۔ گورنر ہاؤس کے اردگرد گھروں میں اسلحہ کی نمائش ہوتی رہی۔ مگر کسی کو اپنی حفاظت کے لئے چھپنے کی پروانہ تھی۔ اور دھڑکتے دلوں، خدا سے ملتجی ہونٹوں اور بے تکان آنکھوں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے سب لوگ لان میں جمے رہتے۔

لیکن صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ ساڑھے تین بجے سہ پہر غیر معینہ مدت کے لئے کرفیو لگ گیا اور ہندوستان ریڈیو بار بار پاکستانی فوج کے نام جنرل مانک شاہ کے الٹی میٹم نشر کرنے لگا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو گے تو جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک ہوگا ورنہ سب تباہ کر دیئے جاؤ گے۔

بالآخر ساڑھے چھ بجے شام معلوم ہوا کہ چینی مداخلت کی خبر غلط تھی۔[۱]

لیکن اگلے روز دنیا کے ریڈیو سٹیشنوں سے پتہ چلا کہ گذشتہ روز ہندوستان نے پیراشوٹ کے ذریعے ڈھاکہ کے قریب فوج اتاری ہے۔ وائس آف امریکہ نے تبصرے میں کہا کہ ڈھاکہ کے قریب ہندوستانی پیراٹروپ اترنے سے ہندوستان کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی ہے اور ایک آدھ دن تک ڈھاکہ جنگ شروع ہو جائے گی۔

"کیا یہ محض اتفاق تھا" بھولا فون پر مجھ سے پوچھنے لگا "یا دانستہ تھا کہ چین کے نام پر ہندوستانی پیراٹروپ بحفاظت سے اتر سکیں ــــــ نہ معلوم یہ مشرقی پاکستان کی مدد تھی یا ہندوستان کی؟"

بھولا سے ملاقات نہ ہوتی تھی مگر فون کے ذریعے وہ ہم سب میں شامل تھا اور حالات کی قیامت خیز رفتار سے باخبر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ تبصرہ شاذونادر ہی کرتا تھا۔ خبر سن کر یا خاموشی سے فون رکھ دیتا۔ یا ٹھنڈی سانس لیتا۔ یا زیر لب ایک آدھ دعا کہہ دیتا۔

بارہ تاریخ کی شام کو ہم نے اپنے اپنے ضروری کاغذات دیکھے کچھ ساتھ رکھنے کو چھانٹ لئے۔ کچھ جلا ڈالے۔ حسن ظہیر نے کہا کہ انہوں نے وصیت لکھ کر اپنے ایک بنگالی دوست کے پاس چھوڑ دی ہے۔ دو چار دوسرے کہنے لگے کہ بہتر ہے کہ ہم بھی ابھی لکھ لیں مگر چھوڑیں گے کس کے پاس۔ ہمایوں نے بھولا کا نام تجویز کیا جس پر سب متفق تھے۔

رات گئے بھولا کا فون آیا تو میں نے اس سے ذکر کیا۔ وہ بڑی طنز سے ہنسا "تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں بچ جاؤں گا۔ مجھ جیسے لوگوں سے ہی تو بنگلہ دیش انتقام لے گا ــــــ بہرحال کاغذ میں رکھ لوں گا۔ آگے جو خدا کو منظور۔"

تیرہ دسمبر کو سوموار تھا۔ ہم لوگ گورنمنٹ ہاؤس میں تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ دفتر جانا بے سود ہے مگر میں ساڑھے نو روانہ ہو گیا۔ باہر نکلتے ہی ہوائی حملے کا سائرن سنا مگر دفتر پہنچنے تک کوئی جہاز نہ آیا۔

سیکریٹریٹ قریباً ویران تھا جیسے میلہ اجڑ چکا ہو اور اداسی رونق کی تلاش میں ہو۔ کار پارک کسی گنجے سر کی طرح صاف اور چٹیل تھا۔ لفٹ ہسپتالی مشین کی طرح ساکت تھی کئی منزلہ عمارت کی سیڑھیاں بھکاری کی طرح دامن پھیلائے پڑی تھیں۔ نہ کوئی تیزی سے اترنے والا نہ کوئی ہانپ کر چڑھنے والا۔ مگر کبھی کبھی اوپر یا نیچے کی منزلوں سے پاؤں کی دھمک سنائی دے جاتی جس سے اندازہ ہوتا کہ عمارت میں اکا دکا لوگ گھوم رہے ہیں۔ چوکیدار اور چپڑاسی بھی خال خال ہی تھے، اس لئے زیادہ تر کمرے بند تھے۔

میں اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر بعد عطاءالحق بھی آ گیا کیونکہ اس کا کمرہ بھی بند تھا۔

میری میز پر کوئی فائل نہ تھی اور فون کی گھنٹی خاموش تھی۔

علیک سلیک۔ دو ایک رسمی جملے۔ اور پھر ہم خاموش بیٹھ گئے۔ کبھی کبھی فضا میں توپوں کے دھماکے گرج اٹھتے یا ہوائی حملے کا سائرن گونجنے لگتا۔ ان سے خاموشی ٹوٹ جاتی مگر خاموشی کا احساس قائم رہتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آج امریکہ ریڈیو نے کہا ہے کہ ڈھاکہ کے قریب ہندوستانی چھاتہ بردار فوج کے اترنے سے صورت حال بہت بدل گئی ہے اور اب چند گھنٹوں میں ڈھاکہ کی جنگ شروع ہو جائے گی اور گلی کوچے میدان جنگ بنیں گے۔ نہ معلوم جنگ کیا رخ اختیار کرے گی اور کن گلیوں میں لڑائیاں ہوں گی۔ ادھر سیکورٹی کونسل میں کل رات امریکن مندوب نے بہت سخت اور تیز تقریر کی اور ہندوستان کو مطعون کرتے ہوئے خبردار کیا کہ اس جنگ میں امریکہ براہ راست مداخلت کر سکتا ہے۔

فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔

۱۔ مگر کاوشتہ جھوٹ تھا۔ تفصیلات کے لئے دیکھیں "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا"۔ تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۰۲

محکمہ تعمیرات کے سکریٹری بول رہے تھے۔ عظیم پورو کے گورنمنٹ کوارٹرز فوری طور پر فوج کو چاہئیں۔ وہاں کے مکینوں کو یونیورسٹی کا کوئی ہوسٹل دلوادیں۔

میں نے وائس چانسلر سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے بتایا کہ تین ہوسٹلوں میں ہسپتال قائم ہو چکا ہے۔ چوتھے میں جگہ بنا دیتے ہیں۔

میں نے سوچا ڈھاکہ کی جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

گیارہ بج چکے تھے۔ ویرانی، خاموشی، بیکاری اور غیر یقینی صورت۔ حال سے تنگ آ کر میں نے ریڈیو لگا دیا۔ ادھر ادھر سوئی گھمائی تو ریڈیو آسٹریلیا بول پڑا۔ اناؤنسر نے بتایا کہ جیسور کا، جو علاقہ پاکستان سے چھن چکا ہے وہاں، ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں "بنگلہ دیش" کے "صدر" نذرالاسلام اور "وزیر اعظم" تاج الدین نے ہندوستانی علاقے سے آ کر شرکت کی اور دھواں دھار تقریریں کیں۔ جلسے کی کارروائی کا ریکارڈ پیش کیا جا رہا تھا۔

بلند بانگ تقریریں ہوئیں جن میں پاکستان شیطان تھا اور ہندوستان فرشتہ تھا۔ ظلمت کے دور کے اختتام کی خوش خبری تھی اور سنہری زمانے کی آمد کی نوید تھی۔ بے لحاظ طعنے تھے۔ اونچے دعوے تھے۔ سانچ کو آنچ نہ تھی۔ اور دروغ کے پاؤں نہ تھے۔

بیچ بیچ میں نعرے گونجتے تھے۔ فلک شگاف اور پرجوش نعرے۔

مجیب الرحمان	زندہ باد
اندرا گاندھی	زندہ باد
اندرا مجیب	بہن بھائی
کوسیجن مجیب	بھائی بھائی

نعروں کی گمبھیر گونج لہر در لہر اٹھتی تھی۔ جیسے حد نظر تک پھیلا ہوا بیکراں سمندر ہو۔ یہ گونج ایک تواریخی تغیر کی ندا بن کر ابھر رہی تھی۔ وقت کے کارزار میں یہ فاتح کی للکار تھی جسے دو افراد ایک اداس اور ویران کمرے میں طرفین کی علامتیں بن کر ریڈیو پر سن رہے تھے اور کمرے کی اداسی اور ویرانی ان دونوں شخصیتوں کے تضاد سے اور بھی پریشان تھی۔

گذشتہ سات ماہ سے ہم دونوں نظریاتی حریف لیکن بامروت شریک تھے۔ ہمارے بول کڑوے تھے مگر نگاہیں میٹھی تھیں۔ زبانوں میں کاٹ تھی مگر آنکھوں میں لحاظ تھا۔ ہماری مخالفت پر وضع داری کا پردہ تھا اور حفظ مراتب کی روک تھی۔

مگر ریڈیو سے ابھرنے والے نعروں نے گویا سب پردے جھر جھر کر کے پھاڑ دیئے۔ ہم دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے کسی تیسرے ہاتھ نے ہمیں ایک دم ننگا کر دیا ہو اور ہماری آپس میں نظر ملانے کی ہمت نہ ہو۔ حقائق مخفی ہوں تو قابل برداشت، اگر مشہور ہوں تو بعض اوقات ناقابل برداشت بن جاتے ہیں۔ یہ نعرے ایسی ہی سفاک حقیقت تھے جن کے بے رحم تاثر نے ہم دونوں کا حریفانہ روپ ایک دم آشکارا کر دیا تھا۔

یہ نعرے پاکستانی فوجوں کی پسپائی کے بعد پاکستانی علاقے میں پاکستان کے خلاف بلند کئے جا رہے تھے۔ اور پاکستان کے سابقہ شہری لگا رہے تھے۔

یہ نعرے اس کے لئے امرت اور میرے لئے زہر تھے۔

یہ نعرے سات ماہ کی اصولی بحثوں کے بعد اس کی جیت اور میری ہار کا اعلان تھے۔

ماتحت ابھر رہا تھا اور افسر ڈوب رہا تھا۔

اس کا وطن نمودار ہو رہا تھا اور میرا وطن دور سرک رہا تھا۔

ایک ہی قسم کے نعروں کے دو متضاد اثرات بہت تکلیف دہ تھے۔ حفظ مراتب چور چور ہو گیا، وضع داری تار تار ہو گئی، مروت شرمانے لگی، اور نظروں میں اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ تھوڑی دیر تو ہم اس تکلیف کی بھرپور گرفت میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ہمت کر کے ریڈیو کی سوئی گھما ڈالی۔

ڈھاکہ ریڈیو سے اعلان ہو رہا تھا کہ دو بجے سے غیر معینہ عرصے کے لئے کرفیو لگ جائے گا۔

ہم دونوں نے اپنی اپنی گھڑیاں دیکھیں ...... ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"اوہ" وہ گھبرا کر بولا "میری گاڑی تو ڈھائی بجے آئے گی"۔

"گھبراؤ نہیں، میرے پاس گاڑی ہے"۔

وہ بازار تک جانا چاہتا تھا تاکہ کچھ چیزیں خرید سکے۔

ہم دونوں بازار پہنچے تو ایک بھگدڑ سی مچی تھی۔ لوگ بھاگم بھاگ گھروں کو جا رہے تھے۔ دکانداروں کے پاس گاہکوں کا ہجوم تھا کیونکہ لوگ کرفیو کے دوران کے لئے خریداری کرنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود دکاندار آہستہ آہستہ دکانیں بڑھا بھی رہے تھے۔

وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی مگر مجھے ہر چیز اداس لگتی تھی۔ شاید یہ میری ذہنی حالت کا نتیجہ تھا۔ مگر وہ بھی خاموش تھا۔ اور جب میں نے اسے گھر کے سامنے اتارا تو مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"سر پتہ نہیں اب کہاں اور کن حالات میں ملاقات ہو گی ...... لیکن اگر ...... کسی وقت میری ضرورت ہو ...... تو بلا تکلف یاد فرمائیے گا"۔

اور پھر وہ تیزی سے مڑ کر گھر میں داخل ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ ہم کو ابھی تک سیکورٹی کونسل سے امیدیں ہیں کہ شاید جنگ بندی ہو جائے۔ مگر اسے خوب اندازہ ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب ڈھاکہ میں پاکستان کوئی دم کا مہمان ہے۔ اس کے بعد اسے میری حیثیت کا بھی اندازہ ہے اور اپنی کا بھی۔

میں جب گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا تو کرفیو شروع ہو چکا تھا

رات ڈیڑھ بجے پتہ چلا کہ ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ سے چھ میل دور ہیں اور ان کے ساتھ مکتی باہنی کے بیس ہزار رضا کار بھی شامل ہیں۔ اسی وقت اسلام آباد اور کراچی سے رابطہ قائم ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ کل گورنمنٹ ہاؤس خالی کر دیا جائے اور سب لوگ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ریڈ کراس کی پناہ میں منتقل ہو جائیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح پتہ چلا کہ روس نے سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی کا ریزولیوشن ویٹو کر دیا ہے۔

اب ڈھاکہ کی جنگ ناگزیر تھی اور کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔ بلکہ شہر کے دیگر حصوں پر ایک دو ہوائی حملے ہو بھی چکے تھے۔ اس سے پہلے ایرپورٹ اور انڈسٹریل ایریا پر ہوتے رہتے تھے۔

ہم اپنا بچا کھچا سامان باندھ رہے تھے

مجھے کسی نے کہا کہ میرا فون آیا ہے۔

"ہیلو"

عطاء الحق بول رہا تھا۔

"سر مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ہوٹل میں جا رہے ہیں۔"

"ہاں یہی فیصلہ ہوا ہے۔"

"سر، یہ بہت اچھا فیصلہ ہے ..... میں نے یاد دلانا تھا کہ اگر کوئی بھی خطرہ ہو تو مجھے نہ بھولیے گا۔"

یہ میرا حریف بول رہا تھا جو اب جنگ جیت چکا تھا۔

میرے باہر شکست تھی۔ میرے اندر ریخت تھی۔ میرے اوپر موت کے سائے تھے۔ ایسے میں ہمدردی کے دو بول اتنے اجنبی لگے کہ اندیشے چیخے۔

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مگر اندیشے خود ہی شرمندہ ہو گئے اور پگھل کر گہرے تاثر میں ڈوب گئے جو اس کی ہمدردی نے پیدا کیا تھا۔ فون بند کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ دو نسلوں کی محبت مر گئی مگر انسانیت بچ گئی۔ شاید یہی انسانیت صبح کے بھولے ہوئے کو شام تک گھر واپس لے آئے۔ مگر ہوائی حملے کے سائرن نے چیخ کر پوچھا کون سا گھر؟..... گھر تو ٹوٹ رہا تھا۔ نئی نسل اپنا گھر الگ بنا رہی ہے، ایسا گھر جسے انھوں نے برق سے روشن کیا ہے ..... خدا خیر کرے ....

دسمبر کی چودہ تاریخ تھی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ اور میں بھولا کو آخری اطلاع دے رہا تھا کہ اب معاملہ ختم ہی سمجھو۔ ہم سب ریڈ کراس کے Neutral Zone میں پناہ لینے جا رہے ہیں۔

فون پر سکوت طاری ہو گیا ——— پھر بھولا کی بجھی ہوئی آواز آئی "او کے۔"

سکوت اور گہرا ہو گیا .....

"خدا حافظ ——— بھولا" نہ معلوم الفاظ کیسے میرے منہ سے نکل آئے

یوں لگا جیسے منوں مٹی کے نیچے سے اس کی مدھم آواز ابھری ہے "خدا حافظ"..............

میں نے بڑی نرمی سے فون رکھ دیا ——— جیسے کسی لاش کا چہرہ ڈھانپتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمارا پہلا گروپ چند کاروں سے گورنر ہاؤس سے نکل کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل چلا[1]۔ میں اسی گروپ میں شامل تھا۔ باقی لوگ ابھی اندر ہی تھے کہ تھوڑی بعد ہندوستانی طیاروں نے گورنر ہاؤس پر بھرپور بمباری شروع کر دی۔ ساتھ ہی ارد گرد کے مکانوں سے گولیاں اور راکٹ برسنے لگے۔

ہوٹل کی گیارہویں منزل سے ہم دل تھامے یہ بمباری دیکھ رہے تھے۔

دن بھر یہ بھی دیکھتے رہے کہ ہندوستانی ہوائی جہاز آج ایرپورٹ پر حملے نہ کر رہے تھے بلکہ شہر کے دیگر مقامات پر بھی بمباری کر رہے تھے جہاں طیارہ شکن توپیں نہ تھیں۔ اور ہم حیران ہوتے رہے کہ ایرپورٹ کی بیالیس طیارہ شکن توپیں جو فارغ کھڑی ہیں انھیں دوسری جگہ استعمال کیوں نہیں کیا جاتا۔

رینگنے سے چھلے ہوئے جسموں اور گرد آلود کپڑوں کو لیے ہمارے ساتھی اکا دکا گورنر ہاؤس سے نکلتے رہے۔ اور شام تک سب خستہ حالوں میں ہوٹل میں پہنچ چکے تھے۔ خوش قسمتی سے کوئی بھی بم یا گولی سے زخمی نہیں ہوا تھا۔

سہ پہر میں میرے فون کی گھنٹی بجی۔

"سر آپ کا فون ہے" آپریٹر نے کہا۔

---

[1] ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں چار دن کے قیام کے حالات کے لیے مصنف کی کتاب "چہرے" ملاحظہ فرمائیں۔

"ملایئے" میں نے کہا۔

"نو سر" وہ چند سے رکا ــــــ پھر معذرت سے بولا "ریڈ کراس کی ہدایت ہے کہ یہاں سے کسی کے ساتھ فون پر بات نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

"بتا نہیں رہا سر ــــــ دوسری طرف ایک خاتون زائرہ سلطانہ ہیں۔ وہ پوچھ رہی ہیں کہ آپ خیریت سے تو پہنچ گئے ہیں۔ بمباری میں نقصان تو نہیں ہوا۔"

میں سمجھ گیا کہ انھوں نے کسی ریڈیو پر گورنر ہاؤس پر بمباری کی خبر سن لی ہوگی۔

"ہاں۔ ان سے کہئے کہ ہم سب خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ اور شکریہ ادا کر دیں۔"

فون بند ہو گیا۔

حالات قیامت کی چال چلتے رہے ــــــ مغرب کے قریب بھولا کا فون آیا اور حسب سابق اوپریٹر کی معرفت اس نے میری خیریت پوچھی۔ اور اوپریٹر ہی سے میرا جواب اور شکریہ وصول کیا۔

بھولا سے یہ میرا آخری رابطہ تھا۔

مشرقی پاکستان سے بھی یہ میرا آخری رابطہ تھا ــــــ کرب اور ذلت کے لمحوں میں دو ہمدردانہ فون کال ایسے تھے جو میں کبھی نہ بھول سکوں گا ــــــ اس لئے بھی کہ فون کرنے والوں نے اپنے متعلق ایسے ثبوت نوٹ کرا دیئے تھے کہ وہ آسانی سے دار پر چڑھائے جا سکیں گے۔

دو دن بعد ــــــ سولہ دسمبر کو ــــــ مشرقی پاکستان ہی ختم ہو گیا۔

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

ہندوستان

طوفان گزر چکا تھا ــــــ زلزلے تھم گئے تھے ــــــ ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔

ٹوٹے ہوئے گھر کا ملبہ تواریخ کے صحن میں بکھرا پڑا تھا ــــــ دل و دماغ بمشکل مان رہے تھے کہ یہ ہمارے گھر کا ملبہ ہے۔

شکست کی ذلت سے ہم نڈھال تھے ــــــ پچھلے چند ماہ کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کی جگہ اب انتہائی تھکاوٹ اور بے حسی نے لے لی تھی۔

کف افسوس ملنے کے لئے مشیت نے قید کی خاموشی مہیا کر دی۔

نہ معلوم کب تک!!

دل نے لنگڑا سا دلاسہ دینے کی ناکام کوشش کی:

چاند تارے ادھر نہیں آتے ــــــ ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

مگر تھوڑے ہی عرصے میں اندازہ ہونے لگا کہ یہ آسمان وہی نہیں بلکہ مختلف ہے ــــــ اتنا مختلف کہ یہ آسمان تو ہمیں جلانے پر تلا ہوا ہے۔

بریلی چھاؤنی میں تین بیرکیں تھیں جن میں دیواریں کھڑی کر کے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے۔ کسی میں ایک قیدی، کسی میں دو کسی میں تین اور کسی میں والدین اور بچوں سمیت سارا کنبہ۔ ملحقہ دو بیرکوں میں دفتر اور کچن وغیرہ تھے۔ ان پانچ بیرکوں کے گرد سرچ لائٹوں اور خاردار تاروں کے تین حصار تھے جن کے درمیان مشین گنوں سے مسلح سنتری اور شکاری کتے چکر لگاتے رہتے تھے۔ چاروں کونوں پر کئی منزلہ مچان (Watch Tower) تھے جن پر تیز سرچ لائٹ، دوربردار سنتری اور چاروں اطراف نصب کی ہوئی بندوقیں اور مشین گن تھیں۔

یہ کیمپ نمبر ۲۹ تھا اور وی آئی پی پنجرہ (V.I.P. Cage) کہلاتا تھا کیونکہ اس کے مکین قریباً تین سینیئر افسران تھے۔ یہ کیمپ دوسرے کیمپوں سے نسبتاً بہتر تھا۔ جہاں ہزاروں لوگ بے ترتیبی سے ٹھونسے ہوئے تھے اور ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے:

ستر (۷۰) ہزار فوج اور تئیس (۲۳) ہزار کے قریب سویلین (جن میں عورتیں بچے بھی شامل تھے) ان کیمپوں میں محبوس تھے۔

اس پنجرے میں پڑے پڑے میں دو سال تک سوچتا رہا ـــــ وہ سارے سوال جو مشرقی پاکستان میں ابھرتے تھے، اب اس بڑے اور بنیادی سوال میں ضم ہو رہے تھے کہ آیا ان کیمپوں کا آسمان ہمیں مٹا رہا ہے یا ہم خود ہی مٹ جانے میں مصروف ہیں یا دونوں ہی قوتیں کام کر رہی ہیں۔

ان سوچوں میں بھی بھولا میرا ذہنی شریک تھا اور رات کی تنہائی میں اس کے وہ سوال میرے کانوں میں گونج اٹھتے جو وہ ملک کے متعلق پوچھا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے متعلق پوچھتا تھا اور حکمرانوں کی نیت کے متعلق پوچھتا تھا ـــــ ان سوالوں میں سے اکثر یہ سوال بھی جھانکتا، کیا وہ بھی میری طرح کسی قید خانے میں پڑا یہی کچھ سوچ رہا ہوگا۔ یا اب تک بنگلہ دیش کی انتقامی گولی یا سنگین کا نشانہ بن گیا ہوگا۔

میری خاموش اور سنسان راتوں میں یا تو ایسے سوالوں کی گونج تھی یا سنتری کے بھاری جوتوں اور بندوق پر تھاپ کی آوازیں تھیں یا کتوں کی غرانے اور سیٹیوں کے خبردار کرنے کی چیخیں تھیں۔ سرچ لائٹ سے عاجز آ کر نیند سے بوجھل آنکھیں تاریکی کا دامن ڈھونڈتی رہتیں مگر وہ سکون آمیز تاریکی کیمپ میں کبھی نہ ہوتی تھی جس میں نیند آ جائے۔ بلکہ اس کی بجائے وہ پریشان کن تاریکی طاری تھی جو ہمارے شکست خوردہ من میں دن کو بھی ایسے چھائی رہتی کہ بقول آتش:

گور سے تنگ ہوا جاتا ہے زنداں مجھ کو

اس تنگ گور میں منکر نکیر کے جیسے سوالوں سے بھی زیادہ تیکھے سوال ہمیں ہر وقت تنگ کرتے رہتے۔ دن کو سوال ـــــ رات کو سوال ـــــ سوتے میں سوال ـــــ جاگتے میں سوال ـــــ خوابوں میں سوال ـــــ خدا سے فریادوں میں سوال ـــــ مشرقی پاکستان میں ہم نے یہ جنگ ایسے کیوں لڑی؟ ـــــ فلاں فیصلہ ایسے انداز میں کیوں ہوا؟ ـــــ اور کس نے کیا؟ ـــــ یا کس نے کب نہیں کیا جب کرنا چاہیئے تھا؟ ـــــ ہتھیار ڈالے جانے کے صرف مہینہ بھر بعد جب ہمیں پابجولاں ہندوستان لے گئے تو ہفتہ بھر ہم سٹیمر اور ٹرین میں بھیڑ بکریوں کی طرح سفر کرتے رہے جن میں تین دن کا سفر بنگلہ دیش کے علاقے میں تھا۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈھونڈتے رہے کہ کہیں تو لڑی ہوئی جنگ کے آثار نظر آئیں۔ کسی بم کا گڑھا۔ کوئی جھلسا ہوا درخت۔ کوئی سسکتا ہوا میدانِ جنگ کا کھنڈر۔ کوئی ٹوٹا ہوا تار یا کھمبا مگر کہیں سے بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اس ملک میں جنگ لڑی گئی ہے ـــــ خدا معلوم یہ کیسی جنگ تھی؟

پھر دل و دماغ سرگوشی کرتے کہ یہ تو صرف ایک باب ہے۔ ہماری قوم کی تو ساری ہی سوالوں کی تاریخ ہے۔ ہر اہم موڑ پر ناآسودہ سوالوں کے ڈھیر لگے ہیں۔

سوال ہی سوال۔

ایسے سوال جن کا جواب کبھی نہیں ملتا۔

قوم مجسم سوال ـــــ حکمران مجسم بے اعتنائی ـــــ جواب وہی مسلسل شرمساری۔

یہ ہے تاریخِ پاکستان ـــــ احتساب اور جواب دہی سے تہی اور مسلسل المناک حادثوں کی داستاں ـــــ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ ہماری ملت کی بنیاد ایسی روایات پر اٹھی ہے جو مسجد کے کھلے مجمع میں خلیفۂ وقت کا احتساب کرتی ہیں کہ مالِ غنیمت سے ملنے والی چادریں تو اتنی چھوٹی تھیں کہ ان سے کرتا نہیں بن سکتا تھا۔ پھر وہ نیا کرتا کیسے پہنے ہوئے ہیں۔ کیا انھوں نے خیانت کی ہے؟ اور خلیفہ کو جواب دینا پڑتا ہے کہ یہ کرتا دو چادروں سے بنا ہے جن میں سے ایک چادر ان کے لڑکے کے حصے کی ہے۔

تو پھر اب ایسا کیوں ہے کہ قوم کے زخموں کے ڈھیر سوال پہ سوال پوچھتے ہیں اور حکمران نہ صرف مسلسل سازشی چپ سادھے رہتے

ہیں بلکہ مزید وار پہ وار کئے جاتے ہیں۔

زنداں کی دیواروں سے جب میں یہ سوال بار بار پوچھتا تو ماضی کی قبر سے ۱۸۵۷ کا سال کلبلا کر باہر نکل آتا اور مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ۱۸۵۷ اور ۱۹۷۲ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ برعظیم کی مسلمان قوم کے لئے وقت تھم گیا ہے۔ ۱۸۵۷ میں قوم سے غداری اور انگریزوں سے وفاداری کرنے والوں کو جاگیریں ملیں۔ پھران جاگیروں پر مستقل قائم رہنے کے لئے نئے رویے بنے، خلق آزاری۔ قوم فروشی اور وطن فراموشی۔ ۹۰ برس میں قریباً چار نسلوں کی زندگی میں یہ رویے پختہ تر ہوگئے۔ اور ۱۹۴۷ میں پاکستان بنا تو یہی لوگ پاکستان کی اسمبلیوں میں پہنچ گئے اور ملک کو جاگیر کے انداز میں چلانے لگے۔ ان کا واحد منشور یہی قوم کش رویے تھے۔ انھیں تو انگریز سے آزادی مل گئی مگر قوم کو ان سے آزادی نہ مل سکی۔ نہ تعلیم حاصل کرنے کی آزادی۔ نہ سوچ کی آزادی۔ نہ سوال کرنے کی آزادی ـــــ جاگیرداروں پر ۱۹۴۷ طلوع ہوا مگر قوم ۱۸۵۷ کے سائے میں ہی رہی ـــــ بھارت نے اس راز کو پایا اور فوراً جاگیریں اور ریاستیں ختم کردیں، چنانچہ وہاں فرد آزاد ہوگیا۔ اور جمہوریت چل پڑی۔ مگر پاکستان میں فرد حسب سابق جاگیردار کا غلام رہا اور جمہوریت کے دھوکے میں، چند درجن جاگیرداروں کو باری باری اسمبلیوں میں اقتدار کے جھولے جھلاتا رہا۔ اور وہ کبھی از خود اور کبھی فوج سے مل کر اپنے اقتدار کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے گئے۔ اس مذموم مقصد کے لئے انھوں نے قانون کی بالادستی ختم کرکے شخصی حکومت کو فروغ دیا، شخصی حکومت کے ان دھاروں نے جب چاہا اپنے اقتدار کی خاطر قوم اور وطن توڑ ڈالا۔ ان جاگیرداروں کے لئے قوم فقط بے بس مزارعوں کا ہجوم تھی۔ اس رشتے میں سوال کی جرأت نہیں ہوتی۔ فقط مجبوری کی اطاعت ہوتی ہے، چنانچہ احتساب کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے پاکستان کی تواریخ ایک آزاد قوم کی تواریخ نہیں بلکہ ایک بیمار جاگیر کی تواریخ ہے جو مطلق العنان حاکموں کی من مانیوں سے زخمی ہے اور بے بس قوم کے تشنہ سوالوں کی فریاد سے کراہ رہی ہے۔ چند خود غرض لوگ بڑی بے دردی سے وقت کے سینے قوم کے لہو سے قوم کا مرثیہ لکھ رہے ہیں اور ہم اسے تواریخ پاکستان کہتے ہیں جس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قوم ان لوگوں کا ہاتھ نہیں روک سکتی۔

کیمپ نمبر ۲۹ میں پہنچے ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا جنوری ۱۹۷۲ کے آخری دن تھے کیمپ کا کمانڈنٹ راؤنڈ پر آیا تو ہاتھ میں ایک کتاب پکڑے ہوئے تھا جس کا عنوان دور سے پڑھا جاتا تھا **Pakistan cut to size** ـــــ مصنف کا نام تھا مانکے کر (**Mankekar**) کمانڈنٹ دامنِ فخر اور غرور سے کتاب کی نمائش کرتا ہوا گھوم رہا تھا۔ ہمارے زخم ابھی تازہ تھے۔ کرید کلبلا رہی تھی، اس لئے کسی نے وہ کتاب مانگ لی اور اگلے چند دن سب لوگ کسی اخبار کے ہنگامی ضمیمے کی طرح اسے پڑھتے رہے۔ کتاب ہندوستانی پروپیگنڈے کا مخصوص نمونہ تھی جو ہماری شکست کے بعد ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں شائع ہوگئی تھی۔ اس میں کئی مسخ شدہ حقائق تھے۔ اور اصولوں کے نام پر ہندوستانی جارحیت کا جواز تھا۔ مگر جنگ کی جھڑپوں کا تاریخ وار ذکر درست لگتا تھا اور اس میں کئی اطلاعات ہمارے لئے نئی تھیں۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے جنگ لڑنے کے انداز پر دشمن بھی متعجب تھا۔ اور جب میں نے یہ فقرہ پڑھا:

"Yahya Khan, As if in a hurry to fulfil a self-assigned mission of disrupting Pakistan, precipitated a war with India so as to remove any obstacle in the latter's path in sending its Army into East Pakistan"

(ترجمہ: یوں لگتا تھا جیسے یحییٰ خاں نے پاکستان توڑنے کا فرض اپنے ذمے لے رکھا تھا اور اسے عجلت میں تکمیل دینے کے لئے ہندوستان سے جنگ کی نوبت لے آیا، تاکہ مشرقی پاکستان میں آزادانہ فوج بھیجنے کو ہندوستان کے لئے راہ صاف ہو جائے۔)

تو مجھے یوں لگا جیسے بھوا میرے سامنے بیٹھا ازسر نو وہ سارے سوال دہرا رہا ہے جو پچھلے چند مہینوں میں پریشان ہو کر وہ پوچھا کرتا تھا کہ؟
کیا یحییٰ خاں جان بوجھ کر مشرقی پاکستان کے حالات خراب کر رہے تھے؟

چند ماہ بعد اس موضوع پر ایک اور کتاب ہندوستان میں چھپ گئی۔ اور جب سابق ہمارے کیمپ میں پہنچ گئی۔ کتاب اور مصنف کا نام یاد نہیں مگر وہ چبھتا ہوا فقرہ ابھی تک یاد ہے جس نے اس وقت بھی ہمیں ہلا دیا تھا۔ تین دسمبر ۱۹۷۱ کو مغربی پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے ہوائی اڈوں پر جو لنگڑا سا پہلا حملہ ہوا تھا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا کہ یہ حملہ تو محض نام ہی کا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یحییٰ خاں ہندوستانی فوجوں کو سبز جھنڈی دکھا کر پاکستان پر کھلے حملے کی اجازت دے رہے تھے۔

میرے ذہن میں گونجا کہ ایک دفعہ بھولا نے بھی سبز جھنڈی کا استعارہ استعمال کیا تھا۔ پاکستان کی دانستہ تباہی کا جو پہلو اس استعارے میں مضمر ہے اسے دوست اور دشمن دونوں پہچان رہے تھے۔

کیمپ میں ہمارے لئے خبروں کا ذریعہ ریڈیو تھا۔ یا ہندوستانی انگریزی اخبارات تھے جن کی وجہ سے ہم بنگلہ دیش کے حالات سے پاکستان کے لوگوں کی نسبت زیادہ باخبر رہتے تھے۔ بنگلہ دیش بنتے ہی شیخ مجیب الرحمان نے پہلے تو اعلان کیا کہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان کوئی سرحد نہیں، مگر بعد میں سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں طرف چند میل چوڑے علاقے میں آزادانہ آمد و رفت روا رکھی گئی۔ اس کا عملی نتیجہ وہی تھا کہ سرحد مٹ گئی۔ چند ہفتوں بعد شیخ مجیب الرحمان نے اعلان کیا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد جو ہندو جائیدادیں چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے، وہ آ کر اپنی جائیدادیں واپس لے سکتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد خبریں آنے لگیں کہ ضلع میمن سنگھ کے گلی کوچوں میں فسادات شروع ہو گئے ہیں کیونکہ متروکہ جائیداد کے مکینوں نے ہندوستان سے آنے والے مالکوں کو جائیدادیں واپس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ فسادات کافی دن چلے، مگر بعد ازاں ہندوستانی اخبارات سے اندازہ نہ ہو سکا کہ بالآخر معاملہ کیسے سلجھا۔ غالباً دونوں حکومتوں نے حکم واپس لے لیا تھا۔

میمن سنگھ بھولا کا ضلع تھا۔ جن دنوں یہ خبریں آ رہی تھیں۔ میرے ذہن میں بھولا کے فقرے گونجتے رہتے کہ ہمارے لوگ تو اپنی بقا کے لئے جانیں لڑانے کو تیار ہیں۔ نہ معلوم ملک کے تحفظ کے لئے انہیں حکومت اپنے ساتھ شریک کیوں نہیں کرتی۔

فسادات چلتے رہے ــــــ اور میں سوچتا رہا......

قید کی مایوسی کئی گنا بڑھ کر تاریکی بن گئی ــــــ ایک دفعہ پھر اپنوں نے ہم وطنوں کو بے بس کر کے غیروں کے آگے ڈال دیا ہے ــــــ اس شہری کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیسی ہو گی جس کے لیڈروں نے سرحد پار سے لوگوں کو مدعو کیا ہے کہ وہ آ کر اسے بے گھر کر دیں اور کاروبار کا ٹھکانہ چھین لیں۔

مگر دھیرے دھیرے اس صورت حال کے پوشیدہ پہلو مجھ پر کھلنے لگے، اور یہ خبریں ایک مثبت پیغام بننے لگیں۔ پاکستان کا حال مایوس کن سہی مگر مستقبل کے افق پر مجھے ایک روشن کرن نظر آنے لگی۔ کرن عوام کی خود آگہی ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ کر کے حالات کو خود سنبھالنا ہے اور یہ اسی معاشی آزادی میں پوشیدہ ہے جو مسلمانوں کو پاکستان بننے کے بعد ملی۔ ہمارے ملک میں سیاسی آزادی تو سر نہ اٹھا سکی مگر فرد کی معاشی آزادی جڑ پکڑ کر توانا درخت بن چکی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے انارکلی میں صرف ایک دکان مسلمان تاجر کی تھی۔ اب سب مسلمان ہیں اور کامیاب تاجر ہیں۔ وہ اپنی سرحدوں پر اپنی فوج کی شکست پر تو محض مرثیہ خوانی کر کے رہ جاتے ہیں مگر جب کوئی انہیں دکان اور گھر سے بے دخل کرنے آئے گا تو میمن سنگھ کے بے یار و مددگار شہری کی طرح خود مقابلہ کریں گے۔ ہمارے لیڈر سیاسی آزادی کی بیخ کنی کرتے رہیں مگر ہمارا فرد اپنی معاشی آزادی کا تحفظ خود کرے گا، اور یہ پوری ملت کی مدافعت بن جائے گی۔ پاکستان کے مستقبل کی اصل قوت یہی عوام ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کے خلاف بھی لڑنا ہے کیونکہ یہ دونوں ہی پاکستانی قومیت کے دشمن ہیں ــــــ یہی عوام پھر اپنی صفوں میں سے نئے نمائندے پیدا کریں گے۔ جو چھوٹے پیغمبروں جیسے خودساختہ لیڈروں کی جگہ لیں گے۔ تب پاکستان کے مستقبل میں درخشانی کے تار پڑ جائیں گے۔

کیونکہ اس عمل میں عوام نے نمائندوں کا احتساب کرنے کا گُر سیکھ چکے ہوں گے۔

مجھے یوں لگا جیسے آج کا میمن سنگھ کل کے پاکستان کے لئے ایک لیبارٹری کا کام دے رہا ہے اور بے بس شہریوں کی کھلی مدافعت امید کی ایک روشن کرن ہے۔

مگر وقت بڑا بے رحم ہے۔ جن ہندوستانی اخباروں نے میمن سنگھ کی خبریں مجھ تک پہنچا کر ذرا سہارا دیا تھا انہی اخباروں نے ایک دفعہ پھر مایوسی کے گڑھے میں دھکیل دیا جب بہت مختصر سی خبر نظر سے گزری کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سجاد حسین ایک گلی میں نیم مردہ حالت میں پائے گئے۔ ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور جسم زخموں سے چور تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد وہ کافی عرصہ کہیں چھپے رہے مگر بالآخر پکڑے گئے۔ پکڑنے والوں نے رات کے اندھیرے میں انھیں مار مار کر ختم کر دیا تھا اور مردہ سمجھ کر گلی میں پھینک گئے تھے۔ مگر دن نکلنے پر کسی نے ان کے تن مردہ میں زندگی کی ایک رمق دیکھ لی اور پولیس کو اطلاع دے دی۔

چند ماہ پیشتر ڈاکٹر سجاد حسین نے مجھ سے کہا تھا کہ مارشل لاء کا مناسب ضابطہ آنے پر میں یونیورسٹی کے طلباء کو یقیناً سنبھال لوں گا۔ یہ میرا مشن ہے۔

اخبار پر نگاہیں گاڑے میں بالکل دم بخود تھا......

یہ اُن کے مشن کی تکمیل تھی ____

اخبار کی کانپتی ہوئی سطروں نے سرگوشی کی ــ خدا معلوم بھولا کا کیا حشر ہوا ہوگا؟؟ (مسلسل)

ضمیمہ ۵

بہ مطابق فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۳۔

۱۹۷۱ء کی جنگ

۱۹۷۱ کی جنگ جس انداز سے لڑی گئی۔ اس کا مفصل بیان تو یہاں ممکن نہیں۔ مگر چند مصنفین نے اپنی کتابوں میں جو مکمل یا جزوی تجزیہ کیا ہے اس کی کچھ جھلکیاں درج ذیل ہیں۔

(۱) PAKISTAN'S CRISIS IN LEADERSHIP۔ مصنف: جنرل فضل مقیم۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۳۔

(انگریزی سے ترجمہ)

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (CMLA) کی طرف سے ایسٹرن کمانڈ کو یہ ہدایت تھی کہ باغیوں کو کسی علاقے پر قابض نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں شدید خطرہ تھا کہ ہندوستان اس علاقے کو بنگلہ دیش کی مملکت کے طور پر تسلیم کر لے گا۔ مگر تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کو نظر انداز کر کے مسلسل طور پر اس پالیسی پر گامزن رہنا بالکل بعید از فہم ہے۔ (۱۱۹)...... مارچ کے فوجی ایکشن کے بعد صوبے سے باغیوں کا صفایا لازمی تھا۔ (اور یہ پالیسی کچھ معنی رکھتی تھی)...... مگر بعد ازاں جب ہندوستانی حملے کا خطرہ بڑھا تو بھی اس پالیسی میں تبدیلی کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ نہ ہی پاکستانی فوج کو از سر نو ترتیب دینے کی طرف کوئی توجہ دی گئی تاکہ وہ ہندوستانی حملے کا مقابلہ کر سکیں...... جنرل ہیڈ کوارٹر (GHQ) اور ایسٹرن کمانڈ کے بہت سے افسران اس پالیسی کے خلاف تھے مگر انھیں بار بار یہی کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا کہ صدر یحییٰ کا حکم ہے کہ ملک کے ایک انچ حصہ پر بھی باغیوں کا قبضہ نہیں ہونا چاہیئے...... نتیجہ یہ ہوا کہ اس پالیسی پر عمل کی وجہ سے فوجی دستے مشرقی پاکستان کی لمبی سرحد پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے (صفحہ ۱۲۰)...... ایسٹرن کمانڈ کے تین کمزور ڈویژن اس قابل نہ تھے کہ ۰۰...۴ میل لمبی سرحد

پر مکمل کنٹرول کر سکتے۔ (صفحہ ۱۲۳) ...... یہ پالیسی شروع میں چند مفروضوں کی بنا پر بنائی گئی تھی۔ بعد ازاں حالات میں واضح تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ مفروضے کالعدم ہوگئے تھے، مگر نہ تو اس پالیسی میں کوئی تبدیلی کی گئی اور نہ ہی خفیہ رپورٹوں کی بنا پر حالات کا باضابطہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ (صفحہ ۱۲۴)

بتایا جاتا ہے کہ چیف آف جنرل سٹاف کے خیال میں ایسٹرن کمانڈ سے موصول ہونے والی رپورٹیں مبالغہ آمیز ہوتی تھیں اور وہ اپنے ماتحتوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ ان رپورٹوں پر کوئی عمل نہ کیا جائے ...... مگر اس صورت حال کو بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی (صفحہ ۱۲۵)

اکتوبر اور نومبر میں ہندوستانی فوج سرحدوں پر جارحیت کرنے لگی۔ پاکستانی فوجی پوزیشنوں پر منظم اور بھرپور حملے ہونے لگے جن میں باغی ہندوستانی بارڈر سیکورٹی فورس اور ہندوستانی فوج مل کر حصہ لیتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶) ...... پھر ان حملوں کی شدت میں روزانہ اضافہ ہونے لگا اور ساتھ ہی اندرون ملک گوریلوں کے حملے بڑھنے لگے۔ (صفحہ ۱۲۸) ...... مغربی پاکستان سے دورے پر آنے والے فوجی افسران ان حالات سے بے خبر نہیں تھے اور مشرقی پاکستان سے واپسی پر وہ اپنے اعلیٰ افسروں کو حالات کی رپورٹ پیش کرتے ...... مگر ان پر کوئی عمل نہ ہوتا تھا اور چیف آف سٹاف (COS) ان پر کوئی آرڈر جاری نہ کرتے تھے (صفحہ ۱۲۹) ...... ان نازک حالات میں جب صدر اور COS نئی ہدایات جاری کرنے سے دانستہ انکار کرتے رہے تو اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ ایسٹرن کمانڈ کی پالیسی سے مطمئن تھے کہ فوج سرحد پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹی رہے) (صفحہ ۱۳۰) ...... ۱۴ نومبر کو مصدقہ اطلاعات ملیں کہ ہندوستان عید کے روز (۲۰ نومبر) بھرپور اور کھلے حملے کا ارادہ کر رہا ہے ...... مگر اس کے باوجود (اسلام آباد سے) ایسٹرن کمانڈ کو نئی ہدایات جاری نہ کی گئیں کہ وہ علاقہ بچانے والی پالیسی تبدیل کر کے ہندوستانی حملے کے نئے خطرے کے لئے تیار ہوں اور مقابلے کے مناسب دفاعی اقدامات کریں۔ نہ ہی ایسٹرن کمانڈ نے اس نئے خطرے کے مقابلے کے لئے کوئی دفاعی پوزیشن اختیار کی (صفحہ ۱۳۱) ...... جب ہندوستان نے حملہ کیا تو (ان پالیسیوں کی وجہ سے) مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج اتنے نامساعد اور ناموافق حالات سے دوچار تھی جس کی مثال نہیں ملتی۔ مٹھی بھر فوج کے پاس بھاری ہتھیار نہ تھے اور وہ آٹھ مہینے سے انتہائی مخالفانہ ماحول میں بے مقصد جنگ لڑ رہی تھی۔ فوجیوں کو غیر فوجی اور نیم عسکری انداز میں ادھر اُدھر بانٹا ہوا تھا۔ ان کے سامنے نہ تو کوئی واضح مقصد تھا اور نہ ہی واضح ہدایات ملتی تھیں۔ ان کا رابطہ، مواصلات قریباً منقطع ہو چکا تھا۔ (صفحہ ۱۳۱)

سرحدوں پر ہندوستان کی مسلسل جارحیت سے فوجی سپاہیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ ان میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کی حالت میں وہ مغربی پاکستان سے کٹ جائیں گے۔ مزید فوجی امداد نہ مل سکے گی اور وہ ہندوستانی فوج اور دشمن بنگالیوں کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے۔ اس احساس میں مزید تلخی اس بات سے پیدا ہو رہی تھی کہ صدر یحییٰ (جو کمانڈر ان چیف بھی تھے) نے مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد کے تاریک مہینوں میں ایک دفعہ بھی مشرقی پاکستان کا دورہ نہ کیا تھا۔ اسی طرح COS اور دوسرے سینئر افسران بھی شاذونادر ہی مشرقی پاکستان گئے ...... ان حالات میں حکومت پر نکتہ چینی اور خفگی بڑھ رہی تھی کہ مغربی پاکستان میں صدر یحییٰ صورت حال کو سنبھالنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے جس سے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا دباؤ کم ہو سکے (صفحہ ۱۵۶) ... اکتوبر تک یہ خفگی افسران کے علاوہ جوانوں تک بھی پہنچ چکی تھی ...... جیسے جیسے ہندوستانی دباؤ اور ہندوستانی حملہ یقینی نظر آنے لگا، حکومت پاکستان کی کمزور پالیسی کے خلاف غم و غصہ بڑھنے لگا۔ مثلاً ایک نوجوان فوجی افسر نے مغربی پاکستان میں اپنے والدین کو خط میں لکھا "سب جانتے ہیں کہ ہندوستان باغیوں کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ ہندوستانی توپ خانہ پاکستان میں ہماری پوزیشنوں پر دن میں ہزاروں گولے گراتا ہے۔ ہندوستانی فضائیہ مسلسل پاکستانی فضا میں مداخلت کر رہی ہے۔ ہمارے ہزاروں لوگ مارے جا رہے ہیں۔ مگر ہماری حکومت نے کیا کیا ہے؟ سوائے رحم اور امن کی اپیلوں کے ــــ اسے ہم تحمل کہیں یا بزدلی؟" (صفحہ ۱۵۷)

(۲۲ر نومبر کی صبح کو) VCGS ہندوستانی حملے کی خبر لے کر جنرل عبدالحمید COS کے گھر پہنچے مگر دو گھنٹے کی لاحاصل بحث کے بعد COS نے انھیں بغیر کسی فیصلے یا ہدایات کے واپس بھیج دیا...... شام کو COS نے COS سے درخواست کی کہ اگلی صبح وہ صدر یحییٰ کے ہمراہ اپریشن روم میں بریفنگ کے لئے آئیں۔ مگر درخواست نامنظور کر دی گئی کیونکہ صدر یحییٰ اس دن سیالکوٹ میں فوج کا معائنہ کرنے جا رہے تھے۔ COS نے بار بار درخواست کی کہ سیالکوٹ کا دورہ ملتوی کیا جائے مگر یہ اصرار بھی مسلسل رد ہوتا رہا...... تیسرے پہر کو صدر یحییٰ اور COS سیالکوٹ سے واپس آئے تو ان سے اپریشن روم آنے کی درخواست کی گئی۔ مگر اس نازک وقت میں COS تجویز کرتے رہے کہ بریفنگ شام کو کی جائے کہ صدر یحییٰ سہ پہر میں سو کر آرام کر سکیں ...... بالآخر جب صدر یحییٰ کو بریفنگ دی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ دو گھنٹے سوچیں گے اور بعد ازاں ایوانِ صدر میں کانفرنس کریں گے...... کانفرنس کے ایک ممبر نے بتایا کہ وہاں صدر یحییٰ بالکل بے پروا اور لاتعلق تھے۔ کانفرنس بھی مختصر اور غیر سنجیدہ تھی اور وہاں صدر یحییٰ نے کہا "میں مشرقی پاکستان کے لئے کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں تو صرف دعا کر سکتا ہوں"۔ (صفحہ ۱۶۰)

صدر یحییٰ کی دانستہ لاپروائی اور بے عملی سے ہندوستانی جارحیت کا تاثر ماند پڑ گیا اور اس طرح صدر یحییٰ نے براہِ راست ہندوستان کو فائدہ پہنچایا کیونکہ ہندوستان اپنی جارحیت کو عالمی اخباروں کا موضوع نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس عالمی پریس میں ہندوستان پاکستانی فوج کی فرضی جارحیت کی جھوٹی افواہیں پھیلاتا رہا (صفحہ ۱۶۰)..... ہندوستانی حملے کے معاملے میں صدر یحییٰ کا رویہ قطعی غیر سنجیدہ تھا اور وہ جان بوجھ کر اس پر پردہ ڈال رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی سیاسی اور سفارتی رکاوٹ کے بغیر ہندوستان نے اپنی فوجی جارحیت پوری آزادی سے جاری رکھی۔..۔ مغربی پاکستان سے فوری جوابی حملے میں دانستہ تاخیر کر کے یحییٰ خاں نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی بقا بالکل ناممکن بنا دی تھی۔ (صفحہ ۱۶۱)

(۲۰/۲۱ نومبر کی رات کو) ہندوستانی حملہ ہوا تو اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں پاکستان نے سرکاری طور پر کوئی شکایت نہ کی جب وہاں خبر پہنچی تو جنرل اسمبلی کی تیسری کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا اور مندوبین توقع کر رہے تھے کہ پاکستان یہ مسئلہ سیکورٹی کونسل میں اٹھائے گا۔ چنانچہ اہم ممالک کے تمام مندوبین وہاں اکٹھے ہو گئے تاکہ پاکستان کی طرف سے یہ اعلان سن سکیں کہ یہ مسئلہ سیکورٹی کونسل میں پیش کیا جائے گا۔ مگر پاکستانی نمائندے نے ایسا کوئی اعلان نہ کیا کیونکہ اسلام آباد کی طرف سے) پاکستانی نمائندے کو خبردار کیا گیا تھا کہ سیکورٹی کونسل کی میٹنگ کے لئے ہرگز درخواست نہ کی جائے تاوقتیکہ حکومت کی طرف سے واضح ہدایات نہ ملیں (صفحہ ۱۶۱)..... سیکورٹی کونسل میں شکایت نہ کرنے کی دانستہ کوتاہی کی وجہ سے بعد ازاں بہت دوررس اور بہت مضر اثرات نکلے کیونکہ ایک تو ہندوستان پر جارحیت کا الزام نہ لگ سکا اور دوسرے پاکستان بھی جارحیت کا شکار تسلیم نہ ہوا (ان دونوں اثرات کا مکمل فائدہ ہندوستان کو پہنچا اور مکمل نقصان پاکستان کا ہوا)...... یہ ریکارڈ کرنا ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا حملہ غالباً واحد مثال ہے جس میں اقوامِ متحدہ کے ایک ممبر ملک پر کسی دوسرے ممبر ملک نے حملہ کیا مگر جارحیت کے شکار ملک نے فوراً سیکورٹی کونسل میں شکایت نہ کی...... اس کے علاوہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان دو طرفہ معاہدے کے تحت بھی فوراً امریکہ سے مدد طلب نہ کی گئی جو پاکستان پر حملے کی حالت میں اس معاہدے کے تحت مل سکتی تھی۔ کافی عرصے کے بعد یہ نیم دلی سے مانگی گئی مگر اس کے نتیجے کا علم نہیں کیونکہ کسی دوسرے کی مدد کے بغیر صدر یحییٰ ذاتی طور پر یہ کام کر رہے تھے (صفحہ ۱۶۲) مغربی پاکستان کے محاذ پر کچھ کرنے سے پہلے پاکستان تیرہ دن رکا رہا۔ بالآخر تین دسمبر کو محدود پیمانے پر فضائی اور بری حملہ کیا جس کو ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر دوسرے بھرپور حملے کے لئے بہانے کے طور پر استعمال کیا اور مسلسل پروپیگنڈے سے جنگ کی تاریخ کو ۲۱ر نومبر کی بجائے ۳ر دسمبر مشہور کر ڈالا۔

پانچ دسمبر کو جنرل عبدالحمید خاں COS نے جنرل نیازی کو بتایا کہ چین کی طرف سے امداد کی بہت امید ہے۔ گو یہ خبر بالکل بے بنیاد تھی اور اس کا کوئی جواز تھا۔ شاید وہ جنرل نیازی کا حوصلہ بڑھانا چاہتے تھے تاکہ وہ اس وقت تک لڑ سکے کہ مغربی پاکستان سے جوابی حملہ ہو سکے (صفحہ ۱۷۴)...... اس جوابی حملے پر سب کی امید بندھی تھی خصوصاً مشرقی پاکستان میں لڑنے والے فوجیوں کی۔ مگر اس حملے میں تاخیر ہی ہوتی رہی (صفحہ ۱۷۶)..... آہستہ آہستہ یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ صدر یحییٰ اور COS کی نیت جنگ جاری رکھنے کی نہیں تھی۔ اور انھوں نے جوابی حملہ ملتوی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ (صفحہ ۱۸۲)..... چین سے فرضی امداد کا لایعنی ڈرامہ بھی جاری رکھا گیا (صفحہ ۱۸۵) اور ۱۲ر دسمبر کو CGS نے جنرل نیازی کو فون پر پشتو

زبانی میں پیغام دیا کہ شمال و جنوب سے پیلی اور سفید قوم کے لوگ ۱۳ دسمبر کی دوپہر تک آجائیں گے۔ اگلے دن GHQ نے پیغام بھیجا کہ دوستوں کے آنے میں ۴۸ گھنٹے کی تاخیر ہو گئی ہے۔

سات دسمبر کے بعد COS پر ہر طرف سے دباؤ بڑھنے لگا کہ مغربی پاکستان کی طرف سے جوابی حملہ کیا جائے۔ ڈائرکٹر ملٹری اپریشن اور اس کا نائب بار بار اصرار کرتے رہے کہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ آٹھ دسمبر کو COS نے وعدہ کیا کہ اگلے دن کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ ...... مگر اگلے دن جوابی حملے کا حکم دینے کی بجائے ؟ ... نے ۳۳ ڈویژن کو دو حصوں میں بانٹ دیا ..... اور یوں لگتا تھا کہ وہ جوابی حملے کو کہیں بھول ہی گئے ہیں (صفحہ ۲۱۳) ...... اس کے بعد ایک اور احمقانہ فیصلہ ہوا کہ جوابی حملے کا طریق کار تبدیل کر دیا گیا ..... اور تیرہ دسمبر کی صبح کو نو بجے COS نے حملے کے نئے طریق کار کی منظوری دی ...... حملہ سولہ دسمبر کی صبح کو ہونا تھا۔ مگر بعد ازاں اسے مزید چوبیس گھنٹے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ سولہ دسمبر کی شام کو ایک عام بریفنگ کے دوران COS نے اچانک کہا "جنرل ٹکا خان کو روک دو" اور ان کے سٹاف نے بلا چوں و چرا حملہ رکوا دیا۔ (صفحہ ۲۱۷)

(مشرقی پاکستان میں جنگ بندی کے متعلق جب اعلان ہوا) تو ملک پر غم و اندوہ کا طوفان ٹوٹ پڑا۔ فوجی افسر اور جوان رونے لگے ..... فوج میں عام احساس یہ تھا کہ دشمن سے لڑنے کا موقعہ دیئے بغیر انھیں ہتھیار ڈالنے کی ذلت اٹھانا پڑی (صفحہ ۲۲۰) ..... اٹھارہ دسمبر کو مغربی پاکستان کی سرحد پر جنگ بندی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ دراصل وہ اپنے حاکموں کی بے وفائی سے لاعلم تھے۔ ان کو اندازہ نہ تھا کہ ان کے حاکم امن اور جنگ جیسے اہم مسئلوں سے کتنے لاپروا اور بے حس رہے تھے۔ نہ ہی وہ جانتے تھے کہ جنرل یحییٰ کتنے تباہ کن انداز میں اپنا عہدہ چلا رہے تھے (صفحہ ۲۲۴) ..... غم کی شدت میں لوگ بلند ترین سطح پر غداری کے الزامات دھرتے تھے ..... پاکستانی فوج بھی بہت افسردہ اور تلخ تھے ..... کہ جب زیادہ تر فوجیوں نے ایک گولی بھی نہیں چلائی تو جنگ بندی کے کیا معنی؟ (صفحہ ۲۵۱) ..... بدقسمتی سے قومی سطح پر نہ صرف حالات کو سنبھالا نہیں گیا بلکہ تاثر یہ ابھرتا ہے کہ دانستہ بگاڑا گیا (صفحہ ۲۶۰) ..... یہ جنگ ایسے لڑی گئی جیسے کلاسیکی سبق پڑھایا جا رہا ہو کہ جنگ کیسے نہیں لڑنی چاہیئے (صفحہ ۲۶۱)

(ب) THE DELIBERATE DEBACLE : مصنف : ڈاکٹر صفدر محمود، پہلا ایڈیشن۔ جون ۱۹۷۶ء (انگریزی سے ترجمہ)

صدر یحییٰ خاں نے پہلے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک اور پھر جنگ میں انتہائی نا اہلی کا ثبوت دیا اور ملک کو شکست سے دوچار کر کے اس انداز میں تباہ کیا جیسے سٹاف کالج کے ٹریننگ کورس میں شکست کا سبق سکھایا جاتا ہے (صفحہ ۱۵۷) ..... آخری دنوں میں گورنر مالک سر توڑ کوشش کرتے رہے کہ صدر یحییٰ سے فون پر مشورہ کر سکیں مگر صدر یحییٰ بات کرنے سے یوں انکار کرتے رہے جیسے اپنی دانستہ لائی ہوئی تباہی کا انتظار کر رہے ہوں (صفحہ ۱۲۵)

حکومتِ پاکستان کا ہمیشہ سے یہ موقف رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کی طرف سے حملے سے ہوگا۔ مگر سب غیر جانبدار مبصر متفق ہیں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو پاکستان نے اپنی پوری فوج استعمال ہی نہ کی اور شاید جان بوجھ کر مغربی پاکستان میں سنجیدگی سے جنگ بھی نہیں لڑی ..... حقیقت یہ ہے کہ کئی اہم فوجی دستوں کو (جنھیں مغربی پاکستان سے حملے کی خاص تربیت تھی) ایک گولی بھی چلانے کا موقع نہ دیا گیا۔ علاوہ ازیں فوج اور فضائیہ میں مجرمانہ حد تک رابطے کی کمی تھی (صفحہ ۱۸۲)

مشرقی پاکستان میں جنگ بندی کے وقت پاکستانی فوج کے پاس کئی ہفتے کے لئے اسلحہ اور سامان کا ذخیرہ تھا۔ اور وہ کافی عرصہ تک ڈھاکہ میں جم کر مقابلہ کر سکتے تھے ..... سوال یہ ہے کہ جب پاکستانی فوج کے پاس کئی ہفتے مقابلہ کرنے کے وسائل تھے تو پھر اس نے سولہ دسمبر کو کیوں ہتھیار

لہ دن اُس ڈھاکہ میں سولہ دسمبر کی صبح کو ہتھیار ڈالے جا چکے تھے۔ (۱) آخری دنوں کے کرب، بے چینی اور شدید انتظار کا حال مصنف کی کتاب "جرے" میں ملاحظہ کریں۔

ڈال دیئے۔ کیا یہ تباہ کن شکست جان بوجھ کر لی گئی (صفحہ ۱۸۴)...... ایک اور بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ پاکستان اگر اپنی فوجی کمزوری کو محسوس کر رہا تھا تو پھر یہ معاملہ ۴ر دسمبر سے پہلے ہی اقوام متحدہ میں کیوں نہ پیش کیا گیا (صفحہ ۱۸۶)

تمام شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی فوجی حکومت نے جنگ شروع ہوتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے جائیں گے تاکہ مغربی پاکستان میں فوج حکومت کرتی رہے۔ ان کا یہ مقصد کسی بھی قسم کے سیاسی حل ڈھونڈنے سے پورا نہ ہو سکتا تھا..... صدر یحییٰ کی ساری زندگی بتاتی ہے کہ ان کی سب سے بڑی خواہش اقتدار کی ہوس تھی چاہے وہ کسی بھی قیمت پر ہو اور اس معاملے میں وہ کسی بھی قانون، اصول یا احتیاط کے قائل نہ تھے۔ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ انھوں نے محض سازشوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا تھا (صفحہ ۱۸۶)....

(اسی مقصد کے حصول کے لیئے یحییٰ خان شروع ہی سے شیخ مجیب الرحمان کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہے اور ہر اہم مسئلے پر وہ شیخ مجیب کے آگے جھکتے گئے (صفحہ ۱۹۰)

یہ صاف ظاہر ہے کہ یحییٰ خان مشرقی پاکستان میں سیاسی حل بالکل نہیں چاہتے تھے۔ بیرونی سیاستدانوں سمیت ان کے تمام دوست انھیں سمجھاتے رہے کہ مجیب سے گفت و شنید کے ذریعے مسائل حل کریں۔ یحییٰ بظاہر ان کی بات سنتے رہے مگر اس مشورے پر خلوص سے عمل کرنے کی ان کی کبھی نیت نہ تھی ...... اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سر پر منڈلاتی ہوئی جنگ لڑنے کی بھی سنجیدہ تیاری نہ کی ــــ پھر ان کی اصل نیت کیا تھی ؟؟ اس بات کے کافی ثبوت ہیں کہ فوجی حکومت نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کا پہلے سے ہی فیصلہ کر لیا تھا تاکہ مغربی پاکستان میں حکومت کر سکیں ...... اور اس میں شک نہیں کہ جنگ بھی خلوصِ دل سے نہیں لڑی گئی (صفحہ ۱۹۴)

یہ سب جانتے ہیں کہ مغربی پاکستان سے حملہ اتنی دیر سے کیا گیا کہ اس وقت تک مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج کے لیے ہتھیار ڈالنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس طرح مغربی پاکستان سے محاذ کھولنے کا مقصد ہی فوت ہو چکا تھا۔ سخت مایوسی کے عالم میں نوجوان فوجی افسروں نے محاذِ جنگ سے اپنے اعلیٰ افسروں کو خطوط لکھے کہ یہ پالیسی ملک کے مفاد کے خلاف ہے ...... ہندوستانی جرنیلوں سمیت فوجی مبصرین متفق ہیں کہ صحیح پالیسی سے کافی دیر تک مقابلہ کیا جا سکتا تھا، مگر پاکستان نے وقت سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے (صفحہ ۱۹۵)

جس طریقے سے صدر یحییٰ اور فوجی حکومت نے جنگ کے دوران ایسٹرن کمانڈ کو جھوٹی تسلیاں دیں کہ چین اور امریکہ حمایت کریں گے، وہ ان کی بُری نیت کا غماز ہے ...... جنگی منصوبہ بندی سے صدر یحییٰ کی لاپروائی اور بے حسی بھی عجیب بات ہے۔ جنگ کے دوران بھی مشورے کے لیئے ان سے ملاقات ممکن نہ تھی ...... مختصراً یہ کہ جس انداز میں جنگ لڑی گئی اس سے پوری قوم لٹ گئی۔ بلاشبہ یہ تباہی جان بوجھ کر اور دانستہ لائی گئی تھی (صفحہ ۱۹۶)

مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد بھی یحییٰ خان اپنے آپ کو صدر اور جنرل عبدالحمید خان C.C کو کمانڈر انچیف بنانا چاہتے تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور خوددار اور محبِ وطن شخص ہوتا تو وہ شکست کے بعد استعفےٰ دے دیتا۔ مگر یحییٰ خان اور فوجی حکومت تو شکست کی دانستہ کوشش کرتے رہے تھے اور اب وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے (صفحہ ۱۹۷)

میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا مصنف: صدیق سالک تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴

(یحییٰ خان) نے ۳ر دسمبر سے مشرقی پاکستان میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ انھوں نے دفتر آنا بھی ترک کر دیا تھا۔ عموماً ان کا ملٹری سیکرٹری نقشے پر جنگ کی تازہ ترین صورت نگران کے پاس لے جاتا جس پر وہ کبھی کبھی نگاہِ غلط انداز ڈال لیتے تھے۔ سنا ہے ایک دفعہ انھوں نے مشکل جنگی حالت دیکھ کر اتنا کہا تھا "میں مشرقی پاکستان کے لیے کر بھی کیا سکتا ہوں" (صفحہ ۲۰۷)

میرے ہمدم، میرے دوست!

تسنیم سلیم چھتاری

محترمہ تسنیم سلیم چھتاری اور محترمہ ڈاکٹر صبیحہ خاتون صبا کی ان تحریروں یا یادداشتوں کی نوعیت ویسے تو یقیناً ذاتی ہے مگر ان میں انسانی رشتوں اور رابطوں کی جو کیفیات موجود ہیں، ان کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک ہمہ گیر انسانی مسئلے کی ہو گئی ہے۔ شاعرہ صبیحہ خاتون صبا کا دکھ بیٹی کا دکھ ہے کہ جب وہ کرۂ ارض کے اُس طرف قیام پذیر تھیں تو کرۂ ارض کے اِس طرف اُن کے والد گرامی انتقال کر گئے! پھر آج سے چالیس برس پہلے کی مشہور و معروف افسانہ نگار تسنیم سلیم چھتاری نے اپنے ایک معذور لختِ جگر کو تیس برس تک جس غیر معمولی استقامت کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھا اور اس کی خاطر داری اور تیمار داری پر اپنے ہر آرام، ہر آسائش، حتیٰ کہ تخلیقِ فن کی صلاحیتوں کو بھی جس حیرت انگیز فراخ دلی سے قربان کر دیا، وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ اس طرح کے معجزے صرف ماؤں کے ہاں ہی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

"ادارہ"

سدھ پور کے دیرینہ قبرستان میں ایک قبر کی لوحِ مزار پر ابدی نیند میں سونے والے کا نام "محمد نوید سلیم" لکھا ہوا ہے۔ پیدائش کی تاریخ ۲۷ اگست سنہ ۵۴ء ہے اور رحلت کی تاریخ ۲۶ جون سنہ ۸۵ء کندہ ہے۔ اس گنجان آبادی میں یہ مٹی کا ڈھیر سب سے تازہ ہے اور شاید صدیاں گزرنے پر بھی یہ اسی طرح نیا لگتا رہے گا ـــــ غالباً یہ اس جواں سال اور زندہ دل انسان کی زندگی کا عکس ہے جس کے قہقہے منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں مگر اُن کی گونج آج بھی فضا میں باقی ہے۔

یہ تیس سال دس مہینے کیسے اور کس طرح گزرے؟

سنہ ۷۳ء کی بات ہے، غالباً مئی کا مہینہ تھا۔ میں بی اے کا امتحان دے کر نتیجہ کا منتظر تھا۔ کئی جگہ داخلے کے فارم بھر دئے تھے اور اب اِدھر اُدھر گھوم کر وقت گزار رہا تھا۔ نینی تال میں چچا گورنمنٹ کے ملازم تھے اور میں کچھ دن کو ان کے پاس آ گیا۔ مجھے پہاڑ بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان نشیب و فراز میں چڑھنے اترتے رہنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ایک دن میں کاٹ گودام جانے والی سڑک پر بہت دور تک اُترتا چلا گیا اور واپسی میں سانس چڑھنے لگا تو کچھ دیر کہیں بیٹھ کر دم لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سڑک کے موڑ پر سامنے ایک موٹر رُکی ہوئی تھی جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور ایک نوجوان جوڑا جھک کر کچھ پُرزے اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ اندر دو تین چھوٹے بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک کی دوسری سمت ایک پتھر کی پُلیا تھی جس پر ایک شخص بیٹھا ہوا بڑے کوفت آمیز انداز سے موٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے موٹروں کے کل پُرزوں سے مطلق واقفیت نہیں ہے اور دوسرے وہاں ایک نوجوان خاتون کی موجودگی نے مجھے اپنی خدمات پیش کرنے سے معذور رکھا۔ میں بھی پُلیا پر بیٹھ کر اپنی تھکن اُتارنے لگا۔

جو صاحب میرے قریب تھے اب میں نے اُن کا جائزہ لیا۔ یہ غالباً میرے ہم عمر ہوں گے مگر میں جس قدر نحیف و نزار تھا، یہ اسی قدر تنومند نظر آتے۔ انھوں نے ایک بہت ہی شوخ رنگ کا پولو نیک سویٹر پہن رکھا تھا اور جو دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے اُن کی انگلیوں کا سائز اور کلائی کی چوڑائی دیکھ کر میں نے غیر اختیاری طور پر اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور ذرا سا رشک کا جذبہ بیدار ہوا۔ اسی دوران میں انھوں نے پتلون کی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور ایک سگرٹ منہ میں دبا کر لائٹر سے اسے سلگانا چاہا مگر پتہ نہیں

کس طرح وہ لائیٹر ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر ان کے جوتوں کے قریب جا پڑا۔ میں نے سوچا کہ لمبے چوڑے ہاتھ کوئی نزاکت کا کام نہیں کر سکتے....

مگر اب جو میں توجہ سے دیکھ رہا تھا وہ یہ کہ یہ حضرت اپنے جوتوں کے پاس پڑے ہوئے لائیٹر کو جھک کر اٹھانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں —— ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد میں غیر ارادی طور پر جھکا اور لائیٹر اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"شکریہ" اور وہ سنجیدہ چہرہ یکایک کھل اٹھا۔ "یہ مصنوعی ٹانگیں بہت کار آمد ہیں مگر کبھی کبھی ان کے کل پرزے اٹک جائیں تو پریشان بھی کر دیتی ہیں۔"

"مصنوعی ٹانگیں؟"

"جی ہاں"۔ انھوں نے گھٹنوں سے اچھی پتلون پکڑ کر پائنچے اوپر کھینچے اور دو بادامی رنگ کی لکڑی کی پنڈلیاں میرے سامنے تھیں۔

"اوہ"۔ میں بوکھلا سا گیا "یہ —— یہ حادثہ؟ آئی ایم سوری ——"

"نہیں اس میں افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے"۔ انھوں نے ہنستے ہوئے پتلون کے پائنچے درست کئے اور سگرٹ سلگایا "فوجی زندگی میں اس قسم کے حادثوں کے لئے تیار ہو کر ہی قدم رکھا جاتا ہے۔"

"فوجی زندگی؟ تو کیا آپ ملٹری میں ہیں؟"

"ہوں نہیں، تھا —— میرا کردار اس فیلڈ میں بدقسمتی سے جلد ہی ختم ہو گیا۔"

"تو یہ حادثہ —— کسی ملٹری ایکشن کے دوران......"

"ہاں بھئی..... آپ محض دو ٹانگیں دیکھ رہے ہیں —— کاندھوں سے سر اڑ جاتے ہیں —— کبھی تو انسانی جسم اتنے حصوں میں بٹ جاتے ہیں کہ سب کو تلاش کر کے ایک جگہ جمع کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا —— میں نے خود اپنی ٹانگیں پھر کبھی نہیں دیکھیں —— اور خیر میں ہوش میں کب تھا جو انھیں تلاش کرتا۔ ممکن ہے اب تک وہیں کہیں پڑی ہوں۔"

میں بڑے انہماک سے اس نوجوان کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو اپنے اپاہج ہو جانے کا واقعہ اتنے اطمینان اور مسکراہٹ کے ساتھ سنا رہا تھا۔ مجھے تو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اس جواں مرد کا تعلق فوج سے ہے۔ چوڑا سینہ اور نوکیلی مونچھیں اور یہ برداشت کی قوت...!

"مگر —— مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

"کیسے ہوا یہ تو بڑی الجھی ہوئی کہانی ہے —— ان الجھی ہوئی سرنگوں کی طرح جیسے دشمن اپنے محاذ کے چاروں طرف پھیلا دیتے ہیں۔ رات کا وقت تھا۔ اس سیاہ سناٹے میں صرف ہمارے بوٹوں کی آواز مخل ہو رہی تھی۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ ہمارے چاروں طرف بارود کی سرنگیں پھیلی ہوئی ہو سکتی ہیں اور ایک قدم بھی ہمیں موت کے منہ میں لے جا سکتا ہے مگر ہم اس وقت گرد و پیش کے ہر خطرہ سے بے نیاز تھے اور دماغ میں یہی، ایک دھن تھی کہ کسی طرح اپنے ملک کے دشمنوں کا سراغ پا لیں اور ہاتھوں میں تھامی ہوئی مشین گنوں سے ان کا سینہ چھلنی کر دیں ——"

"چلو فریدہ، خدا کا شکر ہے، موٹر اسٹارٹ ہو گئی ——" ہم دونوں نے بیک وقت نظر اٹھا کر اس خاتون کو دیکھا جو دو بیساکھیاں اٹھائے مسکراتی ہوئی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میرے ساتھی نے اپنے دونوں گھٹنے ٹٹول کے پتلون کے نیچے چھپے ہوئے کچھ کھٹکے دبائے اور بیساکھیاں لے کر ان کے سہارے کھڑا ہو گیا "اچھا میاں خدا حافظ ——"

میں اس نوجوان کی کہانی میں اس قدر محو تھا کہ اس طرح یکایک دخل اندازی سے گھبرا گیا، میں اور بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا، سننا چاہتا تھا، مگر وہ آہستہ آہستہ موٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا "سنیئے —— آپ مجھے اپنا نام تو بتا دیجئے

"میرا نام؟ میرا نام نوید سلیم ہے۔ کیپٹن نوید سلیم۔"

میں واپس مڑ کر اسی پلیا پر بیٹھ گیا۔ میں اس نوجوان فوجی سے اور باتیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ حادثہ کب اور کہاں ہوا؟ کون سی جنگ تھی جس میں اس نے اپنی دونوں ٹانگیں کھو دیں۔ ۱۹۶۲ء کی چین والی جنگ میں وہ مشکل سے چار پانچ سال کا ہوگا۔ ۱۹۶۵ء کی پاکستان والی لڑائی میں بھی وہ اس عمر کا نہیں ہو سکتا کہ فوج میں شامل ہو جائے۔ پھر یہ کون سی لڑائی کا واقعہ ہو سکتا ہے جہاں دشمنوں کی تلاش میں وہ زندگی بھر کے لئے معذور ہو گیا؟ میں اب یہ سوال کس سے کر سکتا تھا۔ وہ موٹر تو لمحوں میں موڑ سے گزر کر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

مجھے کئی ماہ تک بار بار اس اجنبی فوجی کا خیال آتا رہا۔

نوید پچھلے کئی ہفتہ سے بیمار ہے اور دس بارہ دن سے اسے علی گڑھ میڈیکل کالج میں داخل کر رکھا ہے۔ وہی پرانی گردوں میں انفکشن کی شکایت ہے۔ خدا خدا کرکے بخار قابو میں آگیا ہے۔ شاید دو تین دن بعد گھر جانے کی اجازت مل جائے۔ دن بھر گھر والے اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ شام کو میڈیکل کالج کے اسپیشل وارڈ کا یہ کمرہ کلب بن جاتا ہے۔ دوست احباب جمع ہو جاتے ہیں۔ چائے کا دور چلتا ہے۔ قہقہے لگتے ہیں اور دنیا بھر کی گپیں ہانکی جاتی ہیں۔

خالد نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا "نوید بھائی میں آ سکتا ہوں؟"

"خیریت؟ یہ آپ کو اجازت لینے کی ضرورت کب سے پیش آئی؟"

خالد اندر آگیا "یہ بات نہیں۔ دراصل میرے ساتھ ایک لڑکا اور ہے۔ اس کا نام ایاز ہے۔ چار پانچ دن ہوئے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ وہ تمہارے کسی ہمنام فوجی سے مل چکا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم تمہیں اپنے کمانڈر سے ملاتے ہیں۔"

"تو پھر اندر بلاؤ، باہر کہاں چھوڑ آئے۔"

خالد نے برآمدے میں جا کر ایاز کو کمرے میں بلا لیا۔ نوید اور ایاز ایک دوسرے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ نوید کے چہرے پر گہری مسکراہٹ اور ایاز کے چہرے پر شدید حیرت ——!

نوید نے پلنگ پر لیٹے لیٹے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا "آپ اس قدر حیران کیوں ہیں ایاز میاں؟ انسان کو خواب دیکھنے کی تو اجازت ہے یا اب اس پر بھی پابندی لگ گئی؟"

آج ۲۶ اگست ۱۹۵۴ء ہے۔ لگتا ہے آج میرا چوتھا بچہ میری منتظر بانہوں میں آجائے گا۔ مجھے پچھلے آٹھ دن سے اس بچے کی آمد کا شدید انتظار تھا۔ ۱۸ اگست کو فرید دو سال کا ہو گیا۔ میری خواہش تھی کہ دونوں بچوں کی سالگرہ ایک دن ہو مگر یہ نیا بچہ اپنی علیحدہ شخصیت کا مالک ہوگا۔ یہ اپنے ساتھ کسی کی شرکت نہیں چاہتا —— درد زہ بڑھ رہے ہیں۔ میری چھوٹی بہن تزئین بار بار میرے پاس آکر کہتی ہے "آپی یاد رکھئے گا لڑکا ہوا تو اس کا نام میں نوید رکھوں گی۔"

لیڈی ڈاکٹر متفکر ہے۔ یہ "بریچ" ڈیلیوری ہوگی جو بچے کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے مگر اللہ محافظ ہے۔ جس زندگی کو میں نے کئی مہینوں سے اپنے جسم کی گہرائیوں میں کروٹ بدلتے ہوئے محسوس کیا ہے وہ یوں دفعتہً ساکت تو نہیں ہو سکتی۔

پھر وہ موت و حیات کی کشمکش شروع ہوتی ہے جہاں پیروں تلے جنت پانے سے قبل جہنم کی تپش اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے ——

یکایک کمرہ کی خاموش فضا میں نوزائیدہ کی پہلی چیخ اپنی آمد ـــ اپنی حیات کا اعلان کرتی ہے۔

خدا کا شکر ہے میرا بچہ زندہ سلامت ہے۔

میری ماں آہستہ سے کہتی ہے "لڑکا ہے"

"خدا کا شکر ہے فرید کا ایک ساتھی آگیا۔ تبسم اور انیس کتنی خوش ہوں گی۔ مگر اس سکوت میں محض بچے کے رونے کی آواز گونج رہی ہے۔ میری ماں اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ وہ تو مستقل بیٹے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ انھوں نے دروازہ کھول کر بیٹے کی پیدائش کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ باہر منتظر گھر والوں میں سے کسی نے بھی مبارکباد کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ کسی نے بھی زور سے "جنم لیا ہے علیؑ" کا مخصوص گیت نہیں گایا ـــ کیا بات ہے۔ کیا بات ہے؟

"امی بات کیا ہے۔ بچہ تو زندہ ہے نا؟"

"ہاں بالکل زندہ ہے کتنی بلند آواز سے تو رو رہا ہے۔"

"پھر آپ اتنی خاموش سی کیوں ہیں، کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"نہیں ـــ دراصل بچے کی ٹانگیں بہت کمزور ہیں اور پاؤں بھی مڑے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے، ٹانگوں میں طاقت آجائے گی اور پاؤں تو پلاسٹر سے سیدھے کئے جا سکتے ہیں ـــ مجھے دکھا دیجئے کیا خرابی ہے؟"

"ہاں ہاں ضرور دیکھ لینا۔ نرس بچے کو نہلا دے تو پھر دیکھ لینا ـــ"

مگر یہ سارا ماحول اتنا پُراسرار کیوں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر میری ماں سے کیا سرگوشیاں کر رہی ہے؟ میری ماں دبے لہجے میں باقی گھر والوں سے کیا باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے وحشت ہو رہی ہے ـــ میرا بچہ مجھے دیدو ـــ

چادر میں لپٹا ہوا میرا بچہ میری آغوش میں دیدیا جاتا ہے۔ میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو بھول جاتی ہوں ـــ میرے سینے میں مسرت اور سکون کا سارا خزانہ اُبل پڑا ہے۔ یہ بچہ کس قدر خوبصورت ہے۔ اس کا صحت مند چہرہ، گول گول کلائیاں ـــ یہ دنیا کے سب بچوں سے زیادہ اچھا ہے، میرے اور بہن بچوں سے بھی زیادہ اچھا ہے ـــ

مگر میری اس خوشی میں باقی گھر والے شامل کیوں نہیں ہیں؟ اور ڈاکٹر کیوں بلائے جا رہے ہیں، بار بار بچے کو دوسرے کمرہ میں لے جا کر کسی نئے ڈاکٹر کو کیوں دکھایا جا رہا ہے محض پاؤں ٹیڑھے ہونے پر اس قدر ہنگامہ؟

میرے شوہر سلیم میرے پاس آکر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کا چہرہ بھی باقی گھر والوں کی طرح اترا ہوا ہے۔

"آپ نے بچہ دیکھا؟ کس قدر پیارا اور صحت مند ہے، پاؤں ٹیڑھے ہونا تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ پلاسٹر یا پھر آپریشن سے سیدھے کئے جا سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ممکن تھا مگر ہمارے بچے کے ساتھ اور بھی نقص ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی خراب ہے۔ تمہیں اللہ کے بھروسے پر ہمت سے کام لینا ہوگا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس حالت میں بچے کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ ریڑھ کی ہڈی میں ایک سوراخ ہے جس سے پانی نکل رہا ہے اور یہ بچہ ـــ یہ بچہ شاید تین چار دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا ـــ"

"یا اللہ یا میرے پروردگار! یہ اتنا پیارا بچہ۔ ہمارا اپنا بچہ ـــ"

رات کو نیند کی گولیاں کھانے کے بعد میں پوری رات آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھتی رہی۔ کیا یہ معصوم چہرہ کبھی میرے

تصور کی آنکھوں سے اوجھل ہو سکے گا

میرے والد جو اس زمانے میں پارلیمنٹ کی وجہ سے دہلی میں مقیم تھے، اس خبر کو سُن کر علی گڑھ آ گئے۔ "اگر علی گڑھ کے ڈاکٹر نا امید ہیں تو پھر باہر سے اسپیشلسٹ بلانے چاہئیں۔" آگرہ سے ہڈی کے مشہور سرجن ڈاکٹر سی بی سنگھ کو بلایا گیا ــــــ "خوش قسمتی سے بچے نے اس سوراخ کے گرد ایک چھالا سا بنا دیا ہے۔ یہ چھالا ممکن ہے سائز میں بڑھتا رہے مگر اس کی مکمل حفاظت کی گئی تو میں تین ماہ کی عمر میں اس بچے کا آپریشن کروں گا اور یہ زندہ رہ سکے گا۔ فی الحال اسے پابندی سے دوائیں دیتے رہنا پڑے گا۔"

یہ الفاظ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری تھے۔ میں نے پلٹ کر اپنی بہن تزئین سے کہا۔ "اب تم اس بچے کا نام نوید رکھ سکتی ہو۔"

تین ماہ کس طرح گزرے ــــــ نوید نے اپنی غذا کی شروعات ماں کے دودھ کے علاوہ "ٹیرامائی سین" سے کی۔ نوید کو ہم بہار میں جہاں سلیم ملازمت پر ہیں، لے آئے۔ میری ماں اور تزئین ہمارے ساتھ آ گئیں۔ ہم نے تین ماہ نوید کو باری باری گود میں رکھا کہ مبادا یہ سوتے میں سیدھا ہو جائے اور کمر پر جو چھالا دن بدن سائز میں بڑھ رہا تھا وہ پھوٹ نہ جائے۔

میں نے اپنا ہر کام ہر شوق ختم کر دیا۔ قلم کاغذ اٹھا کر رکھ دیئے کتابوں پر گرد جمنے لگی۔ میرا مقصدِ حیات اب اس بچے کی دیکھ بھال تھا۔

تین ماہ کی عمر میں ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن ہوا۔ آگرہ کے "سروجنی نائیڈو ہسپتال" میں وہ دو ماہ بھی کس امید و بیم کی حالت میں گزرے۔ کئی بار ایسا لگا کہ آسرے کی ڈور ہاتھوں سے چھوٹ رہی ہے۔ ڈاکٹر اس کو زندگی کا پچاس فی صدی چانس دے رہا تھا اور یہی چانس ہماری ہنسی اور آنسوؤں کے درمیان تھا۔

جب ہم آگرہ سے واپس ہو رہے تھے تو میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "اور اس کی ٹانگوں کا کیا ہو گا ڈاکٹر صاحب؟"

ڈاکٹر سی بی سنگھ نے کہا۔ "مسز سلیم، جب میں نے علی گڑھ میں اس بچے کو دیکھا تو اس وقت آپ نے مجھ سے اس کی زندگی کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اب میں یقین سے آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ اس بچے کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر اس کی ٹانگوں کا میڈیکل سائنس میں کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ خرابی پیدائشی ہے اور ریڑھ کی ہڈی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے پیٹ ہی میں اس کا نچلے کا دھڑ صحیح نہیں بن سکا ہے۔ اس کی ٹانگوں میں بالکل مسل نہیں ہیں اور خون کا دوران بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے اس کی ٹانگوں میں احساس کا مادہ بھی نہیں ہے۔ پیر تو پلاسٹر سے سیدھے ہو سکتے ہیں مگر جہاں تک اس کے چلنے کا سوال ہے ــــــ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا بچہ کبھی چل پھر سکے گا ــــــ"

ہم نوید کو لے کر بہار واپس آ گئے۔ ماں باپ کی محبت کو بالکل بے لوث کہا جاتا ہے۔ ہم سے پوچھیئے۔ ہم خوش تھے کہ خدا نے ہمارے سینے کو اولاد کے داغ سے بچا لیا۔ ہمارا بچہ زندہ ہے مگر کیا اس وقت ہمیں احساس تھا کہ ایک معذور اور اپاہج انسان کی زندگی کیا ہوتی ہے کیا دکھ ہوتے ہیں!

اور نوید تم نے ہمیں کبھی اپنے احساسات کا علم بھی تو نہ ہونے دیا۔

نوید نے اپنی عمر سے پہلے ہی ہوش سنبھالنا شروع کیا اور اپنے گرد و پیش کی دنیا میں جو کچھ دیکھا اس میں گہری دلچسپی لی۔ بولنا شروع کیا تو جو الفاظ بھی سنے فوراً استعمال کئے۔ ریڈیو پر گانے سنے تو خود بھی نقل کرنے لگا۔

نوید کو انسان، جانور، کھلونے ــــــ سبھی کچھ اچھا لگتا ہے۔

اس دوران میں ماں باپ مختلف شہروں میں مشہور ڈاکٹروں کے پاس لے جا کر نوید کی مفلوج ٹانگوں کے بارے میں مشورہ کرتے رہے۔ سب کا ایک ہی جواب تھا کہ قدرت کی اس کاریگری میں بندہ کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ جو نقص جسم کے نچلے حصہ میں آیا وہ اوپر

کی طرف نہیں گیا ورنہ بچہ ہاتھوں سے معذور ہو سکتا تھا، ذہنی طور پر ناکارہ ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دی ہوئی کمی کا ازالہ ذہن و دماغ دے کر پورا کیا تھا۔ نوید کو صبر اور برداشت کی قوت اتنی عطا کر دی کہ وہ مسکراتے ہوئے اپنی محرومی اور لاچاری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہا۔

نوید کے بہن بھائی ایک ایک کر کے تعلیم کے لئے نینی تال کے بورڈنگ اسکولوں میں چلے گئے۔ نوید کے لئے لوگوں نے مشورہ دیا کہ اسے بھی بمبئی کے "ٹاٹا انسٹیٹیوٹ" میں داخل کر دیا جائے جہاں تعلیم کے علاوہ معذور بچوں کو کسی نہ کسی شعبہ میں ہنرمند بنایا جاتا ہے —— ہمیں یہ بات قطعی گوارا نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ابھی نوید کے مستقبل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ ہم اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتے۔

نوید میاں کے لئے گھر پر ماسٹر آنے لگا۔ اسے پڑھائی سے زیادہ کھیلنے میں دلچسپی تھی مگر ماسٹر جو کچھ پڑھاتا وہ کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتا تھا۔

اسی دوران میں نوید سے چھ سال چھوٹی بہن صبیحہ آ گئی۔ ہمیں خوف تھا کہ ہم نے نوید کو گود کا بچہ بنا کر رکھا ہے، اسے ہماری محبت کی تقسیم پر ناگواری نہ ہو جائے مگر نوید صبیحہ کی بہترین آیا اور دوست ثابت ہوئے۔ صبیحہ نے گیارہ ماہ کی عمر میں پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ اسے جوتوں کی ضرورت پڑ گئی مگر ہم صبیحہ کے لئے جوتے کس طرح خریدیں جب نوید آج تک جوتے نہیں پہن سکا —— یہ مسئلہ نوید نے خود ہی حل کیا "کیا یہ بچی یونہی ننگے پیروں گھوما کرے گی؟" صبیحہ کی پہلی سالگرہ پر سرخ جوتے نوید نے اپنی پسند سے خریدے۔

نوید کی خوش مزاجی اور حاضر جوابی نے اسے کبھی زندگی میں دوستوں کا فقدان نہ ہونے دیا۔ اسٹاف کے درجنوں بچے لان میں جمع ہو جاتے۔ فٹ بال کھیلی جاتی۔ آنکھ مچولی ہوتی۔ نوید بیٹھ کر انہیں ہدایتیں دیتا۔ آپس کے تنازعے دور کرتا مگر اس نے ہمارے سامنے کبھی اپنی اس بے بسی اور لاچاری پر کوئی اظہار غم نہیں کیا کہ اس قدر شوق ہوتے ہوئے بھی وہ ان کھیلوں میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا —— ایسا کیوں ہوا؟

وقت گزرتا رہا۔ پہلے تو نوید کو گود میں اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے تھے۔ پھر اس کے لئے "ڈھیل چیئر" خریدی گئی، چھوٹی چھوٹی "بیساکھیاں" مہیا کی گئیں تاکہ وہ اپنی مرضی سے گھوم پھر سکیں۔ پڑھنے لکھنے کا نوید کو خصوصی شوق نہیں تھا اور حساب سے خاصے متنفر تھے مگر ان کے ماسٹر کو اپنے ذہین شاگرد پر بہت فخر تھا۔ بہن بھائی جب نینی تال سے چھٹیوں میں آتے تو نوید ان سے انگریزی بولنا سیکھتے۔ ان کی پرانی کتابیں اپنی الماری میں منتقل کر لیتے۔ چاروں آپس میں لڑتے، مار پیٹ بھی ہوتی۔ فرید سے خصوصی جنگ ہوتی اور خواہ نوید کی غلطی کیوں نہ ہو اگر فرید کی حمایت کرو تو بڑے طنز سے کہتے "ہاں بھائی جان تو آپ کے فیورٹ ہیں نا!" وہ صبیحہ پر زیادہ مہربان تھے کیونکہ اس میں "بھیا" سے مقابلہ کی سکت نہیں تھی۔

فرید نے بہت کمسنی میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔ غالباً تحت الشعور میں وہ نوید کی حالت اور ہمارا مستقبل ڈاکٹروں سے رجوع ہونا محسوس کر رہا تھا، اور وہ اپنے عزم پر قائم بھی رہا۔

ڈھیل چیئر اور بیساکھیوں کی وجہ سے نوید کو جو مستقل ورزش ہوتی تھی اس نے ہاتھوں اور بازوؤں کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ان کے بہن بھائی اور دوست ان کی زد میں آنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کا کسی سے مصافحہ کرنا بھی دست مشکل ہوتا تھا۔ سیر تفریح کے بے حد شائق تھے۔ سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اچھے کپڑے اور اچھا کھانا پسند تھا۔ گھنٹوں ریڈیو پر فٹ بال اور کرکٹ کی کومنٹری سنتے تھے۔ ان کے کمرے کی دیواریں مشہور اسپورٹسمین کی تصویروں سے سجنے لگیں

ایک رات پلنگ میں اُن کے کپڑے بدلتے ہوئے موزے اتارے تو دیکھا کہ ایک ٹخنہ چھلا ہوا ہے۔

بیساکھی سے چلتے ہوئے اس کے پیر گھسٹتے تھے اور موٹے موٹے موزے پہنانے کے باوجود یہ زخم اُسی کا نتیجہ تھا۔ مرہم پٹی شروع ہوئی، دوائیں کھلائیں، انجکشن لگے۔ مگر وہ زخم گہرا ہوتا چلا گیا —— آخر اسے لے کر رکسول، پٹنہ اور دربھنگا کے شہرت یافتہ ڈاکٹروں سے رجوع کرنا شروع کیا۔

"یہ زخم ہڈی تک پہنچ گیا ہے اور خون کے دوران کی کمی کے سبب کسی دوا کا اثر نہیں ہو رہا ہے۔ زخم کی شکل سے لگتا ہے کہ یہ گینگرین میں بدل جائے گا اس لئے آپریشن سے یہ پیر کاٹ دینا ہی بہتر ہوگا!!" ہر طرف سے یہی فیصلہ سنائی دیا۔ ہمارے دل بیٹھے ہوئے تھے مگر نوید کو نہ پیر میں تکلیف کا احساس تھا نہ ذہن پر کوئی گھبراہٹ نظر آتی تھی۔

پٹنہ میں ڈاکٹر "مکھو پادھیا" سب سے قابل سرجن تھے اور ہم نوید کو شروع سے اُن کے پاس لے جاتے رہے تھے اُنھوں نے ہم سے کہا کہ آپ کا بیٹا چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ ایک پاؤں کٹ جانے سے اس کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا مگر جب آپ کو یہ آپریشن کرانا ہی ہے تو کیوں نہ اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے نیچے سے ہٹا دی جائیں تاکہ بعد میں یہ آرٹیفشل ٹانگوں سے چل سکے ——"

ہم لوگ دم بخود تھے مگر نوید بڑی دلچسپی سے ڈاکٹر سے مستقل یہی سوال کر رہے تھے "تو کیا میں آرٹیفشل ٹانگیں پہن کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا؟"

نوید میاں کی اس آمادگی نے ہمیں بھی اس مسئلہ پر غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر "مکھو پادھیا" کا یہ بھی کہنا تھا کہ "یہ آپریشن کہیں بھی ہو سکتا ہے مگر مناسب ہے کہ آپ کسی طرح "پونا" کے ملٹری ہسپتال میں داخلے کی اجازت لے لیں چونکہ "آرٹیفشل لمب سینٹر" وہیں ہے اس لئے وہ ٹانگوں کی تراش اسی مناسبت سے کرتے ہیں کہ بعد میں مصنوعی ٹانگیں استعمال کی جاسکیں۔"

دونوں ٹانگوں کا آپریشن سے علیحدہ کرا دینا! یہ تصور ہمارے لئے انتہائی جان لیوا تھا۔ وہ جیسی بھی ٹانگیں تھیں بہرحال ہمارے بچے کی ٹانگیں تھیں —— نوید خوش تھے اور جو بھی اس معاملہ میں تفکر کا اظہار کرتا اسی سے بحث کرنے لگتے۔ اُن کی نیپالی آیا نے احتجاج میں رونا شروع کیا تو نوید نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا "کیا تم چاہتی ہو کہ میں عمر بھر اسی طرح وہیل چیئر پر گزار دوں؟ ان ٹانگوں سے مجھے کیا فائدہ ہے؟"

میرے والد کی "چیف آف آرمی اسٹاف" سے جان پہچان تھی۔ نوید کو پونا کے ملٹری ہسپتال میں داخلہ مل گیا۔

تبسم اس سال تعلیم سے فارغ ہو گئی تھی۔ وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ پونا گئی۔ اس سفر میں ہم لوگ بہت پریشان اور افسردہ تھے۔ مگر نوید کی خوشی اور تفریح کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اتفاق سے سفر کے دوران بہت سے فلم اسٹار جو کسی فنکشن سے لوٹ رہے تھے اسی ٹرین میں ہم سفر ہو لئے۔ نوید نے بڑی محبت سے جگدیپ اور "ٹن ٹن" کو اپنے کمپارٹمنٹ میں مدعو کر لیا۔ اللہ اُن لوگوں کا بھلا کرے کہ نوید سے تعارف کے بعد انھوں نے اپنی مزاحیہ اداکاری کا وہ نمونہ پیش کیا کہ پھر بمبئی تک سفر، وقت کا احساس کئے بغیر ہی گزر گیا۔

پونا کے ملٹری ہسپتال میں نوید کو فیملی وارڈ میں کمرہ ملا جہاں بڑی رد و کد کے بعد مجھے صبح نو بجے سے شام کو سات بجے تک نوید کے پاس رہنے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر میجر جوشی نے یہ کیس لیا۔

ہسپتال کی پابند زندگی میں نوید کو کسی قسم کا شغل نہ ملا تو اس نے حلق سے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ میرے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ وقتاً فوقتاً کبھی شیر کی طرح دھاڑتا، کتے کی طرح بھونکتا۔ بلی اور بکری کی نقل کرتا اور مرغے کی طرح بانگ دیتا تھا۔

میں نے وہاں کی انچارج "میجر ڈیوس" سے اپنے بیٹے کی اس ہنگامہ آرائی کے لئے معافی مانگی تو انھوں نے بہت ہنس کر کہا کہ میں نے اس لڑکے کی تنہائی کے خیال سے چند بچوں سے کہا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں چلے جایا کریں مگر وہ سب ڈرتے ہیں کہ یہ ہمیں کاٹ کھائے گا!!

آپریشن کی تاریخ مقرر ہوئی۔ طے پایا کہ ایک ہفتے کے توقف سے دونوں ٹانگوں کا باری باری آپریشن ہوگا۔

سلیم، تبسم اور میں ہسپتال سے تقریباً دو میل دور ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپریشن سے قبل کی رات ہم تینوں نے جاگ کر گزاری۔ صبح سویرے ہسپتال پہنچے تو نوید کے کمرے سے اس کے قہقہے سنائی دیئے۔ اسے آپریشن کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔

برآمدے میں کیپٹن سنگھ مل گئیں۔ کہنے لگیں "میں ابھی آفس میں گئی تو دیکھا کہ میجر ڈبوس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مجھ سے بولیں کہ "یہ بچہ اتنا ہنس رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس آپریشن میں اس کی ٹانگیں کاٹی جائیں گی۔" میں نے انھیں یقین دلایا کہ نوید کو اپنا کیس بخوبی معلوم ہے اور میں خود ابھی اس کے کمرے میں گئی تھی تو مجھ سے کہنے لگا "پتہ ہے آپ کو؟ آج میجر جوشی کا برتھ ڈے ہے اور میں اپنی ایک ٹانگ انھیں تحفے میں دینے والا ہوں۔"

آپریشن کے بعد نوید کو "پوسٹ آپریٹو وارڈ" میں لے جایا گیا۔ یہ ۶۵ء کی بات ہے۔ ہسپتال زخمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں انھیں متعدد مریضوں کے ساتھ لٹا دیا گیا۔ جب ہوش آ گیا تو پوچھا کہ "کون سی ٹانگ گئی؟" شام کو حسب معمول ہمیں ہوٹل واپس آنا پڑا۔ اس رات کسی نے کھانا نہیں کھایا، باتیں نہیں کیں، ہم سب کا دل بیٹھ رہا تھا۔

دوسرے دن صبح پھر ہسپتال پہنچے، اس وارڈ میں داخل ہوئے جہاں کل رات نوید کو چھوڑا تھا۔ پلنگ پر نظر پڑی۔ وہ خالی تھا!! کل جس بچے کا آپریشن ہوا تھا، رات وہ جس پلنگ پر نیم بیہوشی کے عالم میں پڑا تھا آج وہ پلنگ خالی ہے —— اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے!!

میری بے اختیاری چیخ پر برابر کے کمرے سے آواز آئی "ارے اماں میں یہاں ہوں" ہم اس آواز کی طرف لپکے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں نوید میاں ایک فوجی افسر کے برابر پلنگ پر لیٹے تھے۔ "وہاں گرمی بہت تھی" نوید نے بتایا۔ "میں نے شور مچایا تو کیپٹن شرما نے مہربانی کرکے مجھے اپنے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بلا لیا"۔ کیپٹن شرما سے یہ بھی پتہ چلا کہ رات نوید نے انھیں مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر نرسیں رات کو بجلی نہ بجھائیں تو کیوں نہ ہم یہاں کے بلب پھوڑ دیں!!

دوسرا آپریشن ہوا تو نوید کا اسٹریچر تھیٹر سے باہر نکالا گیا، ہم دوڑ کر اس پر جھک گئے۔ "بالکل بیہوش ہے" ہم میں سے کسی ایک نے کہا۔ دفعتہً نوید کے حلق سے عجیب طرح کی غیر انسانی آوازیں نکلنے لگیں —— وہ کچھ ایسی آوازیں تھیں کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ "اس کے دماغ پر اثر ہو گیا" میں نے رو کر کہا "خدا کے لئے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ" تبسم چیخی۔

"ابھی بلاتا ہوں" سلیم ایک طرف دوڑے۔

"ہائیں ہائیں آپ سب اس قدر شور مچا رہے ہیں۔ کوئی فوجی کان پکڑ کر آپ کے علاوہ مجھے بھی باہر کر دے گا" نوید میاں آنکھیں کھولے مسکرا رہے تھے۔

"تم ہوش میں ہو؟ تو پھر ابھی ابھی تم اس طرح ...."

"وہ تو میں آپ لوگوں کا دل بہلا رہا تھا۔ مجھے وہیں ٹیبل پر ہوش آ گیا تھا۔"

نوید کی ٹانگوں کے زخم دو ماہ میں بھرے۔ اس دوران میں اُسے ڈھیروں دوائیں کھلا دی گئیں۔ روزانہ انجکشن لگتے تھے۔ خون کا دوران کم ہونے کی وجہ سے زخم بھرنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ہم سب انتہائی پریشان تھے۔ نوید حسب معمول ہر ایک سے دوستی اور مذاق کرنے میں مصروف تھے۔

دو ماہ بعد نوید کو ہسپتال سے "آرٹیفشل لمب سینٹر" میں منتقل کیا گیا جہاں اس کے ساتھ مجھے اور تبسم کو رہنے کی اجازت مل گئی۔ سلیم

اپنی ملازمت پر بہار واپس چلے گئے۔

یہ دور نوید کی زندگی کا انتہائی تفریح کا دور تھا۔ صبح کچھ دیر کے لئے انھیں مصنوعی ٹانگوں کے استعمال کے بارے میں ہدایات ملتیں، ناپ لئے جاتے اور باقی دن وہ اور مریضوں یا فوجی سپاہیوں کی سنگت میں گزارتے۔ انھیں ایک وھیل چیئر مل گئی تھی جس پر ہوا کی رفتار سے چلتے تھے۔ وہاں ایک سینما ہال تھا جس میں صرف فوجی نوجوانوں کو فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور جب ہال میں اندھیرا ہو جاتا تو اُن کے فوجی دوست چپکے سے اُن کی وھیل چیئر اندر لے جاتے تھے۔ انھیں ملٹری کینٹین میں کھانے پینے کی چھوٹ بھی مل گئی تھی۔

نوید نے اپنی بارھویں سالگرہ وہیں لمب سینٹر میں منائی۔ وہ زندگی کی یادگار سالگرہ تھی جس میں وہاں کے معمولی "جوان" سے لے کر برگیڈیر تک نے حصہ لیا۔ نوید کے لئے مخصوص اسٹیج بنائی گئی اور اسے پھولوں اور تحفوں سے لاد دیا گیا۔ ملٹری والوں کے اخلاق اور محبت نے ہم سب کو گرویدہ کر لیا تھا اور نوید تو اس قدر خوش تھا کہ اکثر تبسم جل کر کہتی "تمہیں اپنی تفریح سے فرصت نہیں ملتی اور ہم دونوں یہاں قید کی زندگی گزار رہے ہیں!"

جب نوید نے مصنوعی ٹانگوں پر پریکٹس شروع کی تو ہر قدم پر اُن کے احباب تالیاں بجاتے، شاباشی دیتے۔ کولہوں کی ہڈیاں بھی غلط بنی ہوئی تھیں اس لئے نوید کو بعد میں بھی سیدھا کھڑا ہونے کے لئے بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑا۔ چھ ماہ کے بعد ہمیں "پونا" سے واپسی کی اجازت ملی۔ سلیم اور انیس ہمیں لینے آئے اور نوید نے اپنی نئی ٹانگیں پہن کر اسٹیشن پر اپنے باپ اور بہن کا استقبال کیا۔ واپسی میں ہم چند روز بمبئی رکے اور نوید نے وہاں کی ہر مشہور جگہ کو دیکھا —— اپنی فیورٹ فلم اسٹار "مینا کماری" سے اس کے گھر جا کر ملاقات کی۔ علی گڑھ پہنچے تو اسٹیشن پر پُر شاندار استقبال ہوا۔ خاندان کا ہر فرد انھیں لینے آیا اور جب وہ ٹرین سے اُتر کر پھولوں سے لدا ہوا اسٹیشن پر اپنی ٹانگوں سے چلا تو جس خوشی کے اظہار کی پچھلے بارہ سال میں کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی وہ یکایک پھوٹ پڑی اور "جنم لیا ہے علی" کا گیت فضا میں گونج گیا۔

"بارہ چکیہ" (بہار) میں وہ شگر فیکٹری تھی جہاں سلیم صاحب نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا اور اب یہاں جنرل منیجر تھے۔ واپس پہنچ کر نوید نے اپنی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی اور پرائیویٹ کی حیثیت سے مڈل کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ باقی مضمون تو ماسٹر پڑھاتا تھا مگر انگلش، انھوں نے خود ہی لکھنی پڑھنی، بولنا تو بہن بھائیوں کے ساتھ بخوبی سیکھ لیا تھا۔ اب اخبار رسالے بھی ہاتھ میں رہنے لگے۔ اس کے بعد ناولوں کا دور شروع ہوا۔

تبسم اسے پابندی سے نماز پڑھواتی تھی اور اس کی مستقل شرارتوں پر کہتی تھی کہ "یہ غنڈہ" بن رہا ہے۔ جب تبسم کی رفعت سعید سے شادی ہوئی تو فرید اور نوید نے رخصت کے وقت باقاعدہ تالیاں بجائیں کہ خدا کا شکر ہے ہمارے گھر سے "آپا" کی جابرانہ حکومت کا دور ختم ہو گیا!

نوید اپنے دوستوں کے ساتھ مصنوعی ٹانگیں پہن کر دور دور تک گھومنے جاتے اور بہت خوش رہتے تھے مگر کچھ دن سے ایک پریشانی یہ شروع ہوئی کہ دو چار ماہ بعد اس کے اُلٹے گردے میں درد ہوتا اور بخار آ جاتا۔ ہر بار پیشاب میں انفکشن نکلتا۔ پھر دوائیں دی جاتیں اور وہ ٹھیک ہو جاتا۔

۷۶ء میں سلیم صاحب ملازمت ترک کر کے علی گڑھ لوٹے۔ اس دوران میں فرید نینی تال سے سینئر کیمبرج کر کے آ چکا تھا اور علی گڑھ کے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ انیس نے گریجوٹ کر لیا تھا اور صبیحہ کو گرلس اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ اب ہمارے سامنے سوال تھا کہ نوید آئندہ کیا کرے گا۔ وہ زندگی کو جس طرح "بازیچۂ اطفال" سمجھتا تھا۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ سنجیدگی

سے کوئی بزنس کر سکے گا کسی دوکان پر پابندی سے بیٹھنا بھی اس کے بس کا روگ نہیں تھا ـــ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم لوگ چھتاری جا کر اپنے آبائی قلعہ میں رہیں اور باغات اور فارم کی دیکھ بھال کریں۔ شاید نوید اچھا کاشتکار بن جائے۔

ہم لوگ چھتاری آکر رہنے لگے۔ فرید شروع سے بڑا اچھا آرٹسٹ ہے اس نے نوید کو ڈرائنگ اور پینٹنگ میں لگانا چاہا۔ بہت سے آرٹ پیپر اور پینٹ لائے گئے، پنسلیں تراشی گئیں، فرید میاں اسے گھنٹوں پکڑ بیٹھتے اور سمجھاتے رہتے۔ کئی مہینے یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر فرید نے ہار مان لی۔ "اماں اس کے یہ ضخیم ہاتھوں میں سارا برش ہی غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی انگلیاں بہت موٹی ہیں اسے لوہار بنا دیجیے یہ مصور نہیں بن سکتا۔"

پھر نوید نے خود ہی افسانہ نگاری شروع کی۔ کئی کہانیاں لکھیں مگر جب ہمیں پڑھ کر سنائیں تو "ہیرو" اور "ولن" اس طرح خلط ملط ہو جاتے تھے کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ نوید نے سب کہانیاں پھاڑ پھینکیں۔ وہ اب تنہائی سے گھبرا رہا تھا۔ ٹیلی وژن خرید لیا مگر اس سے کتنا وقت گزرتا ہے۔

اُدھر بار بار گردے میں درد اور بخار کا سلسلہ جاری تھا۔ چھتاری سے علی گڑھ ۲۸ کلومیٹر ہے اسے بخار ہونے لگتا تو ہم اسے میڈیکل کالج لے جاتے۔ وہاں نوید کو فوراً داخل کر لیا جاتا، خون اور پیشاب کا کلچر ہوتا۔ دوائیں ملتیں اور انجکشن لگتے۔ ہفتہ عشرہ وہ ٹھیک ہو کر چھتاری آجاتا، اور دو ایک مہینے کو سکون ہو جاتا۔

ایسے ہی میڈیکل کالج کے ایک قیام میں نوید کی ملاقات صادق سے ہوئی۔ صادق دبلا پتلا نوجوان تھا۔ نوید سے عمر میں چند سال بڑا تھا۔ اور کسی علاج کے سلسلے میں جنرل وارڈ میں داخل تھا۔ ایک دن نوید حسب عادت سارے میڈیکل کالج میں گھوم کر کمرے میں آئے تو میں نے دیکھا کہ صادق اس کی "وہیل چیئر" دھکیل رہا ہے اور اس کا سانس بُری طرح پھول رہا تھا۔

"نوید یہ کون لڑکا ہے؟ کیا اسے دمہ کی شکایت ہے؟"

"یہ صادق بن ازہر ہے، پتہ نہیں کیا بیماری ہے مگر کہتا ہے کہ وہ چھ سات مہینے سے یہاں داخل ہے۔ باتیں بہت مزیدار کرتا ہے۔"

نوید اور صادق کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ جب ہم چھتاری لوٹے تو صادق نے وعدہ کیا کہ وہ نوید سے ملنے ہمارے گھر آئے گا۔ وہ اگلے ہفتہ ہی چھتاری پہنچ گیا۔

صادق اکثر چھتاری آنے لگا۔ بقول اس کے اتوار کے دن ڈاکٹروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان ہوتا ہے۔ وہ اس قدر مسخرا تھا اور اتنے لطیفے یاد تھے کہ نوید ہی نہیں ہم بھی اس کے گرویدہ ہو گئے۔ یہ اب تک پتہ نہیں تھا کہ اسے مرض کیا ہے۔ صادق کو شکار کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک بار سلیم کی بندوق لے کر تیتر کی تلاش میں نکل گیا اور جب لوٹا تو قلعہ کی سیڑھیوں پر چڑھنا مشکل ہو گیا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اور چہرہ درد کی شدت سے زرد تھا۔

بہت دیر بعد نوید کے مستقل اصرار پر اس نے کہا "نوید تم میری بیماری کیوں جاننا چاہتے ہو؟ تمہارے اپنے دکھ کیا کم ہیں اور پھر تم میری کوئی مدد بھی تو نہیں کر سکتے!! مگر تم بہت باہمت انسان ہو۔ اس لئے میں تمہیں بتا دوں گا۔ سنو!! مجھے کینسر ہے، پھیپھڑوں کا کینسر! پچھلے ایک سال سے ڈاکٹر مجھے طرح طرح کی دوائیں دے کر اسے آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میری زندگی کے اب گنے چنے دن رہ گئے ہیں اور میں انہیں رو کر نہیں ہنس کر گزارنا چاہتا ہوں۔"

صادق کی شرارتوں کا یہ عالم تھا کہ میڈیکل کالج میں اس کے وارڈ کے مریض بھی اس سے عاجز رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ربر کا بے حد خوفناک شکل کا سانپ لے کر چھتاری پہنچ گیا۔ پہلے گھر والوں اور ملازمین کو ڈرایا گیا۔ اس کے بعد قلعہ کی فصیل کے نیچے راہ چلتوں پر پھینکا گیا۔

دن. بھر تخت او دھم رہا اور نوید اور صاد ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے۔ ایک مرتبہ فرید علی گڑھ سے صاد کا پیغام لایا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور ڈاکٹر آپریشن کر کے پھیپھڑا نکالنے والے ہیں ـــــ نوید نے فرید سے خواہش کی کہ جب صاد کا آپریشن ہو تو آپ ضرور موجود رہیں اور ہمیں اس کی مکمل خیریت بتا دیں۔

اگلے سنیچر فرید گھر آیا تو اس نے بتایا کہ وہ آپریشن کے دوران تھیٹر میں تھا۔ ڈاکٹر نسیم انصاری نے صاد کا پھیپھڑا کھولا ضرور تھا مگر اسی طرح بند کر دیا ـــــ میں نے خود دیکھا ہے اب وہاں پھیپھڑے کی جگہ محض کینسر رہ گیا ہے اور یہ زہر باقی جسم کے حصوں میں بھی پھیل رہا ہے۔ اب وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا۔

نوید بہت دیر تک گم سم رہے۔ پھر انھوں نے خواہش کی کہ "میں ایک مرتبہ صاد سے ملنا چاہتا ہوں" ہم انھیں میڈیکل کالج لے گئے۔ صاد کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ اس نے نوید کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رک رک کر کہا "نوید بھائی! میں مرنا نہیں چاہتا مگر یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اب تو دعا کا وقت بھی نہیں رہا۔"

تین چار دن بعد ہی علی گڑھ سے صاد کے انتقال کی خبر آ گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار نوید کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔

نوید کا گردے کا درد اور بخار کا سلسلہ گاہے بگاہے چل رہا تھا مگر درد اور بخار کی حالت میں بھی وہ خاموش لیٹنے کا قائل نہ تھا۔

ایک دن اسے خیال آیا "اس دن ابو کہہ رہے تھے کہ انھوں نے سترہ سال کی عمر میں سگرٹ پینا شروع کر دیا تھا اور میں اب انیس سال کا ہو گیا ہوں" ـــــ اور ہفتہ عشرہ بعد ہی اس کی جیب میں سگرٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ پہنچ گئی۔

سلیم کے ماموں زاد بھائی کا بیٹا کوکب حمید" یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور انیس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ اسے ہر ہفتہ چھتاری آنے کے لیے نوید سے بہتر حیلہ کیا مل سکتا تھا اور اتفاق سے زندگی کو مذاق بنانے میں دونوں کا نظریہ بھی ایک تھا لہٰذا جلد ہی گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں سیر و تفریح کے شائق تھے۔ کوکب کو اردو شاعری سے لگاؤ تھا۔ نوید بھی بات بات پر شعر پڑھنے لگے۔

کوکب سے نوید نے ایک اور سبق بھی سیکھا اور وہ یہ تھا کہ جب انسان کسی چیز کو خود محسوس کرنا چاہے تبھی اس کا احساس ہوتا ہے مثلاً گرمیوں میں بجلی اڑ جائے تو گرمی کو محسوس کرنا بالکل اختیاری ہے" اسی طرح بخار کی تکلیف، گردے کا درد، سر کا درد، سب اس زمرے میں آتے تھے اور نوید کا تکیہ کلام بن گیا کہ "یہ سب احساس کی بات ہے۔" بھوک لگنے اور پیاس لگنے پر بھی یہی قید عائد تھی۔

کوکب اور انیس کی شادی کے بعد نوید اکثر اُن کے ہاں میرٹھ چلا جاتا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ کار میں ہر جگہ سیر تفریح کرانے لے جاتے۔ نینی تال، مسوری اور شملہ، ہر وہ جگہ جو نوید دیکھنا چاہتا تھا وہاں پہنچ جاتا تھا مگر وہ درد اور بخار کا سلسلہ جوں کا توں قائم تھا۔

فرید نے ڈاکٹری پاس کر لی تھی اور اب ہاؤس جوب کر رہا تھا۔ یکایک اس نے طے کیا کہ اب وہ چھتاری میں پریکٹس کرے گا اور نوید اس کی مدد کرے گا۔ نوید اس خیال سے بہت خوش ہوا۔ قلعہ سے متصل کوٹھی کا ایک کمرہ کلینک کے لئے تیار کیا گیا اور ایک دن ڈاکٹر فرید بہت سی دوائیں اور ساز و سامان لے کر چھتاری پہنچ گئے۔ دروازے پر پہلے ہی بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ یہاں اس سے قبل کوئی ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر نہیں تھا۔ صبح سے مریضوں کی بھیڑ لگ گئی اور فرید کے ساتھ نوید بھی کمر کس کے علاج معالجہ کرنے میں مصروف ہو گئے، نوید کے ذمہ مریض کی کیس ہسٹری لکھنا، دوائیں دینا اور فیس وصول کرنا بھی تھا۔

رات کو فرید دیر تک نوید کو مرض کی علامت، اس سے متعلق دوائیں اور انجکشن لگانے کے گُر سمجھاتا اور نوید بڑے انہماک سے اپنا سبق یاد کرتا۔

محض ایک پریشانی سامنے آ رہی تھی کہ نوید مریض کو دوائیں دیتے وقت جلدی میں ڈاکٹر کی فیس تو ایک طرف، دوا کی پوری قیمت

بھی نہیں لیتے تھے۔ اس طرح بجٹ تو بگڑ رہا تھا مگر شہرت اور دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

یہ دور ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ نہیں چل سکا۔ فرید کے نام میڈیکل کالج سے آفیشل خط آیا کہ وہ "ہاؤس جوب" میں لکھے ہوئے معاہدے کے تحت کام کر رہے تھے اور اس طرح بغیر اطلاع غائب ہو جانے کی وجہ بتائیں اور فوراً واپس آ کر اپنی ڈیوٹی سنبھالیں!

فرید با دل ناخواستہ واپس چلا گیا اور نوید کافی دن کو بجھ سا گیا۔ ادھر بہت دن سے ایک اور پریشانی بھی لاحق ہو گئی بار بار بخار آنے کی وجہ سے نوید نے اپنی مصنوعی ٹانگوں کا استعمال بہت کم کر دیا تھا اور زیادہ تر وہیل چیئر چلاتا تھا۔ مستقل رگڑ لگنے سے موٹے موٹے ربر کے کشن کے باوجود اس کے ایک کولھے پر زخم ہو گیا تھا۔ جو کسی طرح بھرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

اب میری نرس کی ٹریننگ شروع ہوئی "ڈاوکلو" خرید ا گیا اور میں نے باقاعدہ سلوشن بنانا، انجکشن لگانا اور مرہم پٹی کرنا سیکھا۔ ہم کوشاں تھے کہ نوید کو زیادہ تر لٹا کر رکھا جائے تاکہ اس کے زخم پر زور نہ پڑے۔ ہم نے کہیں آنا جانا چھوڑ دیا۔ خاندانی تقریبوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ دعوت ناموں کے جواب میں معذرت کر دیتے تھے۔ قلعے میں اونچی اونچی چوکھٹیں اور متعدد سیڑھیاں تھیں۔ ہم نے چھتاری میں نوید کے لئے علیحدہ گھر بنایا جو ہر طرح اس کی ضرورت اور آسانی کے حساب سے تھا۔ چھت پر جانے کے لئے سلوپ بنایا تاکہ ہمارے بعد اسے تنہا رہنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

پتہ نہیں کب میرے بال سفید ہوئے اور کب چہرے پر جھریاں پڑیں۔ میں تو تمہیں جوان ہوتا دیکھنے میں محو تھی بیٹا ——

فرید کی شادی ہو گئی۔ اس نے ایم۔ ڈی پاس کیا اور میڈیکل کالج میں لکچرار ہو گیا۔ وہ نوید کی طرف سے بہت متفکر تھا کہ جو دوائیں ایک بار اس کے انفکشن پر فوری اثر کرتی ہیں، دوسری مرتبہ دیر میں اثر ہوتا ہے اور تیسری مرتبہ "یورین کلچر" میں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ اس طرح دواؤں کی فہرست بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ٹوٹا ئی ایکسرے سے پتہ چلتا تھا کہ بائیں گردے کا سائز بڑھنے لگا ہے۔ فرید نے طے کیا کہ ہم نوید کو چنڈی گڑھ لے جائیں جہاں گردوں کے امراض کے ماہر ہیں۔

ہم چنڈی گڑھ گئے۔ وہاں "کڈنی ٹرانسپلانٹ" بھی ہوتا ہے۔

"میں نے سنا ہے کہ ماں کا گردہ اولاد کا جسم جلدی قبول کر لیتا ہے"۔

"ہاں یہ صحیح ہے مگر آپ کے بیٹے کے گردہ کی خرابی کا سبب اس کا بلیڈر ہے جس میں پیدائشی نقص ہے، اور کبھی خالی نہیں ہوتا اور اسی کا انفکشن اوپر گردوں میں جاتا ہے۔ ہم نیا گردہ لگا دیں تو وہ بھی اسی طرح خراب ہو جائے گا"۔

مجھے سکھا گیا کہ کیتھڈر سے دن میں اس کا مثانہ کئی بار کس طرح خالی کیا جائے۔ ہم اور بہت سی دوائیں لے کر واپس آ گئے۔

ہم نے فرید سے کہا کہ آج کل عرب ممالک ڈاکٹرز کو مدعو کر رہے ہیں، تم کیوں نہیں جاتے؟

"میں نوید کو اس حالت میں آپ لوگوں کے پاس چھوڑ کر نہیں جا سکتا"۔

"مگر تم یہاں رہ کر اس کے لئے نئی دوائیں کہاں سے مہیا کرو گے؟ اگر اسے علاج کے لئے باہر لے جانا پڑا تو ڈالر کا انتظام کس طرح ہو گا"۔ فرید کو فوراً ریاض میں ملازمت مل گئی اور وہ چلا گیا۔

نوید کا زخم کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اب فرید جا چکا تھا، ہمیں پھر سے میڈیکل کالج کے ڈاکٹروں سے رجوع کرنا پڑا۔ طے ہوا کہ آپریشن کر کے زخم کو صاف کیا جائے اور سی دیا جائے۔ وہی خون کے دوران کی کمی یہاں بھی زخم بھرنے میں مانع ہو رہی تھی۔

آپریشن کے لیے خون کی ضرورت پڑی اور نوید کے دوست احباب تو آمادہ تھے ہی یونیورسٹی کے اُن طلبا نے بھی ہمارے پاس آ کر اپنا خون دینے کی خواہش کی، جنھیں نوید نے کبھی پہلے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس طرح نوید کا حلقۂ احباب بڑھتا گیا ـــــ ہمارے گھر میں ہمارے نام کی ڈاک بہت کم اور نوید کی ڈاک بہت زیادہ آتی تھی۔ وہ جب بھی میرٹھ سے آتا تھا نئے دوستوں کے پتے ساتھ لاتا تھا۔ میں نے کئی بار اس کے نام آئے ہوئے خطوط پڑھے ہیں، اس کے دوست اپنے مسائل کا اس سے حل پوچھتے تھے۔ اپنی پریشانیاں بیان کرتے تھے۔ وہ یقینی انھیں حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنے کی رائے دیتا ہوگا۔

اس تمام علالت کے باوجود نوید کے مذاق اور شرارت میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو اپنے بھانجے اور بھانجیوں کو جمع کر کے وصیت کرنا شروع کرتا۔ کسی بچے کو اپنا ٹیپ ریکارڈر اور کسی کو ریڈیو بخشتا۔ کسی کے نام اپنا "ٹی۔ وی" کر دیتا اور اسی دوران میں کوئی نہ کوئی بچہ سوال کر بیٹھتا کہ "ماموں میرے لیے کچھ نہ چھوڑو گے؟"

نوید کے کولہوں کے زخم کا دوبارہ آپریشن ہوا۔ ہر بار کئی کئی بوتل خون کی ضرورت پڑی مگر ہر بار زخم کے ٹانکے کھل گئے اور مواد آتا رہا۔ یہ زخم بڑھتے بڑھتے کولھے کی ہڈی تک پہنچ گیا۔ اب محض اس کی صفائی کرنا اور پٹی لگانا میرا کام تھا۔ نوید کو پلنگ سے اُٹھنے کی اجازت نہیں تھی مگر اُن کے دوستوں کو اُن کے پلنگ سے کون اٹھا سکتا تھا۔

ریاض سے نئی دوائیں آ رہی تھیں اور گردے کا درد بھی پہلے سے بہت بہتر تھا۔ ہسپتال کی نرسیں بھی اُن کے حلقۂ احباب میں شامل تھیں۔ ہم کئی ماہ بعد ہسپتال سے لوٹے۔

فرید نے ریاض سے لکھا کہ حج کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ میں ویزہ بھیج رہا ہوں۔ آپ لوگ ریاض آ جائیں۔ میں آپ دونوں کو حج کرانا چاہتا ہوں۔ نوید نے سنا تو کہا "کیا مطلب؟ کیا مجھ پر حج فرض نہیں ہے؟" مگر خود ہی کچھ سوچ کر طے کر لیا "ہاں آپ حج کر آئیے۔ میں بی بی (انیس) کے پاس رہ لوں گا ـــــ"۔ نوید کو چھوڑ کر جانا ہمارے لیے بہت دشوار فیصلہ تھا مگر حج کی خواہش بھی اسی قدر شدید تھی اور ہم چاہتے تھے کہ وہاں جا کر ہی اللہ سے نوید کے لیے صحت کی بھیک مانگیں۔ ہم نوید کی دوا اور علاج کا مکمل چارج انیس کو دے کر ریاض چلے گئے۔ حج کے بعد مجھے ریاض میں ایک ایک پل بھاری ہو رہا تھا۔ نوید کے برابر خط آ رہے تھے "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں اور واپسی میں میرے لیے بہت سے عمدہ قسم کے شیونگ لوشن اور قمیصیں لائیں"۔ نوید کو رنگوں سے، خوشبو سے اور روشنی سے بہت لگاؤ تھا۔ ہم دو ماہ بعد ریاض سے واپس ہوئے تو گھر کے بہت سے افراد استقبال کے لیے دہلی میں موجود تھے۔ کسٹم سے نکلے تو انیس نے کہا کہ پہلے آپ نوید سے مل لیں وہ باہر بیٹھا ہوا ہے۔ میں دوڑ کر گئی تو وہ ایک بنچ پر پھولوں کے ہار لیے بیٹھا تھا۔ میں نے جھک کر اس کے ماتھے کو پیار کیا تو محسوس ہوا کہ وہ تیز بخار میں تپ رہا ہے۔ انیس کہنے لگی کہ "اسے صبح ایک سو تین بخار تھا مگر یہ کسی طرح رُکنے پر تیار نہیں تھا۔ کہہ رہا تھا کہ امی ابو حج کر کے آ رہے ہیں۔ اگر میں لینے نہیں گیا تو انھیں افسوس ہوگا"۔ نوید اس دو ماہ کے عرصے میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اسے مستقل بخار رہتا تھا۔ اس بار جو ڈائی ایکسرے ہوا تو پتہ چلا کہ اس کا بایاں گردہ بالکل ناکارہ ہو چکا ہے اور اب کوئی دوا بھی انفکشن کے لیے کارگر نہیں ہو رہی ہے۔

ایک نئی دوا آئی جس کا ہر چار گھنٹے کے بعد دس سی سی کا انجکشن لگتا تھا۔ بازو اور کولھے سوج کر پتھر ہو گئے، مگر اس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ میں اب رات کو اُسے کمرہ میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی مگر سوتے وقت جب اپنے لیے کیمپ بیڈ لے کر اس کے کمرہ میں آتی تو وہ شور مچاتا تھا "ارے اماں کیوں میرے سر پر چڑھی جاتی ہو۔ ساری رات بھر نہ خود سوؤ گی نہ مجھے سونے دو گی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ میں رات میں جب بھی سر اٹھا کر دیکھتی تو اسے آنکھیں کھولے چھت کو تکتا پاتی اور مجھے جاگتا دیکھ کر وہ جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا۔

اس کی غذا بہت کم ہو گئی تھی، وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ نئے انجکشن کے بعد چند ہفتے اس کا بخار رک گیا۔

مارچ میں کوکب "ایم ایل اے" کے الیکشن میں کامیاب ہوئے اور انہی دنوں نوید نے بائیں گردے میں درد کے بجائے مستقل بھاری پن کی شکایت کی اور پھر اُس کے جسم پر ورم آنا شروع ہوگیا۔ سلیم نے مجھ سے کہا کہ میرے خیال میں اس کامیابی پر کوکب کی دعوت کرنی چاہئے۔ میں نوید کی حالت دیکھتے ہوئے کسی ہنگامہ آرائی کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھی مگر نوید خفا ہوگیا "میری بیماری کوئی عذر نہیں ہے، میں تو ہمیشہ ہی بیمار رہتا ہوں تو کیا اس سے دنیا کے سارے کام رک جائیں گے، کوکب بھائی کی دعوت ابھی ہوگی ورنہ بعد میں اس کا کیا لطف رہ جائے گا"

نوید نے دعوت کے انتظام میں دل کھول کے حصہ لیا اور جب مہمان رخصت ہو رہے تھے تو وہ اپنی وہیل چیئر میں گیٹ پر آگیا، کسی پتھر سے ٹکرا کر پہیوں کا توازن بگڑا، اور وہ نیچے گر گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اسے اُٹھا کر واپس بٹھانا پڑا ورنہ وہیل چیئر سے گر کر اٹھنا تو اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔

اپریل کے آخر میں ہم نے اسے میڈیکل کالج میں داخل کر دیا۔ بخار پھر سے ہونے لگا تھا اور "اینیمیا" بڑھ رہا تھا۔ صرف چہرے پر کوئی ورم نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید تازہ خون پہنچانے سے اس کی طبیعت سنبھلے۔ اس بار بھی دوستوں اور رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے اپنا خون دینے پر آمادگی نہ ظاہر کی ہو۔ ہر تیسرے دن خون کی ایک بوتل دی گئی۔

نوید اب ہسپتال میں رہنا نہیں چاہتا تھا، اور نہ ڈاکٹر رکھنے پر مصر تھے۔ گھر پر اس کی تیمارداری سے وہ مطمئن تھے اور خود کچھ اور کرنے سے قاصر تھے۔ مجھ سے صرف یہی کہا کہ اگر آپ کو اس سے کوئی قلبی سکون ملے تو یقین کیجئے آپ نے یا ہم نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑی ـــــ نوید کو اب چھتاری لانے کا سوال نہیں تھا۔ ہم اسے راحت منزل پر ابن بھائی کے یہاں لے گئے۔ صبیحہ کی شادی ہو چکی تھی۔ تبسم اور صبیحہ دونوں اپنے شوہروں کے ساتھ کلکتہ میں تھیں۔ انھیں نوید کی حالت سے مطلع کیا گیا اور فرید کو ٹیلیفون کیا کہ اب اگر اور کوئی دوا باقی ہو تو لے آؤ۔

فرید نے کہا کہ میں اسی ماہ کے اختتام تک بہت سی دوائیں منگا کر لا رہا ہوں۔ تبسم اور صبیحہ تیسرے دن ہی پہنچ گئیں۔ نوید نے انھیں آتا دیکھ کر قہقہہ لگایا "کیوں، بڑی بی دیکھا کیسے پکڑ کر بلا لیا" تبسم کو وہ ہمیشہ "بڑی بی" کہتا تھا۔ انیس میرٹھ سے آ چکی تھی۔ اب محض فرید کا انتظار تھا جو بہت سی دوائیں لا رہا تھا۔

ایک دن نوید نے باآواز بلند خود سے کہا "میں نے اپنے دماغی کیلنڈر پر ایک دن اور کاٹ دیا، اب بھائی جان کے آنے میں اٹھارہ دن باقی ہیں" نوید کی کمزوری ہر روز بڑھ رہی تھی۔ وہ غسل کا بہت پابند تھا اور اسپنج باتھ کا قائل نہیں تھا۔ اب ہم اسے وہیل چیئر پر غسل خانے لے جاتے اور اسی کرسی پر نہلا کر واپس پلنگ پر لٹا دیتے۔

۲۱؍جون کو عید تھی۔ نوید کے لئے ایک دن پہلے بہت شوخ رنگ کی قمیص خریدی جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور نہا کر پہنی۔ چھتاری سے اس کا دوست طارق عید ملنے آگیا، دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جاتے وقت طارق نے کہا "اچھا بھائی اب چھتاری میں ملاقات ہوگی۔"

نوید نے آہستہ سے جواب دیا "نہیں طارق اب چھتاری میں ملاقات نہیں ہوگی۔"

نوید کا اپنے چھوٹے ماموں "انور" سے ہمیشہ ہنسی مذاق چلتا تھا۔ اس دن انور نے کوئی مذاق کیا جس پر نوید کے چہرے پر ناگواری کا اظہار ہوا اور میں حیران ہوگئی۔ رات کو میں نے اس سے کہا کہ بیٹے آج آپ نے انور کو پریشان کر دیا۔ مذاق پر خفا ہو جانا تو آپ کی عادت نہیں ہے۔ کہنے لگا کہ ہاں مجھے اس کا افسوس ہے۔ آپ کو معلوم ہے کیا وجہ ہے۔ باہر سے ملنے کے بعد میں نے طے کر لیا تھا کہ میں بھی اس کی طرح ہنستے ہنستے زندگی گزاروں گا اور کبھی کسی کو موقع نہیں دوں گا کہ میری حالت پر ترس کھائے، مگر کیا کروں کبھی کبھی تھک جاتا ہوں، آپ میری طرف سے انور ماموں سے معافی مانگ لیں۔

دوسرے دن تبسم نے مجھ سے پوچھا "اماں کیا نوید نے آپ سے اپنے کسی خواب کا ذکر کیا ہے؟ وہ نیند میں سے کچھ کہہ رہا تھا میں سمجھی نہیں ———"

میں اُٹھ کر نوید کے پاس گئی "سنا ہے آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے.....؟"

"ہاں" اس نے بڑے اطمینان سے کہا "بڑا اچھا خواب ہے"

"مجھے بتاؤ میں سننا چاہتی ہوں"

"میں دیکھتا ہوں کہ میں بہت سخت بیمار ہوں اور پلنگ میں اسی طرح لیٹا ہوں جیسا کہ ہمیشہ لیٹا رہتا ہوں اور میری پائنتی کی طرف سے ایک بزرگ میری طرف آ رہے ہیں۔ انھوں نے لمبے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور ان کا چہرہ بہت نورانی ہے۔ میرے پلنگ کے قریب آ کر وہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہیں اور میں بھی اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ اُن کا ہاتھ تھام لوں مگر اُسی وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے....."

میرے دل کو دفعتہً بڑا دھکا سا لگا "یہ خواب کب دیکھا تھا آپ نے؟"

"روز دیکھتا ہوں، دن کو بھی اور رات کو بھی، جب بھی نیند آ جائے یہی خواب نظر آنے لگتا ہے مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی شور مچا کر مجھے جگا دیتا ہے اور خواب یہیں ختم ہو جاتا ہے مجھے کوئی آرام سے سونے بھی نہیں دیتا۔ میں اُن ہاتھوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہاتھ ٹھنڈے ہیں یا گرم ہیں......"

"آپ کو اس خواب سے کوئی وحشت تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اس خواب کو پورا دیکھنا چاہتا ہوں"

پروردگار! مایوسی کے اُن تین دنوں میں میری زندگی کے تیس سال سمٹ گئے اور میں آج بھی اسی موڑ پر کھڑی ہوں ———

نوید کی غذا کم ہوتی گئی اور کمزوری بڑھتی رہی۔ ۲۴ر جون کو خون کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ "بلڈ یوریا" بہت بڑھ گیا ہے۔

وہ اب بھی حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ سارے گھر والے برابر کے کمرے میں موجود تھے اور اس کی تازہ بلڈ رپورٹ پر تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ نوید نے مجھے آواز دی "اماں کیا کوئی خاص چیز بہت سستی بک رہی ہے؟"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں"

"اس کمرہ میں بہت لوگ بھرے ہیں۔ میں نے سوچا شاید کوئی عمدہ مال ہو"

"نوید تم بہت پاجی ہو۔ یہ سب تمہاری مزاج پرسی کو آئے ہیں"

۲۵ر جون کی بلڈ رپورٹ اور بھی خراب تھی۔ نوید کے بازو میں کئی دن سے ڈرپ لگا ہوا تھا اور اسی کے ذریعے انجکشن پہنچائے جا رہے تھے۔ شام تک اس کی بڑھتی ہوئی کمزوری کو دیکھ کر طے کیا گیا کہ میڈیکل کالج کا کوئی ڈاکٹر رات کو گھر پر رہے اور سرِ شام ایک نوجوان ڈاکٹر آ گیا۔

نوید کو گرمیوں میں شام کے وقت کمرہ میں رہنا پسند نہیں تھا اسی لئے سرِ شام ہم اس کا پلنگ آنگن میں لے آتے اور رات کو باہر ہی سوتے تھے۔ نوید نے ڈاکٹر کو اپنے پلنگ کے پاس کرسی پر بٹھا لیا اور اسے اپنی کیس ہسٹری سنانی شروع کی۔ وہ انگلش میں بات کر رہا تھا اور سارے وہ میڈیکل ٹرم استعمال کر رہا تھا جو عام طور پر محض ڈاکٹروں کو آتے ہیں۔ وہ بڑی دیر تک ڈاکٹر سے باتیں کرتا رہا۔ آخر میں ڈاکٹر نے پوچھا "آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟"

"تعلیم؟ میں نے تو کبھی کسی اسکول میں بھی قدم نہیں رکھا"

"مگر یہ میڈیسن میں آپ کی اس قدر معلومات؟"

نوید نے قہقہہ لگایا "ڈاکٹر صاحب میرا بڑا بھائی بھی ڈاکٹر ہے۔"

آخرکار ڈاکٹر طاہر آرام کرنے کی ہدایت کر کے کمرہ میں سونے چلا گیا۔ میں نے اپنا پلنگ اس کے پلنگ سے ملا کر بچھایا۔ آج پہلی بار اس نے یہ نہیں کہا کہ "اپنا پلنگ ذرا ہٹ کر بچھائیے آپ کروٹیں بدل کر میری نیند خراب کریں گی۔"

نوید نے پچھلے دو ماہ سے سگرٹ پینا ترک کر دیا تھا کل اس نے مجھ سے فرمائش کی اور میں نے سگرٹ کا پیکٹ منگا لیا تھا۔ اس نے ایک سگرٹ جلائی اور اسی وقت سلیم ہماری طرف آئے۔ نوید نے انھیں دیکھا۔ آج تک نوید نے سلیم کی موجودگی میں سگرٹ نہیں پی تھی مگر آج اس نے گھبرا کر سگرٹ نہیں پھینکی۔ سلیم مڑ کر واپس چلے گئے۔

سب اپنے اپنے بستروں میں لیٹ چکے تھے۔ نوید کو ایڈیما کی وجہ سے سیدھا لیٹنے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کئی تکیے استعمال کرتا تھا اور تقریباً نیم دراز رہتا تھا۔ میں اس سے لگ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا ـــــ وہ اندھیری رات میری زندگی میں ہمیشہ روشن رہے گی۔

"اماں آج میں نے بڑی بدتمیزی کی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"آج میں نے ابو کے سامنے سگرٹ پی ہے۔ وہ رک گئے تھے مگر جب میں سگرٹ پیتا ہی رہا تو وہ خود ہی یہاں سے ہٹ گئے۔ کل آپ میری طرف سے ابو سے معافی مانگ لیں۔"

"کوئی حرج نہیں ہوا، انھیں پتہ ہے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے ـــــ"

"اماں میں ابو سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

"ہاں بیٹا وہ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

پھر بیٹا تم نے کہا "میں اپنی بہنوں سے اور بھائی جان سے بھی بہت محبت کرتا ہوں میری اللہ سے دعا ہے کہ مجھے اتنی زندگی دے دے کہ میں اپنے بھائی کو دیکھ لوں۔"

"ایسا کیوں کہتے ہو بیٹا؟ فرید تو اب دو تین دن بعد آ ہی جائے گا۔"

"اماں مجھے معلوم ہے تم نے میرے لئے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ اماں کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ اپنی اس حالت کے باوجود کسی کو تمہارے لئے لے آؤں جو تمہاری خدمت کر سکے۔ اماں میں تو تمہیں پلنگ پر بٹھا کے رکھنا چاہتا تھا ـــــ"

خدارا نوید یہ سب نہ کہو۔ تمہاری دیکھ بھال تو میری زندگی کا مقصد ہے۔ اللہ تمہیں شفا عطا کرے تمہاری خدمت کرنے سے میں کبھی نہیں تھکوں گی ـــــ"

پھر تم نے کہا "اللہ کرے اماں میری عمر بھی تجھے لگ جائے۔"

نوید! کیا آج تک کسی اولاد نے اپنی ماں کو ایسی سخت بد دعا دی ہے....؟

رات گزرتی گئی اور تم وہ سب کہتے رہے جسے کہنا تم انسانی کمزوری سمجھتے تھے، جو الفاظ سننے کو میرے کان ترستے تھے مگر ہر لفظ آج میرے سینے میں تیر کی طرح چبھ رہا تھا۔

تمہیں بار بار خیال آتا کہ میں سونا چاہتی ہوں اور اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور پھر کوئی بات یاد آ جاتی جو صرف اسی رات کہی جا سکتی تھی اور ہم دونوں باتیں کرنے لگتے ـــــ رات کے تین بجے تم نے کہا "ارے اماں تم بہت تھک گئی ہو اب سو جاؤ" اور کچھ لمحوں کے بعد ہی

"اماں کیا تم سوگئی ہو؟"

"نہیں بیٹا میں جاگ رہی ہوں۔"

"اماں کیا تم مجھے "نبی اکرمؐ" کی زندگی کے بارے میں کچھ سنا سکتی ہو؟ پھر میں سو جاؤں گا مگر تم مجھے صبح کی نماز کے وقت ضرور جگا دینا۔"

میں تمہیں "سرکارِ دو عالمؐ" کی زندگی کے بارے میں سناتی رہی اور جب تم سو گئے تو میں نے دیکھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اذان ہوئی مگر تمہیں جگانے کی ہمت نہیں ہو سکی —— ابھی تو تمہیں نیند آئی ہے۔

چھ بجے تمہاری آنکھ کھل گئی۔ تم نے آدھی پیالی چائے پی اور انیس سے کہا کہ جب میں منہ ہاتھ دھو لوں تو میری مونچھیں اسی طرح تراشنا جیسے آپ کوکب بھائی کی کاٹتی ہیں۔ انیس نے جواب دیا "تم اپنا منہ میرے حوالے کر دینا میں سوے سے مونچھیں ہی اڑا دوں گی۔" تم اس خیال سے بہت ہنسے کہ مونچھوں کے بغیر چہرہ کیسا لگے گا۔

آج تم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ پلنگ سے اٹھ کر وھیل چیئر میں بیٹھ سکو۔ ہم تمہارا پلنگ اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔

ڈاکٹر نے تمہیں دیکھا اور مجھ سے کہا کہ آج بھی بلڈ یوریا کرانا پڑے گا!

میں تمہارے کیس کے ڈاکٹر انچارج کو تمہاری رپورٹ دینے چلی گئی۔

ایک گھنٹہ بعد میں واپس آئی تو تم تکیوں کے سہارے بے خبر سو رہے تھے۔ "رات بھر جاگا ہے اب تھک کر سو رہا ہے۔"

صبیحہ نے کہا "اماں آپ کے جانے کے بعد انھوں نے نیند کی ایک گولی بھی کھائی ہے۔"

"کس نے دی اسے نیند کی گولی؟"

"انھوں نے مجھ سے دواؤں کا ڈبہ منگایا تھا اور خود ہی یہ کہہ کر ایک گولی کھالی کہ میں آرام سے سونا چاہتا ہوں۔"

دوپہر ہونے لگی تو ہم نے تمہیں جگانے کی کوشش کی مگر ہر بار ہلانے سے تم آنکھیں کھول کر دیکھتے اور پھر سو جاتے۔ تین بجے ہم سب گھبرا گئے تو میرا بھتیجا اقبال تمہارے ڈاکٹر انور سلامت کو کسی طرح لے آیا۔

ڈاکٹر نے تمہارا معائنہ کیا اور جب نیند کی گولی کھانے کی اطلاع ملی تو خفا ہو گیا "نوید بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا دل اور نبض صحیح چل رہے ہیں۔ یہ محض نیند کی گولی کا اثر ہے۔ دو تین گھنٹے کے بعد جب نیند پوری ہو جائے گی تو جاگ جائے گا۔ پھر اسے کھانا ٹھیک سے کھلا دیں۔ فی الحال کوئی پھلوں کا عرق دیجیے۔"

ڈاکٹر انور سلامت نے تمہیں زبردستی اٹھا کر بٹھا دیا اور یکے بعد دیگرے تین گلاس پھلوں کا عرق پینے پر مجبور کیا۔ تم خاموشی سے حکم مانتے رہے۔ پھر میری طرف دیکھ کر ناگواری سے کہا "انور سلامت بہت ظالم ہے!"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد تم پھر سے سو گئے۔ ہمیں ڈاکٹر کی باتوں سے اطمینان ہو چکا تھا سب آرام سے بیٹھ گئے۔ میں وضو کرنے چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد تبسم گھبرا کر اٹھی اور تم پر جھک گئی۔ پھر اس نے چیخ ماری "اماں دیکھو نوید کو کیا ہو گیا——"

میں اب کچھ اور نہیں دیکھنا چاہتی —— میں جانتی ہوں کہ آخرکار تم نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے اُن رحمت کے ہاتھوں کو تھام لیا ہے —— میں اب شکر کا سجدہ کرنے جا رہی ہوں کہ میں نے اللہ کی امانت اسے واپس کر دی، یا اللہ تو گواہ رہنا کہ میں نے تیری دی ہوئی نعمت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا، مگر اب شاید میں ہی اس کی نگرانی کی اہل نہیں رہی تھی ——!

بہت دن میرے کان تمہاری وھیل چیئر کی آواز سننے کے منتظر رہے۔ تمہارے قہقہوں کے لئے ترستے رہے۔ میری آنکھوں نے غیر ارادی طور پر تمہیں ہر طرف تلاش کیا۔ واش بیسن پر تمہارا ٹوتھ برش اسی طرح لگا ہوا ہے۔ تمہارے پلنگ پر وہی تکیہ ہے جس میں ۲۶ جون کی رات تمہارا پسینہ جذب ہوا تھا۔ نماز کی ٹوپی میں تمہاری تسبیح اسی طرح لپٹی ہوئی ہے۔ ہم وہی ہیں، وہیں ہیں۔ مگر اب تم کبھی نہیں آؤ گے میرے ہمدم میرے دوست ——!!

آہستہ برگِ گل بہ فشاں....

ڈاکٹر صبیحہ خاتون صبا

چلو اطمینان ہوا۔ آئندہ سے کوئی فون، کوئی خط ایسا نہیں آئے گا جس سے یہ بے کلی ہو کہ میاں[1] کیسے ہیں۔ وہ جو ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک ایک خدشہ تھا کہ یا اللہ یہ کہیں ہم سے جدا نہ ہو جائیں، وہ ختم ہو گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب زندگی کی سب سے بڑی حقیقت دنیا سے مراجعت ہی ٹھہری تو کیوں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے چاہنے والوں کا یہ صدمہ نہ دیکھیں۔

لیکن میاں کی بات یہ ہے کہ وہ تو ہمیشہ سے میرے ساتھ تھے۔ میں سولہ سال سے عرصۂ ہجر میں ہوں۔ جو کہ اب بظاہر مستقل ہی سا لگتا ہے۔ دعاؤں کا ایک باب تھا جو بند ہو گیا۔ مگر کہاں — مجھے یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں۔ اپنی تمام شفقتوں، شگفتہ چہرے اور دلنواز تبسم سے ہم سب کو دیکھ رہے ہیں۔ ہماری کامیابیوں پر خوش۔ ہمارے دکھ پر متفکر، مجسم شفقت۔ مکمل محبت۔

وہ مکتبِ حیات میں دعاؤں کا نصاب ہے
کتابِ زندگی میں وہ محبتوں کا باب ہے
وہ خالقِ مجاز بھی، ندیم بھی، شمیم بھی
مری لطافتِ سخن اُسی سے اکتساب ہے

میرا خالقِ مجاز، میرا ندیم، سید عبدالعزیز شمیم، نکہتِ صبا، مینارۂ نور، دشتِ غزال کا صحرا نورد، فاران کا کوہ پیما، ۹ ستمبر ۱۹۸۹ء بروز ہفتہ گیارہ بجے شب، آغا خان اسپتال کراچی میں بظاہر ایک معمولی علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ظاہر ہے کہ ایک عام قاری کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ روز ہی اس دنیا سے لوگ رخصت ہوتے ہیں لیکن ذرا ٹھہریے۔ مجھے اپنے باپ، اپنے دوست کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

میرے والد سید عبدالعزیز شمیم، کراچی میں ۱۹۴۷ء کے بعد کی جدوجہد کے اعلیٰ امثیل تھے۔ ترکِ وطن کرنے والوں کو اس نئے ملک میں جو مسائل پیش آتے رہے، جس طرح انھوں نے محدود، بلکہ وسائل کی موجودگی کے بغیر اپنے آپ کو انتھک محنت اور خلوص سے اپنی اولاد، اپنے کنبے والوں، اپنے دوستوں اور اپنے پڑوسیوں کے لیے جرائت، ہمت، استقامت اور محبت کی علامت بنا لیا تھا، وہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔

میرے والد، مشہور محدث، عالم دین، نواب صدیق حسن القنوجی (نواب شاہجہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال کے شوہر ثانی) کی اکلوتی نواسی نواب سید دا شرف جہاں بیگم کی سترہ اولادوں میں سے آخری اولاد تھے۔ ان کے والد یعنی میرے دادا حافظ سید عبدالرحمٰن حسنی (مرحوم) ایک دوسرے درویش، مجاہد خانوادے کی پانچویں خلف تھے۔ کراچی میں یہ کنبہ خانوادۂ سید احمد شہید بریلوی علیہ الرحمۃ کہلاتا ہے۔

---

[1] میاں سے اس مضمون کی مصنفہ ڈاکٹر صبیحہ خاتون صبا (نیویارک) کے والد گرامی سید عبدالعزیز شمیم مراد ہیں۔

میرے والد کے تایا زاد بھائی اور اسی خاندان کے مایۂ ناز بزرگ، (خدا ان کا سایہ تادیر نہ صرف ہمارے اوپر بلکہ دنیائے اسلام پر قائم رکھے) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ابن سید عبدالحی مرحوم (مصنف گل رعنا) ہیں۔ نواب صدیق حسن (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۹۰ء) نے دہلی میں مفتی صدرالدین آزردہ سے سندِ علم و فضل حاصل کی تھی۔ عالم دین، محدث، محقق، عربی اور فارسی کے شاعر اور تقریباً ۲۲۲ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جامعۃ الازہر میں آج بھی ان کی کتب احادیث و فقہ شاملِ نصاب ہیں۔

دوسری طرف سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدانہ کارناموں سے کون واقف نہیں۔ بالاکوٹ (ہزارہ) میں ان کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف سید صاحب کی مسلح جدوجہد، برصغیر کی تحریک آزادی کا ایک درخشاں باب ہے۔ میں اپنا یہ شعر اس نسبت سے اپنے والد کے نام کر رہی ہوں کہ ان کی زندگی اور تعلیم اسی پر محیط تھے:

خلوص و جہدِ مسلسل مری سرشت میں ہے
میں خانوادۂ احمد شہید شاہ میں ہوں

غالباً ۱۹۵۰ء میں ہم لوگ کراچی میں وارد ہوئے۔ میرا بچپن میاں کی جدوجہدِ حیات کی یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ شروع ہی سے کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اپنا سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ ہو جائے۔ عالمگیر روڈ اور شہید ملت روڈ کے درمیان و جوانب کا یہ علاقہ اُس وقت ایک غیر آباد صحرا تھا۔ ہمارا کنبہ یہاں آباد ہونے والا اولین کنبہ تھا۔ ہمارے سامنے اس علاقے کے پہلے اسکول کی تعمیر شروع ہوئی۔ اسکول کی ابتدا کے پہلے روز ہی ہم بہن بھائی کو داخل کر دیا۔ ہمارے پرنسپل جناب مشکور احمد مخدومی صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ صرف لڑکوں کا اسکول ہے لیکن والد صاحب کی منشا یہی تھی کہ لڑکیوں کی تعلیم کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میرا داخلہ ہو گیا اور دوسرے دن مخدومی صاحب نے خود اپنی بیٹی فرزانہ کو بھی داخل کر دیا اور فرمایا "شمیم صاحب آپ نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا"۔ انہی کے صاحبزادے ڈاکٹر سعید مخدومی (ڈین فیکلٹی آف سول انجینئرنگ این ای ڈی یونیورسٹی) ہیں۔ وہ ہمارے ہم جماعت بھی رہے ہیں۔

میاں کو ہمیشہ اس بات پر فخر ہوتا کہ میری بیٹی اسکول کی پہلی طالبہ تھی۔ ان کی ہم سب کو ایک یہی نصیحت ہوتی تھی کہ

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

اگر کسی بچے میں تعلیم کی طرف سے کوئی کم ہمتی پاتے تھے تو سخت بے چین ہو جاتے تھے۔

میرے چھوٹے بھائی سید احمد ٹیپو کو جمہوریہ ترکیہ میں مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی انقرہ میں انجینئرنگ میں داخلہ ملا۔ وہ اس وقت جامعہ کراچی میں فزکس آنرز میں تھے۔ کچھ جزبز ہوئے کہ کون جائے، یہیں سے ڈگری لے لوں، لیکن میاں نے تاکید سے ان کو وہاں جانے پر مجبور کیا۔ لڑکوں لڑکیوں کے لئے ہمیشہ مکمل پروفیشنل تعلیم پر زور دیتے تھے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ فیصلہ درست تھا۔ آج سید احمد کو نہ صرف آغا خان یونیورسٹی ہاسپٹل کے مکینیکل انجینئر ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ گزشتہ کئی برسوں سے ریاض (سعودی عرب) میں چیف میکینکل انجینئر ہیں اور اپنے کام کی وجہ سے محترم ہیں۔

ہم پانچ بہنوں اور دو بھائیوں کو میاں نے اپنے وسائل کے مطابق مکمل تعلیم دلوائی۔ سید احمد نے اپنے شوق سے مرچنٹ نیوی کو پسند کیا۔ کم عمری کی بناء پر داخلہ میں دشواری پیش آئی لیکن امتحان پاس کر چکے تھے لہٰذا ان کو میاں نے دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ چٹاگانگ میں قائم میرین اکیڈمی روانہ کیا۔ تعلیمی رپورٹ انتہائی انہماک اور دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ مجھے اس بات پر بے حد فخر ہے کہ میرے بھائی نے ہر زمانے میں اور ہر جگہ سب سے کمسن طالب علم ہونے کا ریکارڈ قائم رکھا۔ ۱۹۷۴ء میں انگلینڈ میں کیپٹن کے امتحان کی تیاری مکمل تھی کہ میاں کی بیماری کی بناء پر فوراً کراچی آ گئے۔ سوچا اس وقت میاں کے پاس ہونا ضروری ہے۔ امتحان تو بعد میں بھی دے سکتا ہوں۔ میں کم نصیب

اس وقت بھی اپنے باپ سے دور کالوراڈو میں تھی۔ ہم سب کی دعاؤں سے میاں صحت یاب ہو کر گھر آگئے۔ بھائی سید محمد نے دو ماہ بعد امتیازی حیثیت میں کپتان کا امتحان پہلی کوشش میں پاس کرلیا۔ یہ سب ان کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ چاروں چھوٹی بہنوں میں سے قدسیہ بلال نے اردو میں ایم اے کیا، جبیبہ شاہد نے فزکس میں ایم ایس سی کیا جبکہ نجمہ محسن نے بائیو کیمسٹری میں ایم ایس سی اور سب سے چھوٹی عطیہ شمیم نے فارسی میں گریجویشن کیا اور اب آغا خان ہاسپٹل میں اسٹاف فارماسسٹ ہیں۔

میاں سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ یہ کنبہ اپنی آبائی زمینوں پر قنوج (ضلع فرخ آباد یوپی) جا کر آباد ہوا۔ قنوج اپنے عطر اور محمود غزنوی کے حملوں کی وجہ سے آج بھی مشہور ہے۔ یہاں محلہ شیخپورہ میں دو حویلیاں "ممتاز منزل" کے نام سے تھیں ـــــ ایک نواب اشرف جہاں بیگم (میری دادی صاحبہ) کی اور دوسری ان کے بھائی سید محمد مصطفےٰ صاحب کی تھی۔ یہ میاں کے نانا میر عبدالحی ممتاز الدولہ دبیر الملک کے نام پر تھی، جو نواب صفیہ جہاں بیگم بنت نواب صدیق حسن کے شوہر تھے۔ میری والدہ آسیہ خاتون بنت سید سلیمان نقوی اصفہانی، انہی میر عبدالحی صاحب کی بہن سیدہ زینب اور چچا زاد بھائی سید مزمل حسین آف مزمل ہاؤس بھوپال کی پوتی ہیں۔

بات ہو رہی تھی میاں کی جد وجہد اور استقامت کی۔ اوائل عمر سے اللہ تعالیٰ نے میاں میں یہ صفات رکھی تھیں کہ اپنی تکلیف کا اظہار بالکل نہیں کرتے تھے۔ نہ اپنے چاہنے والوں کی محبت آزماتے تھے۔ میری دادی بتایا کرتی تھیں کہ شروع ہی سے شدید درد گردہ ان کو اٹھتا تھا بالآخر انیس سال کی عمر میں خاموشی سے لکھنؤ جا کر اپنے بڑے بھائی سید محمد اویا مامرحوم کو ہمراہ لے کر آپریشن کرایا۔ صحت یاب ہونے کے بعد قنوج اطلاع بھجوائی کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ صابر اور باہمت اتنے تھے کہ قنوج کے جنگلوں میں جب ہرن اور نیل گائے کے شکار کو نکلتے تھے تو فرسٹ ایڈ کٹ میں درد شکن انجکشن ساتھ ہوتے تھے۔ وقت پڑنے پر خود ہی انجکشن لگا لیتے تھے۔

یہ تین بھائی تھے سید محمد اویا ما، سید محمد سلیم اور والد صاحب سید عبدالعزیز شمیم تینوں کے مزاج میں نرم دلی اور خاکساری تھی۔ کسی ذی روح کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جس دن ان کا پالتو بل ڈاگ "شیرا" نمونیہ کی نذر ہوا، چچا ابا، چچا میاں، اور میاں نے کھانا نہ کھایا۔

میاں، اسلام اور مسلمانوں کی محبت سے سرشار تھے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ کو جوں کا توں قبول کرنے والے۔ مختلف مفسرین کی تاویلات اور توجیہات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کثرت سے تلاوت کرتے تھے۔ یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے لئے گھر سے نکلتے اور محلے کی مسجد میں موذن کو خبردار کرتے کہ فجر کی اذان کا وقت ہو گیا ہے۔ اکثر ڈھائی بجے شب میں مسجد پہنچ جاتے تھے۔ تب پتہ چلتا کہ ابھی فجر میں دیر ہے۔ علی الصبح طویل چہل قدمی ان کا شعار تھی۔ ضرورت مندوں کی مستقل امداد ان کا مشن تھا۔ وہ بھی انتہائی خفیہ کہ کم ہی پتہ چلتا تھا کب کس کی مدد کی۔

فروری سنہ ۱۹۸۹ء میں دہلی میں دوسری عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر پرنس مظفر شکوہ (آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے خانوادے کے چشم و چراغ حال مقیم نیویارک) نے ناچیز کا تعارف کانفرنس کے کنوینر علی صدیقی صاحب سے یہ کہہ کر کرایا کہ دہلی سے ان کا تعلق یہ ہے کہ مومن خاں مومن دہلوی ان کے خاندان کے سرخیل سید احمد شہید کے مرید تھے۔ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ مومن خاں مومن سید صاحب سے بیعت تھے اور مختلف جگہ ان کی سفارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

والد صاحب یہاں میرے پاس تین مرتبہ امریکہ تشریف لائے۔ آخری مرتبہ فروری سنہ ۱۹۸۹ء میں یہیں تھے۔ یہاں قیام کے دوران پروفیسر احمد علی کی تفسیر قرآن پڑھی۔ سورہ فیل اور واقعہ شق القمر پر ان کی توجیہات سے قطعی مطمئن نہ ہوئے۔ دلی خواہش تھی کہ کسی صورت سے NASA (خلائی تحقیقات کا امریکی ادارہ) سے نیل آرمسٹرانگ کا وہ بیان مل جائے جو چاند سے واپسی پر اس نے دیا تھا کہ "اس نے چاند کو اس طرح پایا جیسے دو مساوی حصے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد دوبارہ مل جائیں کہ ایک شگاف سا درمیان میں رہے"!

Michael Hart کی کتاب THE HUNDRED کو حاصل کرنے کے لئے اپنے بھتیجے سید عبدالحی کو لے کر University of Richmond گئے۔ تلاش کے بعد وہ کتاب وہاں کی لائبریری میں موجود پائی۔ اس کتاب کی تلاش انھیں اس لئے تھی کہ ایک غیر مسلم نے اول نمبر پر اس کتاب میں آنحضرت صلعم کے تذکرے کو جگہ دی ہے۔

مشہور محقق، مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی، میاں کے جگری دوستوں میں شامل ہیں۔ رشتہ داری جدا ہے۔ حالت یہ تھی کہ صبح کی نماز اور چہل قدمی کے بعد گھر آتے، اخبار دیکھتے اور اُٹھ جاتے کہ چل کر مولانا کو بیدار کیا جائے۔ سیاسیات عالم پر بحث اور فکر کی بالیدگی کے لئے۔

بہت سے لوگوں کی طرح میاں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں صرف دو قومیں آباد ہیں، مسلم اور غیر مسلم۔ باقی سب سیاست کی شعبدہ گری ہے۔

دو مرتبہ حج بیت اللہ کو گئے۔ انتہائی جذباتی ہو کر واپس آتے تھے۔

تاریخ و جغرافیہ ان کے خاص مضامین تھے۔ "نیشنل جوگرافک" ہمیشہ زیر مطالعہ رہا۔ مناظر قدرت سے دلچسپی اور مشاہدہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔

جون ۱۹۸۲ء میں میرے ساتھ Yellow Stone National Park گئے۔ خدا جانے کب سے اس جگہ کے بارے میں اس قدر معلومات تھیں کہ بالکل ٹورسٹ گائیڈ کا سا انداز تھا۔ مجھے اسی زمانے میں شعر گوئی پر مائل کیا تھا۔

ڈاکٹر معروج اختر زیدی نے میاں کے انتقال پر ڈیٹرائٹ سے یہ مصرعہ بھیجا تھا:

"گلشن میں شورِ ماتمِ داغِ نسیم ہے"

۱۴۱۰ھ

اس مصرعہ پر محمود اختر زیدی اور میں نے یہ گرہ لگائی:

کیا گریہ و فغاں ہے، صبا اب یتیم ہے

۱۹۸۹ء

جب کوئی تیز گاڑی چلاتا، تو میاں یہ شعر پڑھتے تھے:

آہستہ برگِ گل بہ فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

اور آخر میں ایک اپنا شعر پیش کر کے رخصت چاہوں گی:

وہ نیم جاں کہاں گیا — صبا کو روک روک کر
پسِ وصالِ قیس، یہ غزل پوچھتے رہے

نزاکتوں کا مرقع

سیّد مشکور حسین یاد

مجھے اچھی طرح یاد ہے کم عمری اور کم سنی کے زمانہ میں جب کبھی کوئی پتھر کا ٹکڑا ہاتھ آجاتا تھا تو ایک عجیب طرح کی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ خوشی تو پھولوں کو بھی دیکھ کر بہت ہوتی تھی لیکن وہی بات کہ دیکھنے کی حد تک۔ پھولوں کو توڑ کر حاصل کرنے کی خواہش مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ ٹوٹے ہوئے پھولوں کو، میرا مطلب ہے شاخ سے جدا ہوئے پھولوں کو، میں نے جب بھی ہاتھ میں لیا، یوں محسوس ہوا جیسے کچھ حاصل کرنے کے بجائے میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ پھول تو بس اپنی شاخ پر ہی بھلے لگتے ہیں اور صرف بھلے ہی نہیں لگتے، وہ دور ہی دور سے بہت کچھ بخشتے بھی رہتے ہیں۔ پتھر کے ٹکڑوں کے ساتھ یہ بات نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہاتھ آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے نظم و ضبط کے معانی مجسم ہو کر ہمارے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ ویسے تو چھوٹی عمر کی خوشیوں اور غموں کے اسباب بہت معمولی ہوتے ہیں لیکن اپنے تاثر کے اعتبار سے بہت گہرے اور دور رس بھی ثابت ہو سکتے ہیں، چنانچہ چھوٹی عمر میں مجھ پر جب کوئی غم طاری ہوتا تو ایسے موقع پر ہاتھ آیا ہوا پتھر کا کوئی معمولی سا ٹکڑا بھی مجھے بہت سہارے دیتا تھا۔ غم کی وجہ سے میں جو بکھر سا جاتا تھا، پتھر کا یہ ٹکڑا مجھے ایک دم مجتمع کر دیتا تھا۔ اپنی جگہ قائم اور مضبوط۔

پتھر کے ٹکڑے کے مل جانے سے جو خوشی مجھے حاصل ہوتی تھی آپ اسے خزانہ مل جانے والی خوشی کے ساتھ ہرگز نہ ملائیں۔ اگر مجھے کوئی خزانہ ملتا تو یقیناً اس پر بھی میں بہت خوش ہوتا۔ لیکن پتھر کے ٹکڑے کے ملنے والی خوشی کی کچھ اور ہی بات ہے۔ خزانہ مل جانے پر آدمی خوش تو ہوتا ہے لیکن یہ خوشی اپنے ساتھ ہزاروں قسم کے فوری غم بھی لے کر آتی ہے۔ گویا خزانہ کیا ملتا ہے آدمی بے شمار قید و بند کا شکار ہو جاتا ہے۔ پتھر کا ٹکڑا مل جانے والی خوشی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں — یہ خوشی عجیب آزاد قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ میں یہاں ہیرے جواہرات یعنی قیمتی پتھروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ قیمتی پتھروں کی تو ایک قیمت ہوتی ہے اور اپنی اس قیمت کے باعث وہ محدود ہو جاتے ہیں۔ میں تو عام سادہ پتھروں اور ان کے ٹکڑوں کا ذکر کر رہا ہوں، سادہ پتھر یا سادہ پتھر کے ٹکڑے کی چونکہ کوئی قیمت نہیں ہوتی اس لئے وہ انمول بھی ہوتا ہے اور ذہن انسانی کو امکانات کے نو بہ نو اُفق دکھانے کے باعث لامحدود بھی۔ سادہ پتھر کے اس لامحدود ہونے کو میں نے یہاں آزاد خوشی سے تعبیر کیا ہے، سادہ پتھر کا ٹکڑا آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ اس سے ذہنی طور پر بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ابتداء میں عرض بھی کیا ہے کہ پتھر کے ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کر پہلا احساس یہ ہوتا کہ زندگی بکھری ہوئی یا منتشر چیز نہیں ہے، یہ تو ایک بہت ہی مضبوط قسم کی حقیقت ہے۔ ویسے بھی پتھر جمادات میں سے ہے۔ گویا زندگی اور کائنات کی بنیاد ہی نظم و ضبط پر رکھی گئی ہے۔ سادہ پتھر کے ٹکڑے

کو ہاتھ میں لے کر میرا دوسرا احساس یہ ہوتا کہ ہزار نظم و ضبط کی پیچیدگیوں کے باوجود یہ زندگی اور کائنات سادگی سے آراستہ و پیراستہ ہے اور سادگی کیا ہے؟ آزادی کا دوسرا نام — بالفاظ دیگر نظم و ضبط آزادی کے دشمن نہیں۔ نظم و ضبط سے تو آزادی کا صحیح مفہوم اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ البتہ آزادی اور نظم و ضبط کے رشتہ کو جو چیز واضح اور قائم کرتی ہے وہ سادگی ہے۔ سادگی کے بغیر نہ آزادی کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور نہ نظم و ضبط کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ بظاہر آزادی اور نظم و ضبط ایک دوسرے کی دشمن دکھائی دیتے ہیں، لیکن سادگی کا یہی کمال ہے کہ وہ اس دشمنی کو گاڑھی دوستی میں بدل ڈالتی ہے اور عام سے پتھر کے ٹکڑے میں مجھے سادگی کا یہ کمال اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اسے آپ میرا تیسرا احساس سمجھیے۔ یعنی سادہ پتھر کا یہ ٹکڑا میرے ہاتھ آتا تو مجھے یوں لگتا جیسے کوئی بہت خوبصورت سی چیز میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔ ہاں اس کی خوبصورتی کو میں بیان نہیں کر سکتا تھا، صرف محسوس کرتا تھا۔ یہ خوبصورتی عجیب اور غریب ضرور ہوتی تھی لیکن امکانات سے مالا مال۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر میں نے جب بھی کسی سادہ پتھر کے ٹکڑے کو ہاتھ میں لیا وہ مجھے یہ کہتا سنائی دیا — ''پیارے مجھے تم نے اپنے ہاتھ کی گرفت میں اچھی طرح سے لے رکھا ہے نا — لیکن میں تمہاری گرفت سے آزاد ہوں — ہاں ہاں مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ تم میری آزادی کو محسوس کر رہے ہو مگر میرے نظم و ضبط کے پیش نظر تمہیں حیرت بھی ہو رہی ہے اور پھر میری سادگی نے تو تمہیں ایک طرح سے مدہوش سا بھی کر رکھا ہے۔ لیکن تمہاری یہ مدہوشی بہت سی بصیرتوں کا پیش خیمہ ہے۔ تمہیں یہ احساس بھی پوری طرح سے ہے کہ میں بے شمار خوبصورتیوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہوں۔ ابھی ابھی میرے وجود کا دروازہ کھلے گا اور یہ خوبصورتیاں تمہاری آنکھوں کے سامنے امڈ پڑیں گی۔''

پتھر کے ٹکڑے کا یہ مکالمہ مجھے اس دن پہلی بار اچھی طرح سمجھ میں آیا جس دن میں نے مائیکل انجلو کی انکسار سے بھرپور یہ بصیرت افروز بات سنی کہ ''میرا پتھروں سے خوبصورت مجسمے تراشنا کیا معنی رکھتا ہے۔ بات فقط اتنی سی ہے کہ خوبصورتی تو خود پتھر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ میں تو محض اس کے اردگرد کے پردے ہٹا دیتا ہوں اور بس'' بقول مائیکل انجلو وہ خوبصورتی جو پتھر کے اندر چھپی بیٹھی ہے۔ اس نے مجھے بچپن اور لڑکپن میں بھی بہت لبھایا اور آج بھی اسی طرح لبھاتی ہے۔ جی ہاں، پتھر بڑا ہو یا چھوٹا، مجھے اس کے بطون میں خوبصورتی نہایت سادگی کے ساتھ بیٹھی دکھائی دیتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ دکھائی دینے کے باوجود دکھائی دیتی ہے۔ اصل میں پتھر کا پورا وجود آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ اب خواہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو یا اپنی جگہ ثابت و سالم — اس کھیل سے وہ کبھی باز نہیں آتا — یہ کھیل پتھر کے وجود کا اقرار ہے۔ پٹی ہماری آنکھوں پر بندھی ہوتی ہے، ہم سمجھتے ہیں پٹی پتھر کی آنکھوں پر بندھی ہے۔ ویسے پٹی خواہ کسی کی آنکھوں پر بندھی ہو، جب یہ پٹی اترتی ہے تو دکھائی ہمیں دیتا ہے۔ پتھر کو بینائی کی داد کسی نے نہیں دی، البتہ پتھر کی اس محرومی سے حمد کے بے شمار پہلو نکلتے ہیں۔ پتھر کو چھو کر مجھے کم عمری میں بھی بڑے بھولپن کے ساتھ خدا یاد آتا تھا، اور اب بھی اسی طرح یاد آتا ہے۔ لیکن اس لمس کے ساتھ بے شمار بت بھی تو پاش پاش ہو جاتے ہیں — مکر و ریا کے بت، تصنع اور بناوٹ کے بت، لالچ اور طمع کے بت — مطلب یہ ہے کہ پتھر کو چھو کر مجھے ایک اور سادہ و معصوم سا احساس یہ ہوتا ہے، جیسے اپنی تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک ہو کر انسان کی تہذیب اور تمدن سراپا شرافت بن کر میرے سامنے آ موجود ہوتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی

نرمیوں اور ملائمتوں نے یقیناً انسان کو بہت کچھ دیا ہوگا لیکن ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ تہذیب و تمدن کی نرمیوں اور ملائمتوں نے انسان سے بہت کچھ چھین بھی لیا ہے۔ میں جب پتھر کو دیکھتا ہوں، اسے چھوتا ہوں تو پتھر کی مضبوطی اور سختی کا لمس وہ چھپی ہوئی دولت مجھے واپس لوٹاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے پتھر کا ایک معمولی سا ٹکڑا ابھی مجھے اچھا خاصا صاحبِ ثروت بنا دیتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ عربی میں حَجر کے معنی سخت پتھر کے ہیں اور جس جگہ کو پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو اس کو حِجر کہا جاتا ہے۔ لیکن غالباً یہ سن کر آپ کو حیرت ہو گی کہ اسی حجر (یعنی پتھروں سے احاطہ کرنا) سے حفاظت اور روکنے کے معنی اخذ کر کے عقلِ انسانی کو بھی حجر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی انسان کو طرح طرح کی بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ ہماری اردو میں تو عقل پر پتھر ڈال کر عقل اور پتھر کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان چونکہ اشیاء سے قربت کا زیادہ احساس دلاتی ہے اس لئے اس نے عقل اور پتھر کے درمیان مضبوطی کی مشترک خصوصیت کو دیکھ کر عقل اور پتھر کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور یوں جمادات کو فرش سے اٹھا کر عرش پر لا بٹھایا۔ ویسے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آپ میرے اس احساس سے کیا تاثر لیتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب بھی کسی پتھر کو ہاتھ لگایا ہے، مجھے یوں لگا جیسے میں عرش کو چھو رہا ہوں اور عرش میری پہنچ اور رسائی سے کوئی باہر کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح میں اس بات کو بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ سادگی کا عرش کے ساتھ کیا تعلق ہے، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پتھر کو چھونے سے یا پتھر کو ہاتھ میں لینے سے جو چیز مجھے عرش کا احساس دلاتی رہی ہے وہ پتھر کی سادگی ہے۔ پتھر کو دیکھ کر یا پتھر کو چھو کر ایک اور شدید احساس جو مجھے اپنی کم عمری میں ہوتا تھا وہ خلوص کا احساس تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے پتھر سے یا پتھر کے ٹکڑوں سے خلوص چھن چھن کر میری شخصیت میں جذب ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے اپنے اس احساس کا اس وقت بہت لطف آیا جب میں نے بڑے ہو کر ایک لغت میں یہ پڑھا کہ عربی میں صفا پتھر ہی کو کہتے ہیں اور پتھر کی صفائی دیکھ کر ہی اس لفظ صفا کے معنی خلوص اور اخلاص قرار پائے۔ اور جب میں نے لفظ صفا کے ساتھ صدق کا لفظ بھی دیکھا یعنی صدق و صفا یکجا نظر آئے تو مجھے پتھر سچ بولتے ہوئے بھی سنائی دیئے اور پتہ چلا کہ بچپن میں جو مجھے پتھر کے ٹکڑوں سے سچائی پھوٹتی دکھائی دیتی تھی تو میرا یہ احساس محض میرے تخیل کی کارفرمائی نہ تھی اور نہ ہی یہ کوئی خالی پھیکا وہم تھا۔ اس میں تو سچائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

عربی زبان کی حقیقت پسندی یا قربتِ اشیا اپنی جگہ، ہمارے اردو کے عظیم شاعر غالب نے جو پتھر کے بارے میں اپنے ایک شعر میں اظہارِ خیال فرمایا ہے ہم یہاں اسے کس طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس شعر پر کسی قسم کی رائے پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شعر یہ ہے:

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

بظاہر اس شعر میں غالب نے اپنے خاص انداز میں پتھر کی تعریف کی ہے اور ہر پتھر کو صدف قرار دیا ہے۔ لیکن ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے اس شعر میں پوری کائنات کی فطرت کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ گویا پوری کائنات پتھر کی طرح نظم و ضبط میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کا ہر ذرہ ایک صدف کے مانند ہے جس کے دامن

میں کوئی نہ کوئی موتی موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے پوری کائنات طرح طرح کے موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ جی ہاں معانی اور مطالب و مفاہیم کے موتیوں سے بھرپور ـــ البتہ ان موتیوں کو حاصل کرنے کا طریقہ بالکل انوکھا اور اچھوتا ہے ـــ مطالب و مفاہیم کے یہ موتی عام موتیوں کی طرح براہ راست صدف سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس صدف سے ذات انسانی کو لہو لہان کیا جاتا ہے تو یہ موتی برآمد ہوتے ہیں ـــ غالب نے اسی لئے "معنی کے موتی کو گوہر شکست" کہا ہے۔ گویا انسان کی ذات پر کسی غم کی چوٹ پڑتی ہے تو اس کا شعور بیدار ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اپنے شوق کو جنون کی حد تک پہنچا دے۔ یعنی گوہرِ مقصود جس قدر عالی ہوتا ہے اس کے لئے اتنی ہی شدت شوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب نے اس شدت شوق کو جنون کے ساتھ سودا کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے تن من دھن ہر چیز کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ گویا ایثار اور قربانی بڑے سے بڑے گوہر مقصود کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ حق ہے اور بقول غالب اس سودے میں نقصان تو کسی صورت میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض محال اس کاروبارِ جنون میں کوئی بڑا موتی ہاتھ نہیں آتا تو ننھے منے موتیوں سے تو یقیناً آپ کا دامن بھرے بغیر نہیں رہے گا۔ مگر سارا مسئلہ جنون کے ساتھ سودا کرنے کا ہے یعنی اپنے شوق کو بروئے کار لانے کا ـــ شوق بروئے کار آجائے تو معمولی پتھر اور اس کے ٹکڑے بھی موتیوں سے بھرے صدف ثابت ہوتے ہیں ـــ سچ تو یہ ہے کہ غالب نے اپنے اس شعر میں پتھر کو زندگی کی کامیابیاں حاصل کرنے کا ایک وسیلہ کہا ہے جس کو آپ بلاخوف تردید ایک نہایت مضبوط وسیلۂ وصال قرار دے سکتے ہیں۔ جی ہاں نہایت مضبوط لیکن جمال افروز وسیلۂ وصال ـــ جمال افروز اس لئے کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں پتھر اس کائنات کی نازک ترین شے ہے اور نزاکت کو آپ حسن سے کسی طرح جدا نہیں کر سکتے۔ رہی شیشے کی نزاکت تو وہ پتھر کی نزاکت کے سامنے کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ شیشے کی نزاکت کمزوری کی حامل ہے جبکہ پتھر کی نزاکت سرتا پا قوت اور توانائی کی مظہر ـــ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے جس چیز کو عرف عام میں ہم اور آپ پتھر کہتے ہیں وہ اس کائنات کی نزاکتوں کا ایک دیدہ زیب مرقع ہے۔ پتھر میں نزاکتیں جم کر بیٹھی ہوتی ہیں اور ان کا نہاتِ خود منتشر ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا جبکہ شیشے میں نزاکتیں جمع ہوتی ہی اس لئے ہیں کہ وہ منتشر ہونے اور بکھرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں ـــ لہٰذا صابر و شاکر نزاکتوں کا اور بے صبری اور جلدباز نزاکتوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پتھر ثباتِ حیات کا آئینہ دار ہے اور شیشہ بے ثباتیِ حیات کا ـــ شیشے کی سب سے بڑی کمزوری اور چالاکی یہ ہے کہ آپ اس کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ گویا وہ اپنے وجود کو آپ کی آنکھوں پر حتی الوسع واضح نہیں ہونے دیتا۔ پتھر میں نہ یہ کمزوری ہے اور نہ چالاکی ـــ وہ تو سینہ تان کر آپ کے سامنے آتا ہے۔ مجال ہے آپ کی آنکھیں اس کے وجود کے آر پار دیکھ سکیں۔ پتھر کا ٹھوس ہونا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کوئی ٹھوس قسم کی چیز نہیں۔ یہ ٹھوس پن تو پتھر کی بنیادی نزاکت ہے۔ پتھر کی باقی تمام نزاکتیں اس کی اسی ٹھوس نزاکت سے ظہور میں آتی ہیں۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ DIGNITY یعنی توقیر کا عربی لفظ بھی وقر سے نکلا ہے جس کے معنی پتھر جیسا ہونا ہے۔ گویا وقار سے پتھر کا براہ راست تعلق ہے۔ غرض سادگی کی نزاکت ہو یا خلوص کی نزاکت، مسیحائی کی نزاکت ہو یا اپنی جگہ جمے رہنے کی نزاکت، یعنی یہ سب وقار DIGNITIES ٹھوس نزاکتیں

ہیں اور یہ پتھر کا وجود انہی نزاکتوں یعنی DIGNITIES سے عبارت ہے۔ البتہ پتھر ٹھوس نہ ہوتا تو پھر یہ ضرور کوئی ٹھوس قسم کی چیز ہوتا۔ ٹھوس قسم کی چیزیں خواہ دنیا بھر کی دولت و ثروت جمع ہو جائے اس میں آپ کو دل کی دھڑکن کبھی سنائی نہ دے گی۔ قصۂ مختصر میں اتنی دیر سے آپ کو صرف یہ بتانے کی کوشش میں مصروف ہوں کہ پتھر بھی دل کی طرح دھڑکتا ہے اور آپ نے اس کی ان دھڑکنوں کو ایک بار نہیں، یقیناً سینکڑوں بار سُنا ہوگا۔ لیکن اگر آپ کو میری ان باتوں پہ یقین نہ آئے تو کسی پتھر کے ٹکڑے کو اُٹھا کر اپنے کانوں کے پاس لے جائیے اور پھر دیکھئے پتھر کی دھڑکنیں آپ کو کس طرح سنائی دیتی ہیں۔ البتہ آپ میر درد کے اس مصرعے پر بالکل توجہ نہ دیجئے۔

ع ہر سنگ، دکان شیشہ گر ہے

پھر تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ دل کی دھڑکنیں سننا آسان ہے، کسی دکان میں بیٹھ کر حساب کتاب کرنا مشکل۔

نثر پارے

ارشد علی

کامیابی کے اسباب ـــــ یا زوال کی وجوہ ـــــ ایک مخصوص تجزیاتی انداز ـــــ یعنی جیتنے والے کی خوبیاں تلاش کرو ـــــ اور جو ہار جائے اس کی خامیاں ـــــ اے نتیجے کی لاٹھی پکڑ کر ٹانگ ٹوٹیاں مارنے والی، ہماری لولی لنگڑی اور اندھی دانش ـــــ ! تو اتنا آگے نہیں بڑھ پاتی جتنا فاصلہ طے کر لیتی ہے

اس نے کہا "مجھے مانتے ہو؟" ـــــ میں نے کہا "کیا؟" ـــــ اس پر وہ غیظ میں آکر منہ سے آگ برسانے لگا اور مجھے خوفزدہ پاکر بولا ـــــ "اب تو مانو گے! ضرور مانو گے!" ـــــ میں نے کہا "ہاں! مانتا ہوں کہ تم منہ کے راستے آگ نکال سکتے ہو" ـــــ یہ سن کر اس نے آگ برسانا بند کر دی ـــــ اور زمین پر تھوکتے ہوئے بولا ـــــ "منکر!!"

میں سورج کا بیٹا ہوں ـــــ روشن دن کے روشن سورج کا بیٹا ـــــ دوپہر زاد ـــــ جب سائے قامت سے نہیں بڑھتے ـــــ اور چڑیا بھی ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک ـــــ خاصی سوچ سمجھ کر جاتی ہے۔

پہاڑ اونٹ بن گئے ہیں ـــــ ٹیلے کارواں ـــــ بھوری مٹی یا خاکستری گھاس ـــــ رات بھر کی بارش کی بھیگی ہوئی ـــــ اس کا پانی نچڑنے کے لیے کتنے دنوں کی دھوپ کافی ہوگی ـــــ ؟ دن! جو تسلسل سے نہیں آتے ـــــ ہر دو دنوں کے بیچ ایک رات ہوتی ہے ـــــ رات! جس کے دامن میں ـــــ بارش نہیں تو شبنم یا کہرا ہوگا ـــــ اونٹ پھر بھیگ جائیں گے ـــــ بھیگتے بھیگتے زنگ آلود ہو جائیں گے ـــــ اونٹوں اور پہاڑوں کو چھت کون مہیا کرے ـــــ اونٹوں اور پہاڑوں کے دنوں کے درمیان سے ـــــ راتوں کو کیسے کھینچ نکالا جائے ـــــ ؟

باتیں کرو کہ سرِ شام ـــــ دو آدمی چپ چاپ بیٹھے اچھے نہیں لگتے

میں نے پتھر پھینکا اور جھاڑی تیتر بن گئی

سن رہی پگلی ـــــ ! تو جیون کے اس اندھے کنوئیں سے ـــــ کیا کھینچے ہے ـــــ ؟ گہرائیاں !!

دشمن بعد میں پہنچا ـــــ بستیاں پسپائیوں میں روندی گئیں۔

انسان موت سے نہیں ڈرتا ـــــ اس کا تجسس ـــــ اگلے لمحے سے محرومی کے خوف میں مبتلا ہے۔

ٹائم زون

میں شہر میں آتے ہی ___ اپنے کاندھے کے کپڑے کو ___ اپنے جوتوں کی گرد جھاڑ کر تھیلے میں رکھ لیتا ہوں ___ پھر جب چائے کی میز پر ___ وہ پورے قانون اور پوری روایت کو مسترد کرنے لگتے ہیں ___ تو میں خود کو اُن کے ساتھ اُڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں ___ مگر واپسی پر ___ اپنے کپڑے کو پھر سے اپناتے ہوئے ___ مجھے آدھی سے زیادہ بغاوت وہیں چھوڑ آنا پڑتی ہے۔

دوسری غلطی

کیا کہا؟ ___ گلدان ٹوٹ گیا؟ ___ چلو بھول جاؤ۔ کوئی بات نہیں ___! مگر یہ آواز کیسی ___؟ بلی نے دودھ گرا دیا ___؟ تمہارے ہوتے ہوئے ___؟ اور تم نے گلدان بھی توڑنا ہے ___!

اگلے ہفتے نکلنے والی لاٹری کا ٹکٹ

ہاں ___! دیکھو ___! صرف ایک روپے میں ___ پورے سات دنوں کے خواب خرید لایا ہوں۔

ایک سہ فریقی مکالمہ

"اونٹ!"

"کہاں؟"

"تمہیں کہہ رہے ہیں!"

کتنی خوشی ہوتی ہے ہمیں ___ دوسرے کے بارے میں جان کر! ___ منافقانہ مسرت ___! گویا وہ کوئی پہاڑ تھا ___ جسے ہم نے سر کر لیا ہو ___ اور اس کی چوٹی کو ___ اپنے قدموں تلے روند کر ___ اس کا سارا غرور پاش پاش کر ڈالا ہو

دراصل ہر آدمی میں ___ بقدرِ ظرف ___ ایک فامولا ہوتا ہے ___ وہ کچھ نہیں کرتا ___ بس زندگی بھر اسے دہرائے جاتا ہے ___ ایک بار نہیں تو دوسری بار ___ دوسری بار نہیں تو تیسری ___ سارے سٹیپس (Steps) سمجھ لیے جاتے ہیں ___ اور کہنے والا کہہ اُٹھتا ہے ___ "میں جانتا ہوں وہ کتنے پانی میں ہے!"

یہ جانے جانے کا ڈر بھی عجیب ہے ___ یہ مکاری تک اُکسا ڈالتا ہے ہمیں ___ اور ہم عین آخری وقت ___ اپنے فارمولے میں کوئی غیر فطری ترمیم کر جاتے ہیں ___ لوگ سوچتے ہیں کہ یوں ہوگا ___ لیکن جب یوں نہیں ہوتا ___ تو پھر سوچنے لگ جاتے ہیں۔

پھر کتنی خوشی ہوتی ہے ہمیں ___ دوسروں کو اپنے بارے میں سوچتا ہوا دیکھ کر ___ منافقانہ مسرت!

آرٹ گیلری میں ___ محنت کشوں کے موضوع پر ___ تصویری نمائش ___ اور اس خیال سے ___ دادِ فن دیتے سرمایہ دار ___ کہ تصویریں ہی تو ہیں ___ ہمارا کیا لے جائیں گی۔

آج کا دن بھی اکارت گیا ___ سورج کو خبر کر دو ___ کل صبح جلدی اُٹھے ___ ہمیں بہت لمبے سفر پر جانا ہے

خاقان خاور

○

بھرے گھر میں ہے اِک کونا ہمارا
نہ ہونے سا ہے اب ہونا ہمارا

وہ خوش ہوتا ہے تڑپا کر کسی کو
سکوں دے گا اُسے رونا ہمارا

کسی دریا کی ہم کیوں ریت چھانیں
ہمارے ہاتھ ہیں سونا ہمارا

جنم دے گا مہ و انجم کو اِک دن
زمیں میں دھوپ کو بونا ہمارا

نہیں پھولوں پہ بھی اب نیند آتی
کبھی کانٹوں پہ تھا سونا ہمارا

○

شمع کی طرح جل سکو گے کیا ؟
ساتھ میرے پگھل سکو گے کیا ؟

زندگی نے کبھی جو دی آواز
آئینوں سے نکل سکو گے کیا ؟

خود کو بدلا نہیں گیا تم سے
تم رُتوں کو بدل سکو گے کیا ؟

اب وہ شدّت نہیں ہے موسم میں
اب مرے ساتھ چل سکو گے کیا ؟

میرے جوتے پہن لیے تم نے
چال بھی میری چل سکو گے کیا ؟

تم کوئی موم تو نہیں خاورؔ
ایک پتھر میں ڈھل سکو گے کیا ؟

عالمتاب تشنہ

○

سودا تمہارے عشق کا سر سے اُتر نہ جائے
دیکھو کہیں بہار کا موسم گزر نہ جائے

ہم جائیں اور ساتھ غبارِ سفر نہ جائے
یعنی دُعا کے ساتھ دُعا کا اثر نہ جائے

تجدیدِ عہدِ عشق پہ اتنا بھی خوش نہ ہو
قول و قرار سے وہ کہیں پھر مُکر نہ جائے

گزرے چراغِ جاں کو بُجھاتی ہوئی ہوا
الزام یہ بھی آپ کے دامن کے سر نہ جائے

زلفیں کھلیں کہ طبلۂ عطار کھل گیا
پھر کیوں مشامِ جاں تری خوشبو سے بھر نہ جائے

گلکاریوں کو بیش تو کر دیں لہو بھی ہم
اس پر بھی گر خرابیٔ دیوار و در نہ جائے

سیلِ بلائے ہجر قیامت سے کم نہیں
یارب، یہ میرے گھر سے کسی اور در نہ جائے

جو تلخیٔ کلام بنا ہے زبان پر
وہ نفرتوں کا زہر دلوں میں اُتر نہ جائے

ہو گی کوئی ملامت و دُشنام کی بھی حد
ڈرتا ہوں میرے صبر کا پیمانہ بھر نہ جائے

آرائشِ جمال میں اتنے بھی گم نہ ہو
حیرت میں آئینہ کہیں حد سے گزر نہ جائے

تم روز و شب خدا سے یہی مانگنا دُعا
تشنہؔ کبھی دعا سے دعا کا اثر نہ جائے

عالمتاب تشنہ

○

محبت رقص کرتی ہے جنوں بیدار رہتا ہے
سو یوں مصروفِ وحشت عشقِ تازہ کار رہتا ہے

مری آنکھیں ڈھونڈتی رہتی ہیں اب بھی چاند سے چہرے
مگر یہ دل کہ جو مستِ مئے پندار رہتا ہے

مرے احباب ملتے ہیں نقابیں ڈال کر مجھ سے
مرے ہمراہ کوئی آئینہ بردار رہتا ہے

یہ کیسی جنگ سی جاری ہے روز و شب مرے اندر
کوئی تو ہے جو مجھ سے برسرِ پیکار رہتا ہے

لگی رہتی ہیں روزن سے یہ کس کی خشمگیں آنکھیں
یہ لگتا ہے کوئی دشمن پسِ دیوار رہتا ہے

فقیرِ شہر کو رہتا ہے فخرِ آبرو مندی
امیرِ شہر کو خوفِ سر و دستار رہتا ہے

وہی عہدِ محبت سے مکر جاتے ہیں پل بھر میں
جنھیں عہدِ محبّت پر بہت اصرار رہتا ہے

بہت کرتا ہے دل کو خوش گماں اندازِ دید اس کا
بظاہر جس کے لب پر عشق سے انکار رہتا ہے

دھنک کے رنگ بھرتا ہے سخن آرائی میں تشنہ
مرے اندر کوئی مجھ سے بڑا فنکار رہتا ہے

○

مری دسترس میں ہے گر قلم مجھے حسنِ فکر و خیال دے
مجھے تاجدارِ سخن بنا، مجھے اعتبارِ کمال دے

مری شاخِ شعر رہے ہری دے مرے سخن کو صنوبری
مری جھیل میں بھی کنول کھلا، مری گدڑیوں کو بھی لعل دے

تری بخششوں میں ہے سروری، ہو عطا مجھے بھی قلندری
جو اُٹھے تو دستِ دعا لگے، مجھے ایسا دستِ سوال دے

رگِ جاں میں جمنے لگا لہو، اسے مشک بننے کی آرزو
ہے اداس دشتِ تتارِ دل، اسے پھر شلنگِ غزال دے

کوئی بات عقرب و شمس کی کوئی ذکرِ زہرہ و مشتری
تو بڑا ستارہ شناس ہے، مجھے کوئی اچھی سی فال دے

ہیں یہ جسم و جاں کے قیود کیا، خد و خال کے یہ حدود کیا
میں ہوں عکسِ منظرِ ماورا، مجھے آئینوں سے نکال دے

ہے یہ رنجِ راحتِ رفتہ کیا، جو گزر گیا سو گزر گیا
شب و روزِ یادِ گزشتہ کیوں مجھے زعمِ شوکتِ حال دے

میں وہی ہوں تشنۂ باوفا، مرا آج بھی وہی مدعا
نہ فراق دے مجھے مستقل، نہ مجھے ہمیشہ وصال دے

سورج نرائن

○

ڈالتا عدل کی جھولی میں سیاہی کیسے
مانگتا مجھ سے کوئی جھوٹی گواہی کیسے

کیا ترے جسم پہ ٹوٹی ہے قیامت کوئی
دفعتاً آج مری روح کراہی کیسے

جب ہر اک درد کی زنجیر کو کٹ جانا ہے
پھر ترا درد ہوا لامتناہی کیسے

کتنا بے ڈھنگ تناسب ہے محاذِ غم پر
اتنے لشکر سے لڑے ایک سپاہی کیسے

جی رہا ہوں میں غلاموں کا حوالہ بن کر
میری پہچان بنے مسندِ شاہی کیسے

کس حوالے سے تھا موسم کا ستم پیڑوں پر
دور تک پھیل گئی زرد تباہی کیسے

پیر اکرم

○

اب تلاش کرتا ہوں جگنوؤں کے ہالوں میں
کھو دیا جسے میں نے صبح کے اجالوں میں

لَو سی دینے لگتی ہیں آنسوؤں کی تحریریں
ذکر کوئی کرتا ہے جب ترا حوالوں میں

عکس تیرے لہجے کے گنگنانے لگتے ہیں
گھنٹیاں سی بج اٹھیں جس طرح شوالوں میں

جب یہاں نہ ہونگے ہم، کون یاد رکھے گا
ذکر ہو کبھی شاید ہجر کی مثالوں میں

چھپ گیا ہے اک چہرہ جو مری نگاہوں سے
صبح و شام رہتا ہے اب مرے خیالوں میں

گو نگاہ میں تیری ہم نہ تھے کسی قابل
ہاں! شمار کر لینا پیار کرنے والوں میں

افضل علوی

○

دل دکھانے کو، کبھی درد جگانے کو مِلا
وہ مِلا جب بھی تو پھر روٹھ کے جانے کو مِلا

اپنی قسمت میں نہ تھی خندہ جبینی اُس کی
ورنہ چاہت سے تو وہ ایک زمانے کو مِلا

"باعثِ قربِ بنے حالات، محبت تو نہ تھی"
دِل جلانے کی یہ اِک بات بتانے کو مِلا

خاک وہ ناز اٹھائیں گے کسی کے، جن کو
غمِ ہستی سا گراں بوجھ اُٹھانے کو مِلا

صدق و اخلاص سے سب پہلو بچا کر گزرے
اور یہ روگ تو علوی سے دوانے کو مِلا

○

گزرے ہوئے زمانے اچھے لگتے ہیں
جیسے ساتھ پرانے اچھے لگتے ہیں

سب رشتوں کی رونق ان کے دم سے ہے
پیار کے تانے بانے اچھے لگتے ہیں

رکھتے ہیں کچھ دلداری کے پہلو بھی
ہمدم! تیرے بہانے اچھے لگتے ہیں

جو ہیں اب رکھوالے پچھلی قدروں کے
وہ نایاب گھرانے اچھے لگتے ہیں

اندیشوں کے مارے دانشمندوں سے
دیوانے، مستانے اچھے لگتے ہیں

تیرے نام سے علوی جی کی نسبت کے
بے بنیاد فسانے اچھے لگتے ہیں

مختار جاوید

○

معیار کو اٹھاؤں تو کردار گر پڑے
چھت کو سنبھالتا ہوں تو دیوار گر پڑے

اتنا ہوا کہ رزق سمندر نہیں ہوئے
اِس پار گر پڑے کبھی اُس پار گر پڑے

تو اور کیا بلند ہو، میں اور کیا کروں
دیکھوں بھی تیری سمت تو دستار گر پڑے

لب رہ گئے کھُلے کے کھلے اُس کے سامنے
الفاظ سب کے سب پسِ اظہار گر پڑے

اک مرحلہ تھا راہ میں اونچی اُڑان کا
دو چار اوپر اُٹھ گئے، دو چار گر پڑے

لاؤں کہاں سے امن کی دہشت کہ خود بخود
ہر جنگجو کے ہاتھ سے تلوار گر پڑے

پھولوں کو کیا بلا تری اندھی پھوار سے
شبنم کے ذائقے تو سرِ خار گر پڑے

○

دوسرے دیس میں کس کام کا گھر ہوتا ہے
گھر تو ہوتا ہے مگر نام کا گھر ہوتا ہے

کتنے دُکھ درد قبیلے کی طرح رہتے ہیں
دل ہو آباد تو آلام کا گھر ہوتا ہے

صبح ہوتے ہی اڑانوں پہ نکل جاتے ہیں
گھر پرندوں کا فقط شام کا گھر ہوتا ہے

اک تسلسل کے حوالے سے جو دیکھا جائے
بابِ آغاز ہی انجام کا گھر ہوتا ہے

گھر تو ہوتا ہے مگر نام کی تختی کے بغیر
ایسے جیسے کسی بے نام کا گھر ہوتا ہے

اس حویلی کے مکینوں کو بتاؤں کیوں کر
گھر پرانا ہو تو اوہام کا گھر ہوتا ہے

مختار جاوید

○

کچھ بھی نہ برگ و بار کے کردار سے ملا
سایہ ملا تو صحن کی دیوار سے ملا

آنکھوں میں پھر سے رات کا اندھیر بس گیا
پل بھر کو کیسی صبح کے آثار سے ملا

کتنے ہی حادثات ہیں خوشبو کی راہ میں
ملنا تھا ایک پھول سے سو خار سے ملا

جیسا بھی تھا وہ صاحبِ توقیر ہو گیا
اعزاز اُس کو باپ کی دستار سے ملا

ممکن ہے آج ہو کسی سازش کا انکشاف
دشمن بڑے خلوص، بڑے پیار سے ملا

اِس پار سے قریب نہ اُس پار سے قریب
نکلا وہ دسترس سے تو منجدھار سے ملا

شاید وہ حُسنِ صبح کے امکاں میں بھی نہ ہو
جس کا سراغ روزنِ دیوار سے ملا

○

پھولوں کے انتخاب میں یہ کیسی بھول ہے
ہر آدمی کے ہاتھ میں کاغذ کا پھول ہے

کھلتے رہیں گلاب، کسی کو غرض نہیں
ہر شخص زخم خوردۂ شاخِ ببول ہے

جاتے ہوئے وہ زرد سی اک شام دے گئے
اربابِ روشنی کا یہ کیسا اصول ہے

کس بے جہت سفر پہ روانہ ہوا ہوں میں
جنگل کا کرب ہے کہیں صحرا کی دھول ہے

کانٹے سنبھالنے کے سوا اور کچھ نہیں
پھولوں سے اشتراک کا سودا فضول ہے

آزار راس آئے تو آزار چھن گئے
دل خوش ہے یا کہ اور زیادہ ملول ہے

عرفانہ عزیز

○

ہر کاسۂ دل کیف سے سرشار بہت ہے
مائل بہ کرم کوئی طرحدار بہت ہے

کب سطوتِ اسباب کی ہے دل کو تمنّا
ہم اہلِ طریقت کو تو پندار بہت ہے

یہ عہد عبارت نہیں شمشیر و سناں سے
شوریدہ سرو! جرأتِ گفتار بہت ہے

کرتا ہے لہو دل کو ہر اک حرفِ تسلّی
کہنے کو تو یوں قربتِ غمخوار بہت ہے

ہر چند رسائی میں نہیں فصلِ بہاراں
اربابِ جنوں! دامنِ دلدار بہت ہے

ہونٹوں سے ہو مانوس اگر حق، تو جنوں کو
اِک نعرۂ منصور سرِ دار بہت ہے

○

شکستِ چشم و نظر کا اُسے پتا نہ لگے
کہ زخم زخم بدن ہو مگر ہوا نہ لگے

یہی رہا جو دلِ ناصبور کا عالم
ستم شعار کہیں درد آشنا نہ لگے

گلہ نہ کر کہ بہت زود رنج ہے وہ بھی
سخن وہ کہہ کہ سخن فہم کو بُرا نہ لگے

یہ چاہتے ہیں فقط حرف آشنا میرے
کہ میرے دل کی صدا بھی مری صدا نہ لگے

وہاں تو جو بھی گیا لوٹ کر نہیں آیا
مسافروں کو ترے شہر کی ہوا نہ لگے

شبِ فراق کی بے مہریوں سے کب ہے گلہ
کہ فاصلے نہ اگر ہوں تو وہ بھلا نہ لگے

(کینیڈا)

شبنم شکیل

○

محور ہو مری سوچ کا، برسوں کا یقیں ہو
تم جو کہ فقط وہم ہو، اور کچھ بھی نہیں ہو

میرے ہی تخیل نے تراشا ہے یہ پیکر
تم میری غزل کی کوئی شاداب زمیں ہو

لازم ہے حفاظت بھی تو اس خانۂ دل کی
رہتے ہو مرے گھر میں مگر کیسے مکیں ہو

اب اس کی تپش مجھ کو بکھرنے نہیں دیتی
حسرت تھی مرے پاؤں کے نیچے بھی زمیں ہو

ہو میری طرح تم بھی تو اپنے سے ہراساں
شاید اسی نسبت سے رگِ جاں سے قریں ہو

○

کبھی عزیز ہیں طوفاں کبھی کنارے ہیں
عجب عجب مری خواہش نے روپ دھارے ہیں

فضا بتائے گی جب وہ قریب پہنچے گا
کہ شہرِ غم کے بھی اپنے کچھ استعارے ہیں

کرے وہ قوتِ گویائی بھی عطا مجھ کو
صحیفے جس نے مرے قلب پر اُتارے ہیں

نہ کھاؤ خوف اندھیروں سے، قافلے والو!
تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں ستارے ہیں

شکستِ دل نے تجھے کیا نہیں دیا شبنمؔ
یہ پوچھ اُن سے جو جیتے کبھی نہ ہارے ہیں

صبیحہ خاتون صبا

○

حیات! تیرے نئے تقاضے، ہمیں تو بے موت مار دیں گے
ذرا یہ قرضِ جہاں چکا دیں، تو قرضِ ہستی اتار دیں گے
ملے گی فرصت غمِ جہاں سے، تو اُن کی زلفیں سنوار دیں گے
خزاں رُتوں سے، جو بچ رہیں گے، وہ پھول ہم ان پہ وار دیں گے
جو وقتِ رخصت، قرارِ جاں کی دعا سے ہم کو نوازتے ہو
قرارِ جاں! اس دعا پہ ہم بھی، تمہیں، دعائے قرار دیں گے
کہیں ہواؤں کا استعارہ، کہیں کسی درد کا اشارہ
سُنا ہے وہ روئے فکر و فن کو، ہمارے غم سے نکھار دیں گے
کسی کے گلدستۂ محبت سے بس یہ پیغام مُنسلک تھا
یہ نیم وا، نرگسی شگوفے، سلیقۂ انتظار دیں گے
یہ فرقتوں کے عذابِ موسم، کہیں تمہیں بے یقیں نہ کر دیں
ہمیں تو جاناں! یہ ہجر کے دن گزارنا ہیں، گزار دیں گے
وہی جو تھا حرفِ روح پرور، ذرا وہ ارشاد ہو مکرّر!
وہی، کہ ہم دستِ بدگماں ہیں، صحیفۂ اعتبار دیں گے
تمازتوں، یا خنک فضاؤں پہ اس کا الزام کیوں لگائیں
زمیں سے رشتوں کو، توڑ کر خاک یہ شجر برگ و بار دیں گے
سمندروں کے سفر سے پہلے، وہ قریۂ جاں سے ہو کے گزرے
ہوائے شب کو پیام، ہم بھی، بہ نامِ شہرِ نگار دیں گے
صبا کے پیکر کو، پھر کوئی زخمِ آرزو سے سجا گیا ہے
چلو غنیمت ہے، اور کچھ دن، یہ گُل، فریبِ بہار دیں گے

(نیویارک)

شفیق سلیمی

○

رات مدہوش تھی اور سمندر کے پہلو میں مہتاب تھا
نیند نے بھی ہمیں کیا دیا تھا، فقط خوف تھا خواب تھا

زرد پتّوں کی شاخوں پہ شاداب ہو کے پرندے نہیں
آسمانوں سے اُترا زمینوں پہ جو اب کے، زہراب تھا

مصرعۂ تر کی صورت گری میں کوئی کام آتا نہیں
اس سے پہلے نہ یوں ذہن ماؤف تھا ضعف لعصا آتھا

کرب تقسیم ہوئے، راحتیں لے اُڑی راحتوں کی طلب
ریگِ صحرا پہ لکھا ہواؤں نے یوں ہجر کا باب تھا

اپنی مٹی سے دُوری کے احساس نے قربتیں بخش دیں
ایسا پانسا پڑا، درد وہ مل گیا ہے جو نایاب تھا

○

دعاؤں میں اثر باقی نہیں ہے
کوئی بھی معتبر باقی نہیں ہے

کسی دیوار میں در کس طرح ہو
کوئی آشفتہ سر باقی نہیں ہے

درختوں سے پرندے اُڑ گئے ہیں
کہ اب اُن پر ثمر باقی نہیں ہے

تھکن نے کر دیا یوں بے ارادہ
کہ جیسے اب سفر باقی نہیں ہے

مکیں سب مائلِ ہجرت ہوئے ہیں
مکاں باقی ہے، گھر باقی نہیں ہے

(ابوظہبی)

حسن ناصر

○

زبانِ خلق پر آئی صدا رکتی نہیں ہے
مری جاں، دشت ہو یا گھر ہوا رکتی نہیں ہے

اُترتے ہیں دلوں پر جب صحیفے روشنی کے
صلیبیں گاڑنے سے بھی وفا رکتی نہیں ہے

فضا میں بہتے لمحے روز دیتے ہیں بشارت
سحر کے چاہنے والو! ضیا رکتی نہیں ہے

تمہارا نام دشنامِ زمانہ ہو چکا ہے
کبھی تاریخ کی لکھی سزا رکتی نہیں ہے

یہ سب کچھ آگ بن جانے سے پہلے سوچ لینا
حسن ناصر تعصّب کی وبا رکتی نہیں ہے

○

موسم کے اُلٹی جانب ہے آج بہاؤ سوچوں کا
باہر بارش ہے اور اندر ایک الاؤ سوچوں کا

کس کے نام سیاہی لکھوں کس کو سچا مانوں میں
مجھ کو پاگل کر دے گا اک روز چناؤ سوچوں کا

پیچھے جان لیوا تنہائی، آگے خوف ہزیمت کا
دونوں کو کس موڑ پہ لے آیا ٹکراؤ سوچوں کا

دیواروں سے باتیں کرتے کتنی صدیاں بیت گئیں
آخر کس دن ٹوٹے گا بے درد تناؤ سوچوں کا

شب بھر اپنے دل سے لاکھوں عہد کروں ناصر لیکن
دن ہوتے ہی اور الجھ جائے الجھاؤ سوچوں کا

تنویر سپرا

○

بہرِ عدو جو باعثِ خلجان بن گئے
وہ لفظ کھُردرے مری پہچان بن گئے

جمہوریت پسند تھے، جب تک نحیف تھے
طاقت ملی تو شہر کے سلطان بن گئے

جو بے جواز جھُک گئے، وہ تو مَلک ہوئے
جو طالبِ دلیل تھے، شیطان بن گئے

ہر دَر پہ اُس نے وردیوں والے بٹھا دیے
ہم نے جو گھر بنائے تھے، زندان بن گئے

جن پر لگے تھے کُفر کے فتوے وہی عمل
میرے لیے نجات کا سامان بن گئے

تنویرؔ تب میں تنگ تھا چوروں کے ہاتھ سے
اب مسئلہ مرے لیے دربان بن گئے

○

ہمہ اوقات مر جانے کا ڈر اچھا نہیں ہوتا
پھلا دے جس میں رہتے ہوں وہ گھر اچھا نہیں ہوتا

تعلق اس لیے طرزِ کہن سے میں نے توڑا ہے
کھنڈر معبد کا ہو تو بھی کھنڈر اچھا نہیں ہوتا

یہ بوجھل گٹھریاں بے لطف کر دیں گی سیاحت کو
ضرورت سے فزوں زادِ سفر اچھا نہیں ہوتا

اے تنویرؔ سپرا کاٹ پھینکو اپنے شانوں سے
جو ہر چوکھٹ پہ جھُک جائے وہ سر اچھا نہیں ہوتا

نجیب احمد

○

زر کے طالب ہیں ریت چھانتے ہیں
ہم سب اِک دوسرے کو جانتے ہیں

لاکھ بہروپ، اے جمالِ ہنر
آئینے صورتیں پہچانتے ہیں

اختیارات کا ہو زعم جنہیں
کب کسی کے حقوق مانتے ہیں

اور ہی کچھ رضا خدا کی ہے
ورنہ کیا کیا نہ جی میں ٹھانتے ہیں

جن کے ہاتھوں میں ہیں رُتوں کے چراغ
ہم کو پرچھائیاں وہ جانتے ہیں

چھاؤں مانگیں تو وہ سروں پہ نجیبؔ
سائبانِ غبار تانتے ہیں

○

پیار کرنے کا فن سکھا دیں گے
تجھے پیکر بھی ہم نیا دیں گے

تاج کشکول بن کے پھیلیں گے
یہ گداگر کسی کو کیا دیں گے

ہاتھ لگتے ہی قرض کی چھاؤں
ہم تو گھر کے شجر کٹا دیں گے

کیا خبر تھی کہ روشنی کے لیے
آگ وہ شہر میں لگا دیں گے

خاک پر دھر تو لیں قدم ہم بھی
ہم بھی سب کشتیاں جلا دیں گے

تُو نے مشکیزہ بھر لیا تو نجیبؔ
تیر اہلِ کرم چلا دیں گے

امجد اسلام امجد

○

وہ دمکتی ہوئی لَو کہانی ہوئی، وہ چمک دار شعلہ فسانہ ہُوا
وہ جو اُلجھا تھا وحشی ہَوا سے کبھی، اُس دیئے کو بجھے تو زمانہ ہُوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف، اُس کے اعلان کی، اُسکے امکان کی
رابطہ پھر بھی اُس حُسنِ بے نام سے، جس کا جتنا ہُوا غائبانہ ہُوا

باغ میں پھُول اُس روز جو بھی کھلا، اُس کی زُلفوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارا بھی اُس رات روشن ہوا، اُس کی آنکھوں کی جانب روانہ ہُوا

کہکشاں سے پرے، آسماں سے پرے، رہگزارِ زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہُوا

اب تو اُس کے دنوں میں بہت دُور تک، آسماں ہیں نئے اور نئی دھوپ ہے
اب وہ شب یاد ہو گی اُسے کیوں بھلا، جس کو گزرے ہوئے اک زمانہ ہُوا

موسمِ وصل میں خُوب ساماں ہوئے، ہم جو فصلِ بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس قالین کی طرح بچھتی گئی، سر پہ ابرِ رواں شامیانہ ہُوا

اب تو امجد جدائی کے اُس موڑ تک، درد کی دھند ہے اور کچھ بھی نہیں
جانِ من! اب وہ دن لوٹنے کے نہیں، چھوڑیئے، اب وہ قصّہ پُرانا ہُوا

صفدر سلیم سیال

○

خارِ پُشتوں کی حراست سے نکل آئے ہیں
ہم بھلے وقت میں عزت سے نکل آئے ہیں

اس قدر دُھند تھی پھر منزلِ جاناں کی طرف
لوگ اُس کنجِ مسافت سے نکل آئے ہیں

راز داری کا سلیقہ نہیں آیا تم کو
خواب کچھ دیدۂ حسرت سے نکل آئے ہیں

دُور تک اُن سے ملاقات کے آثار نہیں
ہم یونہی فرطِ محبت سے نکل آئے ہیں

رنگ وہ دستِ شفق پر نہیں اُبھرے پھر بھی
کچھ ستارے صفِ حیرت سے نکل آئے ہیں

وضعداری تو نبھاتے ہیں مگر کیا کیجے
لوگ اُس عہدِ مروّت سے نکل آئے ہیں

اُنھیں پاگل ہی سمجھ کر نظر انداز نہ کر
پھول بہت جھٹر میں جو وحشت سے نکل آئے ہیں

خوف آتا ہے اسی بات سے دُنیا دارو!
ہم گرفتِ کفِ عبرت سے نکل آئے ہیں

جلیل عالی

○

نہ بحر و بر نہ یہ شمس و قمر گھیرے ہوئے ہیں
ہمیں اپنی اناؤں کے بھنور گھیرے ہوئے ہیں

گرفتارِ غبارِ خوفِ فردا ہیں نگاہیں
دلوں کو جا بجا صدیوں کے ڈر گھیرے ہوئے ہیں

فقط باہر کے فتنوں کی حراست میں نہیں دل
درونِ جاں بھی کیا کیا شور و شر گھیرے ہوئے ہیں

نئی پہچان راہوں کا سفر آساں نہیں ہے
کچھ اپنے عیب کچھ اپنے ہُنر گھیرے ہوئے ہیں

نئی یادوں کے رنگوں میں مگن پھرتے ہیں ورنہ
افق تک بے کشش منظر نظر گھیرے ہوئے ہیں

چلی جاتی ہے اپنے ساتھ اک خوش عکس خوشبو
مسلسل کچھ دمکتے بام و در گھیرے ہوئے ہیں

یوسف حسن

○

کہو کہ زیرِ فلک اپنی آبرو کیا ہے
زمیں کا خواب تھا کیا، خواب کی نمو کیا ہے

کچھ ایسے مسخ ہوئے خد و خال چہروں کے
کہ آئینے بھی کہیں اپنے رُو برو کیا ہے

نہ اعتبار ہے کوئی، نہ اختیار کوئی
پھر اس گلی سے گزرنے کی آرزو کیا ہے

وہی نگاہ، وہی راہ آشنائی کی
غبارِ شام میں اور اپنی جستجو کیا ہے

ہم اپنی سمت جو آئیں تو کچھ خبر پائیں
رضائے دوست ہے کیا، نیّتِ عدو کیا ہے

مسافروں کے قدم ڈولنے لگے یوسفؔ
ہوا اور چراغوں میں گفتگو کیا ہے

○

ٹوٹ کر بھی کب بکھرنا ہے مجھے
ایک وعدے پر ٹھہرنا ہے مجھے

تیرے وصل و ہجر بیں رہ کر کھلا
کیسے جینا، کیسے مرنا ہے مجھے

"کس قیامت کا سفر در پیش ہے"[1]
اِک ترے دل سے گزرنا ہے مجھے

تیری ہی رو میں ہے میری زندگی
تیرے ہی غم سے ٹکرنا ہے مجھے

میں فقط تیری طلب میں ہی نہیں
سامنا اپنا بھی کرنا ہے مجھے

پھر کشش جاگی کسی ہم خواب کی
پھر کہیں کچھ کر گزرنا ہے مجھے

یوسفؔ اپنے سر پہ کچھ ہو یا نہ ہو
خاک پر رہ کر سنورنا ہے مجھے

[1] "کس قیامت کا سفر ہے در پیش" ذکی آذر

عدیم ہاشمی

○

دُرونِ صحنِ مسجد ہر نظر سے خوف آتا ہے
خدا کے گھر میں جا کر بھی بشر سے خوف آتا ہے

وہ موسم ہے، نہ جانے ٹہنیوں سے کیا نکل آئے
ثمر آنے سے پہلے ہی شجر سے خوف آتا ہے

نشہ سا ہو گیا ہے جسم کو بیمار رہنے کا
دوا کے نام پر ہی چارہ گر سے خوف آتا ہے

پڑوسی کو پہنچنے میں تو پھر کچھ وقت لگتا ہے
مجھے تو اُس سے پہلے اپنے گھر سے خوف آتا ہے

ابھی تو برف پگھلی ہے، ابھی سے تیزیاں کیسی
ابھی دریا کے پانی کو بھنور سے خوف آتا ہے

وہ بجلی ہے، زیادہ سے زیادہ راکھ کر دے گی
عدیمؔ اُس کی نہیں، اپنی نظر سے خوف آتا ہے

○

کیوں نہ ہم اس کو اسی کا آئینہ ہو کر ملیں
بے وفا ہے وہ تو اُس کو بے وفا ہو کر ملیں

تلخیوں میں ڈھل نہ جائیں وصل کی اُکتاہٹیں
تھک گئے ہو تو چلو پھر سے جدا ہو کر ملیں

پہلی پہلی قربتوں کی پھر اُٹھائیں لذتیں
آشنا! آ پھر ذرا نا آشنا ہو کر ملیں

ایک تُو بھی ہے جو سر سے پاؤں تک ہے انکسار
لوگ وہ بھی ہیں جو بندوں سے خدا ہو کر ملیں

معذرت بن کر بھی اس کو مل ہی سکتے ہیں عدیمؔ
یہ ضروری تو نہیں، اس کو سزا ہو کر ملیں

(امریکہ)

ڈاکٹر زبیر فاروق

○

بہارِ نکہت و رنگت تھا پھر گلاب وہی
تمام رات تھا آنکھوں میں ایک خواب وہی

بدل سکی نہ ہمیں عمر کی رفاقت بھی
سوال اُس کا وہی ہے، مرا جواب وہی

جو ہم نے بھولے سے بچپن کے ساتھ ہی کھو دی
اگر کہیں سے ملے تو پڑھیں کتاب وہی

خمار جتنا بھی ہم کو تھا چشمِ یار سے تھا
وگرنہ بزم وہی شیشہ و شراب وہی

یہ کس خیال سے تم خوش ہو اس قدر فاروقؔ
پسِ غروب تو اُبھرے گا ماہتاب وہی

○

ہر رستے کو بند ایسے بھی کرتی ہے دیوار
دروازوں کے اندر بھی دَر آتی ہے دیوار

پختہ ہو تو آندھی بھی مایوس چلی جائے
خستہ ہو تو جھونکے سے بھی گرتی ہے دیوار

ساتھ میں رہنے والوں کو بھی کر دیتی ہے دور
پیار کے رستے میں جب نفرت بنتی ہے دیوار

باہر دیکھ تو سکتے ہیں پر نکل نہیں سکتے
کبھی کبھی تو شیشے جیسی ہوتی ہے دیوار

تنہائی میں باتیں کرنے سے گھبرا فاروقؔ
ساری باتیں کان لگا کر سنتی ہے دیوار

شہزاد قمر

○

ویسے تو کسے گھر سے محبّت نہیں ہوتی
بس دشت میں اتنا ہے کہ وحشت نہیں ہوتی

ہم سُود و زیاں خوب سمجھتے ہیں عزیزو!
یہ عشق ہے اور اس میں تجارت نہیں ہوتی

وہ کون سا چلّہ ہے جو ہم نے نہیں کاٹا
پر اپنے لیے کوئی بشارت نہیں ہوتی

صُورت سے تو ہوتا نہیں اندازۂ کردار
سائے سے تو پیمائش قامت نہیں ہوتی

کب ہم کسی طوفان کی زد پر نہیں ہوتے؟
کب ہم کو سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی؟

اس درجہ بدلتے ہوئے حالات ہیں اب تو
اس بات پہ حیرت ہے کہ حیرت نہیں ہوتی

شہزاد چلے تم بھی زمانے سے اُلجھنے؟
اک خود سے اُلجھنے کی تو ہمت نہیں ہوتی

○

اس کے سارے مسکن ہیں ذات کے حصاروں میں
آدمی کو دیکھو تو آج بھی ہے غاروں میں

اُس سے کیا بچھڑنا تھا، ہم بچھڑ گئے خود سے
وہ جو گھر کی باتیں تھیں، اب ہیں اشتہاروں میں

وہ تو ہم تھے جن کو بس ڈوب کر بھی جانا تھا
ورنہ کون اُترتا ہے اتنے تیز دھاروں میں

ہم بھی کس حقیقت کے خواب چُننے نکلے تھے
رہ گئی ہیں آنکھیں ہی بے جہت ستاروں میں

گھر کے سب پیالوں میں کس نے زہر گھولا ہے؟
کس نے نفرتیں بانٹیں ماں کے ان دلاروں میں؟

خود ہی اپنی آنکھوں کو دی ہے یہ جلن شہزاد
ہم نے آگ کے منظر خود بھرے نظاروں میں

(بحرین)

شہزاد قمر

○

ایک جیسے منظروں کی دے کے تنہائی مجھے
کون تھا جو کر گیا میرا تماشائی مجھے

جانتا ہوں وہ بھی جو مجھ کو نہیں تھا جاننا
راس آئے اب نہ شاید میری دانائی مجھے

فاصلے سے ہٹ کے چلنا زندگی کے دشت میں
جانے کن رستوں پہ لے جائے یہ بینائی مجھے

تیرگی گھٹتی نہیں ہے، روشنی بڑھتی نہیں
صبحِ کاذب کس مقامِ جبر پہ لائی مجھے

بچ بھی جاؤں تو مرا جینا کوئی جینا نہیں؛
قتل کرنے آگیا ہے جب مرا بھائی مجھے

پھر تو جیسے پتھروں کو بھی زبانیں مل گئیں
ایک لمحے کو ملا کیا اذنِ گویائی مجھے

بے کلی اتنی بڑھی، دل کو قرار آنے لگا
شدتِ غم دے گئی وصفِ شکیبائی مجھے

کب نکل جاؤں بدن کی قید سے شہزاد میں
جانے کب میلے میں لے جائے یہ تنہائی مجھے

(بحرین)

کاوش عباسی

○

مرے روزانہ کے معمول میں طوفان بھر جائے
ہو کچھ ایسا کہ جس سے میرا دل پھر سے بپھر جائے

کبھی سیماب سا رہتا تھا میں، تھکتا نہ تھمتا تھا
اور اب ہلکی سی جنبش بھی مجھے ہلکان کر جائے

مجھے بے حال کر رکھا ہے میری غم پسندی نے
کوئی آئے، مجھے اس خول سے آزاد کر جائے

میں بے تحریک ہوتا جاتا ہوں آہستہ آہستہ
کوئی پھر سے مری جولانیوں میں آگ بھر جائے

ہوں ساکن تو ہوا بھی دل کو لرزا کر گزرتی ہے
لگے ٹھوکر کوئی ایسی کہ دل سے جاں کا ڈر جائے

مرے ماحول میں پلتا ہے میرا چاند سا بیٹا
میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، وہ باپ پر جائے

(سعودی عرب)

صابر ظفر

○

رات کو خواب ہو گئی، دن کو خیال ہو گئی
اپنے لیے تو زندگی، ایک سوال ہو گئی

ڈال کے خاک چاک پر، چل دیا ایسے کوزہ گر
جیسے نمودِ خشک و تر، رُو بہ زوال ہو گئی

پھول نے پھول کو چھوا، جشنِ وصال تو ہوا
یعنی کوئی نباہ کی رسم بحال ہو گئی

تجھ کو کہاں سے کھوجتا جسم زمیں پہ بوجھ تھا
آخر اسی تکان سے، روح نڈھال ہو گئی

کون تھا ایسا ہمسفر، کون بچھڑ گیا ظفرؔ
موجِ نشاطِ رہ گزر، وقفِ ملال ہو گئی

○

کیا ہے یہ زندگی، یہ سخن ذات ہی سے ہے
اپنا معاملہ تو خیالات ہی سے ہے

دن بھر تو مجھ کو رونقِ دنیا رکھے بحال
دل جو بجھا ہوا ہے فقط رات ہی سے ہے

مضمون باندھنے کا بہت شوق ہے مجھے
اور اس کا واسطہ مرے جذبات ہی سے ہے

اس برتری میں کوئی تکبّر ہو، کیا مجال
اپنی غرض تو صرف تری مات ہی سے ہے

ہم جو ظفرؔ کسی نہ کسی کے اثر میں ہیں
وابستگی ہماری طلسمات ہی سے ہے

سعید کوکب

○

کبھی چاند اور سورج کے اجالے تھے مرے گھر میں
سحر کیا شام، دونوں کے حوالے تھے مرے گھر میں

میں جب لوٹا، عجب اک جشنِ ویرانی کا منظر تھا
در و دیوار پر مکڑی کے جالے تھے مرے گھر میں

گلابوں کی طرح بڑھ کر سمیٹے اپنے دامن میں
وہ انگارے جو دشمن نے اچھالے تھے مرے گھر میں

مری دہلیز پر دم توڑنا، غم کا مقدر تھا
مری اولاد کی صورت جیالے تھے مرے گھر میں

میسر جب کبھی ساون رُتیں آئیں تو یاد آیا
کسی نے پیار کے جھولے بھی ڈالے تھے مرے گھر میں

مری کوتاہیوں پر درگزر کرتے تھے سب کوکبؔ
کشادہ دل، کشادہ ظرف والے تھے مرے گھر میں

○

اُداس ہونا نہیں، آنکھ نم نہیں کرنا
کسی بھی حال میں اظہارِ غم نہیں کرنا

کسے خبر کہ کہاں برگ و گل نمو پائیں
کسی بھی شاخِ شجر کو قلم نہیں کرنا

تراش سکتے ہیں لفظوں سے مرمریں پیکر
ترے خیال کی حرمت کو کم نہیں کرنا

ستم جو کرنے پہ آتے تو کر چکے ہوتے
انھیں تو ہم پہ کوئی بھی کرم نہیں کرنا

مجھے اکیلے ہی کرنا ہے یہ سفر کوکبؔ
نہیں! کسی کو بھی اب ہم قدم نہیں کرنا

(دوبئی)

ستّار سیّد

○

یوں تو کچھ بھی نہیں رہا ہے کہیں
دل میں میلہ لگا ہوا ہے کہیں

دُوریوں میں تری صدا کی طرف
ایک جلتا ہوا دیا ہے کہیں

سب اُسی کی تلاش میں گُم ہیں
اِک خزانہ چھپا ہُوا ہے کہیں

وقت کی زد سے بچ نکلتے ہم
بچ نکلنے کا راستا ہے کہیں

عکس در عکس ڈھونڈتے ہیں جسے
منظرِ آنکھوں میں خواب سا ہے کہیں

جس نے رکھا ہوا تھا گرمِ سفر
راستے میں بچھڑ گیا ہے کہیں

اِک صدا سی سنائی دیتی ہے
کوئی جیسے بُلا رہا ہے کہیں

○

بازار نہ کوچے نہ نگر اور طرح کے
کیوں ہو گئے سب لوگ مگر اور طرح کے

تم ساتھ نہیں ہو تو نہ رستہ ہے نہ منزل
درپیش ہیں اب مجھ کو سفر اور طرح کے

تم جن کا مداوا تھے، وہ غم مٹ بھی چکے ہیں
لاحق دلِ خستہ کو ہیں ڈر اور طرح کے

یا رب، ہو اگر اذن تو ہم لوحِ جہاں پر
تحریر کریں شام و سحر اور طرح کے

منصب کے بدلتے ہی بدل جاتے ہیں اطوار
احباب بھی آتے ہیں نظر اور طرح کے

سیّد گلزار بخاری

ہم تو مجبور ہیں عادت سے تجھے دیکھتے ہیں
تو نے سمجھا ہے محبت سے تجھے دیکھتے ہیں

خوش نہ ہو خاک نشینوں کی دعا گوئی پر
پوچھ ان سے بھی جو رغبت سے تجھے دیکھتے ہیں

تو نے کب چاہنے والوں کی پذیرائی کی
شکر کر، اب بھی مروت سے تجھے دیکھتے ہیں

ہمیں کیا کیا نظر آتا ہے تری صورت میں
جب کبھی چشمِ بصیرت سے تجھے دیکھتے ہیں

آئنہ ہی ترے جلووں کا تماشائی نہیں
اور کچھ لوگ بھی حسرت سے تجھے دیکھتے ہیں

ناز تھا جن کو تری بندہ نوازی پہ بہت
کیوں وہ احساسِ ندامت سے تجھے دیکھتے ہیں

کل یہی دوست کہیں اور دکھائی دینگے
آج کس جوشِ عقیدت سے تجھے دیکھتے ہیں

دور گستاخ نگاہی کا ہے جانِ گلزار
اک ہم ہیں کہ شرافت سے تجھے دیکھتے ہیں

تکمیلِ آرزو کا مقام آ گیا تو پھر؟
اٹھ کر چلے ہو، دور میں جام آ گیا تو پھر؟

آشوبِ انتظار میں وقفہ روا نہیں
کوئی کسی گھڑی سرِ بام آ گیا تو پھر؟

کر تو رہے ہو ترکِ مراسم کا فیصلہ
تجدیدِ دوستی کا پیام آ گیا تو پھر؟

دن میں چراغ پھینک دیے تم نے کس لیے
رستے میں دشتِ ظلمتِ شام آ گیا تو پھر؟

قربان کر چکے ہو دل و جاں ہلال پر
پیشِ نگاہ ماہِ تمام آ گیا تو پھر؟

خوگر ہوا ہے سست روی کا یہ قافلہ
سالار کوئی تیز خرام آ گیا تو پھر؟

گلزار دوسروں کی اسیری پہ خوش نہ ہو
تو خود بھی زیرِ حلقۂ دام آ گیا تو پھر؟

افتخار نسیم

○

رنج و الم رہا نہ کسی کی خوشی رہی
کب زندگی میں کوئی گھڑی دائمی رہی

قدموں کے ساتھ ساتھ تھا پتّوں کا شور بھی
اُٹھ اُٹھ کے رہگزار مجھے دیکھتی رہی

میں ناچتا چمکتا رہا نوکِ خار پر
سُورج کی سُرخ آنکھ مجھے گھورتی رہی

مجھ کو بُجھا کے سر کو پٹختی رہی ہوا
بستی میں کس کو پچھلے پہر ڈھونڈتی رہی

میں آئینہ بدست تھا لوگوں کے سامنے
اہلِ ریا سے میری عمر [illegible] دشمنی رہی

○

اُس کے چہرے کی چمک کے سامنے سادہ لگا
آسماں پر چاند پورا تھا مگر آدھا لگا

ہر گھڑی تیار ہے دل جان دینے کے لیے
اُس نے پوچھا بھی نہیں، یہ پھر بھی آمادہ لگا

جس گھڑی آیا پلٹ کر وہ مرا بچھڑا ہوا
عام سے ملبوس میں تھا، پھر بھی شہزادہ لگا

تند اتنی روشنی تھی رنگ بھومی کی نسیمؔ
ہو گئے کردار مدغم، کرشن بھی رادھا لگا

(شکاگو)

مخلص وجدانی

○

جب اپنے بازو کام نہ دیں، کوئی موسم ساتھ نہیں دیتا
بادل نہ ہوا کے سنگ چلیں، ساون برسات نہیں دیتا

ہر صبح سنہری کرنوں سے دھرتی کی مانگ سجاتا ہے
دن بانٹتا پھرتا ہے گھر گھر، یہ سورج رات نہیں دیتا

منصور بھی کیسا انساں تھا، کس شان سے دار پہ کہتا تھا
جاں دینا اس کو آساں ہے جو اپنی بات نہیں دیتا

وہ چاند حسین بہت ہی سہی، دھرتی پھر اپنی دھرتی ہے
میں چاند کو چاند ہی کہتا ہوں، میں تشبیہات نہیں دیتا

کشکول اٹھائے ہیں اس کو جینے کی دعائیں دیتا ہوں
وہ مجھ کو تسلی دیتا ہے لیکن خیرات نہیں دیتا

دھرتی بھی اپنی بانجھ نہیں، پانی بھی وافر ہے لیکن
جو پیڑ لگاتا ہوں مخلص وہ پھل اور پات نہیں دیتا

○

اگرچہ رات کو بیرونِ در اچھا نہیں لگتا
سیاہِ شب کے پہرے ہیں تو گھر اچھا نہیں لگتا

بھٹکنا بھی تو کچھ اچھا نہیں لگتا مگر مجھ کو
انہی راہوں پہ چلنا عمر بھر اچھا نہیں لگتا

وہ جن کی چھاؤں میں دہقان زادے کھیلنا چاہیں
مجھے ان خوش نما پیڑوں میں گھر اچھا نہیں لگتا

وہ خود سر ہے، وہ سرداری کسی کی مان لے کیونکر
اسے تو قد سے اونچا اپنا سر اچھا نہیں لگتا

دکھاتا ہے جو آئینے میں صورت ہو بہو مخلص
مجھے ایسا کوئی آئینہ گر اچھا نہیں لگتا

مقبول عامر

O

کیوں خوابوں کے محل بنائیں کیوں سپنے تعمیر کریں
جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے کیوں نہ وہی تحریر کریں

ہم تو دل کی بات کہیں گے، چاہے وقت کے آہن گر
سوچوں پر تعزیر لگائیں، جذبوں کو زنجیر کریں

دل کے اندر رِستے والے آنسو کس نے دیکھے ہیں
جو نظروں سے اوجھل ہے اُس دُکھ کی کیا تشہیر کریں

بستی کی ساری قندیلیں صبح تلک روشن رکھیں
تیرہ شبی سے لڑنے والے لوگوں کی توقیر کریں

حال اُس نے پوچھا لیکن یہ سوچ کے ہم خاموش رہے
خود تو صدموں سے بوجھل ہے اُس کو کیوں دلگیر کریں

جس کے سارے رنگ مری آنکھوں کو ازبر ہیں عامر
آؤ دل کی دیواروں پر وہ صورت تصویر کریں

O

چرواہا بستی والوں سے کہتا ہے
پربت کے اُس پار بھی کوئی رہتا ہے

جس دریا کے رستے میں دیوار نہ ہو
وہ دریا کس خاموشی سے بہتا ہے

مولا جیسی فطرت ہے اُس بندے کی
دیکھتا ہے سب کچھ لیکن چپ رہتا ہے

غم کی موجیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں
دل کا ساحل دھیرے دھیرے ڈھتا ہے

میری بھیگی آنکھوں میں اُس کا پیکر
جھیلوں میں مہتاب کی صورت رہتا ہے

چاند نے کل شب دریا سے پوچھا عامر
ساحل میرے بارے میں کیا کہتا ہے

اشرف جاوید

○

جو نقش آنکھ نے لکھے سدا سجے ہی رہے
طلسمِ خواب کے موسم ہرے بھرے ہی رہے

یہ معجزہ تھا ترے انتظار کا شاید
چراغ بامِ ہوا پر دھرے، دھرے ہی رہے

لبوں پہ حرف تھے شعلے تھے، برف تھی، کیا تھا!
اگرچہ تیرے قرب کے لمحے بھی اَن کھلے ہی رہے

بشارتوں کی مہک تھی لکیر تا بہ لکیر!
غبارِ بے خبری سے وہ ہاتھ اٹھے ہی رہے

عجیب شور تھا دیوار کے پرے — اُس رات
تمام شہر کی آنکھوں میں رتجگے ہی رہے

شجر بھی کاٹ دیئے ہیں، سفر بھی دھوپ کا ہے
تقاضے راہِ اَنا کے بھی بے تُکے ہی رہے

○

غبارِ شب ہے، فشارِ خوشبو کہ خواب موسم
سحر کی آنکھوں میں جاگتے ہیں سراب موسم

کبھی تو شاخِ دعا پہ حرفِ اثر کھلیں گے
جمالِ نطقِ بہار ہوں گے عتاب موسم

ہوائے شہرِ اَنا کے سب ذائقے ادھورے
پسِ فصیلِ گماں بنے اضطراب موسم

یہ میری مٹی مرے نمو سے تہی رہی ہے
اُگے ہیں بطنِ زمین سے بھی عذاب موسم

سفر سے لوٹے تو لہجہ چہرے کا آئنہ تھا
ملامتوں کی تھکن سے نکلے حجاب، موسم

ہم آپ اپنے گواہ ٹھہرے ہیں — دیکھ لینا
لکھیں گے برگِ ہوا پہ اک دن حساب، موسم

علی اصغر عباس

○

غبارِ شام میں ڈوبا ہے آج کا دن بھی
ہمارے ساتھ مشقت سے تھک گیا دن بھی

کہا جو رُکنے کو ہم نے دو ایک پل کے لیے
مسافرت کا بہانہ بنا گیا دن بھی

عجیب شخص تھا، سورج کے ساتھ ساتھ چلا
گیا سفر پہ تو ساتھ اپنے لے گیا دن بھی

اب ایک عمر گزاریں گے کس طرح تنہا
تری جدائی میں جن سے نہ کٹ سکا دن بھی

پرندے لوٹ کے آئے تو دیکھتے کیا ہیں
شجر کے ساتھ لپٹ کر تو کٹ چکا دن بھی

○

کوئی تخت یا کوئی دار دے
مجھے زندگی کا شعار دے

مرے مُنہ میں اپنی زبان رکھ
مرے لب کو اپنی پکار دے

تو ہدف ہے میری نگاہ کا
کبھی رُخ سے پردہ اُتار دے

کبھی چشمِ زرد کو سبز کر
کبھی دشتِ دل کو بہار دے

تو جو چاہے اپنے کمال سے
مری زندگی کو نکھار دے

مرے آئینے میں جو عکس ہے
اُسے ہر طرح سے اُبھار دے

اسلم فیضی

○

وہ جس کا ضبط رہا اونچے پربتوں کی طرح
کسے خبر تھی کہ روئے گا بادلوں کی طرح

دیا غریب کی کٹیا کا کیا ہوا روشن
کہ جھونکے چلنے لگے تیز آندھیوں کی طرح

گلی گلی یہاں خاموشیاں برستی ہیں
عجیب شہر ہیں، لگتے ہیں مرقدوں کی طرح

پناہ کون سے خطے میں ڈھونڈنے نکلوں
یہاں تو سارا علاقہ ہے دلدلوں کی طرح

یہ میرے جسم پہ لکھی ہیں زردیاں کس نے
ہرا بھرا تھا کبھی سبز جنگلوں کی طرح

سسکتی خواہشیں آخر لہو لہو ہو کر
بکھر گئیں مری پلکوں پہ موتیوں کی طرح

بڑے سکون سے فیضی میں رات بھر سویا
ہوا کا گیت بھی تھا ماں کی لوریوں کی طرح

○

غم کو آفاق کی وسعتیں دے گیا
ہم کو چپ رہنے کی عادتیں دے گیا

پھول بن کر مجھے کس نے آواز دی
کون خوشبو بھری خواہشیں دے گیا

کرتا رہتا ہوں اب خود سے ہی گفتگو
میری تنہائی کو محفلیں دے گیا

وہ جو رہتا تھا کوہِ گراں کی طرح
وقت اس کو فقط گردشیں دے گیا

اب کے سارے پرندوں کو ابرِ کرم
اجنبی دیس کی ہجرتیں دے گیا

رات پاگل ہوا کی ردا اوڑھ کر
خالی گھر پہ کوئی دستکیں دے گیا

اعجاز حسن

○

شجر پر سانپ اک بیٹھا ہوا ہے
پرندہ خوف سے سہما ہوا ہے

ہر اک رُت بیت جاتی ہے مگر کیوں
یہ موسم درد کا ٹھہرا ہوا ہے

سفر کا کس طرح باندھے ارادہ
مسافر سوچ میں ڈوبا ہوا ہے

ابھی تو رات بھر رونا ہے مجھکو
گلا کیوں شام سے بیٹھا ہوا ہے

نکل سکتا نہیں میں اس سے باہر
یہ کیسا دائرہ کھینچا ہوا ہے

ہوئے تحلیل اس میں کس کے آنسو
ہوا کا جسم کیوں بھیگا ہوا ہے

میں جس دن سے جھکا ہوں احتراماً
مرا سَر اور بھی اونچا ہوا ہے

اُسے اعجاز اپنی نیند دے دے
وہ ساری رات کا جاگا ہوا ہے

○

کس آواز میں ضم ہو گیا ہوں
میں اپنی لے میں مدغم ہو گیا ہوں

بڑے ہی حوصلوں سے جی رہا تھا
نہ جانے کیسے برہم ہو گیا ہوں

وہ پچھلی رات کے لہجے میں بولا
جواباً میں بھی شبنم ہو گیا ہوں

ہوا آباد تو صدیاں لگی تھیں
مگر ویران یک دم ہو گیا ہوں

تغزل کی گھنی شاخوں کے اُوپر
ہری سوچوں کا موسم ہو گیا ہوں

چرا کر لے گیا ہے کوئی مجھکو
حصارِ جسم میں کم ہو گیا ہوں

اختر شاد

○

آج اپنے ہی در و بام سے ڈر آیا ہے
کوئی آسیب مرے گھر میں اُتر آیا ہے

شور برپا ہے کہ اس شہر کو خالی کر دو
آگ طوفان کس سمت سے در آیا ہے

پھر پرندہ کوئی پرواز پہ نکلا شاید
پھر ہواؤں میں اِک اُڑتا ہوا پَر آیا ہے

لاکھوں آلام کی یلغار میں رکھا خود کو
تب غمِ دل کو چھُپانے کا ہنر آیا ہے

یوں تو احساس میں سو رنگ تھے رقصاں لیکن
تیرے آنے سے یہاں رنگِ دگر آیا ہے

بوڑھے دربان! درِ شہر پہ مت روک اسے
شادؔ قاصد ہے کوئی لے کے خبر آیا ہے

○

تُو نے شبنم فشاں موسموں کی دعائیں تو دی تھیں مگر پیاری ماں! دیکھ لے
میرے چہرے پہ بے رحم سورج کی جلتی ہوئی انگلیوں کے نشاں دیکھ لے

آسماں! تُو نے کشتِ تمنّا کو سیراب کرنے کے وعدے کیے تھے مگر
وقت کے آتشیں ہاتھ نے نوچ لیں سر پہ پھیلی ہوئی بدلیاں، دیکھ لے

مجھ سے رنگوں کی توقیر، خوشبو کی سوغات کی آرزو کرنے والی! ذرا
میری آنکھوں کے جلتے جزیروں میں پہلے سے مرتی ہوئی تتلیاں دیکھ لے

اس طرح پانیوں میں اتر کر بنا میں تلاشے گا تو جل کے مر جائے گا
ہم نشیں! دیکھ لے دُور سطحِ سمندر سے اُٹھتا ہوا وہ دھواں دیکھ لے

انوار فطرت

○

نیلی فضا میں شب کی بلاؤں کا تخت تھا
گلیوں میں روحِ دشت اترنے کا وقت تھا

ہر چند گفتگو میں بہت شائستگی رہی
لیکن رگوں میں خون کا لہجہ کرخت تھا

خوش تھا شجر کے سادہ پرندوں کو چھیڑ کر
بچہ کسی کا، صحن میں شیشہ بدست تھا

دھکا وہ اور گرمیِ بازار دیکھ کر
میں تھا کہ ہر لحاظ سے آتش پرست تھا

عالم تمام صرفۂ افروغِ شب ہوا
آئینہ مرگِ دید پہ از خود شکست تھا

ق

اِک شہر میں کہ جس کے در و بام سبز تھے
اِک گھر تھا، گھر کے صحن میں ننگا درخت تھا

پھر یوں ہوا کہ شہر کی قندیل بجھ گئی
اور مرحلہ زمیں میں اترنے کا سخت تھا

○

اجڑتے شہر کا منظر ہے اور اک میں ہوں
چہار سو کوئی لشکر ہے اور اک میں ہوں

میں اپنی جنگ میں پہچان بھی گنوا آیا
اب ایک لاشۂ بے سر ہے اور اک میں ہوں

نہ کوئی خواب نہ سایہ، کہ دشت ایسا ہے
اک آئینہ ہے کہ ششدر ہے اور اک میں ہوں

یہ بے چراغ گلی، اک مری ندامت کی
کہ جس پہ خوف مقرر ہے اور اک میں ہوں

کمالِ شیشہ گری ہے کہ پشت کے پیچھے
ہر ایک ہاتھ میں پتھر ہے اور اک میں ہوں

زمان کنجاھی

○

سفر نصیب میں ہے ، سنگِ میل کوئی نہیں
مرے سامنے میری دلیل کوئی نہیں

ری حدوں کا تعیّن تو سامنے ہے مرے
ور کیسے کروں جب فصیل کوئی نہیں

ام شہر کے چہروں کو میں نے دیکھا ہے
ے حبیب سے بڑھ کر جمیل کوئی نہیں

ں سے آدمی ہے مبتلا خسارے میں
ے بڑے بھی ہیں ، اور خود کفیل کوئی نہیں

یکھتا ہوں تو منزل بہت ہے دُور زماںؔ
سوچتا ہوں تو راہِ طویل کوئی نہیں

○

یوں تو حلیہ ہے وہی ، پر اس کا ہالا اور ہے
جو مری آنکھوں میں رہتا ہے وہ چہرا اور ہے

اُس کو محفل کی طلب ہے مجھ کو تنہائی کی دُھن
اُس کی دنیا اور ہے اور میری دنیا اور ہے

کام آسکتی نہیں اشکِ رواں کی آبجو
ڈوبنا ہے جس میں مجھ کو ، وہ تو دریا اور ہے

جب مجھے پہچان کر بھی اُس نے پہچانا نہیں
یوں ہوا محسوس ، برسوں کا شناسا اور ہے

چاہے کچھ بھی ہو زماںؔ ، وہ یاد رکھے گا مجھے
جانتا ہے وہ کہ میرا اس سے رشتہ اور ہے

عابد ودود

○

کوئی حقیقت کوئی فسانہ یاد نہیں
کب ٹوٹا زنجیر کا حلقہ یاد نہیں

جنگل، دشت، سمندر، دریا، یاد ہیں سب
کس کس کا احسان ہے کیا کیا، یاد نہیں

میں تو ساری یادوں کو اب تیاگ چکا
اب تو یہ بھی یاد نہیں، کیا یاد نہیں

کس نے میرے ہاتھ کو تھاما، کون تھا ساتھ
کون تھا اپنا، کون پرایا، یاد نہیں

کن یادوں کے ساغر لے بیٹھے عابدؔ
تجھ کو کیا وہ پیاس کا صحرا یاد نہیں

○

فکر کو حسن بنا، سوچ کا معیار بنا
عرصۂ زیست میں کچھ اپنا بھی کردار بنا

اپنی ہر بات کو معراجِ صداقت نہ سمجھ
راست گوئی کو سدا طرّۂ اظہار بنا

چند دن اور جو مہلت ہے غنیمت ہے یہی
زندگانی کو نہ بے رنگیٔ افکار بنا

یہ زمیں تنگ ہوئی جاتی ہے تجھ پر عابدؔ
اپنا گھر سرحدِ افلاک کے اُس پار بنا

(بریڈ فورڈ۔ انگلستان)

راشد مراد

○

ہمیں گھر کوئی، جس گھر کے سوا اچھا نہیں لگتا
اکیلے ہوں تو پھر وہ بھی ذرا اچھا نہیں لگتا

ہوائے مہرباں! تیرے بڑے ممنون ہیں لیکن
چراغوں کو بُجھا دینا ترا اچھا نہیں لگتا

کبھی وہ عام سے موسم میں دل کو کھینچ لیتا ہے
کبھی اچھی رُتوں میں بھی ذرا اچھا نہیں لگتا

ابھی اُس کم سخن پر حال دل کیا کھولنا راشد
ابھی کیا علم اُس کو اور کیا اچھا نہیں لگتا

○

مزاحمت کا تھا خوف جس سے وہ پیڑ بے جان کر دیا ہے
خزاں کا رستہ اکاس بیلوں نے اور آسان کر دیا ہے

اور اب تو دن کو بھی لوگ گھر سے بلا ضرورت نہیں نکلتے
نجانے کس ڈر نے ہنستا بستا نگر بیابان کر دیا ہے

خطا نہیں کوئی آب و گل کی، قصور سارا ہے باغباں کا
بہار میں ہی چمن میں جس نے خزاں کا سامان کر دیا ہے

ستم یہ کم تو نہیں ہے راشد ہمارے اپنے ہی ساتھیوں نے
عدو کے حملے سے پیشتر ہی نگر کو ویران کر دیا ہے

اسلام عظمی

○

پتہ تو پوچھا بہت میں نے یار لوگوں کا
سراغ گم تھا مگر بے شمار لوگوں کا

مری پکار وہ سنتا تو کس طرح سُنتا
کہ میرے گرد کھنچا تھا حصار لوگوں کا

وہ میرے حال پہ خود مجھ سے بڑھ کے گریاں تھے
بتا نا درد میں کیا غم گسار لوگوں کا

ورائے شہر تمنا تو رونقیں تھیں بہت
مگر یہ شیوہ نہ تھا دل فگار لوگوں کا

کسے بتائیں تعلق ہے کیا مرا تم سے
کہ اب تو عشق ہوا کاروبار لوگوں کا

نہیں تھے اتنے بھی ہم ناشناس چہروں سے
ہمیں تو مار گیا انکسار لوگوں کا

تری پناہ میں آئے تو بے حساب ہوئے
رہا نہ ہم پہ کوئی اختیار لوگوں کا

راشد مُراد

○

اس گھر میں مکیں تیرے رسوا رکھ نہیں سکتے
خالی بھی مگر دل کو سدا رکھ نہیں سکتے

ڈر کر بھی حریفوں سے، گزارہ نہیں ہوتا
لشکر بھی مگر اتنا بڑا رکھ نہیں سکتے

اے تیز ہوا! لاکھ ضمانت ہو، مگر ہم
اب تیری ہتھیلی پہ دیا رکھ نہیں سکتے

پھل پھول ہیں جن پر، نہ گھنی چھاؤں ہے جن کی
ہم ایسے درختوں کو ہرا رکھ نہیں سکتے

سازش ہے یقیناً یہ کسی غیر کی راشد
اپنے تو کبھی کچا گھڑا رکھ نہیں سکتے

حسن عباس رضا

○

کل شب، قسم خدا کی بہت ڈر لگا ہمیں
اک زلزلہ وجود کے اندر لگا ہمیں

ایسا نہ ہو، کہ ڈھنگ ہی اڑنے کا بھول جائیں
صیّاد! ایک دن کے لیے پر لگا ہمیں

آتے دنوں میں، تیرا حوالہ تو بن سکیں
کتبہ سمجھ کے قبر کے اوپر لگا ہمیں

اُس کا بچھڑنا کوئی بڑا سانحہ نہ تھا
لیکن یہ دُکھ پہاڑ برابر لگا ہمیں

کل آئنوں نے روک کے مجھ سے کہا، حسنؔ
کچھ دن حصارِ ذات سے باہر لگا ہمیں

○

کسی حرف گلاب کا سجرا تحفہ بھیجو نا
ہم ترس گئے ہیں خوشبو کو، اب مہکو نا

کبھی پورے چاند کی شب اترو مرے آنگن میں
کبھی خواب جزیرے میں آؤ، مل جاؤ نا

کسی سانولی رُت میں دستک بن کر آ جاؤ
مرا دل دروازہ بند ہے، آکر کھولو نا

ترے بعد تو میرے سارے خواب عذاب ہوئے
کسی ماتمی شام کو پرسہ دینے آؤ نا

ترا حسنؔ رضا، شبِ درد کا آخری تارا ہے
اسے اپنے ماتھے کی تقدیر بنا لو نا

صفدر صدیق رضی

○

جس وقت آنکھیں خواب آئینہ دل ہوتا ہے
شعر نہیں لکھا جاتا ، نازل ہوتا ہے

تنہا کیوں چلتے ہو، کسی کے ساتھ چلو تو
اک رستہ ایسا ہے جو منزل ہوتا ہے

اور کسی کے ہاتھ پہ ہم بیعت نہ کریں گے
دریا صرف سمندر میں شامل ہوتا ہے

زندہ رہنا سہل بہت ہے لیکن انساں
جاں سے گزر جائے تو اس قابل ہوتا ہے

ہر شے نفع نہیں ہر چیز خسارہ نہیں ہے
کچھ کھویا جاتا ہے کچھ حاصل ہوتا ہے

○

بات کی جو بھی زمانے سے حسیں کی اُس نے
صبح کی طرح مگر شام نہیں کی اُس نے

ہجر اور وصل میں اِتنا ہی تفاوت رکھا
آسماں سر پہ تو پیروں میں زمیں کی اُس نے

جو مرے نام کی تسبیح پڑھا کرتا تھا
بھول جانے میں بھی تاخیر نہیں کی اُس نے

میں رعایا بھی نہ تھا اور وہ شہنشاہ نہ تھا
لیکن اک عمر مری زیر نگیں کی اُس نے

ڈھل گئی عمرِ گریزاں کہ شب آغاز ہوئی
عشق کی صبح کہیں شام کہیں کی اُس نے

ایوب پیام

○

اس اتفاق نے یکسر مجھے جھنجھوڑ دیا
ارادہ میں نے کیا، ساتھ اُس نے چھوڑ دیا

بس ایک لمحۂ موجود میں پرندوں نے
ہَوا کا زور کھُلے بازووں سے توڑ دیا

امیرِ شہر نے رسمِ وفا پرستی کو
غریبِ شہر کی مجبوریوں سے جوڑ دیا

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے زوالِ شہر کے بعد
گھروں کو امرِ مشیّت سمجھ کے چھوڑ دیا

حصارِ ذات کے اندر جو شہر تھا آباد
اسے روایتِ سود و زیاں نے توڑ دیا

پیامؔ اور ہی کچھ فاصلے نظر آئے
حدِ یقیں پہ جہاں راستوں نے موڑ دیا

○

کھو دیا وقت، زخم دھونے کا
ایک موقع ملا تھا رونے کا

اب مجھے رنج بھی نہیں ہوتا
اس کو پانے کے بعد کھونے کا

کوئی اندر سے جاگ اُٹھتا ہے
قصد کرتا ہوں جب بھی سونے کا

بعض اوقات بے سبب دل میں
خوف رہتا ہے کچھ نہ ہونے کا

کرامت بخاری

○

شجر نہ بیچ، کوئی سائبان رہنے دے
گئے زمانے کا کچھ تو نشان رہنے دے

تجھے نہیں ہے ضرورت تو کیوں گراتا ہے
مرے لیے تو مرا آستان رہنے دے

بسی ہوئی ہیں جو کب سے وہ بستیاں نہ اُجاڑ
یہ خواہشوں کی نمو کے نشان رہنے دے

ترا تو تیر بھی وزنی ہے اس پرندے سے
نہ کھینچ زور سے اتنی کمان، رہنے دے

میں اب کے بار کسی سے مدد نہ مانگوں گا
بھنور کے رُخ پہ میرا بادبان رہنے دے

اقتدار جاوید

○

جذب ہوئی کالے پانی میں شکل جہازوں کی
رفتہ رفتہ بیٹھ رہی تھی گرد آوازوں کی

اک یلغار کے بعد وجود سمیٹیں، زخم گنیں
اک یلغار ابھی باقی ہے تیر اندازوں کی

بھید بھری خاموشی والا رستہ اُس تک جائے
اِک ویران سرائے میرے گہرے رازوں کی

سرحد کی بستی سے خیر کی خبریں آتی تھیں
خون آلود قمیضیں تھیں زینت دروازوں کی

پھر اس ڈھول کے پیچھے شاہ سوار دکھائی دیا
پھر صحرا میں پھیل گئی خوشبو آوازوں کی

خان محمد خلیل

○

ضبط ایسا بھی نہ ہو دل کو جو پتھر کر دے
دکھ دیے ہیں تو پھر آنکھوں کو سمندر کر دے

زیست کم مایہ سہی، جسم برہنہ تو نہ ہو
میری چادر کو ترے قد کے برابر کر دے

میرے ہاتھوں کی لکیریں بھی کبھی چھوٹ کہیں
جو مقدر میں نہیں اُس کو مقدر کر دے

یدِ بیضا کا طلب گار نہیں ہوں لیکن
میری بجھتی ہوئی راتوں کو منوّر کر دے

وہ سیہ بخت جو آنکھیں بھی گنوا بیٹھے ہیں
ان کے بے چہرہ خیالات کو منظر کر دے

○

میں تنہائی کی قسمت، تُو اوروں کی تقدیر بنی
آنکھیں زخمی کرنے والے خواب کی یہ تعبیر بنی

دُھوپ کی پہلی دستک سے ہی موم کی قربت پگھل گئی
مانگے کا زیور تھی، جو شب بھر کو مری جاگیر بنی

اُمیدوں کے ساحل اب سنسان جزیروں جیسے ہیں
موجِ شکست اسے لے ڈوبی، ریت پہ جو تصویر بنی

ہم دونوں کے اپنے مسائل تھے جو خون رُلاتے رہے
میں نے بھی کب عہد نبھایا، تو بھی کون سی ہیر بنی

اکثر دل نے شہرِ وفا کو چھوڑ کے جانا چاہا ہے
اکثر تیری دوستی لیکن قدموں کی زنجیر بنی

ناصر بلوچ

○

ہوا کو توشہ کیا اور صدا کو جادہ کیا
کہ ہم نے کوہِ ندا کا سفر ارادہ کیا

وہاں، دیدۂ عبرت بہت ہوا ہم پر
وہ اصل میں تھا بہت کم جسے زیادہ کیا

گماں ہے قبل بھی اک شکل میں ظہور رہا
یہ لگ رہا ہے کسی بات کا اعادہ کیا

اُداس دل میں تری یاد عکسِ گُل سی تھی
برہنہ شاخ نے اس رنگ کو لبادہ کیا

غیور طبع تھے، پہلو بچا گئے ناصرؔ
کنیزِ دہر نے دامن بہت کشادہ کیا

○

ہمیں سفر کا ستارہ جو استعارا ہوا
تو پھر تلاطمِ امکاں ہی کنارا ہوا

اک آئینے کے مقابل ہے آئینہ تصویر
اک اور عکس کسی نے ہے یاں اُتارا ہوا

یہ عہد وہ ہے جہاں خواب بھی غنیمت ہیں
طلسمِ خواب ہمیں اس لیے گوارا ہوا

گُلِ مراد سرِ شاخِ وصل کھلنے لگا
جمالِ دوست کا موسم کو جب اشارہ ہوا

وہ میں تھا، کھینچ لیے جس نے ہاتھ دُنیا سے
سمیٹی جس نے یہ دولت اُسے خسارا ہوا

خاور نقوی

○

کبھی تو نیند آ جائے کبھی تو رات ڈھل جائے
اجالا ہو نہ ہو لیکن یہ اندھی رُت بدل جائے

میں اس ڈر سے کبھی کوئی کھلونا گھر نہیں لایا
کہ اک بچے کو دوں تو دوسرا شاید مچل جائے

جہاں سے بھی خبر آئی، اداسی کی خبر آئی
کوئی ایسی خبر، جس سے یہ مردہ دل سنبھل جائے

کوئی تحریر ایسی جو جبینِ وقت پر چمکے
کوئی تقریر جس سے قلبِ قاتل بھی پگھل جائے

کبھی تو ہو ہمیں توفیق ردِّ جبر کی خاورؔ
کبھی تو موت کا خطرہ ہمارے سر سے ٹل جائے

ارشد جاوید

○

گرہیں کیسی دلوں میں ہوں وہ پل میں کھول لیتا ہے
وہ ظالم جس سے بھی دو چار پل کو بول لیتا ہے

شکاری جانتے ہیں، کیسے زد پہ اُس کو آنا ہے
پرندہ یوں تو پہلے سے پروں کو تول لیتا ہے

زیادہ دیر تک اُڑتا نہیں اُونچی فضاؤں میں
پتنگ اک ڈھیل پا کر جو ہزاروں جھول لیتا ہے

یہ تاجر کس قبیلے کے یہاں جاویدؔ بستے ہیں
کہ ہر اک بات کرنے کا یہاں پر مول لیتا ہے

اختلافات

رشید ملک، عبد اللہ جاوید، امجد اسلام امجد، عارف محمود، طیّب منیر، یوسف حسن، خیر الدین انصاری، احمد لطیف، طاہر اسلم گورا، علی تنہا، افتخار بخاری، ابو نعمان، رؤف امیر، سیّد نور محمّد قادری، ظفر منصور، غافر شہزاد، اکبر کاظمی، راسخ عرفانی، عبد الرّحیم ندیم، اسعد بدایونی

بہتر یہ ہے کہ بات ان کوتاہیوں سے شروع کی جائے جو مجھ سے "اساطیر" کی قسط اول میں سرزد ہوئی ہیں۔

۱۔ قسط کے آغاز میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ اساطیر پر گفتگو تین اقساط پر مشتمل ہوگی۔ چند سطور کے بعد اس مطالعے کا جو خاکہ پیش کیا گیا اس میں صرف دو اقساط کا ذکر ہے، یعنی (۱) اساطیر کا عمومی مطالعہ اور (۲) رگ وید کی اساطیر جو اب زیادہ وسیع تناظر میں ہندو اساطیر کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس مطالعہ کی اقساط تین ہی ہوں۔ تیسری قسط کو اساطیر کے فیلسوفی تناظر پر مشتمل ہونا تھا جس میں اساطیری شعور، اساطیر میں علت و معلول کے اصول کا عمل، ذات و صفات کی وحدت کا اساطیر کے حوالے سے تذکرہ اور اسی حوالے سے زمان و مکان کا تصور اور اساطیر کی معروضی اور موضوعی جہات وغیرہ پر بحث مقصود تھی۔ یہ تمام موضوع ادق بھی ہیں اور طویل بھی۔ چنانچہ خیال یہ آیا کہ اگر یہ مباحث شروع ہو گئے تو انڈالوجی کے بہت سارے موضوعات سے صرفِ نظر کرنا پڑے گا اس لئے صرف دو اقساط پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

۲۔ فنون کے صفحہ ۱۹ پر یونانی لفظ متھوس کے انگریزی ہجے میری غفلت کی وجہ سے غلط درج ہو گئے ہیں۔ صحیح ہجے یہ ہیں: MUTHOS

۳۔ صفحہ ۲۶ پر اساطیر کے تقابلی مطالعہ کی کچھ وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں ایک حوالہ یوں درج ہو گیا ہے (۱۹۶۱-۶۵) میری کوتاہی کی وجہ سے اس میں اس مصنف کا نام حذف ہو گیا ہے۔ صحیح حوالہ یہ ہے (اولڈن برگ ۱۹۶۱-۶۵) اسی پیراگراف میں دوسرا حوالہ یوں درج ہو گیا ہے (آغا ۳۹) اور اس کتاب کا ذکر کتابیات میں اس طرح آیا ہے: وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج وغیرہ۔ یہ بڑی سنگین حماقت ہے۔ اصل حوالہ یوں ہونا چاہئے تھا (وزیر آغا ۳۹) اور کتابیات میں اسے یوں درج ہونا چاہئے تھا: وزیر آغا، ڈاکٹر: اردو شاعری کا مزاج وغیرہ۔

۴۔ زیرِ نظر قسط میں چند حوالے ارنسٹ کیسرر سے بھی تھے۔ اس مصنف کا نام صحیح نہیں لکھا گیا۔

ان کوتاہیوں بلکہ حماقتوں کے لئے میں شرمندہ ہوں اور جناب ڈاکٹر وزیر آغا، قارئین "فنون" مدیر "فنون" اور کاتب

"فنون" سے معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے تمام متعلقہ حضرات درگذر سے کام لیں گے اور میری معذرت قبول کریں گے۔

بہاولپور کے کہنہ مشق صحافی اور ادیب و شاعر جناب مسعود حسن شہاب دہلوی کی شاہکار کتاب "مشاہیر بہاولپور" پر جناب محمد کاظم کا مقالہ پاکستان کے علمی و ادبی رجحانات پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں چھپنے والی بیشتر علمی کتابوں کا پروٹوٹائپ ہے (مندرجہ ذیل ملاحظات کا اطلاق ادب کی تخلیقی کتابوں پر نہیں ہوتا)

ہمارے ہاں کے بیشتر متخصصین — ایسے حضرات جو اپنے سروں پر دستار فضیلت (پی ایچ ڈی) سجائے پھرتے ہیں اور وہ جو اپنے اپنے شعبوں میں منتہی ہونے کے دعویدار ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہر حرف کو اس شعبے میں حرف آخر سمجھا جائے، ایسی کتابیں لکھتے ہیں کہ اگر ان کو کتابوں کے بین الاقوامی معیاروں پر ناپا تولا جائے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارے یہ مصنفین کتابیں یوں لکھتے ہیں جیسے مرغی انڈے دیتی ہے۔ ان کی ہر کتاب کی اشاعت کے ساتھ یہ اعلان چھپا ہوتا ہے کہ یہ صاحب دس کتابوں کے مصنف ہیں یا پندرہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ کچھ ایسے مصنفین بھی ہیں جو ہر تین مہینے کے بعد ایک کتاب مارکیٹ میں لے آتے ہیں۔ ایسی تصانیف کو اگر غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ کتابیں قلم سے نہیں گوند اور قینچی سے "لکھی" گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے ایک امریکی / یورپی مصنف واشنگٹن اروِنگ نے اپنے مقالے "بک مینوفیکچرنگ" میں اس عمل کا ایک بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

لکھنا اور پھر کتاب لکھنا ایک انتہائی سنجیدہ عمل ہے۔ یہ ابلاغ کا اہم ترین عمل ہے اور اتنا ہی نازک۔ حافظ کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ "ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداریست"۔ ہمارے مصنفین اس سے پورا پورا انصاف نہیں کرتے۔ چنانچہ ہماری علمی کاوشوں کی نمایاں خصوصیات وہی ہیں جن کا تذکرہ جناب محمد کاظم نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔ یعنی

۱۔ ہماری بیشتر علمی کاوشوں کا معیار ایم اے کے مقالات سے بلند تر نہیں ہوتا۔

۲۔ ہمارے مصنفین سنی سنائی باتوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اس طریقے سے اکٹھی کی گئی اطلاعات یا معلومات کی تصدیق کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ ان کوتاہیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مصنف پر سے قاری کا اعتماد اٹھ جاتا ہے جو دوشیزگی کی طرح ایک دفعہ ضائع ہو جانے پر دوبارہ بحال نہیں ہو سکتا۔ مثالیں تو بہت ہیں لیکن مثالیں پیش کرنا دل آزاری کا سبب بن سکتا ہے اس لئے ان سے احتراز بہتر ہے۔

۳۔ تصنیف و تالیف کی علمی کاوشوں میں مواد کی تنظیم ایک سنگین مرحلہ ہے۔ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ ہر خیال، ہر نظریہ پہلے سے موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو۔ ایک مصنف جو اوریجینل کام کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اپنے مخصوص نقطہ نظر کے مطابق وہ اپنے مواد کو اس طرح پیش کرے کہ مصنف کے مافی الضمیر تک پہنچنے میں اس کے قاری کو، جس کے لئے یہ کاوش کی گئی ہے، قطعاً کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ وہ خیالات اور تصورات جن کا ابلاغ مصنف کو مطلوب ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے بیشتر مصنفین اپنے مواد کو منظم کرنے میں اتنا تردد

نہیں کرتے۔

۴۔ ہماری بیشتر علمی کاوشیں موضوعات کا پورا پورا احاطہ نہیں کرتیں۔ ان میں موضوعیت بھی در آتی ہے۔ بلکہ کچھ حضرات اپنے تفاخر کو اجاگر کرنے کے لئے تصنیف و تالیف کی مصیبت اپنے سرے لیتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی علمی کاوش اگر معروضیت کے عنصر سے عاری ہو تو وہ درخور اعتنا نہیں ہوتی۔

۵۔ ہمارے مصنفین کے لئے اپنی نیازمندانہ اور دست بستگی کی روش سے دست بردار ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ مثال یہی کتاب ہے۔ کئی کتابیں تو محض اپنی نیازمندی کے اظہار کے لئے یا دوستوں اور احباب کی خوشنودی کے لئے ہی معرض وجود میں آئی ہیں۔

۶۔ کسی بھی علمی کاوش کی جان مصنف کا اسلوب یا سٹائل ہوتا ہے۔ بدنصیبی سے ہمارے مصنفین اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اردو داں طبقے تک تو سٹائل کے جدید تصورات ابھی تک پہنچ ہی نہیں پائے۔ سٹائل کا ایک انتہائی ضروری عنصر شہادت پیش کرنے کا طریقہ اور اس شہادت کی نشاندہی بذریعہ حواشی یا فٹ نوٹس کرنا ہے تاکہ قاری اس شہادت کو خود پرکھ لے اور اس موضوع پر پڑھنے کی اسے مزید تحریک ہو۔ اس ضمن میں ہمارے مصنفین نہ تو صحیح انداز اپناتے ہیں اور نہ ہی قاری کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ بامر مجبوری ان امور کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر جمیل جالبی آج کل پروفیسر عزیز احمد مرحوم کی انگریزی کتاب STUDIES IN ISLAMIC CULTURE - IN THE INDIAN ENVIRONMENT - آکسفورڈ ۱۹۶۴ء کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ مجلہ اقبال (بزم اقبال، لاہور جلد ۲۶ شمارہ ۴) میں اس ترجمے کا ایک چھوٹا سا حصہ بعنوان "اقبال کا نظریہ پاکستان" شائع ہوا ہے۔ اس میں پہلا اقتباس سر ہملٹن گب کی کتاب MODERN TRENDS IN ISLAM (شکاگو ۱۹۴۵ء) سے ہے۔ گب کا نام تو متن میں آگیا ہے لیکن حواشی میں صرف ماڈرن ٹرینڈز ان اسلام (۱۹۴۵ء) لکھا گیا ہے۔ اب اگر کوئی قاری یہ حاشیہ دیکھتا ہے تو لامحالہ اسے واپس متن میں جانا پڑے گا اور اس کتاب کے مصنف کا نام تلاش کرنا پڑے گا۔ اس عمل سے قاری کو الجھن ہوگی اور یہ الجھن ابلاغ کے اس رشتے پر اثر انداز ہوگی جو قاری اور مصنف (مترجم) کے درمیان ہے۔ اس الجھن کا بار بار اعادہ ابلاغ کے عمل کو مجروح کرے گا اور مصنف (مترجم) کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس عمل میں قاری کا زیاں تو ہوگا ہی لیکن مصنف کا زیاں اس سے کہیں زیادہ ہوگا کیونکہ کتاب لکھنے میں محنت تو مصنف یا مترجم نے کی ہے۔

اس مقالے میں اس قسم کی دوسری مثال خود اقبال کی اپنی کتاب THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS - THOUGHT IN ISLAM - ہے۔ یہ کتاب پہلی بار آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد محمد اشرف لاہور نے اس کے کئی سستے ری پرنٹ شائع کئے۔ معلوم نہیں اقبال نے اس کتاب کی تصنیف کے وقت حواشی سے کیوں گریز کیا۔ حالانکہ اس کی شاعری میں ہر جگہ حوالے ملتے ہیں۔ بہرحال یہ کوتاہی اقبال کے کھاتے میں ہی جاتی ہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر سعید شیخ نے نہایت عرق ریزی سے اس کتاب کے حواشی تیار کئے۔ ان کے اس ادارے سے فارغ ہونے کے بعد ثقافت اسلامیہ نے یہ کتاب شائع کر دی یہی کتاب

عین بعین ایک طرح کے کاغذ، ایک انداز کی پرنٹ، ایک ہی فونٹ، ایک سی جلد، اقبال اکیڈیمی نے بھی بیک وقت اپنے نام سے شائع کر دی۔ فرق صرف ڈسٹ کور کے پہلے صفحے کا ہے۔ اب جس قاری کو کتاب کی اشاعت کے بارے میں ان باریکیوں کا پتہ نہ ہو تو اس کے لئے حوالے کے طور پر صرف ری کنسٹرکشن لکھ دینا ایک مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ اس حوالے کی جانچ پڑتال کے لئے یا اقبال کے اس بیان کو اوریجنل صورت میں دیکھنے کے لئے کون سے ایڈیشن کی طرف رجوع کرے گا۔ آکسفورڈ والی کتاب کا فارمیٹ اشرف کے ری پرنٹس کا فارمیٹ اور ثقافت اسلامیہ/ اقبال اکیڈیمی کا فارمیٹ سب آپس میں مختلف ہیں ——— اس وجہ سے مختلف ایڈیشنوں کے صفحات مختلف ہوں گے اور یہ اختلاف قاری کی سراسیمگی کا سبب بنے گا اور مصنف/ مترجم کا اعتماد مجروح ہوگا۔ ویسے پروفیسر عزیز احمد کے پیش نظر آکسفورڈ والا ایڈیشن تھا اور ان کے تمام حوالوں کا تعلق اسی ایڈیشن سے ہے۔ یہ اب بالکل نایاب ہے۔ اس لئے قاری کی سہولت کے لئے اس کتاب سے حوالوں پر نظر ثانی بہت ضروری ہے اور حوالہ اس کتاب سے ہونا چاہیئے جو قاری کی دسترس میں ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ یہ مقالہ کتاب کا محض ایک حصہ ہے اور ان سارے امور کی کتاب میں وضاحت کر دی گئی ہے یا کر دی جائے گی۔ جب مقالہ علیحدہ شائع ہو رہا ہے تو اسے اپنی ذات میں مکمل ہونا چاہیئے۔ معلوم نہیں وہ شخص جو آج یہ مقالہ پڑھ رہا ہے، آئندہ جمیل جالبی کا کتابی صورت میں یہ ترجمہ پڑھتا بھی ہے کہ نہیں۔ شائد اسے کتاب پڑھنے کا موقع ہی نہ ملے یا وہ اسے درخور اعتنا ہی خیال نہ کرے۔ یہ مقالہ پڑھ کر جو خاکہ مصنف/ مترجم کے بارے میں قاری نے اپنے ذہن میں بنایا ہے وہ ویسے ہی رہ جائے گا۔ اس طریق کار میں مصنف/ مترجم کا زیاں ہے اور قاری کی سراسیمگی۔ یہ محض بے مقصد خانہ پُری ہے۔

اس مقالے کے حواشی کا معیار بحیثیت مجموعی کئی دوسرے مصنفین سے بہتر ہے۔ حال ہی میں (۸۸/۱۹۸۷ء) سندھ یونیورسٹی نے اردو زبان کے مصنفین کی راہنمائی کے لئے مجلہ تحقیق شائع کرنا شروع کیا ہے۔ جس میں تحقیق کے علائم و رموز سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ آئندہ لکھنے والے شاید اس سے کچھ راہنمائی حاصل کریں۔

ایک اہم چیز جو ہمارے مصنفین متواتر نظر انداز کرتے آرہے ہیں وہ لفظ کی حرمت ہے۔ تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب نے لفظ کو مقدس قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں لفظ تمام جانداروں اور غیر جانداروں پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ مصریوں کا قدیم مذہب اس بات کو قبول کرتا ہے کہ تمام دیوتا لفظ سے پیدا ہوئے اور انہوں نے زمین و آسمان اور کائنات کو تخلیق کیا۔ ایکسپر:
THE PHILOSOPHY OF SYMBOLIC- FORMS, YALE UNIVESITY 1955 VOL. II P. 2[illegible]
ویدک مذہب لفظ کی اندرونی طاقت کو اپنا سرچشمہ خیال کرتا ہے۔ مقدس الفاظ کے صحیح استعمال سے ایک پجاری یا کوئی رشی یا منی نہ صرف انسانوں پر بلکہ دیوتاؤں پر بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ الفاظ آتے جاتے ہیں لیکن ان کے پس پردہ ابدی اور لازوال سماوی لفظ موجود ہے۔ رگ وید میں پوری ایک مناجات (۱۰-۱۲۵) واچ کے متعلق ہے جو نطق کی دیوی ہے اور کائنات پر حکمرانی کرتی ہے۔ ویدک مذہب میں ناد مقدس ہے۔ ناد سے الفاظ مرتب ہوتے ہیں اور ان الفاظ سے حیات اور کائنات ترتیب پاتے ہیں۔

عہد نامہ عتیق بتاتا ہے کہ یہ کائنات لفظ کے ذریعے وجود میں آئی:
"خدا نے کہا کہ روشنی ہو اور روشنی ہوئی" (باب اول۔ ۴، اردو ترجمہ، سوسائٹی آف سینٹ پال روما ۱۹۵۸ء)

عہد نامہ جدید میں آیا ہے:
ابتدا میں کلمہ تھا
کلمہ خدا کے ساتھ تھا۔
اور کلمہ خدا تھا
یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا
اسی سے سب کچھ پیدا ہوا (محولہ ترجمہ، عہد نامہ جدید، یوحنا ۱تا۲)

یہاں کلمے یا لفظ کے مابعد الطبیعیاتی معانی ــــ خدا یا حضرت عیسٰیؑ سے قطع نظر۔ لفظ کی بحیثیت لفظ کے اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ برٹرنڈ رسل نے بھی یہاں عام فہم معانی یعنی لفظ ہی لئے ہیں (ہیومن نالج) اور اسلام بھی تائید کرتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے کائنات کو لفظ 'کُن' سے پیدا کیا۔

آلڈس ہکسلے کہتا ہے کہ الفاظ سے وہ ڈوری بنتی ہے جس پر ہم اپنے تجربات لٹکاتے جاتے ہیں۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ عام روزمرہ کی سطح پر بھی لفظ "کارخانہ ہے ایک جادو کا"

ہمارے ہاں تصنیف و تالیف کا عمل ایک وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ الفاظ کا ایک سیل بے پایاں ہے جو امڈا چلا آتا ہے۔ دھڑا دھڑ کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔ وہ پی ایچ ڈی صاحبان جن کے پاس خود کہنے کو کچھ نہیں، قینچی اور گوند کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ مارکیٹ میں کتابوں کا سیلاب آیا ہوا۔ اقبال سب سے زیادہ تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ اس کے نذر علی افکار (؟) سے لے کر اس کے شاہین، بشیر، خچر اور چیونٹی تک پر لوگ "تحقیقی مقالات" لکھ لکھ کر بازار میں لا رہے ہیں۔ دوسری طرف ناشر ایسے ہیں جنہوں نے تمام کالجوں کی لائبریریوں کے سربراہوں کو اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے۔ یہ لوگ اپریل کے مہینے میں کتابیں خریدنے کے لئے لاہور آتے ہیں۔ یہ ناشر انہیں ہوٹلوں میں ٹھہراتے ہیں، شاپنگ کرواتے ہیں، یاروں دوستوں سے ملاقاتیں کرواتے اور دعوتیں کرتے ہیں اور سب سے آخر میں کتابیں خریدتے ہیں اور سال بھر کا خرچہ جیب میں ڈال کر آئندہ سال پھر آنے کا پکا وعدہ کر کے گھروں کو لوٹتے ہیں۔

علمی اداروں کا حال کچھ مختلف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کارکردگی کو ان کی شائع کردہ کتابوں کی تعداد سے ناپا جائے گا۔ چنانچہ جس ادارے کا سربراہ جتنا نااہل ہے یا جتنا ادارے کے لئے ناموزوں ہے، اس کی شائع کردہ کتابوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہے۔ مثالیں دینا چنداں احسن نہیں لیکن مشاہدے میں آئی ہوئی بات نہ کہنا بھی بہت مشکل ہے کیونکہ پاکستانی قوم نے ۵ اپریل ۱۹۷۹ء کو لفظ "احتساب" اپنی لغت سے نکال باہر پھینکا تھا۔ ہمارے ہاں اب یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔

اقبال اکیڈیمی نے ۱۹۷۶ء میں کرائے پر بہت سی کتابیں تصنیف کروائی تھیں۔ ان سب کی "کوالٹی" "سب سٹینڈرڈ" تھی۔ ان کتابوں کے کچھ مصنفین ایسے بھی تھے جن کا اقبال کا مطالعہ پاکستان ٹی وی کی طرح "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

سے آگے نہیں تھا۔ اب یہ کتابیں اقبال کی تفہیم کے راستے میں ہمالیہ بن کر کھڑی ہیں۔ جب تک اس ہمالیہ کو عبور نہ کر لیں وہ اقبال کو چھو بھی نہیں سکتے۔ ان اداروں کے بعض سربراہان ایسے بھی ہیں جو اپنے کرم فرماؤں سے اپنی نیاز مندی کا اظہار ان اداروں کے خرچ پر کتابیں چھپوا کر کرتے ہیں۔

ان حالات میں ہمارے ہاں الفاظ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ الفاظ کے تقدس کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا جاتا۔ ان کا غلط استعمال کر کے ہم قدم قدم پر ان کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کے بدلے ہیں الفاظ اپنے معانی سے دست کش ہوتے جا رہے ہیں۔ روزمرہ کی گفتگو میں ہی کئی الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنے مفاہیم کھو چکے ہیں۔ آج سے چار پانچ سو سال پہلے لفظ مولوی، ملا اور مولانا علم و فضل کے درجہ کمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیسے ملا محسن کاشانی، مولوی جلال الدین رومی، لیکن ہمارے ہاں آج یہ الفاظ بے وقعت ہو چکے ہیں۔

اگر الفاظ کا صحیح استعمال نہ کیا جاتے اور ان کی حرمت اور تقدس کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا جاتے تو یہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو مفاہیم سے علیحدہ کر لیتے ہیں اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آج کل عظیم، نامور، مشہور و معروف، اہم، بے مثال، ممتاز، حضرت، علامہ، آفاقی وغیرہ الفاظ ہمارے ہاں بے وقعت ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔

نئی حکومت کے آنے پر پاکستان ٹی وی کچھ محاورے بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔ یہ ہیں "امن عامہ میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں دی جاتے گی"، "صورتِ حال تسلی بخش ہے"، "تہیہ کر رکھا ہے" اور "عزم کر رکھا ہے"۔ جیسے فلاں فلاں پارٹی نے غربت مٹانے کا تہیہ کر رکھا ہے یا عزم کر رکھا ہے۔ کچھ اور کلیشے جو پی ٹی وی استعمال کرتا ہے یہ ہیں، باہمی دلچسپی کی گفتگو، بات پر زور دینا یا بات زور دے کر کہنا، قومی یک جہتی، نظریاتی سرحدیں وغیرہ ان کے بے دریغ اور بے محابہ استعمال سے ایک طرف تو یہ خبر بنانے والے صاحب کی زبان سے بے خبری کا اعلان ہے اور دوسری طرف بے جا کثرتِ استعمال سے یہ الفاظ اپنے مفاہیم سے دست کش ہو رہے ہیں۔ سامع پر اب یہ کوئی مثبت تاثر نہیں چھوڑتے۔ جب کوئی مصنف یا ادارہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے ایسے مردہ یا قریب المرگ الفاظ کا سہارا لے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ برتن فکر سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ محض ایک خالی ڈبہ رہ گیا ہے جس میں صرف کلیشے کھنک رہے ہیں۔

جب کسی تہذیب یا ثقافت میں الفاظ بے معنی ہونے لگیں تو اس ثقافت یا تہذیب کا رو بہ زوال ہونا لازم آتا ہے۔ ہمارے اخلاقی، علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی انحطاط میں یہ عمل صاف نظر آ رہا ہے۔ الفاظ کا بے معنی ہو جانا عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ ہی ہیں جو انسانی رشتوں، معاشروں اور بنی نوع انسان کو متحد رکھے ہوتے ہیں۔

پروفیسر رالف رسل نے ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" پر اپنے تبصرے کا عنوان رکھا تھا۔ HOW NOT TO WRITE THE HISTORY OF URDU LITERATURE جو شکاگو کے ANNUAL URDU JOURNAL میں چھپا تھا اور یہاں کے کسی اخبار میں بھی نظر آیا تھا۔ اس تبصرے میں چند ایک باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو انسان ان ٹھوکروں سے بچ سکتا ہے جو "بہاولپور کے کہنہ مشق صحافی اور ادیب و شاعر جناب مسعود حسن شہاب دہلوی" نے کھائی ہیں۔

بات بڑی لمبی ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی۔ جناب شاہنواز زیدی "فنون" میں نو وارد ہیں لیکن آتے ہی انہوں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ اردو بڑی تہی دامن زبان ہے۔ فنونِ لطیفہ سے تو اس کا دامن بالکل خالی ہے۔ مصوری پر مواد تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر زیدی صاحب مسلسل لکھتے رہیں تو میری طرح کے اور بہت سے قارئین اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ نظریۂ فن پر اقبال کے فارسی کلام میں بڑا مواد ہے۔ "پیامِ مشرق" کی نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اُمید ہے زیدی صاحب اس موضوع پر علیحدہ مقالہ لکھیں گے۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

جناب محمد علی صدیقی نے غالب کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر پر بڑی کامیابی سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ جناب ابوالخیر کشفی (اردو شاعری کا سیاسی پس منظر) کے کام کو آگے بڑھانے کی اہم کاوش ہے۔ اس موضوع پر خواجہ منظور حسین مرحوم نے بھی کچھ کام کیا تھا لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اُمید ہے کہ صدیقی صاحب اس کام کو جاری رکھیں گے اور ہم لوگ گل و بلبل کے جالوں کو عبور کر کے اپنے شعراء تک پہنچ سکیں گے جو اپنے اپنے وقت میں معاشرے کی آنکھیں تھے۔ زندگی کے سنگلاخ حقائق کو ادب سے منسلک کر کے ان دونوں کے باہمی رشتوں کی نشاندہی کرنا اہم تنقیدی کاوش ہے۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں تہنیت۔ باقی فنون ابھی پڑھا نہیں۔

رشید ملک (لاہور)

تازہ شمارہ

"فنون" کی اشاعت نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء پیشِ نظر ہے۔ پہلے حصّۂ مضامین پر باتیں۔ انڈالوجی (۴) اساطیر (۱) میں رشید ملک نے اساطیر کا عمومی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ مطالعہ ایک مستند خزینۂ معلومات ہے۔ اساطیر کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں، اس کی وضاحت لائق مقالہ نگار نے جس تفصیل سے کی ہے اس کی داد دینا ممکن نہیں ہے۔ اس کا انداز تحقیقی ہے اور موضوع پر ہر ممکنہ زاویے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا اصل مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاری موضوع سے نہ صرف متعارف ہو بلکہ اس کی جانب ذہن و دل سے متوجہ بھی ہو۔ رشید ملک اپنے اس مقصد میں کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں تک انڈالوجی پر رشید ملک کے سابقہ مقالات کا تعلق ہے، میں یہ کہوں گا کہ فاضل مقالہ نگار نے اس موضوع کا انتخاب نہ کیا ہوتا تو کہیں بہتر ہوتا کیونکہ یہ موضوع ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ موصوف کی تحقیقی کاوشوں کے لئے اس سے بہتر موضوعات موجود ہیں۔ رشید ملک کی ایک خصوصی صلاحیت کا ذکر نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی، اور وہ خصوصیت ہے معلومات کی فراہمی اور افکار کی ترتیب و تدوین کی غیر معمولی صلاحیت۔ کاش رشید ملک اپنی اس غیر معمولی استعداد کے مطابق کوئی بڑا کام اپنے لئے تجویز کر لیں۔

غالب پر دو مقالے اس شمارے کی زینت ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ محمد علی صدیقی کا "غالب، انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" ہے۔ اس مقالے میں غالب کو اس سیاسی پس منظر میں رکھنے اور دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تعلق غالب کے عہد سے تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، البتہ یہ نکتہ ضرور نیا پیدا کیا گیا ہے کہ غالب کی فکر شاہ اسمٰعیل شہید کی فکر کے قریب تھی۔ یہ مقالہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی فکری اساس کو واضح کرنے میں بھی مقالہ نگار ناکام رہے ہیں۔ یوں بھی اس مقالے میں فکر کی منطقی ترتیب معدوم ہے۔ یوں لگتا ہے کسی مقالے کے لئے یادداشتیں تحریر کی گئی ہیں۔ مقالے کے اختتامی پیراگراف میں محمد علی صدیقی نے یہ ارشاد فرمایا ہے: "غالب

اپنے فکری جوہر میں یکتا و یگانہ سہی لیکن وہ دور کا سیاسی و معاشی تجزیہ کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ شاید بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اردگرد کے حالات کے بارے میں غافل اور ماورائے احساس و مافوق الفطری سچائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔" ماورائے احساس اور مافوق الفطری سچائیوں سے فاضل مقالہ نگار کیا مراد لے رہے ہیں، اس کی وضاحت خود موصوف ہی کر سکتے ہیں کیونکہ قیاس آرائی کی مدد سے ان فقروں کا مفہوم اخذ کرنا ممکن تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بڑے شاعر کی جو پہچان موصوف نے بتائی ہے وہ ناقابلِ تسلیم ہے۔ غالب ہی کو لیجئے وہ اردگرد کے حالات سے بالکل غافل نہیں تھے۔ انہوں نے حالات کا تجزیہ بھی کیا اور عصری افکار کو پرکھا بھی لیکن یہ دونوں کام انہوں نے اس طرح اور اس منہج پر انجام نہیں دئے جس طرح محمد علی صدیقی سے ممکن ہوا، کیونکہ غالب ان ہتھیاروں سے لیس نہیں تھے جن سے محمد علی صدیقی لیس ہیں۔ محمد علی صدیقی کا تعلق عہدِ جدید سے ہے عہدِ غالب سے نہیں۔ اس ضمن میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے نہیں رہ جاتی کہ پیشِ نظر شمارے ہی میں ڈاکٹر آغا سہیل کا مقالہ "غالب کا نظریۂ شعر" شامل ہے اور اس مقالے کی ابتداء ہی میں ڈاکٹر صاحب نے ارشاد کر دیا ہے "غالب کے نظریۂ شعر کی تفہیم ہمارے زمانے میں بظاہر مشکل ہو تو ہو، حقیقتاً آسان اور سہل ہو چکی ہے کیونکہ معاشرتی علوم کے ارتقاء، تجزیے اور تحلیل کے صحیح مذاق نے بہت سے مراحل خوش اسلوبی سے طے کر لئے ہیں۔" دراصل محمد علی صدیقی غالب کے عصری حالات و افکار کا جس طرح تجزیہ کر رہے ہیں (غالبؔ سے بھی طالب ہیں) غالب کے لئے ہی نہیں بلکہ عصرِ غالب کے کسی بھی فرد کے لئے ممکن نہ تھا۔ دونوں مقالوں کے تقابلی مطالعے سے ایک عجیب سی خواہش یہ پیدا ہوتی ہے کہ محمد علی صدیقی کے مقالے کے متن کو ڈاکٹر آغا سہیل کے مقالے "غالب کا نظریۂ شعر" میں سمو دیا جائے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے "غالب کا نظریۂ شعر" بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے اور غالب فہمی کے ضمن میں اس مقالے کی افادیت سے کسی قسم کا انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور تاریخ و تحقیق ادب کے ضمن میں ان کے اس مقالے کو ایک خاص مقام دینا لازمی ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کا مقالہ "سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" مطالعۂ منٹو کے ضمن میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ایک بار پھر منٹو کے فکری احساس کی جانب متوجہ کر کے، منٹو کے قاری اور ناقد دونوں کو ایک ایسی جہت سے روشناس کر دیا ہے جس کو فراموش کر کے منٹو کے بارے میں کسی صحیح رائے تک پہنچنا قریب قریب ناممکن ہے۔ شاہین مفتی کا مقالہ "فیض اور اردو شاعری میں رنگ کی روایت" ہنوز جاری ہے، اس لئے کچھ کہنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی مناسب لیکن موضوع کے انتخاب کی داد دیئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ موضوع نیا تو نہیں ہے لیکن اس پر بڑے سیر حاصل انداز سے قلم اٹھایا جا رہا ہے اور یہی بات نئی ہے۔

اب کچھ حصۂ شعر کی باتیں۔ ریاض حسین چودھری کی نظم "تشخص ۔ ایک نعتیہ" ہر اعتبار سے منفرد ہے۔ یہ ایک مکمل تخلیق ہے نظم اور نعت کا حسین امتزاج۔ جذبے اور فکر کے رچاؤ کا خوبصورت ماحصل۔ غزلیات کے دونوں حصے غزلیہ شاعری کے کامیاب نمائندے ہیں۔ محشر بدایونی کی شاعری کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جب تک آپ اس کے شعر کو ایک سے زیادہ مرتبہ نہ پڑھیں لطف اندوز نہ ہو سکیں گے (ادبِ عالیہ کا بھی یہ خاصہ ہے) ضیاء جالندھری کے ردائف قابلِ توجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس شمارے میں "بابا" ردیف پر دو غزلیں دو مختلف قافیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

؎ کیسی دہشت ہے کہ خواہش سے بھی ڈر لگتا ہے
منجمد ہو گئیں ہونٹوں پہ دعائیں بابا

صمد انصاری کا یہ شعر دیکھئے:

ے جلائے رکھئے چراغوں کو آخرِ شب تک　　نمودِ صبح کا لمحہ بدل بھی سکتا ہے

نمودِ صبح کے لمحے کا بدلنا بالکل نیا خیال ہے۔ اس شعر کو اگر مدیرِ "فنون" کے اسی شمارے میں شائع شدہ مندرجہ ذیل شعر کے بعد پڑھا جائے تو دیکھئے کتنا لطف آتا ہے :

ے طلوعِ صبح کی افواہ اتنی عام ہوئی　　کہ نصف شب کو گھروں کے دیئے بجھائے گئے

مندرجہ بالا شعر بھی ایک نئے مضمون کا حامل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی فضا، طنز اور دُکھ کے عناصر سے مملو ہے۔ (مدیر "فنون" کی شاعری میری ناچیز رائے میں تین عناصر سے عبارت ہے، طنز، دُکھ اور دعوتِ فکر) شفیق سلیمی، پروین شاکر، یاسمین گل اور اختر عثمان کی غزلیں سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ نظموں میں ناہید قاسمی کی نسوانیت، منصورہ احمد کا کانٹوں کی طرح ذہن و دل میں چبھنے والا عنصر، تسلیم الٰہی زلفی کی نظم "بیٹھے ہیں اندھیرے میں" کی دہشت سے معمور فضا اور اعجاز رضوی کی نظموں کے بولتے الفاظ قابلِ ذکر ہیں۔

افسانے سارے ہی پڑھنے کے لائق ہیں۔ نیلوفر اقبال اچھی جا رہی ہیں لیکن "چابی" اور "بدمعاش میاں" ان کے فن کے گراف کو اوپر نہ لیجا سکے۔ ان کی کہانیوں کی اساس ایسے سٹائر (SATIRE) پر مشتمل معلوم ہوتی ہے جو ان کی کہانیوں کے پورے سماجی پس منظر کے حوالے سے قاری کے ذہن پر منکشف ہوتا ہے۔ "بدمعاش میاں" میں یہ سٹائر ایک نوع کی شگفتہ فضا کے اندر ہی اندر نمو پاتا ہے جبکہ "چابی" میں ایک بھیانک حقیقت نگاری نے اس کے تار و پود کی تشکیل کی ہے۔

زیرِ نظر شمارے کی سب سے اہم کہانی "شہرِ ہول" ہے۔ عطیہ سید میں بدیہی طور پر ایک وسیع کینوس کے استعمال کی صلاحیت ہے۔ اس کہانی کے کردار بھی قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم کردار خود "شہرِ ہول" (نیویارک) ہے۔ جس کی کوکھ سے دوسرے کردار جنم لیتے ہیں۔ نوخیز لڑکیاں جن کی عبادت بنک اکاؤنٹ کے الہامی الفاظ کا ورد (بصد عقیدت واحترام) ہے۔ سینک بار چلانے والی انسانی بیلوں کی جوڑی ڈیبی اور ڈورین جو پندرہ برس اکٹھا رہنے کے باوجود صرف منگیتر رہنے پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ دن میں شدید محنت اور رات میں ٹوالر گیتے ہیں۔ امیر لوگوں کی بیگمات جو مصنوعی اور نقلی زیورات پہنتی ہیں جبکہ ان کے اصل زیورات جوں کے توں ساری عمر بنکوں کے تہہ خانوں میں زمین کے نیچے کئی سو فٹ گہرائی میں دفن رہتے ہیں۔ (عمل کی لایعنیت اور مجہولیت۔ گورکھ دھندا۔ فریبِ نظر۔ تسکینِ انا) اپنی بادلوں کو چھونے والی عمارت کے خالص سونے سے تعمیر کئے ہوئے بالائی حصے میں دس برس قبل ہیلی کاپٹر کے ذریعے اتر کر بند ہو جانے، وہاں سے بذریعہ کمپیوٹر اپنی کاروباری مملکت کو کنٹرول کرنے اور اپنے قلعہ بند قید خانے میں خود عائد کردہ کسمپرسی میں فوت ہو جانے والا کھرب پتی ڈی۔ ڈی کولٹ۔ ایک عمارت کے ملبے اور کوڑے کے ڈھیر میں سپر مارکیٹ کے ناکارہ، گتّے کے بڑے سے خالی ڈبے میں رہنے اور بالآخر اسی ڈبے میں ٹھٹھر کر مر جانے والی مفلس بوڑھی مسز فان کریمر (بڑھاپا اور غربت دونوں ہی ایسے جرائم ہیں جنہیں "شہرِ ہول" کا معاشرہ معاف نہیں کرتا)، پاکستان سے آ کر "شہرِ ہول" کے ماں جالیوں میں گھل مل جانے اور (VICARIKS- SATIS FACTION-) متبادل تشفیوں پر قناعت کرنے والی مسز بشارت اور دوسرا اہم کردار عاصمہ جس کو ہم شہزادہ سدھارتھ (گوتما بدھا) کا نسوانی روپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ پاکستان سے آ کر "شہرِ ہول" سے ملتی ہے۔ حواس خمسہ سے اس کو مکمل طور پر PERCIEVE کرتی اور جس طرح پرنس سدھارتھ نے انسانیت کو بیماری، دُکھ اور موت کے پنجوں میں جکڑا ہوا دیکھا، بیوی بچے اور محل کی شاہانہ زندگی کو تج دے کر دھیان کے مختلف مراحل سے گزر کر گیان کی منزل پر براجمان ہوتا ہے۔ اسی طرح عاصمہ جدید انسان کی رسمی، میکانکی اور مادہ پرستانہ زندگی اور موت پر غور کرتے کرتے

کسی گھنے پیڑ کے سائے کے بجائے ایک اجاڑ اور سنسان مقام پر واقع "کمیون" کی طلسماتی چہار دیواری کے حصار کے اندر گیان کی منزل کو چھو لیتی ہے۔ گیان جو بقول شیکسپیر ان مصرعوں میں پوشیدہ ہے۔

THERE IS SOMETHING ROTTEN
IN THE STATE OF DENMARC

(ریاست ڈنمارک میں کچھ نہ کچھ ہے جو سڑ گل چکا ہے)

کہانی کے آخر میں عطیہ سید اپنے پڑھنے والے کو ایک ہی جھٹکے میں پرنس سدھارتھ سے پرنس آف ڈنمارک ہیملٹ کی جانب لے جاتی ہے اور عاصم کے کردار میں دونوں شہزادے گڈمڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عبداللہ جاوید (کراچی)

۱۹۸۹ء میں دنیا میں کئی ہوشربا واقعات رونما ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اُن کی فہرست اُس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک اس میں یہ خوشگوار حادثہ شامل نہ کیا جائے کہ اس ایک کیلنڈر سال میں "فنون" کے دو شمارے شائع ہوتے ہیں۔ کیونکہ گزشتہ چار پانچ سال سے اس ہر پرچہ "سالنامہ" ہی ہوا کرتا تھا۔ سو سب سے پہلے تو اس کارنامے پر مبارکباد اور ساتھ ہی یہ اُمید اور دُعا بھی کہ اس برس دو کے بجائے تین پرچے (کم از کم) شائع ہوں۔

گزشتہ پرچے کے بارے میں بہت سی باتیں کرنے والی تھیں۔ لیکن اِس وقت وہ میرے سامنے نہیں ہے البتہ اُس کی ایک تحریر میرے ذہن پر نقش ہے سو اُس کا ذکر ضرور کروں گا۔

محترمہ نیلوفر اقبال افسانہ نگاروں کی صف میں نئی نئی آئی ہیں لیکن جس رفتار سے وہ عمدہ کہانیاں لکھ رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اُس صف میں پہنچ جائیں گی جہاں ہمارے کئی افسانہ نگار بیس بیس برس میں بھی نہیں پہنچ پائے۔ اُن کی کہانی "گھنٹی" میرے خیال میں اس دہائی کی دس بہترین کہانیوں میں پورے اعتماد کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ اس انداز اور تکنیک کی ایک کہانی تقریباً پندرہ برس پیشتر راجندر سنگھ بیدی کا نے لکھی تھی جس کا نام تھا "صرف ایک سگریٹ"۔ بیدی جیسے عظیم اور منفرد کہانی کار کے یہاں وہ جو "مولوی مدن کی سی" بات ہے وہ تو شاید کسی اور کو نصیب نہ ہو مگر کم از کم "گھنٹی" کی حد تک، نیلوفر اقبال نے اُن بلندیوں کو چھُوا ضرور ہے۔ سو خاتونِ مذکور کو یہ کہانی لکھنے پر اور آپ کو شائع کرنے پر بہت بہت مبارکباد۔

اور اب آئیے تازہ یعنی موجودہ پرچے کی طرف۔ تقریباً ہر شاعر کی فطری عادت کے مطابق میں نے بھی اس کا مطالعہ حصہ شاعری سے شروع کیا۔ نظمیں (حصہ اول) کم مگر معیار کے اعتبار سے خاصی اچھی ہیں۔ الطاف فطرت کی نظم "مسیحا، فرلیسی، زمانہ" اور نجیب احمد کی پانچوں نظمیں خاص طور پر پسند آئیں۔ گزشتہ ایک دو برس میں نجیب احمد نے بڑی خوبصورت اور چونکا دینے والی نظمیں لکھی ہیں۔ بہرحال اُس کی آمد سے نظم نگاروں کی صف میں یقیناً ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے حصے کی نظموں میں چمک نسبتاً زیادہ ہے۔ یوں نوجوان نسل کی نظمیں واضح طور پر سینئر نسل کے سامنے ایک چیلنج کی طرح کھڑی نظر آتی ہیں۔ پروین شاکر (ایک اُداس نظم) ناہید قاسمی (پناہ) منصورہ احمد ("مجھے رستہ نہیں ملتا"، "میں مجرم ہوں"، "ایک سوال") اشرف جاوید (لمحہ اعراف کی نظم) تسلیم الٰہی زلفی (دست بے سوال) راشد مراد (مختصر نظمیں) احمد لطیف (استفسار۔ تو نے کیا دیکھا ہے) افتخار بخاری (دونوں نظمیں) اعجاز رضوی (ایک مجسمے سے مکالمہ) ابرار احمد (بارش) اور شاہدہ نازنہ کی (مشرقی لڑکیاں) عمدہ اور مؤثر نظمیں ہیں اور لائق صد تحسین ہیں۔

غزلوں میں محشر بدایونی، ضیا جالندھری، حسن عابدی (جن کی غزل کراچی کا شہر آشوب ہے) سید منیر، احمد انصاری، انور مسعود، محمد اظہار الحق، نقوی احمد پوری، رشک خلیلی، شفیق سلیمی، خاقان خاور، گلزار بخاری، صفدر صدیق رضی، پروین شاکر، مقبول عامر، عباس تابش، یاسمین گل، شاہدہ ناز اور رؤف امیر کی غزلیں اچھی لگیں۔ اتنی طویل فہرست لکھنے پر معذرت کے بجائے میر کا ایک شعر پیش کروں گا۔

عشق کرتے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گنہ   آپ سے پوچھے کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

افسانوں میں نیلوفر اقبال کی دونوں کہانیاں اچھی ہیں مگر پچھلی کہانیوں کی طرح غیر معمولی نہیں۔ اسد محمد خاں کی کہانی "مردہ گھر میں مکاشفہ" جزئیات نگاری کا بے مثال نمونہ ہے مگر لرزا دینے کے باوجود ایک قسم کی تشنگی کا احساس چھوڑتی ہے۔ سلطان جمیل نسیم کا افسانہ "بے اختیار" اسلوب کے اعتبار سے روائت اور علامت کے بین بین چلتا ہے۔ مرکزی کردار کے واحد متکلم میں بولنے کی وجہ سے کہانی کی گرفت میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ اس پرچے کی بہترین کہانی میرے خیال میں عطیہ سید کی "شہر جمل" ہے۔ امریکی شہروں کی فلک بوس عمارتوں کی دہشت سے پُر منظروں میں انسان کتنا بے بس اور اکیلا اور زندگی کتنی بے معنی اور مصنوعی ہے، اس کا ایسا مؤثر اظہار بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

مقالات کا حصہ گوارا ہے۔ دراصل ہماری تنقید کو ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں آیا۔ سو بہت سے مباحث خوفِ فسادِ خلق یا کسی اور اندیشے کی نذر ہو جاتے ہیں اور یوں بات ہوتی تو ہے مگر بنتی نہیں۔ رشید ملک، محمد کاظم اور آغا سہیل کے مضامین میں کہیں کہیں فکری تازگی کا احساس ہوتا ہے ورنہ ہر جگہ کچھ "پُر امن بقائے باہمی" کی سی صورتِ حال نمایاں ہے۔

مسعود مفتی کے رپورتاژ کی تیسری قسط "ہم نفس" نے بھی سابقہ قسطوں کی طرح دل کو چھوا اور احساس کو جھنجھوڑا۔ ہو سکے تو اگلی بار اس کے لئے زیادہ صفحات وقف کیجئے۔ کیونکہ ہمارے ادب میں ایسی قیمتی اور سچی تحریریں آسانی سے دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ تبصروں کا حصہ "فنون" کے شایانِ شان ہے یعنی زیرِ نظر کتابوں پر پوری دلجمعی سے گفتگو کی گئی ہے، یہ نہیں کہ تعلقاتِ عامہ پر مبنی دس دس سطریں لکھ کر سب کو ٹرخا دیا گیا۔ "اختلافات" کا حصہ حسبِ معمول بارہ مصالحے کی چاٹ ہے۔ ہر طرح کا ذائقہ اس دسترخوان پر مل جاتا ہے۔

بہت برسوں کے بعد "اختلافات" کے صفحات میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اس لئے شاید تحریر کچھ زیادہ طویل ہو گئی۔ لیکن سچ پوچھیے تو میں ان باتوں کو ابھی کچھ اور تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا۔ چلئے انشاء اللہ آئندہ سہی۔

امجد اسلام امجد (لاہور)

تو گویا یہ بات اب طے ہو چکی ہے کہ "فنون" باقاعدگی سے آئے گا۔ آپ نے تین ماہ بعد ہی نیا فنون شائع کر کے حیران و پریشان کر دیا۔ اور اصل پریشانی تو ٹائٹل کو دیکھ کر ہوئی کہ موجد صاحب بھی چونکانے کے عمل میں برابر کے شریک ہیں۔ اب کے انہوں نے نیا اور خوبصورت ٹائٹل بنا کر بہتوں کے شکوے دور کر دیئے۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں "فنون" باقاعدہ ہوتا جائے گا آپ کو تخلیق کاروں سے گلہ ہوا کرے گا۔ ہماری دُعا ہے کہ "فنون" اسی طرح آب و تاب سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہے۔

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ میں غزلوں کو پڑھنے کے بعد حصہ اول اور حصہ دوم کا جب بھی موازنہ کرتا ہوں تو ہمیشہ نوجوان غزل گو شعراء کی غزلیں مجھے زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ اب کے حصہ غزل کے پہلے حصے کا

مطالعہ کرتے ہوئے ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے ترقی کر کے حصّہ اوّل میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ بالخصوص یوسف حسن، شفیق سلیمی، ستار سید، زماں کنجاہی، گلزار بخاری، الفت رسول کی خوبصورت غزلیں پڑھ کر یہ حصہ غزل بھی توانا اور تازہ محسوس ہوا اور شاید اسی احساس کا نتیجہ تھا یا کوئی اور وجہ کہ اب کے ادا جعفری، محسن احسان راسخ عرفانی، خاقان خاور، اقبال کوثر کی غزلیں بھی بہت بہتر لگیں۔ بالخصوص ادا جعفری کی غزل تو کئی دفعہ پڑھی اور لطف لیا۔ ضیا جالندھری اور امجد اسلام امجد کی غزلوں پر خموشی بہتر ہے۔ سید تنویر صاحب بڑی باقاعدگی سے "فنون" میں شائع ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے کسی اور رسالے یا اخبار میں ان کا نام اور کلام نہیں دیکھا۔ یہ کون صاحب ہیں یہ کوئی بزرگ شخصیت لگتے ہیں اور اگر واقعی بزرگ ہیں تو اتنا عرصہ کہاں گوشہ نشین رہے۔ آپ کی کاوش کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ آپ کہاں کہاں سے شعر و ادب کے ہیرے تلاش کر کے لاتے ہیں۔ ویسے اگر ان کے بارے میں ایک مختصر تعارفی نوٹ دیا جائے تو بہت ہی اچھا ہوگا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی محمد ارشاد صاحب کا سا معاملہ نہ پیش آجائے۔

"بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے" یہ شعر شفیق سلیمی کی پہچان بنا اور اس کے بعد مسلسل شفیق سلیمی نے اچھی غزلیں لکھ کر اپنے وجود کو منوایا۔ وطن، گھر بار، بچوں اور دوستوں سے دوری نے شفیق سلیمی کی شاعری میں ایک نیا درد پیدا کیا ایک نئی کسک پیدا کی۔ کچھ کھوئے جانے کا احساس۔ یہ احساس کسی وقت اس کی شاعری میں جھنجھلاہٹ اور چڑچڑا پن کے عنصر کو نمایاں کر دیتا ہے اور یہ کوئی منفی رُخ نہیں ہے، ایک عصری حقیقت ہے۔ وطن سے دور کوئی شخص مادی آسائشوں کے حصول میں کتنا بھی کامیاب ہو وہ ہمیشہ دوسرے درجے کے شہری کے رتبے پر رہتا ہے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ جس ذہنی، نفسیاتی کیفیات کا شکار ہوتا ہے اس کا ذکر بڑا المناک ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کا شفیق سلیمی نے اپنی شاعری میں بہترین اظہار کیا ہے۔ حصّہ دوم میں مقبول عامر، قائم نقوی، عباس تابش افتخار بخاری، قمر رضا شہزاد، رؤف امیر اور نکہت یاسمین گل کی غزلیں بہت خوبصورت تھیں۔ اختر عثمان، اشرف سلیم اور شاہدہ تاز فنون کی نئی دریافتیں ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ لوگ اسی طرح کی خوبصورت غزلوں سے نوازتے رہیں گے۔

اپنی پسندیدہ غزلوں پر گفتگو کرتے کے بعد میرا یہ پیراگراف شاید کچھ دوستوں کو پسند نہ آئے۔ لیکن کافی عرصے سے میں ایک بات محسوس کر رہا تھا جس کا اظہار کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں اب تک اردو شاعری کی معراج اردو غزل رہی۔ اردو کی ترویج میں بھی نمایاں ترین حصّہ غزل کا رہا ہے۔ غزل نے انسانی نفسیات کے ہر پہلو سے فرد کو متاثر کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے جو غزل لکھی جا رہی ہے، کیا آنے والی کل میں یہ غزل اصنافِ سخن میں غزل کی مقتدر حیثیت برقرار رکھے گی۔ میں اس حوالے سے غزل کا مطالعہ کرتا ہوں تو کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ جبکہ میرے سامنے یہ صورتِ حال بھی ہے کہ نظم بہت ہی اچھی لکھی جا رہی ہے اور اس وقت شاید نظم کسی طور پر غزل سے کم مقبول نہیں۔ ہمارے سکہ بند غزل گو شعرا بھی نظم کی طرف آرہے ہیں اور خوبصورت نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ فارغ بخاری صاحب کے بقول ٹنوں کے حساب سے غزل لکھی جا رہی ہے۔ اب غزل میں تکرارِ مضامین جا بجا نظر آتے ہیں۔ محض زبان و بیان کے زور پر تو غزل لوگوں کو زیادہ عرصہ اپنا گرویدہ نہیں رکھ سکے گی۔ اب تو وہی غزل گو کامیاب ہوگا جو نہ صرف نئی بات کرے بلکہ نئی بات نئے انداز سے کرے۔ پختگیٔ فکر و فن تو خیر پہلی بات ہے۔ لیکن اب کلاسیکی ادب کی روح کے ساتھ ساتھ ہمارے شاعر کو دوسرے علوم میں بھی دستگاہ رکھنا لازمی ہوگا۔ اسے اپنے خول سے بھی باہر نکلنا ہوگا۔ کچھ مشاہدہ بھی کام میں لانا ہوگا۔ آخر کیا بات ہے کہ اکثر اوقات پورا پورا دیوان پڑھ جانے کے بعد بھی کام کے شعر گنتی کے نکلیں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس

کی وجہ نہ صرف بے تحاشا غزل لکھتا ہیں، بلکہ وہ ان شاعروں کو بھی اس کا مورد الزام ٹھہراتے ہیں جو ابھی تک اٹھارویں صدی کی غزل کی دنیا میں رہ رہے ہیں اور ابھی تک بہار و خزاں، گل و بلبل، چمن و آشیاں، فلکِ نامہرباں وغیرہ میں گم ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ غزل کو جدیدیوں نے تباہ کر دیا۔ بھلا لہو، دھرتی، جبر، انقلاب، سازش، یہ کہاں سے غزل کے موضوع اور الفاظ رہے ہیں۔

چند دنوں کی بات ہے کہ ایک حلقۂ یاراں میں نعت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ نعت نے ہمارے اردو ادب میں بہت فروغ پایا ہے۔ اب کوئی کتاب، رسالہ، اخبار نعت کے بغیر شروع نہیں ہوتا اور یہ ایک منفرد صنف بن چکی ہے۔ اب اس محفل میں نعت کے حوالے سے ہونے والی صنفِ سخن کے بارے میں گفتگو غزل، نظم اور دیگر شعری اصناف تک پہنچ گئی۔ ہمارے دوست نے صنف کی تعریف کچھ ایسے کی ہے "ایک خاص ہیئت میں مخصوص موضوعات کا اظہار" بات جب اس نکتے پر پہنچی تو پھر لوگوں نے غزل کو بھی صنف ماننے سے انکار کر دیا کہ اس میں ہیئت تو مخصوص ہے لیکن اس کے موضوعات مخصوص نہیں ہیں۔ اب غزل میں نعت بھی لکھی جا رہی ہے اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہیں، سیاسی موضوعات بھی ہیں، معاشی، سماجی مسائل بھی ہیں، ساتھ ہی طنزیہ اور مزاحیہ غزلیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ اب مختلف شعری اظہار کے وسیلوں میں صرف ہیئت کا فرق ہے کہ یہ غزل ہے یہ نظم ہے یہ ہائیکو ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے اس ساری گفتگو کو کسی نتیجے پر تو نہیں پہنچنا تھا، لیکن کافی سوال ذہن میں رہ گئے۔ میرا خیال ہے کہ الفاظ و تراکیب وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مفاہیم میں تبدیلیاں لاتے رہے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ غزل آپ ۱۹۹۰ء میں لکھیں اور غزل کی تعریف بیان کریں ۱۸۹۰ء والی تو پھر آپ کی تعریف پر جدید غزل پورا نہیں اُترے گی۔ غزل تو خوبصورتی، نزاکت، جذبے، خیال، حسن، احساس، دھیمے پن، کومل پن، سردیوں کی شام، رنگ و خوشبو، آتشدان کی راکھ اور اس میں دبی چنگاریوں کا نام ہے، اور بات ڈھنگ سے کہنے کی خواہش اور لگن ہو تو انہی کیفیات میں بات بڑے ہی احسن طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ فارغ بخاری صاحب امداد ہمدانی کی کتاب "صداؤں کا سمندر" کے دیباچے میں غزل کی موجودہ صورتِ حال پر لکھتے ہیں: "غزل کا کام بڑا کٹھن ہے اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ کیونکہ کم عمری کے باوجود اس مختصر عرصے میں منوں ٹنوں غزل کہی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے اس کا عمل اگر کچھ عرصے کے لئے روک دیا جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اب تک جتنی بے تحاشا غزل کہی گئی ہے، اس میں کام کا مواد کتنا ہے۔ ظاہر ہے وہ بہت ہی کم ہے اور بھرتی کا مواد بکثرت ہے۔ اس لئے اگر بس چلے تو صرف معیاری غزل کی اجازت دی جائے اور قافیہ پیمائی کی غزل پر قدغن لگا دی جائے۔ جو امر محال ہے۔ یہ تو بخاری صاحب کی ذاتی رائے ہے۔ وہ پابندیاں لگانے کی بات کر سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے وہ خود پر اور یا دیگر کچھ افراد پر ایسی پابندیاں لگا چکے ہوں۔ لیکن اس قسم کا ردِ عمل جس میں پابندیاں لگانے کی بات ہو، منفی قسم کا رجحان ہے۔ تاہم غزل کے بارے میں ان کی جو رائے ہے اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور اسے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ میری ان معروضات کا مطلب یہ نہیں کہ میں غزل کے مستقبل سے نا اُمید ہوں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ ہمارے نوجوان شعراء بے پناہ صلاحیتوں کے حامل ہیں، بڑی اچھی غزل لکھتے ہیں۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ ہمارے شعراء بڑے امکانات کے ساتھ دنیائے ادب میں وارد ہوتے ہیں، اچھی غزلیں کہتے ہیں، پھر کچھ عرصہ بعد تن آسانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب یہ نئے شاعروں کی کھیپ آتی ہے تو تازگی فکر، ندرتِ خیال اور خوبصورت اسلوب سے اپنے قارئین کو بے پناہ متاثر کرتے ہیں۔ لیکن دس بارہ سال گزرتے ہیں تو یہی شعراء صابروشاکر اور قانع نظر آتے ہیں کہ اب زمانہ گی

کا ہے ، غزل کی پہچان ان کے نام سے ہے ! تو میری معروضات انہی لوگوں کے لئے ہیں ۔ وہ ادب کے علاوہ دیگر علوم میں بھی تحصیلِ علم کریں ۔ مطالعہ کو روزمرہ معمولات کا حصہ بنائیں ، مشاہدہ کریں ، حسیات کو بروئے کار لائیں ۔ زندگی کے نظری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عملی پہلوؤں پر بھی غور و فکر کریں ۔ مطالعے ، مشاہدے ، حریتِ فکر اور جراتِ تخلیق کی مدد ...... آپ ایسے شعر کہنے پر قادر ہو سکتے ہیں ،

طلوعِ صبح کی افواہ اتنی عام ہوئی　　　کہ نصف شب کو گھروں کے دیئے بجھائے گئے

تری خدائی میں شامل اگر نشیب بھی ہیں　　　تو پھر کلیم سرِ طور کیوں بلائے گئے

گزشتہ شماروں میں شامل ضیاء جالندھری کی خوبصورت نظموں کے برعکس "شہرِ نفاق" نے کوئی اچھا تاثر نہیں دیا ۔ لگتا ہے نظم میں کہیں ربط ٹوٹ گیا ہے جس سے قاری کو نظم پڑھتے ہوئے دھچکوں کا احساس ہوتا ہے ۔ اپنے عصر کی جتنی سچی اور خوبصورت عکاسی نظم میں اختر حسین جعفری نے کی ہے وہ ان کے صاحبِ کمال ہونے کا بیّن ثبوت ہے ۔ وہ مصوّر بھی ہیں اور معمار بھی ۔ "شام کے بے ربط خاکے سے پرے" اس کی ایک اور مثال ہے ۔

نجیب احمد کی پانچ نظمیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کتنا زبردست تخلیقی جوہر اس شاعر میں موجزن ہے ۔ دو تین برس سے نجیب نے عمدہ نظمیں کہیں ۔ غزل کی طرح نظم میں بھی نجیب احمد ایک معتبر نام بنتا جا رہا ہے ۔ تاہم نجیب احمد سے اتنی عرض کرنے کی اجازت ضرور چاہتا ہوں کہ قارئین اس کی غزل کی قیمت پر نظم کو شاید قبول نہ کریں ۔ اس شمارے میں ان کی غزلیں نہیں ہیں اور لگتا ہے وہ غزل کی طرف سے عدم توجہی کا رویہ اختیار کر رہے ہیں ، جو اچھی بات نہیں کہ وہ غزل کے بہت ہی اہم ، سیلے اور خوبصورت شاعر ہیں ۔

حسن عباس رضا کی "دریا ایک دھارے دو" اور امجد اسلام امجد کی "آبِ حیات" بھی اچھی نظمیں ہیں ۔ مقبول عامر نے "باچا خان" پہ بڑی خوبصورت نظم لکھی ہے ۔ مقامِ شکر ہے کہ ہم نے اپنے ہیروؤں کو پہچاننا اور ان کا اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے ۔ "پناہ" ناہید قاسمی کی نرم اور کومل جذبوں کی نظم ہے ۔ ناہید قاسمی کی دیگر نظموں کی طرح اس کی خوبی ، سادگی ، سلاست اور روانی ہے ۔ تازہ شمارے میں "بنجر دل " سیراب کرو" کے شائع ہو جانے کا مژدہ ہے ، دیر آید درست آید ۔

منصورہ احمد کی نظم "مجھے رستہ نہیں ملتا" ہماری سماجی زندگی کی بہترین عکاسی ہے جو منافقت ، نفرت ، تعصب سے آلودہ تر ہوتی جا رہی ہے ۔ "میں مجرم ہوں" بے اصول معاشرے میں کھڑی تنہا اور انا پرست لڑکی کی داستان ہے جو اصولوں ، قدروں اور سچائیوں کی صلیب اٹھائے ہوئے ہے اور وہ کب تک اکیلی یہ صلیب اٹھائے کھڑی رہے گی ۔ اس کا جواب کس کے پاس ہے ؟ اسی طرح "ایک سوال" ایسے جذبوں کی نظم ہے جن کا کوئی نام نہیں ہوتا ۔ اب منصورہ احمد کا ایک اپنا اسلوب اور دلکش تشکیل پا چکا ہے جو کہ ان کی اور ان کی نظموں کی پہچان بن چکا ہے ۔ اگر میرے مشورے کو وہ مناسب سمجھیں تو اپنے مجموعۂ کلام کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کریں ۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ انہوں نے ضخامت کے خوف سے کئی اچھی نظموں سے مجموعے کو محروم کر دینا ہے ۔

"لمحۂ اعراف" اشرف جاوید کی اچھی نظموں میں ایک اضافہ ہے ۔ بے پناہ اضافتوں کے باوجود نظم بہت اچھی ہے ۔ اور اشرف جاوید کی نظم کے بارے میں میرے خیال کی تائید کرتی ہے کہ اشرف جاوید میں اچھی نظمیں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے ۔ "لہو میں لہر لیتی مہک" احمد لطیف کا اختر حسین جعفری کو منظوم خراج ہے ۔ یہ نظم اسی طرح کی لکھی جانے

والی رسمی نظموں کی طرح نہیں ہے۔ احمد لطیف نے جعفری صاحب کو روح میں لیسا رچا کر نظم لکھی ہے "تو نے کیا دیکھا ہے" احمد لطیف کی بہت ہی اچھی نظم ہے۔ اس نظم میں بیان کیا گیا جبر اور دُکھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کتنی ہی ماؤں نے یہ جبر بھی سہا ہے اور دُکھ بھی۔

"ذوالفقار فرخ کی "عکس عقرب" گھریلو جذباتی فضا کی نظم ہے۔ جس کے ساتھ بیتے وہی جانے۔ شاہدہ ناز کی نظم "مشرقی لڑکیاں" بڑی سچی اور کھری نظم ہے۔ افتخار بخاری اور اعجاز رضوی کی نظمیں بھی اس شمارے کی خوبصورت ترین نظموں میں سے ہیں۔

حصہ مضامین میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کا مضمون "اردو کا پہلا افسانہ نگار" بڑے ہی مزے کی چیز ہے۔ آپ اسے جتنی دفعہ پڑھیں گے لطف دوبالا ہوگا۔ میں نے کسی تنقیدی تحقیقی مضمون میں کم ہی ایسی جاذبیت اور کشش محسوس کی ہے۔ عموماً ایسے مضامین خشک اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ جن کو ایک دفعہ پڑھ کر ہی قاری کی صحت جواب دے جاتی ہے۔ لیکن یہ مضمون ان تمام خصوصیات سے عاری ہے۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اس مضمون میں اختلاف کرنے کے بے شمار پہلو ہوں گے۔ لیکن فی الحال ان پر میں گفتگو نہیں کر سکتا کہ مجھے چند حوالہ جات کی کتابیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔ لیکن اس مضمون کے پڑھنے کے بعد جو باتیں سامنے آئی ہیں اُن پہ گفتگو ضرور کروں گا۔ مصنف محترم اپنے استدلال کے بارے میں کتنے پُراعتماد ہیں۔ اس کا اندازہ مضمون کے ابتدائیہ ہی سے ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تنقیدی و تحقیقی کاموں سے لوگوں کی عدم دلچسپی کیا کیا مسائل پیدا کرتی ہے، اس کا اندازہ بھی مضمون پڑھنے سے ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے کا جو حل ڈاکٹر صاحب نے نکالا ہے وہ کچھ عرصہ سے ہمارے محققین اور نقادان کرام میں قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اگر ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کسی کے تنقیدی و تحقیقی کام کو نہیں سراہتے تو کم از کم نقادوں کو ہی ایک دوسرے کے کام کی تحسین کرنا چاہیئے۔ وگرنہ بے چارے نقاد اور محقق کو اپنی تعریف بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ اب یہ بنیادی اور انسانی نفسیات کا اہم پہلو ہے کہ اگر کوئی صاحب کوئی اہم کام سرانجام دیں تو اس کی تحسین ہونی چاہیئے وگرنہ یہ کام بھی خود ہی کرنا پڑتا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے کمال خوبی سے یہ فریضہ سرانجام دیا ہے۔ مثلاً مضمون کے آخر میں دیئے گئے حواشی میں انہوں نے اکثر اپنی ہی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ پھر مضمون میں جابجا انہی کے اقتباسات دیئے ہیں۔ اسلامی بیداری کی جو لہر اور اسلامائزیشن کی جو تحریک چل نکلی ہے اس کے اثرات ہمارے ادب پر بھی گہرے مرتب ہو رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی مختلف میدانوں میں اولیت کے جابجا نقوش دریافت کئے جا رہے ہیں۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ چلیں مسلمان ہونے کے ناتے سے ہم ڈاکٹر صاحب سے اتفاق کر لیتے ہیں کہ یہ پریم چند نہیں ہو سکتے کہ وہ "ہندو" ہیں۔ لیکن راشد الخیری کا نے کیا قصور کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کو رد کرتے ہوتے دلیل یہ دی گئی ہے کہ ان کی تحریریں کہانی پن اور تحیر سے خالی ہیں۔ وہ محض وعظ اور وضاحت ہیں۔ ان کی تحریریں، افسانے کے فنی آداب سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اب ڈاکٹر صاحب کی تحقیق پر ایمان لائیں تو پریم چند نے ۱۹۰۶ء میں افسانہ لکھنا شروع کیا۔ یلدرم نے ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ اور راشد الخیری تو خیر افسانہ نگار ہی نہیں۔ تو کیا افسانہ لکھنے سے پہلے افسانے کی تعریفیں اور حدود معین ہو چکی تھیں کہ افسانے کا ڈھانچہ یہ ہوگا۔ یہ سائنسی مسئلہ تو نہیں تھا کہ پہلے فارمولا تیار کیا جائے، پھر اس کے مطابق پروڈکٹ تیار کی جائے۔ اگر راشد کو آپ بحیثیت افسانہ نگار مسترد کر دیتے ہیں تو پھر تو اور بھی میدان ہیں تحقیق کے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا وہ آج

کے ناول کے حساب سے ناول نگار ہیں ؟ اس مسئلے پر بھی تحقیق کر لیجئے کہ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے۔ یہ تو ڈاکٹر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یلدرم صاحب کی کتاب میں چار تراجم ہیں۔ ترجمہ کتنا ہی اعلیٰ معیار کا کیوں نہ ہو، اس کو کتنا بھی لوکلائز کر دیا جائے وہ مترجم کی تخلیق تو نہیں قرار پائے گا۔ پھر یلدرم صاحب کی تحریریں کس تعریف کے تحت افسانہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ آپ انہیں انشائیے کے کھاتے میں بھی ڈال سکتے ہیں، طنز و مزاح بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر محض اس بنا پر کہ پہلے کون شائع ہوا تو پھر اور تحقیق بھی کر لیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اور نام بھی مل جائیں، جن کی کتابیں شائع نہ ہوئیں، جنہیں آپ اور ہم ابھی نہیں جانتے۔ ہمارے بعض محقق قسم کے دوست تو کہانی کے ابتدائی ڈانڈے غالب کے خطوط سے بھی ملاتے ہیں۔

محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر آغا سہیل کے غالب پر مضامین فکر انگیز بھی ہیں۔ تفہیم غالب میں بھی کافی معاون ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر برج پریمی کا مضمون منٹو کا ایک نیا پہلو سامنے لاتا ہے۔ منٹو کے پبلشر اگر منٹو کے اس کارنامے کو شائع کر دیں تو یہ ادب کی خدمت بھی ہو گی اور ان کی مالی منفعت بھی۔ اُستاد غلام علی کے بارے میں ڈاکٹر داؤد رہبر کا مضمون رشید ملک صاحب کے تعارف کے ساتھ کئی دفعہ پڑھا۔ موسیقی کے بارے میں اپنا علم تو محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اصلاً پنجابی ہیں لیکن انہوں نے پنجابی زبان کے بارے میں موسیقی کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ ان کا لہجہ مجھے بہت تضحیک آمیز محسوس ہوا۔ اُمید ہے پنجابی کے زبان دان اس بارے میں کچھ ضرور لکھیں گے۔ موسیقی کے بارے میں تو رشید ملک صاحب خود ہی ضرور تحریر فرمائیں گے۔

افسانے تمام کے تمام بہت اچھے تھے۔ آج کل کہانی کے حوالے سے جو نام سب سے زیادہ زیرِ بحث ہے وہ نیلوفر اقبال کا نام ہے۔ انہوں نے "مرضی" سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب تو قارئین افسانہ نگاروں کی فہرست میں سب سے زیادہ تجسس سے نیلوفر اقبال کا نام ڈھونڈتے ہیں۔ اختلافات میں ڈاکٹر معین الرحمان صاحب نے فرمایا ہے کہ "مجھے نہیں یاد آتا کہ نیلوفر اقبال کو کہیں پہلے میں نے پڑھا ہو" تو عرض یہ ہے کہ نیلوفر اقبال تقریباً ۱۹۸۰ء سے "فنون" میں شائع ہو رہی ہیں اور ان کے تقریباً چھ یا سات افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں مسٹر عبدالمنان، رس گلے اور مولاداد وغیرہ جیسے خوبصورت افسانے بھی شامل ہیں۔ افسانہ "چابی" بہت سے مقفل ذہنوں اور سوچوں کے لئے چابی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اسے استعمال کرنا چاہے۔ "بدمعاش میاں" ایک ہلکا پھلکا طنزیہ ہے۔ محمد جمیل آفاقی کچھ غیر حاضری کے بعد آئے ہیں لیکن ان کا افسانہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ان کے موضوعات کی تبدیلی بڑی خوش آئند ہے۔ ان کی تحریر میں نکھار بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ عطیہ سید کا افسانہ "شہر ہول" طوالت کے باوجود خوبصورت افسانہ تھا اور مغربی تہذیب کا خوبصورت تجزیہ۔ غافر شہزاد کا پہلا افسانہ "بندھے ہوتے لوگ" پڑھا۔ افسانہ خوبصورت ہے بس اتنا خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ "پنڈی سکول آف تھاٹ" کے نہ ہو کر رہ جائیں۔

سید علی عباس جلالپوری، عطاالحق قاسمی، محمد ارشاد، محمد خالد اختر، خالد احمد، ایوب خاور اور ظہیر بابر کی غیر حاضری کچھ طویل ہو گئی ہے۔ یہ اصحاب علم و فن جہاں جہاں بھی ہیں، اپنے ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

عارف محمود (لاہور)

"فنون" نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ حصہ مقالات میں رشید ملک کا مضمون "انڈالوجی (۲) اساطیر (۱)" خوب ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثر لوگ "انڈولوجی" کی اصطلاح سے بھی ناواقف ہیں (الف پر زبر پڑھتے ہیں) جب کہ

دنیا بھر میں انڈیا (بھارت) کی قدیمی تہذیب اور لسانیات سے متعلق متعدد انڈالوجی انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں، خصوصاً ہائڈلبرگ (مغربی جرمنی) کا انسٹی ٹیوٹ خاصا مشہور ہے۔ اسی طرح مصر کی قدیم تہذیب اور لسانیاتی مطالعہ کے "مصریات" کے شعبہ جات قائم ہیں۔ کاش حکومتِ پاکستان بھی اس سلسلے میں دلچسپی لے کہ متحدہ ہندوستان کے اکثر علاقہ جات جو اب پاکستان میں شمار ہوتے ہیں، خصوصاً بلتستان، ملتان اور علاقہ چھچھ کی لسانیات کو پڑھانے والوں کو تو پاکستان ہی سے نمائندگی ملنی چاہیئے جو بلتی، سرائیکی اور چھاچھی جیسی قدیم زبانوں سے دنیا کو متعارف کروا سکیں۔

"سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" (ڈاکٹر برج پریمی) کے ساتھ اگر پروفیسر سجاد شیخ کا مضمون بھی شاملِ اشاعت ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ شیخ صاحب نے "منٹو اور روسی ادیب" کے عنوان سے نہایت اچھا مضمون قلمبند کیا تھا۔ یہ ایک مضمون بھی معلومات سے پُر ہے۔

اس حصّے کا تیسرا مضمون "اردو کا پہلا افسانہ نگار" (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) خصوصاً محلِ نظر ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اب تک اپنی پُرانی ہٹ پر قائم ہیں یعنی "مطالعۂ یلدرم" میں اُن کا جو تھیسس تھا وہی قدرے قطع و بُرید کے ساتھ دوبارہ پیش کر دیا ہے بلکہ "فنون" سالنامہ مئی جون ۱۹۶۹ء میں انہوں نے جو مضمون لکھا اور چھپوایا تھا اس میں حوالہ جات و حواشی کے اضافے کے سوا کوئی نئی بات نہیں کہی گئی۔ دراصل یہ اُس خفت کو مٹانے کی کوشش ہے جو ترک پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی مساعی سے پیدا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے "فنون" سالنامہ مئی جون ۱۹۶۹ء میں "صحبتِ ناجنس" اور "خارستان وگلستان" کو بھی یلدرم کے طبع زاد افسانوں میں شمار کیا تھا جب کہ وہ ڈاکٹر ترکمان کی تحقیق کے مطابق احمد حکمت مفتی اوغلو کے تراجم تھے۔ اب موصوف یلدرم کے "غربت و وطن" "دوست کا خط" اور "حسرتِ دل کی سوانح عمری" وغیرہ افسانوں کو طبع زاد کہلوانے پر مُصر ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ میں راشد الخیری کے افسانہ "نصیر اور خدیجہ" (مطبوعہ "مخزن" لاہور جلد ۷ شمارہ ۳) کو ڈھونڈ نکالا لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اوّلین افسانے کی تلاش کا سہرا ڈاکٹر انوار احمد کے سر پہ نہیں دیکھنا چاہتے اور یلدرم کے ایک ترجمہ "نشے کی پہلی ترنگ" (مطبوعہ "معارف" علی گڑھ جلد ۳ شمارہ ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء) کی بات کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ "نشے کی پہلی ترنگ" طبع زاد افسانہ نہیں بلکہ ترجمہ ہے اور یہاں بات ہو رہی ہے طبع زاد افسانے کی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "نصیر اور خدیجہ" افسانے کے فنی آداب سے مناسبت نہیں رکھتا تو کیا یلدرم کی تحریر "دوست کا خط" (مطبوعہ "مخزن" لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء) اس فنی معیار پر پوری اُترتی ہے؟ وہ بھی تو ایک خط ہی ہے جب کہ "نصیر اور خدیجہ" میں افسانویت کہیں زیادہ ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے جو تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے اسے کھلے دل کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیئے۔

محمد علی صدیقی جب سے یونیورسٹی میں آئے ہیں اردو ادب کا اکیڈیمک رُخ اُن کی جولانئ طبع کا شکار ہوا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں اُن کا مضمون "غالب، انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" اس سلسلے کا دوسرا مضمون ہے۔ اس سے قبل انہوں نے "قومی زبان" کراچی میں مولوی نذیر احمد دہلوی کو اردو کا پہلا ناول نگار ثابت کرنا چاہا تھا لیکن اس کا بروقت سدِّباب ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے "ماہِ نو" لاہور کے صفحات پر کر دیا۔ اے کاش! محمد علی صدیقی

زیرِ بحث مضمون میں غالب سے متعلق معلومات درج کرتے وقت کالی داس گپتا رضا کی مرتب کردہ "توقیتِ غالب" بھی دیکھ لیتے تو یہاں حیاتِ غالب پر بات کرتے ہوئے زمانے کے تعین کے سلسلے میں وہ ٹھوکریں نہ کھاتے جو اس مضمون میں جابجا کھائی ہیں۔

تازہ "فنون" میں "نقوشِ لطیف" (مرتبہ: احمد ندیم قاسمی) کی اشاعتِ مکرر کی نوید دل خوش کُن ہے۔ اب ادبی دنیا ۴۳ برس قبل شائع ہونے والے اس مجموعے کی ہردم تازہ مہک کو ایک بار پھر محسوس کر پاتے گی۔

اسی پرچے سے ایک اور خبر بھی ملی کہ غالب کے رنگ میں مکتوب نگاری کا حق ادا کر دینے والے پیارے مزاح نگار محمد خالد اختر کی کتاب "مکاتیبِ خضر" بھی شائع ہو گئی۔ اگر یہ کتاب بروقت شائع ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا، کم از کم وہ لوگ تو غالب کے رنگ میں لکھنے کی تگ و دو نہ کرتے جو غالب کے رنگ میں تو کیا اپنے رنگ میں ہی ڈھنگ ڈالنے کے ماہر ہیں۔

آخر میں ایک وضاحت کرتا چلوں کہ "فنون" کے تبصرہ جاتی حصے میں مشکور حسین یاد نے بیورلے نکلس کے تازہ مترجم علی محتشم کو "ورڈکٹ آن انڈیا" کا پہلا مترجم کہا ہے جو درست نہیں۔ بیورلے نکلس کی کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" کا ایک ترجمہ بعنوان "اٹھارہ مہینے ہندوستان میں" کے عنوان سے بشیر احمد انصاری کر چکے ہیں اور وہ کتاب بہت پہلے لاہور ہی سے شائع ہو چکی ہے۔ جملہ مطبوعہ کتابیات میں اس کتاب کا حوالہ موجود ہے۔

حصۂ غزل میں محشر بدایونی، غلام حسین ساجد، رؤف امیر اور قمر رضا شہزاد کی غزلوں کو حاصلِ مطالعہ کہنا چاہیئے۔ نظموں میں ابرار احمد کی نظم "بارش" نے جو سرور بخشا اس کے لئے آپ کا اور ابرار احمد کا شکریہ۔

گوشۂ اختلافات میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اب تک افسانہ نگار نیلوفر اقبال کو نووارد تصوّر کرتے ہیں اور اس دریافت پر آپ کے لئے تہنیت لکھتے ہیں۔ نیلوفر گزشتہ دس برس سے لکھ رہی ہیں۔ اُن کا ایک افسانہ بعنوان "پاکیزہ" پروفیسر فتح محمد ملک اور منشا یاد کی مرتب کردہ کتاب "۱۹۸۱ء کے بہترین افسانے" (مطبوعہ مطبوعاتِ حرمت) میں جگہ پا چکا ہے، صد افسوس کہ ہمارے محققین اور ناقدین کی پہنچ ماضی قریب تک بھی نہیں۔

طیّب منیر (راولپنڈی)

مسعود مفتی کا سلسلہ وار رپورتاژ بعنوان "ہم نفس" پڑھتے ہوئے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محض میرے ذاتی سوالات نہیں ہیں بلکہ ان نسلوں کے بےشمار افراد کے سوالات بھی ہیں جنھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد آنکھ کھولی۔ پاکستان ہی ان کی پہلی محبت ہے اور وہ پاکستان کو ایک واقعی آزاد اور خود مختار اور خوشحال و باوقار ملک بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان سوالات کو دبانے یا چھپانے کی بجائے زیادہ مناسب ہے کہ انہیں سامنے لایا جائے اور ان کے جوابات تلاش کئے جائیں تاکہ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو اپنے فکر و عمل کے لئے درست قومی سمت مل سکے۔ ایک مقام پر مسعود مفتی نے لکھا ہے کہ:

"تحریکِ پاکستان نے پاکستان کی دہلیز پر ہی دم توڑ دیا۔" (فنون جون جولائی ۸۹، ص ۲۶۹)

اگر ہم پاکستان کی دہلیز پر ہی تحریکِ پاکستان کی موت کے اس المیے میں پاکستانی عوام کو بھی شامل نہ سمجھیں تو ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ اس صورت میں ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس المیے کے اسباب قیامِ پاکستان سے پہلے کے دور میں، خود تحریکِ پاکستان اور اس کی علمبردار مسلم لیگ اور بالخصوص مسلم لیگ میں شامل بالائی طبقوں کے فکر و کردار میں ڈھونڈیں۔ خود مسعود مفتی نے تو اس طرف توجہ نہیں کی۔ کیا ہم اتنا حوصلہ رکھتے ہیں کہ اُس دور کے سارے حقائق سامنے لائیں، ان کا معروضی تجزیہ کریں اور جو نتائج برآمد ہوں ان

کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کے روشن مستقبل کے لئے کوئی موزوں راہِ فکر و عمل تجویز کر سکیں۔

مسلم لیگ کے پیشرو سر سید احمد خاں ہیں۔ جن کے تجربے کا ذکر مسعود مفتی نے بھی کیا ہے۔ سر سید احمد خان کے فکر و کردار کے دو متضاد پہلو ہیں۔ ایک مذہبی روشن خیالی کا جو آج بھی انتہائی قابلِ قدر ہے اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ان کا دوسرا پہلو سامراج پرستی اور عوام دشمنی کا ہے۔ اور ان کے اس پہلو کو یا تو چھپایا جاتا ہے یا اس کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سر سید احمد خاں کی سامراج پرستی جائز تھی تو پھر دوسرے سامراج پرستوں کو بھی یہی رعایت کیوں نہ دی جائے۔ اور اس صورت میں برطانوی سامراج کے خلاف جد و جہد آزادی میں جان و مال کی قربانیاں دینے والے ہزاروں مسلمان شہیدوں اور مجاہدوں کو اپنے ہیرو ماننے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

سر سید احمد خان دو قومی نظریے کے پہلے علمبردار تھے۔ کیا انہوں نے دو قومی نظریہ پیش کر کے برصغیر کے مسلمانوں کے تمام طبقوں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہا یا صرف اپنے طبقۂ اشرافیہ کے مفادات ہی ان کے پیشِ نظر تھے۔ ان کا فکر و عمل دوسری بات کی تصدیق کرتا ہے۔ ممتاز حسین کے الفاظ میں:

> "وہ جاگیردارانہ نظام کے طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے .... وہ یہ سوچنے سے قاصر تھے کہ ہر فرد بشر کو وہ انسانی حقوق ملنے چاہئیں جو انھیں حاصل تھے۔ انھیں یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ اسفل طبقوں کے بچے اشراف طبقے کے بچوں کے ساتھ ایک سکول اور ایک جماعت میں پڑھیں۔ اور نہ یہ بات انھیں پسند تھی کہ ہندوستانی لوگ بلا امتیاز طبقہ سول سروس کا امتحان پاس کر کے بحیثیت جنٹ اور کلکٹر ان پر حکمرانی کریں۔ غالباً انھی ساری تنگ نظریوں کے باعث انھیں جمہوریت کا ادارہ بھی ناپسند تھا۔"

"پاکستانی معاشرہ اور ادب" مرتبین ڈاکٹر سید محمد حسنین جعفری و احمد سلیم صفحہ ۲۵

کیا سر سید احمد خان کی سامراج پرستی اور عوام دشمنی کو رد کئے بغیر پاکستان کو ایک حقیقی آزاد اسلامی فلاحی ریاست بنایا جا سکتا ہے؟ اقبال نے دو قومی نظریہ اپنایا تو اس میں سے سامراج پرستی اور عوام دشمنی کے عناصر خارج کر دیئے اور سامراج دشمنی کے ساتھ نچلے طبقوں کے مسلمان عوام کے معاشی و سماجی حقوق پر شدت سے اصرار کیا۔ اس کے بعد ہی بالائی طبقوں کے مسلم لیگی عوام دوستی کا اظہار کرنے لگے تو عوام مسلم لیگ کے ساتھ آئے اور پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔ لیکن یہاں یہ سوال ہے کہ مسلم لیگ میں شامل بالائی طبقوں نے عوام دوستی کا اظہار صرف حکمتِ عملی کے طور پر کیا تھا یا وہ عوام کی بھلائی کے واقعی خواہاں تھے۔ کاش ان کے عمل سے بھی (محض لفظوں سے نہیں) دوسری بات کی تصدیق ہو جائے۔

اس سے قطع نظر کہ دو قومی نظریہ فکری سطح پر بھی مطمئن کرتا ہے یا نہیں، یہ حقیقت ہے کہ پاکستان دو قومی نظریے پر ہی بنا، مگر کیا قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی ہے یا نہیں۔ قائد اعظم نے کانگریس کے ریاستی قومیت کے نظریے کو مسترد کر کے مذہبی قومیت کا نظریہ اختیار کیا تھا اور عوام کی مدد سے پاکستان حاصل کیا تھا۔ پاکستان کی آزادی اور سالمیت قائد اعظم سے زیادہ کسی اور کو عزیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اس مسئلے پر ان کا نظریہ ہی ہمارا راہنما ہے۔ اور انھوں نے ۱۱ اگست کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں اپنی لکھی ہوئی جو تقریر پڑھی تھی اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اب دو قومی نظریے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں مسلم قومیت کی بجائے بلا امتیازِ مذہب پاکستانی قومیت پر زور دیا تھا، یعنی مذہبی قومیت کی جگہ ریاستی قومیت کی بات کی تھی۔ ان کی اس تقریر میں، میور و گریس کی طرف سے تحریف کی کوشش

اور چودھری خلیق الزماں کی تحریری دہائی سے بھی قائد اعظم کے نظریۂ قومیت میں اس تبدیلی کی تائید ہوتی ہے۔ مسعود مفتی سمیت دو قومی نظریے پر اب بھی اصرار کرنے والے قائد اعظم کی اس تقریر کو کیوں نظرانداز کر جاتے ہیں۔

مسعود مفتی مشرقی پاکستان میں فوجی افسروں کے متعلق جو کچھ بتا رہے ہیں وہ شاید غلط تو نہ ہو مگر یکطرفہ بیان ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ان کے "مزید کارناموں" کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ اگر وہ آگاہی کے باوجود ایسا کرنے سے بوجوہ معذور ہیں تو کم ازکم اپنی معذوری کی طرف ہی اشارہ کر دیں تاکہ ان پر حقائق کو مسخ کرنے کا الزام تو نہ آسکے۔

"اختلافات" میں رشید ملک نے روشن خیالی کے حق میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعض نئے حوالوں کے ساتھ بڑی حد تک سید علی عباس جلالپوری کے خیالات کا اظہار مکرر ہے۔ اور یہ اعتراض کی نہیں خوشی کی بات ہے۔ سید علی عباس جلالپوری کی مساعی رنگ لا رہی ہے اور روشن خیالی عام کرنے کی ضرورت کا احساس وشعور بڑھ رہا ہے۔ رشید ملک نے مادری نظام کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ سید علی عباس جلالپوری کا نام بجا طور پر بریکٹ کیا ہے۔ اگر انہیں اس موضوع پر "روح عصر" اور "کائنات اور انسان" میں پیش کئے گئے مواد اور تجزیوں کی صحت پر اعتراض ہے تو محض چند برسبیل تذکرہ جملوں سے اس اعتراض کا حق ادا نہیں ہوتا۔

یوسف حسن (راولپنڈی)

"فنون" کا تازہ شمارہ حسب سابق بہت اچھے مضامین نظم ونثر سے جلوہ گر ہوا ہے۔ یوں تو سبھی چیزیں پسند آئیں۔ لیکن سب کے بارے میں اپنی رائے لکھنا کار دشوار ہے۔ بس چند ایک کے بارے میں لکھتا ہوں جن میں افضلیت رشید ملک کے "انتھالوجی" کو حاصل ہے۔ ملک صاحب نے اساطیر کی اہمیت کو واضح کرتے اور ان کے ادب پر جائزہ لینے میں جس محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ مستحق تحسین ہے۔ ان کے بیانات سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے جس نوعیت کے دلائل درکار ہیں انہیں پیش کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہم ایسے تو داد کے ڈونگرے ہی برسا سکتے ہیں۔ "اختلافات" میں انھوں نے ڈاکٹر سید اختر درانی کے مضمون "مذہب اور سائنس ۔۔ کیا ان میں اختلاف ضروری ہے؟" پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ مکتوب گرامی بذات خود ایک مدلل مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے جو لرزہ خیز شواہد بیان کئے ہیں انہیں پڑھ کر ان لوگوں پر بے اختیار اپنی محبتیں نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے جنھوں نے تاریکی کی مخالفت کرتے ہوئے روشنی کی حمایت کی اور گھور اندھیروں میں عقل کے چراغ روشن کر کے انسانیت کے مستقبل کو تابناک کیا۔ سقراط کا نام تو سبھی جانتے تھے لیکن وائکلف کے بارے میں بہت تھوڑوں کو علم ہوگا ان کے مخالفین نے ان کی قبر کو کھود کر اور ان کی ہڈیوں کو پیس کر سرمہ بنا کر کسی کا کچھ نہیں بگاڑا صرف تاریخ کے صفحات پر اپنی جہالت کی مہریں لگائی ہیں۔ آج بھی کچھ لوگ اس روش پر گامزن ہیں اور خرد کے مقابلے میں کم علمی اور بے عقلی کو سراہ رہے ہیں اور بزعم خویش کوئی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ تاہم کچھ لوگ ہزار مخالفتوں کے باوجود خرد افروزی کے نیک کام میں مشغول ہیں جن میں رشید ملک بھی شامل ہیں۔

مقالات میں محمد علی صدیقی نے "غالب، انگریزی عملداری اور شاہ ولی اللہ کی تحریک" میں غالب کی شخصیت اور فن کی ایک نئی جہت دریافت کی ہے جس سے غالب کے بیشتر اشعار کی نئی تفہیم سامنے آئی ہے اور ان کے غالی تشیعہ ہونے کی تہمت کا رنگ بھی اترا ہے۔ بلاشبہ صدیقی صاحب نے ایک دقت طلب مرحلہ طے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ شاہین مفتی بھی محنت سے مقالہ لکھ

رہی ہیں۔ وہ ایک ایسی محقق ہیں جو موضوع کے ہر پہلو کو اچھی طرح اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی تحریر فیکس کے چاہنے والوں میں مقبولیت حاصل کرتی جائے گی۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے "غالب کا نظریہ شعر" میں غالب کے احساسِ جمال کو ماورائی کی بجائے ارضی کہہ کر اردو کی ترقی پسند تحریک کی جڑوں کو گہرائی عطا کی ہے۔ غمِ دوراں کے موضوع کو ترقی پسندوں نے کامیابی سے نکھارا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بھی یہ موضوع شعراء وادباء کی منظرِ التفات تو حاصل کرتا رہا ہے لیکن کم کم اور دبا دبا۔ ڈاکٹر برج پریمی کا "سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" پڑھ کر محسوس ہوا کہ بعض ترقی پسند یونہی منٹو سے بدظن رہے ہیں ورنہ وہ تو صحیح معنوں میں ترقی پسند تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ایک مخصوص طبقے کی عورت کو استحصال زدہ سمجھ کر اس کے حق میں لکھا جسے ایک مخصوص طبقے نے غیر اخلاقی فعل قرار دے کر اس کے خلاف واویلا مچایا اور اسے گردن زدنی قرار دیا گیا۔ نہ صرف اس کی زندگی میں اس کے لئے مشکلات پیدا کی گئیں بلکہ بعد از مرگ بھی اسے نہ بخشا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا شذرہ تو سبھی قارئین کو یاد ہوگا جو انہوں نے اپنے اخبار "صدق جدید" میں تحریر کیا تھا اور پاکستان کے بعض "پرہیزگار" اخباروں نے اسے نقل کیا تھا۔ خدا بخشے شورش کاشمیری کو کہ انہوں نے مذہبی مزاج رکھنے کے باوجود اس کا نوٹس لیا تھا اور منٹو کے حق میں کچھ باتیں اپنے اخبار "چٹان" میں لکھی تھیں اور مولانا کی تحریر کو روحِ اسلام کے منافی قرار دینے کی جرأت کی تھی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گزرا ہوا کل، آج سے بہتر تھا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر آنے والا دن انسان کے لئے نئی خوشیاں لے کر آتا ہے۔ اور اس کے لئے نوع بنوع آسائشیں مہیا کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان روز بروز شائستگی کا چلن اختیار کرتا جاتا تھا۔ ان دونوں گروہوں میں کون حق پہ ہے اس کا فیصلہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ تاہم اس کو کوئی شخص نہیں جھٹلا سکتا کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر آج کے ترقی یافتہ دور میں آیا ہے جب وہ اپنی ہمت کے بل بوتے پر آسمانوں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ انور عنایت اللہ نے انہی حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر اپنا افسانہ "آج اور کل" تخلیق کیا ہے اور تنہائی کے دکھ کو بیان کیا ہے۔ "جس رات ستارے ٹوٹے" کا عنوان ہی جاذبِ نظر ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر کی مشاقی نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ افسانہ نگار نے واقعات کی کڑیوں کو اس سلیقے اور ہنرمندی سے جوڑا ہے کہ افسانہ لوک گیت کی دھن کی طرح سہانا بن گیا ہے۔ افسانے میں کئی مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں افسانہ نگار کی تحریر نے سحر کا کام کیا ہے اور اس میں استعمال کی گئی نادر تشبیہات نے قاری کو متاثر کیا ہے۔ جیسے یہ جملہ کہ "سمندر پگھلا ہوا سونا بن چکا تھا جس میں اڑتے پرندے چاندی کے چھینٹوں جیسے تھے۔" یہ فقرہ منظر کو اسی صورت میں قاری کی نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے جیسا کہ افسانہ نگار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ افسانہ کے اختتام پر یہ لفظوں کی خوشبو چاندنی بن کر بکھر جاتی ہے۔ اسد محمد خان کا "مردہ گھر میں مکاشفہ" ایک عجیب تجربہ ہے۔ بظاہر تو یہ کہانی بے معنویت کا شکار ہے لیکن ذرا سا غور کیجئے تو اس کے جملوں میں مخفی مفاہیم کا انکشاف ہونے لگتا ہے اور قاری ایک خاص قسم کی کیفیت کی گرفت میں آجاتا ہے۔ مردہ گھر میں سانس لینے کی علامت امید کی رمق کو قائم رکھتی ہے اور اس دور کو ہماری نگاہوں کے سامنے لے آتی ہے جب امید کے آسمان پہ ناامیدیوں کی گھنگور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ نیلوفر اقبال بڑی استقامت سے فنِ افسانہ نگاری میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ "چابی" میں جزئیات نگاری کا کمال دکھایا گیا ہے اور ایک ایسی لڑکی کی نفسیاتی الجھنوں اور جذباتی مسائل کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے جس کے شباب کا سورج بڑی تیزی سے مغرب کی طرف رواں دواں ہے اور شادی کی مسرتوں سے سرشار ہونے کے مواقع معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانہ "بدمعاش میں" بھی خوب ہے جس میں کہانی کار نے سیدھی اور ہموار راہ پر چلتے چلے جانے کی بجائے کہانی کو ایک ایسے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں سے اگر نظریں گھما کر پیچھے کو دیکھیں تو سارا منظر حسین اور دلکش لگنے لگتا ہے۔ سلطان جمیل نسیم ایک باحوصلہ انسان ہیں یعنی وہ جلدباز نہیں ہیں بلکہ اپنی منتخب کردہ راہ پہ سہج سہج چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لمبا سفر طے کر لینے کے باوجود ان کی ابھی تک سانس نہیں

پھولی۔ اب بھی ان کے افسانوں میں تازگی پائی جاتی ہے۔ "بے اختیاری" کی تخلیق میں انہوں نے اپنے آپ کو ایک تجربہ کار افسانہ نگار کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے انسانی جذبوں کے کئی رنگ دکھائے ہیں لیکن ایک خاص رنگ نے ان سبھی رنگوں پر غالب آکر افسانے کے تاثر کی وحدت کو قائم رکھا ہے۔ اس افسانے میں بعض ایسے جملے بھی آگئے ہیں جن میں بیان کی گئی صداقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا مثلاً "مختار ہونے کا جذبہ کسی آدمی کے اندر جب درخت کی طرح سر اٹھاتا ہے تو وہ ساری دنیا کو اپنے سائے میں سمجھنے لگتا ہے۔"

خیر الدین انصاری (جھنگ)

مجھے اس بار فنون سے ایک اجتماعی نظم اور غزل مرتب کرنے کا خیال آیا جیسے کولاژ کہانی ہوا کرتی ہے۔ ایسے ہی کولاژ نظم اور غزل بھی ہو سکتی ہے اور اسی کو اجتماعی بھی کہہ لیجئے۔ ایسے شعر اور مصرعے جو اپنے تخلیق کار کو بھلا دیں اور خود جنارہ نور ہو جائیں۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جب کہنا پڑتا ہے:

ع خالق سے اپنے حسن میں تخلیق بڑھ گئی

مجھے تمام نظموں اور غزلوں میں سے روح عصر کشید کرنے میں دیر نہیں لگی ۔۔۔ ہر عہد کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اور جدید ترقی پسند اُردو نظم کا اسلوب:

ہوائے اس سال جتنے عمال دوسری شاہیوں کو بھیجے تھے ان کی اسناد میں عبارت کی غلطیاں تھیں

قرار پاتا ہے۔

گزشتہ دنوں اُردو نظم کے نام سے ایک مختصر نشست رہی۔ لیکن اس مختصر بیٹھک نے مجھے بیش بہا کر دیا۔ میں اب تک اسی سرشاری میں ہوں۔ اس نشست میں جہاں جدید نظم پر باتیں ہوئیں وہاں مجھے اپنے ہونے کا گمان بھی ہوا۔ کسی کی آنکھ میں کھلنا ہی یوں تو بہت پیارا لگتا ہے لیکن اتنی خوبصورت آنکھوں میں چمکنا کسی اعزاز سے کم نہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر تخلیق کار عہد بہ عہد متاثر ہونے کی عمر گذارتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ سراسر اپنے لفظ تخلیق کرتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ناہید قاسمی کا اسلوب سراسر اپنا تھا اور ہے۔ شعر و ادب میں ایسی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ اور اب گذشتہ کئی شماروں سے منصورہ احمد کی نظمیں سرشار کر رہی ہیں۔ جدید اُردو نظم کو جن ناموں نے اعتبار بخشا ہے، منصورہ اُن میں سے ایک ہیں۔ اب ان کی نظمیں ان کے اسٹائل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ تلازمات کا التزام ان کے سٹروکس، ہر رنگ کی چھوٹ اپنی اپنی جگہ دمک رہی ہے۔ ان کی نظم کی باطنی فضا داقعتاً بڑی شاعری کا پتا دیتی ہے لیکن نقاد منصورہ احمد نجانے کہاں کھو گئیں۔ کیا ہمیں اور انتظار کرنا ہوگا؟ گزشتہ "اختلافات" سونا سوتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ستارہ صابر ہوا کرتی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ کراچی سے اسلام آباد آگئی ہوں۔ بہر حال ستارہ اور منصورہ کے اختلافی خطوط قارئین کے ایک بڑے حلقے کو اپنا گرویدہ کئے ہوئے تھے۔

اشرف جاوید کب اپنی نظم لکھیں گے۔ میں نے قصداً "کہیں گے" نہیں کہا۔ یہی حال تسلیم الٰہی زلفی کا ہے۔ لیکن مجھے ان کا اتنا دکھ نہیں جتنا جاوید کا ہے۔ کیونکہ تسلیم بہت دور جا چکے ہیں۔

گزشتہ تین چار شماروں سے نیلوفر اقبال کے افسانوں نے اپنے چاہنے والوں کا حلقہ وسیع کیا ہے۔ "چابی" اور "بدمعاش میاں" نے تو اردو ادب کو خوبصورت کہانیاں دینے والے ناموں میں ایک اور تابناک نام کا اضافہ کر دیا۔ جزئیات نگاری، نکھرا ہوا اسلوب، ملتزم نثر جس میں قطعاً مصنوعی پن نہیں جبکہ ان عمروں میں تو آرائشی تحریریں دیوانہ کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ حرمت لفظ و معانی کا

احساس اور تازہ کاری اسی کو کہتے ہیں۔ 'جاپانی' کی تخلیق کار وسیع المطالعہ ہیں۔ تمام متداولہ علوم کا عمق اور عہد کا مکمل ادراک سطر سطر سے مترشح ہے۔ منفی اناؤں اور خود غرضیوں کی کہانی۔ محبتوں کے حرز ہونے کی تفصیل۔ گورکی، پریم چند، ندیم، بیدی، عبداللہ حسین اور گارشیا مارکیز اسی اسلوب کی روشن مثالیں ہیں۔ سادگی جو گاؤں کے پاکیزہ حسن سے مملو ہے۔ یہ روایت نیلوفر کے ذریعے انتہائی تمکنت سے آگے بڑھ رہی ہے۔ متوسط طبقے کا نفسیاتی مطالعہ بھی ان کا خاص اسلوب ہے۔ نیلوفر کے ہاں فینٹسی اور حقیقت باہم پیوست ہیں۔ یعنی افسانہ پنڈی اسٹائل کے عبوری دور سے نکل آیا ہے۔

نئے افسانے کا ایک اور نام عطیہ سید (شہر ہول) اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مجھے تو ان میں ایک اور نیلوفر اقبال دکھائی دیتی ہیں۔ وہی اٹھان، وہی انداز، وہی تیور! چشم بد دور۔ افسانوں میں ایک اور ذہین شاعر غافر شہزاد "بندھے ہوئے لوگ" لے کر آئے ہیں ان سے بڑی امیدیں وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسد محمد خان، اردو ادب کا بہت پڑھا لکھا نام ہے۔ خاں صاحب مسلسل بڑی کہانیاں دے رہے ہیں۔ سراسر اپنے اسلوب میں جو کچھ انہی سے وابستہ ہے۔ "مردہ گھر میں مکاشفہ" کیا نتھری ہوئی کہانی ہے۔ آخری جملہ تو اس دہشت نگری کی کلید ہے۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کا مضمون "استاد بڑے غلام علی خاں" خانصاحب کی گائیکی کے کئی نئے گوشے وا کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کا ماہرانہ تبصرہ زبان اور لہجے کے اسرار و رموز پر کسی حد تک روشنی بھی ڈالتا ہے لیکن زبانوں اور

ثقافتوں سے متعلق وطنِ عزیز کی موجودہ فضا میں یہ مضمون جذبات مجروح کرتا ہے۔ اب یہ تو ڈاکٹر سہیل بخاری، قدرت نقوی، عابد پیشاوری، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری اور صوتیات والے گوپی چند نارنگ ہی بتائیں گے کہ کس زبان کے لہجے میں کتنی فحاشی اور کتنا غنڈہ پن ہے۔ یوں تو کسی بھی زبان کے بارے میں اس طرح کے خیالات پیش کرنے سے گریز کرنا چاہئے اور خصوصاً ایسی صورتحال میں جب قومی تحریکیں زور پکڑ رہی ہوں، اس طرح کے ذاتی خیالات کو ہائی لائٹ نہیں کرنا چاہئے۔ زبانوں کا مسئلہ انتہائی جذباتی ہوتا ہے۔ مجھے خبر ہے کہ یہ مضمون پرانا ہے اور ڈاکٹر صاحب وطن عزیز میں ابھرنے والی قومی تحریکوں سے اس طرح باخبر نہیں ورنہ وہ خود ان خیالات پر نظر ثانی کرتے۔ لیکن رشید ملک صاحب تو زبان ایسے حساس مسئلے سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انھیں اپنے ابتدائیے میں اس سلسلے میں بھی کچھ لکھنا چاہئے تھا۔ ملک صاحب تو آپ "اختلافات" کے صفحوں کا بھی مان تران ہیں۔ اس بار بھی ان کا عمیق مطالعہ عسکری کا بت پاش پاش کرنے میں ممد ہوا ہے۔ ٹگر یوں کی حیثیت اور نام نہاد سائنسدانوں کی بوالعجبیاں بھی قارئین تک پہنچیں لیکن محترم علی عباس جلالپوری صاحب کو وزیر آغا صاحب کے ساتھ بریکٹ کرنا کوئی اچھی بات نہیں اور ہاں جناب اقبال کے "نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری" سے کیا مراد ہے۔ محترم ملک صاحب نسل پرستی اچھی بات نہیں لیکن مذہبیت اور یک زبانی کی آڑ میں استحصال کے آپ بھی مخالف ہوں گے۔ رہی بات اقبال کی تو ان کے ہاں کئی تضادات ہیں۔ آریا ہونے کا دعویٰ نہ کرنا آریہ نسل سے نکلنا ہرگز نہیں۔ ہم برصغیر والے نسلاً کیا ہیں اور کس طرح مسلمان ہوئے اور کیسے مسلمان ہیں، تشریح طلب نہیں۔ ہسٹری موضوعی نہیں ہوتی۔ بہرحال رشید صاحب کا اختلافی خط کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند ہو گیا۔ ہاں اگر اقبال کول، دراوڑ ہوتے تو فخر کی بات تھی کہ وہ حملہ آور نہیں۔ اسد محمد خان صاحب نے بھی "مردہ گھر میں مکاشفہ" میں ڈنڈی ماری۔ نشین کاف درست کرنے بیٹھ گئے۔ مجھے اس میں سے "بو" آئی۔ میرے خیالات کو شاونزم کی ذیل میں نہ دھکیلے گا۔ یوں بھی اپنی بات کرنا کسی کے خلاف بات کرنا نہیں ہوتا لیکن ہمارے ہاں یہ روایت پنپے گی کہ نہیں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اغماض اپنی زہرناکی دکھا رہا ہے اور یہ ڈرامہ اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والا ہے۔ لے کا کشن" وائٹ ہاؤس" کے

لئے کام کرنے والے اس "گھروندے" کے لیے بھی کچھ کر سکیں۔

تازہ شمارہ دیکھ کر جدید غزل کے حوالے سے کئی نام یاد آتے ہیں۔ کچھ تو کئی شماروں سے غائب ہیں یعنی تنویر سپرا، احسن بشیر، یوسف جبلی، افتخار قیصر اور مصدق اقبال لیکن ایک نام تو ایک دہائی سے غائب ہے۔ جی ہاں فیصل عجمی۔ کیا دھڑتے کی غزلیں ہوتی تھیں۔ خالد، نجیب، عدیم، پروین شاکر، صابر ظفر، غلام محمد قاصر، یوسف حسن، ایوب خاور، شہناز پروین سحر، شہزاد قمر ایک سے ایک بڑھ کر غزل کہہ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی عجمی کے تیور بھی دیدنی تھے۔ پھر وہ گم ہو گئے۔ اب اس غزل گو کی خوبصورت غزلیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ سنا ہے کہ ان کا مجموعہ اپنے "کام" کے لیے "مشہور" "قرطاس" والوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ خدا اس مجموعے پر رحم کرے اور اسے رہائی مل سکے۔ اثر و رسوخ والے لوگ کوشش کر کے اس نیک کام میں ہاتھ بٹائیں۔ اللہ جزا دے گا۔

احمد لطیف (جہلم)

اس بار "فنون" ملتے ہی سب سے پہلے اس کے ٹائیٹل نے غیر معمولی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بہت عرصے بعد فنون کے ٹائیٹل میں واضح فرق دیکھنے میں آیا ہے۔ پرچے کے مندرجات پر نظر ڈالنے کے بعد افسانوں سے آغاز کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ محترمہ نیلوفر اقبال کے افسانے اس بار بھی 'فنون' میں شامل تھے۔ سب سے پہلے انہیں کے دونوں افسانے "چابی" اور "بدمعاش میاں" پڑھے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت افسانے ہیں۔ گزشتہ "فنون" میں ان کے افسانوں "گھنٹی" اور "مساوات" کے اثر سے ہی ابھی نکل نہیں پایا تھا کہ "چابی" جیسا بالخصوص "ماسٹر پیس" افسانہ پڑھنے کو ملا۔ اس افسانے کو تو خاص طور پر کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اب میں اس افسانے کے مرکزی خیال اور کردار کا رواںؔ مختصر خاکہ پیش کر کے اس افسانے کو سمجھنے کا ثبوت فراہم کرنے کے چکر میں نہیں (جس طرح کچھ احباب کچھ پرچوں میں یہ طریقہ کار استعمال کرتے ہیں)، البتہ اس افسانے سے سر دھننے کا یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ میں نے یہ افسانہ کم از کم دس باذوق دوستوں کو پڑھنے کے لئے دیا۔ اور متعدد احباب کو پڑھنے کیلئے RECOMMEND کیا۔ گزشتہ فنون اور تازہ فنون میں محترمہ نیلوفر اقبال کے فن سے باقاعدہ متعارف ہونے کے بعد میں نے ایک اور پرانا پرچہ نکالا اور ان کا افسانہ "عوضی" پڑھ کر بھی مزید خوش ہوا۔ دفتر فنون میں محترمہ منصورہ احمد کے بتانے پر کہ نیلوفر اقبال صاحبہ کے افسانے "فنون" میں کئی برس سے چھپ رہے ہیں، میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا اور اس کے ازالے کی اب یہ صورت نکالی ہے کہ کسی وقت "فنون" کی فائل اس مقصد کے لئے بھی دیکھی جائے گی۔ محترمہ نیلوفر اقبال کے افسانوں کے علاوہ اس بار "فنون" میں جن دیگر افسانوں نے خاص طور پر متاثر کیا ان میں محترمہ عطیہ سید کا افسانہ "شہر ہول"، محمد جمیل آفاقی کا "صغریٰ" اور رضیہ بٹ کا "پھپھا" شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ تینوں افسانے بھی اپنے حسن میں لاجواب ہیں۔ اب میں یہ کہوں کہ یہ تینوں افسانے کن کن خوبیوں کی بنا پر خوبصورت ہیں تو یہ کہے بغیر بھی یہ خوبیاں موجود رہیں گی چونکہ ان تینوں افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے موضوعات کو جزئیات اور لوازمات کو خوب نبھایا ہے۔

افسانوں کے بعد فنون لطیفہ کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے مضمون "استاد بڑے غلام علی خاں" سے پہلے محترم رشید ملک کی ایک تحریر تھی جس میں انہوں نے اس کتاب کا تذکرہ کیا تھا جس سے یہ مقالہ لیا گیا ہے اور اس کتاب کی نایابی کا بھی ذکر ہوا۔ سو اس تحریر کو تبرکاً پڑھا مگر کچھ ہی دنوں بعد حال ہی میں الحمراء میں ہونے والے بک فیئر میں یہ کتاب "باتیں کچھ سریلی سی" کے دو نسخے دیکھے گئے تو مزید خوشی ہوئی۔ یوں ڈاکٹر داؤد رہبر کے دیگر مقالے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ "فنون لطیفہ" کے ضمن میں دوسری دونوں تحریریں بھی خوب تھیں۔ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے "موسیقی، گائیکی اور شاعری کی تکون سجاد سرور نیازی" میں اپنے خوبصورت سٹائل کی نثر اور تخلیقی جملوں کے ربط سے تحریر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی طرح ثنا ہنواز زیدی کا مقالہ "فنون لطیفہ کی تعلیم و ثقافت"

بھی ایک خاصے کی چیز تھا۔ شاہنواز زیدی نے ہمارے مصور کو عصری شعور کے ادراک کا جو مفید مشورہ دیا ہے اُس سے کسی کترانا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

مسعود مفتی کی رپورتاژ "ہم نفس" جب کبھی کتابی صورت میں آئیگی تو بلاشبہ ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کرے گی۔ سید مشکور حسین یاد کے انشائیہ "بہشت میں پہلا قدم" کی تعریف نہ کرنا صریحاً زیادتی ہوگی۔

غزلیات میں اس بار بعض شعراء کے کچھ اشعار تو ایسے تھے جنکو ندرتِ خیال کے اعتبار سے منفرد ہونے کے سبب یہاں پر نمونہ کے طور پر پیش کرنے کو بے اختیار جی چاہا مگر طوالت کے پیشِ نظر گریز کرنا پڑا۔ البتہ ان اشعار کے خالقوں کا ذکر کرنا بہرصورت واجب ہے۔ ان میں ندیم، ادا جعفری، محشر بدایونی، محسن احسان، آصف ثاقب، رشک خلیلی، روحی کنجاہی، گلزار بخاری، پروین شاکر، عباس تابش، قمر رضا شہزاد، شاہدہ ناز، رؤف امیر اور عارف محمود شامل ہیں۔

حصہ نظم میں اختر حسین جعفری کی نظم "شام کے بے ربط خاکے سے میرے" سید رضی ترمذی کی "برزخ" امجد اسلام امجد کی "آبِ حیات" نجیب احمد کی نظمیں "درخت بادل سے لگ رہے ہیں"، "یہ تاریخ محبت ہے"، "ابھی کچھ کام باقی ہیں" اور "دیئے آنکھوں کی صورت بجھ چکے ہیں" پروین شاکر کی "ایک اداس نظم"، مقبول عامر کی "باچا خاں" ناہید قاسمی کی "پناہ"، منصورہ احمد کی "مجھے رستہ نہیں ملتا"، اشرف جاوید کی "لمحۂ اعراف کی ایک نظم" اعجاز رضوی کی "محاذِ زندگی پر" اور ابرار احمد کی "بارش" نے بہت متاثر کیا۔ البتہ ڈاکٹر جاوید انور کی کمی اس محفل میں شدت سے محسوس کی۔

مقالات میں شاہین مفتی کے مقالے "فیض اور اردو شاعری میں رنگ کی روایت" کے سلسلہ میں ان کے موضوع کی انفرادیت اور جدید حسیات کے ادراک کی روایت سے تسلسل قائم کرنے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ شاہین مفتی کے اس زیرک کام کے جاری رہنے کا جان کر خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کا تحقیقی مقالہ "اردو کا پہلا افسانہ نگار ـــ پریم چند، راشد الخیری یا یلدرم" بھی بہت کام کی چیز ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے مقالے "غالب کا نظریۂ شعر" میں کئی نئی پرتوں کو پیش کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنے مضمون "سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" میں دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ربط کی خوب شکل پیش کی ہے۔ آخر میں اختلافات کے بارے میں، یہی مختصر سی رائے ہے کہ بعض اختلافات تو یقیناً حاشیہ مقالے کا درجہ رکھتے ہیں۔

طاہر اسلم گورا (لاہور)

برصغیر کے نامور براڈکاسٹر سجاد سرور نیازی مرحوم کے بارے میں اجمل نیازی صاحب نے مضمون کے آغاز ہی میں عجب گل کھلا دیا ہے۔ کہاں سجاد سرور نیازی اور کہاں ان کے ایک ـــ اور ممدوح، جو پندرہ سولہ سالوں سے گانے کے باوجود ابھی تک لے اور سُر سے میلوں دور کھڑے ہیں۔

جناب محمد کاظم نے "مشاہیر بہاولپور" کے باب میں نہایت توازن اور صداقت سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ تحقیق و جستجو کے باب میں مصنف "مشاہیر بہاولپور" نے بھی کمال کر دکھایا ہے۔ قیامِ بہاولپور کے دوران میں ایک بار مکرم محمد خالد اختر سے ملنے گیا، دیکھا کہ وہ خلافِ عادت مسکراتے چلے جاتے ہیں۔ عرض کرنے پر انہوں نے "مشاہیر بہاولپور" کے متعلق گوشوں پر خامہ فرسائی سے متعلق متعدد لطائف سنائے۔ حتی کہ محمد خالد اختر صاحب کے نانا کو ان کا بھائی بنا دیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں علم و فن کے میدان میں اس نوع کی فروگذاشتوں نے کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے۔ ادب و فن سے بے اعتنائی

کا نتیجہ ہے کہ تہذیبی سطح پر اندوہ ناکی کا نا ختم سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آرہا۔ اس روح فرسائی کی امثال مسعود مفتی صاحب کے مضمون میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ قوموں کی حمیت اور اجتماعی طرز احساس مردہ ہونے لگیں تو تاریخ ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرتی۔ ایسے مواقع پر سائنس کے جملہ علوم بھی ہاتھ کھڑا کر لیتے ہیں۔ یہ استدعا میں نے رشید ملک صاحب کے ارشادات کو پڑھ کر کی۔ ہر چند رشید ملک صاحب نے سائنس ہی کو کائنات کی اصل حیات قرار دیا ہے مگر دور حاضر کی آشوب کاری، ورہمی اور بربادی میں سائنس کے رول کو کہاں تک کوئی نظر انداز کرے گا۔ محمد حسن عسکری مرحوم جیسے جید ادیب نے سائنس کی اسی استبدادی صورت حال کو واضح کیا تھا۔ عسکری مرحوم کے ادبی اجتہاد سے صرف نظر کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ انہوں نے اگر مغربی فکر کے خلاف مشرق کی عظمت کو اجاگر کیا تو کون سا ظلم ہو گیا۔ رشید ملک بعض معاملات میں ازبس متشدد ہو جاتے ہیں۔ کسی شخص کو اس کے مکمل سیاق و سباق کے بغیر پیش کرنا زیادتی ہوتا ہے۔ رشید ملک صاحب کی اصل جولاں گاہ موسیقی ہے اور کلاسیکل موسیقی میں ان کے پائے کا ناقد عصر حاضر میں نہیں ہے۔ مشرق کی کلاسیکل موسیقی کے مختلف ابعاد جس انداز میں وہ زیر بحث لاتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ پھر کلاسیکل موسیقی کی بنیادیں جس بے رحمی اور ڈھٹائی سے بزعم خویش موسیقاران ڈھا رہے ہیں، ان کے خلاف رشید ملک صاحب کو ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔

علی تنہا (ملتان)

"اختلافات" کی محفل میں پہلی مرتبہ حاضر ہو رہا ہوں۔ تازہ شمارے میں ڈاکٹر داؤد رہبر کا مقالہ "بڑے غلام علی خاں کی گائیکی" پڑھا۔ اگرچہ مقالے میں خاں صاحب کی گائیکی کی بعض خوبصورتیوں کو زیر بحث لایا گیا ہے لیکن اس کے کچھ حصے نہایت قابل اعتراض ہیں۔ بار بار یہ کہا گیا ہے کہ پنجابی زبان میں گالی کا لہجہ ہے اور گالی کا یہ لہجہ خاں صاحب کی گائیکی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تحریر کے چند اقتباسات دوبارہ ملاحظہ ہوں:۔

"جو گالی بغیر لفظوں کے درباری راگ کے سُر ہی سُر میں کوئی دے جائے اُس گانے والے سے کوئی کیسے لڑے۔"

"راقم کی تجویز ہے کہ گالی دینے کو جی چاہے تو ایک تان مار کر غصہ نکال لو۔"

"اندرون لاہور کے کوچوں کے باسیوں کی بولی راقم نے برسوں سنی ہے۔ اس بولی کا اتار چڑھاؤ پہلوانی طبیعت کا غماز ہے اور بے فکری، اوباش پن حتیٰ کہ غنڈہ پن کی چغلی کھاتا ہے۔"

"پنجابی میں گالی دینے کو لفظ کی بھی ضرورت نہیں۔ خالی فحش لہجے سے اچھے بھلے محاوروں میں گالی محسوس کرا دی جاتی ہے۔"

میرے خیال میں گالی کا تعلق کسی زبان سے مخصوص کر دینا اور پھر گالی کو موسیقی جیسے فن لطیف سے جوڑنا ایک نامناسب بلکہ مہمل بات ہے۔ کیا دوسری زبانوں میں گالیاں نہیں ہوتیں اور اگر گالی اور غنڈہ پن موسیقی پر اثر انداز ہوتے ہیں تو دوسرے فنون لطیفہ اور ادب و شعر نے اس "منبع فن" سے استفادہ کیوں نہیں کیا؟ چونکہ یہ مقالہ "فنون" میں رشید ملک صاحب جیسی صاحب بصیرت اور فن شناس شخصیت کی وساطت سے پہنچا ہے اور انہوں نے اس مقالے کی تحسین بھی کی ہے، گمان ہے کہ اس تحریر میں کوئی ایسی اہم بات ضرور ہو گی جسے میں علم موسیقی سے اپنی عدم واقفیت کی بنا پر دریافت نہیں کر پایا۔ ملک صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اس بارے میں ہماری رہنمائی کریں اور یہ بھی فرمائیں کہ وہ کس حد تک ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔

اگرچہ میری حاضری کا سبب یہ مقالہ بنا ہے۔ تاہم تازہ "فنون" میں شامل تخلیقات پر سرسری سا اظہارِ خیال کر لینے میں کچھ حرج نہیں۔ حسبِ روایت تازہ شمارہ بہترین معاصر شاعری سے مزین ہے۔ بلاشبہ یہ معیاری شعر "فنون" ہی کا حصہ ہے۔ اقبال کوثر، خاقان خاور، قائم نقوی، محمد اظہار الحق، شفیق سلیمی، عباس تابش، گلزار بخاری، عارف محمود، رؤف امیر، افتخار عباس اور قمر رضا شہزاد کی غزلوں نے تو شاداب کر دیا۔ یوسف حسن کی غزلیں پڑھ کر گزشتہ "اختلافات" میں غافر شہزاد کی اُن کے بارے میں رائے بالکل درست ثابت ہوئی۔ یقیناً وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ جلیل عالی کی غزلوں کا انتظار رہتا ہے۔ اُن کی غیر حاضری اچھی نہیں لگی۔ آپ کی نظم "ہجرت" میں ہجرت کے دُکھ اور اپنی پہچان کی یافت پر احساسِ طمانیت کی ملی جلی کیفیت نے دیر تک اپنے سحر میں لئے رکھا۔ ذوالفقار فرخ اور اعجاز رضوی کی نظموں میں ایک خوشگوار تازگی کا احساس ہوا۔ منصورہ احمد اور ناہید قاسمی کی نظمیں خوبصورت انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ نجیب احمد، راشد مراد، انوار فطرت، احمد لطیف، ابرار احمد، سحر روشن صدیقی اور شاہدہ ناز کی نظمیں اس شمارے کی اہم نظمیں ہیں۔

حصۂ نثر نہایت پُرمغز اور فکر انگیز مقالات اور خوبصورت افسانوں پر مشتمل ہے۔ نثر کا ایسا انتخاب دیگر معاصر ادبی رسائل کے لئے یقیناً باعثِ رشک ہوگا۔ اسد محمد خاں کا افسانہ "مردہ گھر میں مکاشفہ" تکنیک اور موضوع کے حوالے سے ایک منفرد تحریر ہے۔ وہ بڑے اور صاحبِ اسلوب فن کار ہیں۔ غافر شہزاد کا افسانہ "بندھے ہوئے لوگ" اُن کے شاندار مستقبل کی جانب اشارہ ہے۔

افتخار بخاری (لاہور)

فنون کے شمارہ ۲۹ نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء کے اختلافات کے گوشے میں جناب رشید ملک نے "مذہب اور سائنس کا موضوع" کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھ کر بڑا لطف آیا ہے۔ رشید ملک صاحب کے جھنڈے "فنون" کے قارئین کے حلقے میں اس طرح گڑے ہوئے ہیں کہ اس گوشے کے کئی اور مراسلات بھی موصوف کی علمیت کی مدح سے پٹے پڑے ہیں اور اُن کا رُعب سب پر اس قدر طاری ہے کہ "فنون" کے کچھ سابقہ حضرات بھی (جیسے محمد ارشاد، محمد کاظم اور سید علی عباس جلالپوری) کا چراغ بھی اُن کے سامنے گُل ہو گیا ہے۔

رشید ملک صاحب کسی موضوع پر بند نہیں ہیں۔ ادب ہو یا سائنس، موسیقی ہو کہ فلسفہ، مذہب ہو کہ سیاست سب پر ان کا قلم رواں اور یکساں چلتا ہے۔ چنانچہ اس بار 'اختلافات' اُن کے انہی موضوعات پر محیط ہے۔ وہ کبھی محمد حسن عسکری کے خیالات کو ظلمات پرستی قرار دیتے ہیں اور کبھی ڈاکٹر وزیر آغا کو "مادری نظام کے صنم کدہ کا بنیادی پتھر" ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا کچھ کہنے کے بعد سوائے پیاز کے آخری چھلکے کے اُن کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح محمد حسن عسکری اور وزیر آغا مغربی فکر کے خوشہ چین ہیں اسی طرح رشید ملک صاحب کے پاس بھی اس کے علاوہ کون سی دانش ایسی ہے جسے وہ ذاتی یا کسی نئی حقیقت اور صداقت کے مترادف قرار دے سکیں۔ اُن کی بنیاد اس فکر پر ہے جسے ترقی پسند فکر یا مارکسی فکر قرار دیا جا سکتا ہے اور اس پر (بڑی احتیاط سے) زور دیئے بغیر وہ خود کو مغرب کی روشن خیالی یا سائنسی انکشافات اور جدید وسائل کی ترقی کا وکیل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ دوسروں کے صنم خانوں کے بت اگر باطل ہیں تو ترقی پسندی اور مارکسیت کے صنم خانے کی روشن خیالی اور سائنٹفک حقیقت کے بتوں پر روس اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ نظام کو یکسر مسترد کئے جانے کے بعد کیا گزری ہوگی اور اب رشید ملک صاحب اپنی نئی روشن خیالی کی بنیاد اور تاویل کہاں سے تلاش کریں

گے وہاں "سرمایہ دار" اور "آبرو باختہ" مغرب کی روشن خیال امریکی معیشت اور اخلاق کچھ اور دن اُن کی "روشن خیالی" اور "سائنسی عقلیت" کی پناہ گاہ بن سکے تو بن جائے (کیونکہ خود مادر درس گاہ کمیونزم، میں کمیونزم کے مسترد کر دیئے جانے کے بعد روشن خیالی، جدید سائنس اور جدید وسائل کا پورا ٹھیکہ اب یورپ، امریکہ کے پاس چلا گیا ہے) خدا جانے رشید ملک صاحب اب روس والوں کی ٹانگ بھی اسی طرح کھینچ کر دکھائیں گے یا نہیں جس طرح وہ دوسروں کی کھینچ کر دکھاتے رہتے ہیں اور اب تو اُن کو اس سوال کا بھی جواب دینا ہو گا کہ آخر اس پوری تگ و دو کا نتیجہ سوائے پیاز کے اُس آخری چھلکے کے کیا برآمد ہوا ہے جسے روس نے تاریخ کے کوڑے میں پھینک دیا ہے؟

ان کی ذاتی صلاحیت اور دانش کا عالم یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی پر جو حملہ کیا ہے وہ اپنی جگہ! مگر انگریزوں سے مارے ہوئے اس مال کا کون حساب دے گا جو برصغیر کی صدی رواں کی تاریخ میں پھیلا ہوا ہے اور جس کے تعلق سے انہیں پاکستان کا ایک ہی سائنس دان واحد روشنی کا مینار نظر آ رہا ہے اور باقی سب ظلمات کے پجاری!

رشید ملک صاحب ذرا اس سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں تو بڑی مہربانی ہو گی کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان جن کے نصف "ہندوستان میں رہ گئے" انہیں وہ کس پر چھوڑ آئے تھے؟ اور اس کی کتنی فکر رشید ملک صاحب کو لاحق رہی ہے؟ جن کے لئے حسین احمد مدنی نے وہ الزام سر پر لیا جیسے اُن جیسے بزعم خود روشن خیال لوگ ہمیشہ لگاتے رہے ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں کو ابتدا ہی سے بند کرنے کے بعد اُن جیسے دانشوروں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریک پاکستان میں شرکت، تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ساتھ ادب کی تاریخ کو بھی، ۱۹۴۷ء سے شروع کرنے کی مہم کیوں چلا رکھی تھی۔ کیا صلہ دیا ہے رشید ملک صاحب جیسے دانشوروں نے وہاں کے مسلمانوں کے خلوص کا؟ اور یہ کون سی دانش کی "دیانت داری" اور "غیر جانبداری" ہے کہ آپ نے مولانا حسین احمد مدنی کے حوالے سے دیوبند پر حملہ تو کر دیا ہے مگر بھولے منہ بھی مولانا اشرف علی تھانوی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ بھائی! ذرا "پروفیسر ہودا" سے بچ کر رہیئے گا اس میں جان کا بھی خطرہ ہے اور ایمان کا بھی۔

ابو نعمان (کراچی)

یہ تمنا تو کافی عرصے سے ہے کہ اختلافات کے گوشے میں شرکت کروں لیکن ہر دفعہ کوئی نہ کوئی معروفیت حائل ہو جاتی ہے۔ اس بار میں شریک تو ہو رہا ہوں لیکن مجھے "فنون" کی تخلیقات پر اپنی رائے کا بھرپور اظہار نہیں کرنا۔ بس اپنی زبان میں اپنے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اصل مسئلے کی طرف آؤں تازہ "فنون" پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کی اجازت چاہوں گا۔

افسانوں کے حصے میں نیلوفر اقبال کے پہلے افسانے "جابلی" نے بہت متاثر کیا۔ تجسس کا طویل دورانیہ اس افسانے کو زندہ جاوید بنا رہا ہے۔ ان کا دوسرا افسانہ "بدمعاش میاں" اس مرتبے کا حامل نہیں ہے اور ان کے اپنے بنائے ہوئے معیاروں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ "اختلافات" کے حصے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن جیسے جید عالم نے نیلوفر اقبال کو "دریافت" قرار دے کر حیرت میں ڈال دیا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ خاصی سینئر افسانہ نگار ہیں۔

مسعود مفتی کا رپورتاژ "ہم نفس" ہماری تاریخ کے کئی گوشوں کی نقاب کشائی کر رہا ہے۔ کاش! ہماری تاریخ میں سچ لکھنے کا رجحان پنپ سکتا اور اس سے ہماری قوم صحیح تاریخ اخذ کر سکتی!

غزلوں میں محسن بھوپالی، انور مسعود، محمد اظہار الحق، غلام حسین ساجد، گلزار بخاری، پروین شاکر، مقبول عامر، عباس تابش اور اشرف سلیم کی غزلیں پسند آئیں۔

انور مسعود کی غزل، نظم اور نعت تینوں حسنِ انتخاب ہیں۔ ان پر بات کرتے ہوئے میں آپ ہی کے خط کے یہ الفاظ دہرانا چاہوں گا کہ انور مسعود ایک مثمن ہیرا ہے، جس طرف سے دیکھو ایک نئی چمک دمک اور حسن نظر آتا ہے۔

محمد اظہار الحق اردو غزل کے وسیع اور آفاق گیر تناظر میں اپنا لہجہ بنانے میں کامران ٹھہرے ہیں۔ غلام حسین ساجد کی حالیہ غزلیں ان کی کتاب "موسم" کی ناقابلِ فہم فضا سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور ان کا ادراک ممکن ہے، اس لئے حظ بخش ثابت ہوئیں۔ گلزار بخاری کی موجودہ (اور اس سے پہلے کی غزلیں بھی) خوب ہیں۔ ان کی غزل کا ایک حسن یہ ہے کہ یہ ریزہ خیالی سے مبرا ہوتی ہے اور ہر غزل ایک تاثر کی وحدت میں پروئی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سیاسی و سماجی رویوں کو جدید اسلوب میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ پروین شاکر کی پہلی غزل نے بطورِ خاص متاثر کیا اور یہ غزل "خوشبو" والی شاعرہ کا کھویا ہوا وقار بحال کر رہی ہے۔ مقبول عامر کی غزل سادہ و پرکار ہے۔ عباس تابش مجھ سے ذرا سینئر شاعروں کی نمائندہ صف کے ایک رکن بن چکے ہیں اور ان سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اشرف سلیم کی غزلیں اس لئے قابلِ ذکر ہیں کہ جدید ردیفوں، قافیوں کے ہجوم اور چمکتے لفظوں کے انبار میں یہ نوجوان شاعر ایسی غزلیں سامنے لایا ہے جو ہمارے روایتی اثاثے کا تسلسل نظر آتی ہیں۔ میری رائے میں ہم ایسے نوجوان تغزل کے عنصر کو از سرِ نو اپنائیں گے تو غزل اُن کا ساتھ دے گی ورنہ وہ جدت کی بھیڑ میں خود کو گم کر بیٹھیں گے۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں اور میرا ہدف میری اپنی ہی غزلیں ہیں۔ غزل نمبر ۲ کے آخری شعر کے پہلے مصرعے کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ایک لفظ کے فرق کے ساتھ یہ صابر ظفر کے ایک مصرعے سے مل گیا ہے اور اس کا پتہ مجھے اُس وقت چلا جب غزلیں "فنون" کو روانہ کر چکا تھا۔ میرا مصرع ہے:

ہر ایک پھول نے جھک کر اُسے سلام کیا

اور صابر ظفر کہتے ہیں:

ہر ایک شاخ نے جھک کر اُسے سلام کیا

اسے توارد کہیئے یا اتفاق۔ بہرحال اب میں نے اپنے مصرعے کو بدل لیا ہے اور اس تغیّر کے بعد یہ مصرع صابر ظفر کے مصرعے سے کافی حد تک مختلف ہو جائے گا۔ میرے مصرعے کی موجودہ شکل یہ ہے:

ہر ایک پھول نے جھک کر اُسے سلامی دی

میری تیسری غزل میرے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے اور اس سے قبل کہ ناقدین اس پر رائے زنی کریں میں خود ہی اپنی پوزیشن واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ معاملہ یہ ہے کہ میں "فاعلاتن فاعلاتن فاعلات" سے بالکل نابلد ہوں اور اسی ناواقفیت نے مجھ سے غلطیاں بھی کروائیں۔ غزل چھپنے کے بعد میرے بعض دوستوں یعقوب آسی اور اختر شاد وغیرہ نے میری توجہ اس طرف مبذول کروائی اور بعض دشمنوں نے (جن کے نام صیغۂ راز میں ہیں) "فنون" کا تازہ شمارہ بغل میں داب کر پنڈی اور اسلام آباد کے شہروں میں بہانگِ دہل ڈھنڈورا پیٹا۔ مجھے اپنے دوستوں اور دشمنوں دونوں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان کی وجہ سے مجھے میری خامیوں کا پتہ چلا۔ اس غزل کے وزن میں میں نے خالص وجدان کو رہنما مانا تھا اور

ٹھوکر کھائی۔ ویسے اس سے پہلے کبھی مجھ سے وزن کی غلطی کا ارتکاب نہیں ہوا۔ مسئلہ یہ ہے کہ مطلع کو چھوڑ کر پوری غزل کے مصرع ہائے اوّل میں ذرا سی گڑ بڑ ہے۔[1] اب میں نے اپنی غزل کی یہ "خامی" دُور کر لی ہے۔ اب میری غزل کے یہ پانچوں مصرعے "فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن" کے وزن میں ہیں اور انہیں اس طرح پڑھیئے۔

۱۔ کبھی کبھی بے موقع ہم ہنسنے لگتے ہیں
۲۔ خواہش کی تکمیل کسی کو راس نہیں ہے
۳۔ سوچوں کے انبار اُٹھانے والے انساں
۴۔ مولا میں گویائی سے محروم رہوں تب
۵۔ خوشبو سا اسلوب امیرؔ ملا ہے مجھ کو

رؤف امیر (ٹیکسلا)

"کچھ معرّیٰ اور قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں"

مندرجہ بالا عنوان کے تحت پروفیسر محمد ارشاد صاحب کا ایک طویل مکتوب "فنون" نمبر ۲۸ کے باب "اختلافات" میں شائع ہوا ہے جو "فنون" کے آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل مکتوب کی محرک جناب سید علی عباس صاحب جلال پوری کی وہ سطور ہیں جو انہوں نے جناب محمد کاظم صاحب کے مقالہ "عربی شاعری میں فکر کا عنصر" کے سلسلہ میں تحریر کی تھیں۔ کاظم صاحب نے مذکورہ مقالہ میں "معرّیٰ" کی علمی فکر اور دینی بے راہروی کا ذکر کیا تھا۔ سید صاحب نے کاظم صاحب کے مقالہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

"محمد کاظم صاحب کو معرّیٰ کی فکر کا جائزہ ماقبل اسلام کے عربوں کی بے دینی اور بنی اُمیہ کے دور میں اس بے دینی کے احیاء کے حوالے سے لینا چاہیئے تھا۔" (فنون ۲۷، ص ۶۰۸)

سید صاحب کی مندرجہ بالا سطور کا جواب محمد ارشاد صاحب نے "فنون" کے شمارہ ۲۸ میں تفصیل سے اور بڑے سخت الفاظ میں دیا ہے (جس کا انہیں پورا پورا حق حاصل ہے) اور اس جواب میں بہت سی ناخوشگوار اور غیر متعلق مذہبی بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ خاص طور پر "آلِ محمد" کی اصطلاح سے بحث کی ہے۔ محمد ارشاد صاحب کا ارشاد ہے:

۱۔ "قرآن میں "آل" کی اصطلاح متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد پیروکار اور متبعین ہیں۔ لیکن بنو ہاشم کے پراپیگنڈے کا اثر یہ ہے کہ آج بھی آلِ فرعون (قرآن) اور آلِ لوط (قرآن) سے مراد لوط اور فرعون کے پیروکار ہوں تو ہوں لیکن آلِ محمد سے مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے دار ہی ہیں۔" (فنون ۲۸، ص ۳۵۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ "آل" کی اصطلاح اکثر جگہوں پر متبعین اور پیروکاروں کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی قرآنِ پاک میں یہ اصطلاح اولاد اور خاندان کے معنوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً قرآنِ پاک کی یہ آیت:

"فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ" (النساء آیت ۵۴)

---

[1] یہ "گڑ بڑ" نہیں ہے۔ اساتذہ میں سے بھی بعض نے اس کی اجازت دی ہے۔ ان مصرعوں کے آخر میں حرف ایک رکن "فعلن" کا نصف آخر کم ہے اور یہ کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے اور اگر شاعر نے ان مصرعوں کو "مکمل" کر لیا ہے تو بھی ٹھیک ہے۔ "ادارہ"

آج سے چند سال پہلے تاج کمپنی نے دس ترجموں کے ساتھ پہلے پانچ پارے شائع کئے تھے۔ یہ سب ترجمے اردو ہی میں تھے۔ مترجم درج ذیل حضرات تھے:۔

۱۔ شاہ رفیع الدین ۲۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی ۳۔ مولانا محمود الحسن دیوبندی
۴۔ مولانا اشرف علی تھانوی ۵۔ حافظ نذیر احمد ۶۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی
۷۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۸۔ علامہ وحید الزمان ۹۔ مولانا فتح محمد جالندھری
۱۰۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی

ان سب حضرات نے اس آیت میں "آل" کا ترجمہ اولاد اور خاندان ہی کیا ہے۔ کیا یہ سب مترجمین عربی زبان سے نابلد اور ناواقف محض ہیں یا حب علی سے سرشار ہو کر انہوں نے ایسا کیا ہے؟ ان ترجموں میں سے صرف تین ترجمے ذیل میں دئیے جا رہے ہیں جو نسبتاً زیادہ معروف اور مقبول ہیں:۔

۱۔ "خاندانِ ابراہیم کے لوگوں کو ہم نے کتاب دی اور علم (دیا)"۔ (قرآن پاک دس ترجموں والا تاج کمپنی ص ۳۰۸)
ترجمہ حافظ نذیر احمد دہلوی

۲۔ "تو ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی"۔ (ایضاً ص ۳۰۸) ترجمہ مولانا احمد رضا خاں

۳۔ "ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے"۔
(ایضاً ص ۳۰۸) ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

ب۔ بنی امیہ کی حکومت کیسی تھی اور حکمران کیسے تھے، اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے بنی امیہ کے بارے میں جو کچھ خطباتِ اقبال کے چھٹے خطبہ میں "جبر و قدر" کے تحت کہا ہے وہ درج کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو:۔

"دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال دیں تا کہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جب معبد نے حسن بصری سے کہا کہ اموی مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یوں ہی تھی تو حسن بصری نے کہا: یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں"۔

(خطباتِ اقبال ترجمہ سید نذیر نیازی لاہور بار اول ۱۹۵۸ء ص ۱۶۷-۱۶۸)

ج۔ وحدت الوجود کے بارے میں جو کچھ ارشاد صاحب نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ وحدت الوجود کا حلول اور تناسخ وغیرہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ دونوں امور تو کفر میں داخل ہیں۔ جہاں تک میرے محدود مطالعہ (اور وہ بھی اردو کی حد تک) کا تعلق ہے اردو زبان میں اس مسئلہ پر سب سے بہتر کتاب مولانا غوث علی شاہ حیدر آبادی (دکن) کی ہے۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے صرف ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور آج کل نایاب ہے۔ اس کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "حقیقتِ عالم"۔۔ "اصطلاح صوفیہ میں حقیقتِ عالم" "اعیانِ ثابتہ" ہے جس کو "صورِ علمیہ" بھی کہتے ہیں، یعنی وہ صورتیں جو علمِ حق میں ازل سے ثابت ہیں۔ کتاب اللہ کی رو سے ان کا نام "معلوماتِ الٰہیہ" ہے،

وھو بکل شیئٍ علیم (اور وہ ہر شے کو جانتا ہے)۔ بعض حضرات حقیقتِ عالم اور حقیقتِ حق تعالیٰ کو ماہیتہً اور ذاتاً ایک ٹھہراتے ہیں۔ یہ بہت بڑی لغزش ہے اور الحاد۔ ہاں اگر از روئے ظہور وجود عالم اور وجودِ حق تعالیٰ کی ایک حقیقت بتائی جائے تو یہ درست ہے اور محققین کا یہی مشورہ ہے ورنہ ماہیتہً عین کہا جائے تو سخت بے حجابت ہے اور خطا۔ کیوں کہ حقیقتِ حق وجودِ محض ہے اور حقیقتِ عالم عدم ثابتہ۔ یہ محتاج وجود ہے وہ قائم بالوجود، ایک کیسے ہو سکتے ہیں سبحان اللہ عما یصفون۔

(نور النور مصنفہ سید غوث علی شاہ حیدر آباد دکن بار دوم ۱۲۶۹ھ ص ۲۱-۲۰)

۲۔ سید غوث علی شاہ صاحب کے نزدیک مسئلہ وحدت الوجود کو ان مثالوں نے الجھا دیا ہے جو اس کو سمجھانے کے لئے دی جاتی ہیں، سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"آئیے اب ذرا ان تماثیل کو ملاحظہ فرمائیے اور اُن کی غلط فہمی پر نظر ڈالئے۔ بات واضح ہو جائے گی کہ تھی کیا بات اور یہ سمجھے کیا ہم
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مثلاً یہ کہ پانی گویا حق تعالیٰ ہیں اور برف خلق، یا دریا وہ تو موج و حباب خلق، یا روح وہ تو جسد خلق وغیرہ۔ اب کا نہ، یہی مثال خلق و حق کی سمجھی جائے گی تو کتنی گمراہی ہو جائے گی اور الحاد۔ مثلاً جب برف پگھلا تو پانی ہی پانی رہ گیا، حباب پھوٹ بہا، موج ہوا ہو گئی تو دریا ہی دریا رہا، جسد فانی ہو گیا تو روح ہی روح رہ گئی، لیجئے ذاتِ خلق کی اچھی خاصی نفی ہو گئی اور حالاں کہ خلق ابدی ہے۔ اب اگر اُس کی نفی نہ کیجئے تو پانی اور برف کو، دریا اور حباب و موج کو، روح و جسد کو ایک مانیے، اور ایسا ہوا تھا تو گویا خود خالق بھی وہیں ہیں مخلوق بھی، خدا بھی ٹھہرے بندہ بھی۔ اب کہئے "اصحاب النار ھم فیھا خالدون واصحاب الجنتہ ھم فیھا خالدون یعنی دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور جنتی ہمیشہ جنت میں۔ تو اب دوزخی کون، جنتی کون؟ اور اگر یہ سب کچھ ہے ہی نہیں، محض وہی وہ ہے، تو پھر یہ سارا قرآن کیا کیا جائے گا؟ اس کی تصدیق کیسے ہو گی؟ حضرتِ ایمان کا کیا حال ہو گا؟ اور پھر چند روز کے لئے غیر رہ کر خدا ہی بنا ٹھہرا تو پھر اس مسافر خانہ میں کفر و الحاد کا جھگڑا ہی کیا؟ امت و رسول کا بکھیڑا ہی کیسا؟ نعوذ باللہ سب کا سب باطل لازم آئے گا اور پھر یہ توحید کیا ہوئی، سارا ستیاناس ہو گیا، حالاں کہ ایسا نہیں ہے "افحسبتم انما خلقنٰکم عبثاً وانکم الینا ترجعون"۔ (ایضاً ص ۱۰۶-۱۰۵)

اگر محترم مدیر "فنون" اس کتاب یا کتابچہ کو مکمل طور پر "فنون" میں شائع کرنا چاہیں تو رسالے کے بمشکل بیس صفحات بنیں گے اور اس طرح وحدت الوجود کے الجھے ہوئے مسئلہ کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔ معنف اس کتاب میں صرف قرآن مجید، حدیثِ پاک اور حضرت ابن عربی کی تصانیف سے شواہد و دلائل پیش کرتا ہے۔

سید نور محمد قادری چک ۲ شمالی
ضلع گجرات

"فنون" (نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء) نظر نواز ہوا۔ مجموعی تاثر حسبِ معمول انتہائی خوشگوار اور بھرپور ہے۔ آپ کے حرفِ اوّل اور فنونِ لطیفہ کے باب میں ڈاکٹر اجمل نیازی کے مضمون سے سجاد سرور نیازی (مرحوم) جیسے ہمہ صفت موصوف نابغہ فنکار کے فن اور شخصیت کے بعض ایسے گوشے بھی منور ہوتے جو نئی نسل کی آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھے۔ فنونِ لطیفہ کی اتنی متنوع اصناف میں بیک وقت مہارتِ تامہ اور اتنی سچی اور غیر متزلزل لگن رکھنے والے فنکار اب کہاں۔ اگر ممکن ہو

تو کسی آئندہ اشاعت میں سجاد سرور نیازی (مرحوم) کے لئے خصوصی مطالعے کا ایک الگ گوشہ مخصوص کیجئے، وہ یقیناً اس کے مستحق ہیں۔ فنون لطیفہ کے باب میں قصور کے شہرہ آفاق موسیقار بڑے غلام علی خاں کے فن کے بارے میں ڈاکٹر داؤد رہبر کا مضمون بھی انتہائی اہم اور معلومات افزا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طرح میرا آبائی شہر بھی چونکہ قصور ہے اس لئے قدرتی پر میرے لئے یہ مضمون خصوصی دلچسپی کا باعث بنا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طرح بڑے غلام علی خاں کے فن کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ علم موسیقی میں ان کی خصوصی دلچسپی اور مہارت کا آئینہ دار ہے۔

حصۂ مضامین اس بار انتہائی معیاری ہے۔ ساتوں کے ساتوں مضامین نہایت فکر انگیز ہیں۔ یہ "فنون" ہی کا حصہ ہے کہ ہر شمارے میں اتنے سارے بلند پایہ مقالات شاملِ اشاعت ہوتے ہیں جو قارئین فنون کے لئے نظری اعتبار سے تربیت اور فکری سمت نمائی کا باعث بنتے ہیں۔ اس ضمن میں رشید ملک، محمد کاظم، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر آغا سہیل اور شاہین مفتی تک میرا حرفِ تشکر پہنچا دیجئے گا ـــ بالخصوص رشید ملک کو۔ . . . ان کے طویل مقالے "انڈالوجی" کی ہر قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ کم و بیش یہی صورتِ حال مسعود مفتی کے رپورتاژ "ہمسفر" کے سلسلے میں بھی ہے۔ توقع ہے کہ اقساط کے اختتام پر یہ دونوں تخلیقات کتابی صورت میں بھی پڑھنے کو ملیں گی۔

افسانوں کا حصہ ابھی پوری تفصیل سے نہیں پڑھ سکا۔ لیکن دو تین افسانے جو زیرِ مطالعہ آئے ہیں ان میں نیلوفر اقبال کا "چابی" اور ضیا بٹ کا "چیٹا" پسند آئے۔ نیلوفر اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایک عام سا موضوع لے کر اپنی فنکارانہ چابکدستی سے اسے ایک بڑا افسانہ بنا دیا ہے۔ ضیا بٹ کا موضوع منشیات ہے۔ منشیات بالخصوص ہیروئین کے روز بروز بڑھتے ہوئے رجحان سے ہمارے ہاں جو دلخراش سماجی المیہ جنم لے رہا ہے۔ ضیا بٹ کے افسانے میں اس کی فنکارانہ عکاسی کی گئی ہے۔ ضیا بٹ تو خیر ہمارے "سینئر" اور "منجھے ہوئے" افسانہ نگار ہیں لیکن نیلوفر اقبال کے موضوعات کی تازہ کاری اور اسلوب کا نکھار اس کے ہاں ایک ایسی متاثر کن فضا پیدا کرتے ہیں جو ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

حصہ حمد و نعت اور نظم غزل اس بار انتہائی جاندار ہیں۔ حصہ حمد و نعت میں امین راحت چغتائی کی حمدیہ نظم "بحضورِ حق سبحانہٗ" اور ریاض حسین چودھری کی نعتیہ نظم "تشخص" نے بہت متاثر کیا۔ حصہ نظم و غزل میں جاوید انور اور ایوب خاور کی غیر حاضری سے کسی حد تک تشنگی کا احساس ہوا۔ جاوید انور تو خیر ملک سے باہر تھے لیکن یہ خالد احمد اور ایوب خاور کہاں چلے گئے . . . ؟ توقع ہے آئندہ شمارے میں ان کی منظومات پڑھنے کو ملیں گی۔ آپ کی دونوں غزلیں اور نظم "ہجرت" گہرا تاثر لئے ہوئے ہیں۔ بالخصوص نظم نے تو بہت دیر تک اپنی گرفت میں رکھا اور وحشتِ وفا کی ایک پرانی نظم "یاد" بڑی شدت سے یاد آئی۔ حالانکہ دونوں نظموں کے موضوع میں خاصہ فرق ہے، شاید طرزِ احساس کے اشتراک کی وجہ سے۔ بہر طور "ہجرت" ایک بہت بڑی نظم ہے۔ حصہ نظم میں ضیاء جالندھری کی نظم ہمارے عہد کے ایک دلدوز قومی المیے کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کا پیرایہ اظہار بہت متاثر کن ہے۔ اختر حسین جعفری کی نظم "شام کے بے ربط خاکے سے پرے" ایک ایسی خوشبو کی مانند ہے جو یکبارگی دل و دماغ میں گھر کر لیتی ہے اور جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تفہیم ممکن نہیں۔ شاہ جی بلاشبہ اس عہد کے سب سے بڑے نظم گو شاعر ہیں۔ حصۂ نظم میں امجد اسلام امجد، ناہید قاسمی، نجیب احمد، منصورہ احمد، علی اکبر عباس، حسن عباس رضا، افتخار بخاری، احمد لطیف، ذوالفقار فرخ اور اعجاز رضوی کی نظمیں بھی حرفِ تحسین کی مستحق ہیں۔ حصہ غزل میں یوں تو ہر شاعر اپنا انفرادی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن جن شعراء نے خصوصی طور پر متاثر کیا ان میں محسن احسان، راسخ عرفانی، محمد اظہار الحق،

آصف ثاقب، روحی کنجاہی، تحقیق سلیمی، گلزار بخاری، یوسف حسن، پروین شاکر، مقبول عامر، قائم نقوی، عباس تابش قمر رضا شہزاد اور عارف محمود نمایاں ہیں۔ نجیب احمد غزل کے بعد اب نظم کے میدان میں بھی اپنے فنی کمالات دکھا رہے ہیں۔ کیا خوب نظمیں کہی ہیں!

اختلافات میں رشید ملک کا مراسلہ ایک باقاعدہ مقالے سے کسی طور کم نہیں۔ عارف محمود کا مراسلہ ان کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے، اگرچہ کہیں کہیں ان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ احمد لطیف نے جدید نوآبادیاتی بربریت اور وطنِ عزیز کو درپیش ایک حساس قومی مسئلے کے حوالے سے بڑی متوازن حقیقت پسندانہ اور دردآمیز گفتگو کی ہے۔ لیکن ضیاء بٹ سے ان کی "بے تکلفی" کچھ سمجھ میں نہیں آسکی۔ گو ان کا انداز محبت آمیز تھا۔ اسی طرح ضیا بٹ کے افسانے "دیوار کے اس پار" کے بارے میں غافر شہزاد کا "تنقیدی محاکمہ" بھی سمجھ سے بالاتر رہا۔ آصف ثاقب نے اپنے مراسلے میں خالد احمد کی غزل گوئی کے سفر کا جس مختصر لیکن جچے تلے اور جامع انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ نیز حرفِ اوّل کے حوالے سے منٹو کے فن کے بارے میں صرف چند سطور میں جو بھرپور گفتگو کی ہے، وہ ان کی تنقیدی نگاہ کے عمق کی نشاندہی کرتی ہے۔

آخر میں ایک حرفِ اعتذار! زیرِ نظر شمارے میں اکبر کاظمی کے شعری مجموعے "شہرِ احساس" کے حوالے سے میرا تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں ایک دو جگہ میں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر جیلانی کامران کے حوالے دیتے تھے جو شاید سہواً حذف ہو گئے۔ بہرحال میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ ادبی دیانت کا تقاضہ یہی ہے۔

ظفر منصور (لاہور)

اس تحریر کے آغاز میں غافر شہزاد صاحب نے مصوری کی مختلف تحریکوں ——— امپریشنزم، ایکسپریشنزم، کیوبزم وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ ایک پورا مضمون ہے جس کی یہاں گنجائش نہ تھی چنانچہ ہم غافر صاحب سے معذرت کے ساتھ، شاہنواز زیدی صاحب کے بارے میں ان کے تاثرات سے اس تحریر کا آغاز کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

شاہنواز زیدی نے "فنونِ لطیفہ کی تعلیم اور ثقافت" کے موضوع پر بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ جب تک ہمیں جدید مصوری کی تمام تحریکوں کے بارے میں علم نہیں ہوگا ہم اس کی تعلیم کے بارے میں پاکستان میں کیسے بات کر سکتے ہیں۔ میں باقاعدہ طور پر اس فیلڈ کا آدمی نہیں ہوں۔ تاہم یہ سطور لکھنے کا بنیادی مقصد کسی صاحبِ علم کی توجہ اس طرف مبذول کروانا ہے جو نہ صرف ان جدید تحریکوں کا مکمل احاطہ کرے بلکہ پاکستان میں مصوری کی تعلیم کے مختلف مدارج پر بھی سیر حاصل بحث کرے۔ مصوری کی تحریکوں کو اگر ہم اردو ادب میں (اردو افسانہ اور نظم میں خصوصی طور پر) تلاش کریں تو واضح طور پر فنِ مصوری کے سے تدریجی مراحل یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ہمارے علمی و ادبی رسائل میں اس نوع کے مضامین کی خاصی کمی ہے اور اہلِ علم و فن سے اس طرف توجہ دینے کی استدعا ہے۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کا مضمون "استاد بڑے غلام علی خاں" تین صفحات پر محیط ہے۔ آغاز کے ڈیڑھ سے کچھ زیادہ صفحات کا استاد بڑے غلام علی خاں سے کسی طرح بھی کوئی تعلق نہیں بنتا اور نہ ہی ان میں کوئی علم و فن کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ادیب جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو روزمرہ گفتگو کی بے شمار باتوں اور عامیانہ لب و لہجہ کو نظر انداز کر کے وہ چیزیں سامنے لاتا ہے جو عام سطح سے ارفع ہوتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر داؤد رہبر نے اس طرح کی کوئی بات ذہن میں نہیں رکھی۔ تاہم کچھ اہم باتیں ضرور بیان کی ہیں۔

حصہ نظم میں انور مسعود کی نظم "میرا سوادِ قریۂ جاں مرا" ادبیات (اپریل ستمبر ۱۹۸۹ء) میں "کاش" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ احمد لطیف کی نظم "استفسار" دستاویز (مرتب اشرف سلیم) میں "جینے کی اک گھٹیا صورت" کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ احباب سے گزارش ہے کہ "فنون" جیسے بلند پایہ ادبی پرچے کے ساتھ اس طرح کا مذاق نہ فرمایا کریں۔

منصورہ احمد کی نظم "مجھے رستہ نہیں ملتا" اس قدر عصری تقاضوں کی بھرپور عکاس نظم ہے کہ جب میں نے زیرِ لب دہرایا "مجھے رستہ نہیں ملتا" میری سرگوشی قریب کھڑے شخص نے آنکھیں کھولیں اور کہہ اٹھا "مجھے رستہ نہیں ملتا" ساتھ کھڑا تیسرا شخص چونکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یوں فضا ایک ہی نعرے سے گونج اٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ "مجھے رستہ نہیں ملتا" جب اختر حسین جعفری تک بات پہنچی تو وہ کہہ اٹھے "ہر شکن خوں رنگ مضموں پر چلتا ہے ـــــ تو اک رستہ نکلتا ہے" اور یہی وہ رستہ ہے جس کی ہم سب کو تلاش ہے۔ خدا منصورہ احمد کے ذہن و احساسات کو ایسے ہی زرخیز رکھے اور وہ عصری مسائل کو اسی طرح منظوم کرتے ہوئے تاریخ مرتب کرتی چلی جائیں۔

راشد مراد، اشرف جاوید، اعجاز رضوی اور نجیب احمد اور احمد ندیم قاسمی کی نظموں نے بھی دل خوش کر دیا ہے۔

انور عنایت اللہ کے افسانے "آج اور کل" کا مرکزی کردار آغاز میں بہت بے حس، بے عمل اور موجودہ فضا سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں بس رہا ہوتا ہے مگر اس کے آس پاس زندگی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے اور اس کے ارد گرد بسنے والے لوگ کچھ ایسی فضا بنا لیتے ہیں کہ انجام کار وہ بھی اسی سطح پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ جو آغاز میں اس کے لئے انتہائی بے معنی اور غیر اہم تھی۔ سماجی حرکات اور زندہ صداقتیں کس طرح انسان میں تبدیلی لاتی ہیں۔ افسانے کی اہم خوبی ایک ہی فضا میں بسنے والے وہ کردار ہیں جو حقیقتاً کسی خونی رشتے کی زنجیر میں بندھے ہوتے نہیں ہیں مگر پھر بھی یہ فضا جس میں وہ اکٹھے سانس لیتے ہیں۔ ان کو باہم اتنا قریب کر دیتی ہے کہ یہ تعلق خونی رشتوں سے بھی زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔

اسد محمد خاں کا افسانہ "مردہ گھر میں مکاشفہ" آغاز میں ہی "مردہ خانے" کی بجائے مردہ گھر کا لفظ استعمال کرتے ہوئے قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ میں کبھی مردہ گھر نہیں گیا مگر اس افسانے کو پڑھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سارے کردار میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہیں اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ۔ بلکہ ان کی مخصوص بو بھی میری قوتِ شامہ کی دسترس میں ہے۔ ایک زندہ انسان مردہ انسانوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اگر اپنی خباثتوں سے باز نہیں آتا اور پیٹ کے گورکھ دھندے میں اتنا مکروہ کردار ادا کرتے ہوئے قطعی خوفزدہ نہیں ہوتا تو پھر دیگر لوگ جو زندہ لوگوں کے درمیان ہیں اور خود غرضیوں کے جال اور اپنی خباثتوں کے سامنے بے بس ہیں۔ کم قصوروار ثابت ہو جاتے ہیں۔ بظاہر "تو" میں "کا کردار زندہ کردار ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے یہ کردار بھی مردہ خانے کا ہی ایک مردہ کردار ہے اور اپنے مردہ ہونے کے باوجود وہاں کی خباثتوں سے اتنا الرجک ہے کہ وہاں سے بھاگ نکلنے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگتا ہے۔

ضیا بٹ نے "چھینا" میں جوگی کے حوالے سے منظر نگاری کی ہے اس سے ایک بات تو بنتی ہے مگر ان کرداروں میں کوئی کردار بھی ابھر کر نمایاں نہیں ہوتا۔ شاید اس قماش کے لوگوں میں اس طرح کا جاندار کردار ہوتا ہی نہیں ورنہ ضیا بٹ کی آنکھ اسے ضرور اپنی گرفت میں لاتی۔

"چابی" اور "بدمعاش میاں" نیلوفر اقبال کے دو افسانے ہیں۔ ایک میں جوانی کی حدود کو پار کرتی "عابدہ" کی نجی زندگی کے تمام گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جبکہ "بدمعاش میاں" میں قدیر صاحب کا قصہ ہے کہ کیسے پختہ عمر کے میاں بھی پٹڑی سے

اُترتے ہیں اور پھر آپ ہی آپ کیسے دوبارہ پٹڑی پر چڑھ جاتے ہیں ۔ "چابی" میں لفظ چابی زیادہ بلیغ ہو کر سامنے آتا ہے ۔ دونوں افسانے خوبصورت اور معاشرتی صداقتوں کے آئینہ دار افسانے ہیں ۔

"صغریٰ" محمد جمیل آفاقی کا ایک خوبصورت افسانہ ہے ۔ اس افسانے میں جو فضا پینٹ کی گئی ہے وہ یقینی طور پر پہاڑی علاقے کی فضا ہے ۔ لفظیات کے چناؤ اور استعمال نے وہاں کے لوگوں کی زندگی کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے لا کھڑے کئے ہیں ۔ شروع سے آخر تک تمام کہانی زورر آور خان جیسے زوردار کردار کے گرد بنی گئی ہے مگر انجام سے چند لمحے پہلے ہمیں علم ہوتا ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار تو دراصل "صغریٰ" ہے اور یہ ڈرامائی عنصر افسانے کو منفرد بناتا ہے ۔

کچھ ایسا ہی ڈرامائی عنصر اور سسپنس سلطان جمیل نسیم کے "بے اختیار" میں قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے ۔ آغاز سے انجام تک قاری اپنی سوچ اور فکر کے بل بوتے پر اس کردار کو سمجھنے کے عمل میں اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے مگر جب کردار کی سمجھ آتی ہے تو ایک انتہائی بنیادی انسانی جذبہ افسانے کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے لے آتا ہے ۔

باقی رہ گئیں غزلیں تو ابھی تک پڑھ رہا ہوں اور سر دھن رہا ہوں ۔ ایک خوشی یہ بھی ہے کہ اب سال میں دو نہیں تین مرتبہ اور خدا کرے چار مرتبہ "فنون" اشاعت پذیر ہو اور خدا اس کی عمر دراز کرے ۔

غافر شہزاد

(انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور)

"فنون" کا شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء میرے پیشِ نظر ہے ۔ "حرفِ اول" میں فنونِ لطیفہ کی ذیل میں آپ نے سجاد سرور نیازی مرحوم پر اپنے کالم کے ذریعے روشنی ڈالی اور ایک اہم شخصیت سے فنون کے پڑھنے والوں کو متعارف کرایا ہے ۔ ایسی شخصیتیں ہر دور کی اہم ضرورت ہوا کرتی ہیں ۔ اس لئے کہ ایسے لوگ ہر روز پیدا نہیں ہوتے ۔ ایسے لوگوں کو بعد از مرگ بھی خداوند کریم کی جانب سے ایک زندگی نصیب ہوتی ہے کہ یہ بڑے لوگوں کے قلم کی زینت رہتے ہیں ۔ مقالات میں "شاہ ولی اللہ کی تحریک" اور "غالب کا نظریۂ شعر" کے علاوہ "سعادت حسن منٹو اور روسی ادب" قابلِ توجہ ہیں ۔ افسانوں میں "بدمعاش میاں" (نیلوفر اقبال) اور پاؤں تلے آدمی (علی تنہا) کے بعد ضیا بٹ کا چپٹا پسند کئے ۔ یہ تینوں افسانے معاشرے کے اندھیرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان میں فن افسانہ نویسی بھی اوج پر ہے ۔ میں آزاد نظم کا قائل تو نہیں ہوں لیکن اچھے اور اچھوتے خیالات جب مطالعہ میں آئے تو داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہے اس سلسلہ میں ضیاء جالندھری، اختر حسین جعفری، احمد ظفر، علی اکبر عباس، امجد اسلام امجد، اختر امان اور حسن عباس رضا قابلِ ذکر ہیں ۔ غزلیات کا دوسرا باب جو پروین شاکر سے شروع ہو کر عارف محمود پر اختتام پذیر ہوتا ہے میں نے بطورِ خاص بڑی توجہ سے پڑھا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سطحِ آب پر خوبصورت نقوش بن رہے ہیں جو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر گہرائی اور گیرائی کی کمی ہے ۔ یہی حال نظموں کے دوسرے باب کا ہے ۔

اختلافات میں ضیا ۔ بٹ کی تعریف میں لکھا ہوا احمد لطیف کا خط درج ہے جس میں انہوں نے ضیاء بٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ضیا ۔ بٹ "بدمعاش" افسانہ نگار ہے ۔ پیار میں کسی صاحب کو جو دوست بھی ہو بے تکلفی میں گالی بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے ۔ لیکن کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی استعمال کئے جائیں، ان کے معانی نہیں بدلتے ۔ میرے خیال میں لفظ بدمعاش میں بھی اتنی قوت ہے کہ اس کے معانی بہر صورت ذہن میں گونجتے ہیں خواہ آپ اسے کسی طور پر بھی استعمال کریں ۔ بہر حال اپنا اپنا خیال ہے ۔

آخر میں بحیثیت مجموعی "فنون" کی شان و شوکت کے بیان میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ "فنون" اردو کی دنیا میں بڑا قد آور ادب نما ہے جو پوری دنیا کو اپنی طرف دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ خداوندِ کریم "فنون" کو طویل عمر عطا فرمائے اور یہ ادب کے آسمان پر مدتوں جگمگاتا رہے۔

اکبر کاظمی (لاہور)

سرسری نظر سے "فنون" دیکھا۔ "تشخص" کے عنوان سے ریاض حسین چودھری صاحب کے نعتیہ اشعار دیکھے۔ ممدوح کے اوصاف بیان کرتے ہوئے مداح کے لئے ضروری نہیں کہ اپنے آپ کو "کتے" یا اور نجس جانوروں سے تشبیہہ دے۔ "ان کی گلیوں کے کتوں میں شامل ہوں میں" اشرف المخلوقات ہونے پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن نقاہت کی وجہ سے تفصیلاً نہیں لکھ سکتا۔

راسخ عرفانی (گوجرانوالہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی اور احمد لطیف

"فنون" کے شمارہ ۲۸ میں پروفیسر محمد ارشاد (ہری پور) نے ڈاکٹر صابر آفاقی سے اختلاف کرتے ہوئے اصرار کیا تھا کہ شیخ احمد احسائی وحدت الوجود ہی کے قائل تھے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے اپنے لئے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ دوستوں کو تسامحات کی طرف توجہ دلا دیتے ہیں۔ مگر وہ بات کو بزورِ دلیل منوانے کے قائل نہیں کہ ع

پائے استدلالیان چوبیں بود

اگر خالص تلاشِ حق اور بے ریا محبت درمیان میں نہ ہو تو دلیل کہیں نہیں پہنچاتی بلکہ آدمی کو ضد پہ اور پکا کر دیتی ہے۔ بہرحال یہ ایک دقیق علمی مسئلہ ہے۔ ندیم نے ٹھیک کہا ہے

لوگ مصروف خودنمائی میں اور میں کربِ تنہائی میں

خودنمائی میں مصروف ایسے ہی ایک نوجوان احمد لطیف (جہلم) ہیں جو اپنے اختلافی خط میں لکھتے ہیں کہ وہ "بغیر انسانی زیست" کرتے ہیں۔ دراصل وہ دوسروں کو نیچا دکھا کر اپنا قد اونچا کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ احمد لطیف نے "فنون" کے شمارہ ۲۹ میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بڑے دل آزار بلکہ گستاخانہ لہجے میں دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

احمد لطیف نے ڈاکٹر صابر آفاقی کے ادبی و علمی مرتبہ کو گھٹانے کی غرض سے نہایت دل آزار اور طنزیہ لہجہ میں لکھا ہے کہ "وہ شاعری بھی فرماتے ہیں"۔ معترض کی اطلاع کے لئے گزارش ہے کہ "ڈاکٹر صابر آفاقی ہمارے ملک کے معروف و محترم ادیب، شاعر اور محقق ہیں جو بیرونِ ملک بھی وسیع حلقۂ احباب رکھتے ہیں۔ ان کے اردو میں "شہر تمنا"، فارسی میں "گلہائے کشمیر" اور گوجری میں "پھل کھیلی" جیسے خوبصورت شعری مجموعے شائع ہو کر ان تینوں زبانوں کے نقادوں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے فکر و فن میں داد دینے والوں میں چند ایک مشاہیر کے اسمائے گرامی پیش کئے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر ایساندرو بوسانی (اٹلی) ڈاکٹر مجیب حسین المصری (مصر)، ڈاکٹر عبدالحئی حبیبی (افغانستان) صباح الدین عبدالرحمٰن (بھارت) ڈاکٹر کلیم سہسرامی (بنگلہ دیش) ڈاکٹر فین تھیسن (ڈنمارک) ڈاکٹر برج پریمی (کشمیر) ڈاکٹر سید عبداللہ۔

احسان دانش۔ جمیل الدین عالی۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین۔ سید ضمیر جعفری۔ پروفیسر جمیل ملک۔ میرزا ادیب۔ حکیم محمد سعید وغیرہ (پاکستان) کشمیر کے حوالے سے "راج ترنگینی" (فارسی) "اقبال اور کشمیر"، "جلوہ کشمیر" اور "کشمیر اسلامی عہد میں" جیسی تصانیف ان کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ موخر الذکر دونوں تصانیف کا اب تیسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔

معترض کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ "ڈاکٹر آفاقی ایک بہائی مبلغ ہیں ......" بین الاقوامی بہائی جامعہ قوموں کے اختلافات و تعصبات مٹا کر ان کو متحد کر رہا ہے تاکہ دنیا میں امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ دنیا کی اصلاح کے لئے ہر بہائی یہ تعلیم دیتا ہے کہ ادیان کی حقیقت ایک ہے، سارے انسان ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی شاخ کے پتے ہیں۔ دین اور سائنس میں مطابقت ہونی چاہیئے۔ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوتے چاہئیں۔ ایک عالمی حکومت ہونی چاہیئے۔ تعلیم سب کے لئے ہونی چاہیئے۔ معیشت کا نظام عادلانہ ہونا چاہیئے۔ ہر قسم کے وطنی، سیاسی، جنسی، مذہبی اور لسانی تعصبات کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ساری دنیا کے لیے ایک ہی زبان اور ایک ہی طرز تحریر ہونا چاہیئے۔

کیا یہ تعلیمات ہمارے زوال پذیر معاشرے کی اصلاح کے لئے مفید نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو پھر ان باتوں کے بارے میں دوسروں کو بتانا قابلِ اعتراض بات نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بہائی نظام میں کوئی آدمی پیشہ ور اور تنخواہ دار مبلغ نہیں ہوتا۔ فارسی کی بہائی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بین الاقوامی شہرت کی حامل شاعرہ ہیں۔ دنیا کے اہل قلم ان کو بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے ان کو "خاتونِ عجم" کا لقب دیا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ اپنے لئے تو نیکیوں کا ابلاغ اور اپنے اسلاف کے ساتھ عقیدت و ارادت کا حق رکھیں مگر دوسروں کو یہ حق دینے سے انکار کر دیں۔

معترض ایک نوجوان آدمی ہے۔ اس نے ادب اور شخصیات کے بارے میں بہت کم مطالعہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر آفاقی کی اٹھارہ تصانیف میں سے ایک بھی اس کی نظر سے نہیں گزری ورنہ وہ یہ فتویٰ صادر نہ کرتا کہ "ڈاکٹر آفاقی کی شاعری اور مقالات واجبی سے ہوتے ہیں"۔ اس قطعیت کے ساتھ کسی کی شاعری یا تحقیق کو واجبی قرار دینا ذہنی ناپختگی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

عبدالرحیم ندیم (مظفر آباد)

گذشتہ شمارہ

"فنون" کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مندرجات اور مشمولات میں تنوع کے ساتھ ساتھ ایک حیران کن توازن اور ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مجلہ مشتمل ہے "ادب عالیہ" و "ادب حالیہ" (آج کا ادب) کے (CROSS SECTION) کراس سیکشن پر اور اس طرح اس کی افادیت مسلم ہے۔ جہاں تک اس کے مزاج کا تعلق ہے اس میں ایک نوع کی نرمی، ٹھہراؤ اور بردباری ہے۔ آپ اگر یہ سوال کر بیٹھیں کہ یہاں مجلّے کا ذکر ہو رہا ہے یا کسی آدمی کا تو میں سوال کے جواب کو آپ ہی پر چھوڑ کر جون، جولائی ۸۹ء کے شمارے کی بات چھیڑ دونگا۔ لیکن اس سے قبل یہ کہنا چاہوں گا کہ "فنون" حد سے زیادہ "محتاط" ہے، کاش قدرے کم ہوتا۔

نظموں میں ایوب صابر کی نظم "وہ کہتے ہیں" سیدھی، سچی اور دل و ذہن کو متاثر کرنے والی شاعری کا نمونہ ہے۔ "رئیس امروہوی کی ..." جناب صفدر صدیق رضی کا نوحہ برچھی کی طرح دل میں پیوست ہو گیا۔ ضیاء جالندھری کی نظم

"جس تن لاگے" پڑھنے کے لائق ہے۔ بڑی جذباتی سی تخلیق ہے۔ جہاں تک اس نظم کے اسلوب کا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ اس کو پڑھا تو میراجی اور ابن انشا بیک وقت یاد آئے۔ "آئینہ روشن خطِ زنگار سے" اختر حسین جعفری کی بے حد خوبصورت، فکر و جذبے کی ہم آہنگی سے رچی ہوئی نظم ہے۔ شبنم رومانی کی "ہائیکو"

عکس ہے قید اس کا
آئینے سے لڑتی ہے
بیچاری چڑیا

ایک اچھی ہائیکو ہے۔ ذوالفقار فرخ کی "دو سیال کرّے" میں ایک نئی بات کہی گئی ہے یا پرانی، بہت ہی پرانی بات کو نئے انداز میں کہا گیا ہے۔ "ایک درخواست" کے زیر عنوان ندیم نے بھی یہی کیا ہے۔

افسانوں کا شعبہ اب کی دفعہ یکساں معیار کی تخلیقات کا مجموعہ ہے۔ سب ہی افسانے پڑھنے کے لائق ہیں۔ ممتاز مفتی کا افسانہ 'حادثہ' اس زمرے میں نہیں آتا یا یوں کہئے اس خانے کے باہر ہے۔ اس کو ہم کلاسیکی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ذاتی پسند کے طور پر نیلوفر اقبال کے دونوں افسانے "گھنٹی" اور "مساوات" کا ذکر کر سکتا ہوں۔ ترجموں میں اس مرتبہ بھی آئزک بی سنگر کا ایک اچھا افسانہ "اس کا بیٹا" شامل ہے۔ غزلوں کی محفل بھی غزل کے مزاج کی طرح متنوع ہے۔ یہ ضیا جالندھری کو کیا ہو رہا ہے۔ ان کی غزل کی ردیف جی دہلائے دے رہی ہے۔ محشر بدایونی، احمد ظفر، اسلام عظمی، اظہر عنایتی، ندیم ہاشمی، صابر ظفر، عباس تابش، سعدیہ روشن صدیقی کی غزلیں خوبصورت تخلیقات ہیں۔

زیر نظر شمارے کے حصۂ نثر کے مشمولات میں "ہم نفس-۲"، (مسعود مفتی) کو شامل کر کے آپ نے پڑھنے والوں کو ایک مطابق حال تحریر پڑھنے کے ملنے دی ہے۔ پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے قاری کو ایسی تحریریں پڑھنی ضروری ہیں۔ محمد کاظم کا مضمون "محمود درویش کی ایک گفتگو اور ایک طویل نظم" پڑھ کر جی چاہا کہ صاحب مضمون سے مکمل انٹرویو کا ترجمہ کرنے کی درخواست کی جائے۔ آپ نے "انگارے" کو شبانہ محمود کے قلم سے دوبارہ چھیڑا ہے۔ یہ مقالہ محنت اور لگن سے لکھا گیا ہے۔

عبداللہ جاوید (کراچی)

گذشتہ سے پیوستہ شمارہ

کسی رسالے کی تعریف رسمی طور پر کرنا ہمارے بیشتر ادیبوں، شاعروں کی عادت میں شامل ہے مگر خاکسار شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ "فنون" کے مندرجات نہ صرف دلچسپ بلکہ فکر انگیز ہوتے ہیں اور یہ میرے پسندیدہ رسائل میں سرِ فہرست ہے۔

پچھلے شمارے میں آپ کا اداریہ پڑھ کر میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ جدید غزل کے جدید تر شاعروں کے لئے بھی ایک شمارہ وقف کر دیں۔ برادرم احمد لطیف کے خط میں بھی یہی اصرار ہے۔ یقیناً دوسرے بہت سے حضرات نے بھی اس سلسلے میں آپ کو لکھا ہوگا۔

تازہ شمارے کے حصۂ غزلیات میں یوں تو سبھی شاعروں کا کلام اوسط سے زیادہ ہے مگر اپنی انفرادیت اور

تازگی کے سبب شہزاد احمد، خاقان خاور، امجد اسلام امجد، خالد احمد، جلیل عالی، یوسف حسن، افتخار بخاری، خاور اعجاز، پروین شاکر اور عدیم ہاشمی نے کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔

نظموں میں اختر حسین جعفری، امجد اسلام امجد کی نظمیں اپنی تہہ داری کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پسند آئیں۔ اس کے علاوہ ناہید قاسمی، منصورہ احمد، اور شاہین مفتی کی نظمیں ایک ایسے احساس کی حامل ہیں جو "مردانہ شاعری" سے بالکل الگ ہے نئی شاعرات سینئیر شاعرات کے شعری رویوں کی نہ صرف توسیع کر رہی ہیں بلکہ انہیں کچھ اور سمتیں بھی دے رہی ہیں۔ "فنون" کی غزلوں میں خواتین کا جو کلام شائع ہوا ہے۔ وہ بھی نظم کے دوش بدوش اسی توسیع کا حصّہ ہے۔

مقالات کے حصّے میں عزیز حامد مدنی کے مقالے کی تیسری قسط بھی مایوس نہیں کرتی۔ محمد ارشاد اور شہزاد احمد کے مقالات اپنے اپنے موضوعات پر مکمل گرفت اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے کامیاب نمونے ہیں۔ شہزاد احمد نے اگرچہ ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اب ان کی دوسری امیج ایک بے حد پڑھے لکھے نثر نگار کی بھی بنتی جا رہی ہے۔ مگر یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس دانشوری سے ان کی شاعری پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑ رہا۔ ابھی مقالات کا حصہ زیر مطالعہ ہے اور افسانوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

اسعد بدایونی (علی گڑھ)

نکہت یاسمین گُل

○

اِس قدر ہی رابطہ رہ جائے گا
کوئی شب بھر جاگتا رہ جائے گا

گدلے گدلے پانیوں میں عکس کو
چاند گم سُم دیکھتا رہ جائے گا

لوحِ جاں سے مِٹ رہوں گی، اور وہ
میرے معنی سوچتا رہ جائے گا

چُپ کھڑی رہ جاؤں گی میں آس پاس
وہ زمانہ کھوجتا رہ جائے گا

سوچنے کو منزلیں صدہا، مگر
دیکھنے کو راستہ رہ جائے گا

یہ تڑپ نکلی تو باقی زیست میں
کیا بھلا، تو ہی بتا، رہ جائے گا

بے خطر بھیگوں گی اِک دن، دیکھنا!
رُت کا پنچھی، ہا، چنچیتا رہ جائے گا

○

گُل بُوٹے میں کاڑھ کاڑھ کے ورق سجاتی جاؤں
آنکھوں سے اِک موتی لے لوں، بیچ ٹکاتی جاؤں

پلک پلک شبنم سے سجاؤں، راہ تکوں سُورج کی
چھائی ہے گھنگور گھٹا، پر آس لگاتی جاؤں

کتنا سکوں محسوس کروں جب ریت پہ بیٹھے بیٹھے
ہاتھ سے تیرا نام لکھوں، پھونکوں سے مٹاتی جاؤں

تیز ہوا کے جھکڑ، بارش اور گلی کا پانی
دیکھ کے جانے کیا کیا سوچوں اور گھبراتی جاؤں

لوٹ آئے ہو، اِس دھوکے میں، کھڑے کھڑے مدت سے
دُور کہیں اِک نقطے کو رومال ہلاتی جاؤں

عباس تابش

○

مرے وجود سے انکار کرنا چاہتا ہے
وہ اس طرح مجھے بیکار کرنا چاہتا ہے

میں ایک ساعتِ ساکت ہوں اسکی مٹھی میں
جسے گرا کے وہ سیّار کرنا چاہتا ہے

پہنچ گیا مرے دل کے قریب موجۂ اشک
جو اس مکان کو مسمار کرنا چاہتا ہے

کھلا کہ ترکِ ستم کے بہانے وہ ہم کو
حریصِ لذتِ آزار کرنا چاہتا ہے

بجھا تو سکتا ہے لیکن بجھانے والا نہیں
وہ میری آگ کو گلزار کرنا چاہتا ہے

یہ دوسروں سے رہائی دلانے کا مطلب
وہ ہم کو اپنا گرفتار کرنا چاہتا ہے

جو کل کو ہونا ہے وہ آج کیوں نہیں ممکن
ابھی کرے اگر انکار کرنا چاہتا ہے

سوالِ وصل مجھے بھی پسند ہے تابشؔ
یہ کام وہ بھی کئی بار کرنا چاہتا ہے

○

منحرف ہیں مرے ساتھی تو خدا ہی آئے
میرے حق میں بھی کبھی کوئی گواہی آئے

کوئی افواہ بھی آنگن میں اُتر سکتی ہے
یہ ضروری نہیں کھڑکی سے ہوا ہی آئے

یہ بھی ممکن ہے وہ تانیں کبھی خنجر مجھ پر
اور آڑے مری ناکردہ گناہی آئے

مارے دیتی ہے یہ حساس طبیعت ورنہ
جی تو کرتا ہے یہاں روز تباہی آئے

وہ کہاں ہے، ہمیں ہونے کا پتہ دے کچھ تو
خود نہیں آتا اگر، اس کی صدا ہی آئے

راستہ اتنا بھی ویراں نہیں دیکھا جاتا
کوئی خوشبو، کوئی جھونکا، کوئی راہی آئے

کھل گیا بابِ قبول اور کسی پر تابشؔ
مرے حصے میں مرے دستِ دعا ہی آئے

ثمینہ راجہ

٥

پھر ساعتِ وصال جو اِک شب میں آگئی
اس کلبۂ حزیں میں دیا سا جلا گئی

باہم رہے تو دیکھا کیسے یہ رودِ عشق
ہر سمت ایک نُور کا دریا بہا گئی

تھا کارواں سے ربط مسافر کا ٹوٹنا
کچھ دُور ساتھ ساتھ مگر اِک صدا گئی

وہ رنج بے کنار میں ڈوبی ہوئی نگاہ
اِس دل کو ضبطِ غم کے قرینے سکھا گئی

پھر تو عقب میں اس کے پھرے ہم تمام عمر
دامن کو ایک بار جو چھُو کر ہوا گئی،

٥

وہ اختیار و جبر کے موسم بھی خُوب تھے
وہ شخص بھی عجیب تھا اور ہم بھی خُوب تھے

تا عمر اپنی ذات کے زنداں میں ہم رہے
ہر انجمن میں ویسے تو باہم بھی خوب تھے

ہم خاک ہو گئے نہ انھیں کچھ خبر ہوئی
وہ ہمزبانِ کوکب و انجم بھی خوب تھے

مانندِ آفتاب تھے شعلہ بجاں بھی وہ
گریہ کناں بصورتِ شبنم بھی خوب تھے

پھر دل کو ساری عمر نہ یاد آئی کوئی بات
وہ تجھ کو بھُولنے کے عزائم بھی خوب تھے

ثمینہ راجہ

○

پرندہ کس فضا میں کھو گیا ہے
افق سارا لہو سا ہو گیا ہے

وہ قصّہ ہے پرندے کی زباں پر
سلیماں کو اچنبھا ہو گیا ہے

اسی خوش بخت چشمے سے پرندہ
کئی دیسوں کی مٹّی دھو گیا ہے

پرندے جاگتے ہیں اور دھندلکا
درختوں سے لپٹ کر سو گیا ہے

گلابی آسماں کی آرزو میں
ہمارا دل پرندہ ہو گیا ہے

○

بس طالبِ چشمِ نم رہے ہیں
کس درجہ غریب ہم رہے ہیں

اِک پل کی مُراد پانے والے
عمُروں کے حریص کم رہے ہیں

پہچان کے چند رنگ اب تک
کیا جانیے کیوں اتم رہے ہیں

کیسے انھیں راستے میں چھوڑیں
برسوں سے جو ہم قدم رہے ہیں

اندر سے پگھل کر آنے والے
الفاظ، لبوں پہ جم رہے ہیں

رؤف امیر

○

مت گماں کر کہ کسی دھات کی زنجیریں ہیں
یہ نہ ٹوٹیں گی کہ حالات کی زنجیریں ہیں

زندگی! تُو نے مجھے کتنا جکڑ رکھا ہے
سانس کی ڈور ہے، جذبات کی زنجیریں ہیں

عُمر بھر جن کی اسیری میں مجھے رہنا ہے
میرے اپنے ہی خیالات کی زنجیریں ہیں

اِس لیے بھی وُہ ستاروں کو نہیں چھُو سکتا
پیڑ کے ہاتھ میں ثمرات کی زنجیریں ہیں

بیڑیاں پاؤں کی اِک آن میں کھُل جائیں گی
اصل دُشمن تو مرے ہات کی زنجیریں ہیں!

○

اپنی خواہش کو طلب تک نہیں آنے دیتا
دِل میں جو بات ہے لب تک نہیں آنے دیتا

کُچھ اگر سیکھنے پلتے ہیں، بھُلا دیتا ہے
ہم کو وُہ جینے کا ڈھب تک نہیں آنے دیتا

وُہ تو ہر شخص کی قسمت میں ہے مَرنا، وَرنہ
کوئی یہ چیز بھی سب تک نہیں آنے دیتا

اُس نے دونوں کو کچھ اِس طرح سفر پر رکھا
وُہ کبھی صُبح کو شب تک نہیں آنے دیتا

رُوٹھتا ہے تو امیرؔ اُس کو منا لیتا ہوں
اپنے پیارے کو غضب تک نہیں آنے دیتا

سعدیہ روشن صدیقی

○

جو تم نہیں تھے ہمارے گھر میں تو بس خلا سے مناسبت تھی
چراغِ جاں بھی بجھا ہوا تھا، ہوا سے ایسی مطابقت تھی

فریق دونوں ہی تھک چکے تھے، متاعِ جاں کو گنوا چکے تھے
محاذ خاموش ہو گئے تھے کہ اب مکمل مخاصمت تھی

خرد کے بچپن کا تھا زمانہ، خلوص و ایثار کا خزانہ
بنامِ یاری نہ دشمنی تھی، نہ دوستی میں منافقت تھی

عجب تماشا ہوا وطن میں، ہمارے جذبات کے چمن میں
جو آنکھ کھولی کسی کلی نے، مغائرت تھی نہ خاصمت تھی

عجیب ساتھی مجھے ملے تھے جو ساتھ دینا نہ جانتے تھے
عمل کا جب بھی مقام آیا، زبانی ان کی معاونت تھی

کسی بھی پستی میں ڈوب جاتے، کہیں تو ہم بھی فریب کھاتے
ضمیر و دل کی جو روشنی تھی وہ اک مسلسل مزاحمت تھی

○

جو آنکھیں ہوں سمندر سی انہیں دریا نہیں کہتے
جو منظر شہر بن جائے، اسے صحرا نہیں کہتے

نہ جانے اس کے دل میں محفلیں آباد ہوں کتنی
اکیلا جو بھی بیٹھا ہو، اسے تنہا نہیں کہتے

گئے جب مدرسے بچے کلاشنکوف لے آئے
جو شے ہے ان کے شانے پر اسے بستا نہیں کہتے

چمکنا ہے مقدر میں تو مٹی بن کے چمکیں گے
کبھی چاندی کی فرمائش، کبھی سونا نہیں کہتے

ترا چہرہ ہو یا آنکھیں زباں ہو یا قلم تیرا
جو مطلب کو رکھے مبہم اسے انشا نہیں کہتے

تو اب کیا سعدیہ تم بھی غزل کو سائنس سمجھو گی؟
یہ سب ہے صنعتِ لفظی اسے القا نہیں کہتے

(ابوظہبی)

وزیر علی بابو

○

سفید پرچم اگر خلا میں گڑے ہوئے تھے
زمین زادے تمام بے حس پڑے ہوئے تھے

اُنھیں وہاں سے بھی خوں بہا کی امید کب تھی
یتیم بچے سرِ عدالت کھڑے ہوئے تھے

مری صفائی کے وقت لہجوں میں لکنتیں تھیں
کئی زبانوں پہ آبلے سے پڑے ہوئے تھے

میں اپنے بچوں سے بھیگی آنکھیں چرا رہا تھا
کہ وہ کھلونے خریدنے پر اڑے ہوئے تھے

جو گھر جلا تھا تو آگ تاپی تھی دوستوں نے
سڑک پہ خانہ بدوش بچے پڑے ہوئے تھے

خزاں کی زردی وزیرؔ اپنے نصیب میں تھی
فقیر تھے ہم کہ سختیوں میں بڑے ہوئے تھے

○

میں کائنات میں جب سے خدا ہے، تب سے ہوں
کسے یہ علم، ستارہ ہوں اور کب سے ہوں

سخنوری ہی مرا اوڑھنا بچھونا ہے
بساطِ وقت پہ زندہ اسی ادب سے ہوں

مری زمین کا رس ہے مرے حوالوں میں
میں معتبر ہوں تو آخر کسی سبب سے ہوں

یہ اور بات دعائیں مزار پر مانگوں
حقیقتاً تو مخاطب شہِ عربؐ سے ہوں

میں اُس کے ہونٹ پہ چھالے کی شکل ہوں باؔبو
میں اُس کے جسم کا حصّہ ہوں، اُس کے لب سے ہوں

اعجاز رضوی

○

خاک پر دائرے بناتا ہوں
یوں میں دل کا نگر بساتا ہوں

دھوپ آنگن میں آتے ڈرتی ہے
اور میں چھت پہ کم ہی جاتا ہوں

چاند کا ساتھ بس گلی تک ہے
گھر میں اکثر اکیلا آتا ہوں

شہر کا شہر روٹھ جاتا ہے
خاک سے جب بھی سر اٹھاتا ہوں

دل میں جگنو ہیں تیری یادوں کے
سُونے گھر میں دیئے جلاتا ہوں

○

ایک سہاگن کے دیکھے ہیں بن گجرے کے ہات
سوچ رہا ہوں، آگے چل کر کیا ہوں گے حالات

دھیرے دھیرے بھول گیا ہوں تیری ساری باتیں
لیکن اب تک یاد ہے مجھ کو اک چھوٹی سی بات

تجھ کو اپنا جان کے میں نے من کی باتیں کی تھیں
مجھ کو کیا معلوم تھا پیارے، بدل چکے حالات

تم اعجاز کو تنہا سمجھے، یہ ہے تمہاری بھول
رات وہ کاٹے چاند کے ہمرہ، دن سورج کے سات

○

میری ہر اک بات پہ وہ خاموش رہا
میں نے اس کی خاموشی کا دُ کھ سہا

مایوسی میں مجھ کو حوصلہ دیتا ہے
تیز ہوا میں جھلمل کرتا ایک دیا

پیار کی خودرو بُوٹی دل میں کیا پھوٹی
رفتہ رفتہ جنگل ذات میں پھیل گیا

دیکھتا ہوں تو جیون پھیلا لگتا ہے
سوچتا ہوں تو ایک ہوا کا جھونکا سا

شاھدہ ناز

○

مجھ سے قسمت مری خفا کر دی
اے خدا تُو نے انتہا کر دی

کیا بِلا اُن سے التجا کر کے
قتل کس واسطے انا کر دی

وہ جو دِل کو لہو رُلاتی تھی
دِل سے وہ آرزو رہا کر دی

اِک مرا صبر آزمانے کو
جبر کی اُس نے انتہا کر دی

تیرہ و تار منظروں کے بیچ
کس لیے چشم ہم نے وا کر دی

نازؔ اُس نے تو درد کی صورت
دل کی قیمت مجھے ادا کر دی

○

نہیں جب روشنی تو سائے کیسے
ہمارے ساتھ کوئی آئے کیسے!

مرا اُس سے تعلق ہے نہ ناتا
مرے دُکھ درد وہ اپنائے کیسے

خود اپنے آپ کو دیکھے بِنا، ہم
یہ کہتے ہیں کہ ہیں ہمسائے کیسے

تم آئے ہو تو پہلے یہ بتاؤ
اچانک آج ہم یاد آئے کیسے

مقدّر سے جسے تو کھو چکا ہے
تدبر سے اُسے تُو پائے کیسے

نہ پوچھو نازؔ دورِ بے حسی میں
دلوں کے آئینے دُھندلائے کیسے

منصور آفاق

○

مقید ہوں مَیں کن فکاں کے قفس میں
مری ذات کب ہے مری دسترس میں

خبر ہے — مگر ڈالتا ہوں کمندیں
اڑانیں تمہاری نہیں مرے بس میں

مری لوحِ تقدیر پہ تُو نے لکھا
مسرت کا لمحہ ہزاروں برس میں

تلِ جمیل کے کوئی ساحل پہ پوچھے
کہاں تیرے وعدے کہاں تیری قسمیں

تری برف راتوں کو آغوش دوں گا
بڑی شعلہ افشانیاں ہیں نفس میں

ہمیں نے سجائیں سروں پر صلیبیں
ہمیں سے چلیں قتل گاہوں کی رسمیں

○

شعارِ عشقِ محمدؐ مری نماز ہوا
گماں، یقین کی ساعت سے سرفراز ہوا

تُو کائنات کا خالق ہے، مانتا ہوں، مگر
مرا وجود تری ذات کا جواز ہوا

مجھے زمین پہ کوئی بھی فاش کر نہ سکا
مَیں کائنات کے دِل میں خدا کا راز ہوا

مری جبیں میں بھی سجدے تڑپ رہے ہیں مگر
میں اپنی ذات کا خود ہی حریمِ ناز ہوا

ترے لبوں کی کرم بار مسکراہٹ سے
نیاز مند خدائی سے بے نیاز ہوا

فیصل محفوظ

○

اَب تو پہلے سے بھی بدتر ہو جائیں گے
یہ حالات رہے تو پتھر ہو جائیں گے

کون ہماری اُونچی دستاریں دیکھے گا
ہم اِس سے پہلے جو بے سر ہو جائیں گے

بندوقوں سے کھیلنے والو، چند دنوں تک
ایسے کھیل تماشے گھر گھر ہو جائیں گے

پھر اِک روز اچانک بلی آ جائے گی
اور ہم بھی چُپ چاپ کبوتر ہو جائیں گے

جانے کس کے دور میں سرمایہ داروں سے
مزدوروں کے بچے بہتر ہو جائیں گے

یہ چھوٹے چھوٹے نالے بھی بہتے بہتے
دریاؤں کے ساتھ سمندر ہو جائیں گے

○

مٹی کے بھاؤ میں تول دیئے جاتے ہیں
بازاروں میں ہیرے رول دیئے جاتے ہیں

اگلا ایک دریچہ بند کیا جاتا ہے
پچھلے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں

سب کو مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے
سب کے ہاتھوں میں کشکول دیئے جاتے ہیں

جانے کیسے ہم دیوانوں کی بستی میں
سارے زہریلے سچ بول دیئے جاتے ہیں

میرے شہر میں پھولوں جیسے مفلس بچے
روٹی کے ٹکڑوں کے مول دیئے جاتے ہیں

اطہر سلیمی

○

عروسِ زر جہاں رُخ سے نقاب اٹھاتی ہے
پلاسٹک کے کنول سے بھی باس آتی ہے

ہنسی کی جھیل میں احساسِ غم کے زینے سے
ترے فراق کی کائی نقب لگاتی ہے

وفا کی سطح پہ بنتی ہیں تیری تصویریں
دُکھوں کی نہر میں جب ریت بیٹھ جاتی ہے

دھنک کی شاخ پہ گاتے ہیں رنگ کے پنچھی
تو شام پل کے دریچے میں مُسکراتی ہے

سمٹ کے ختم نہ ہو جائے نیکیوں کا حصار
بُرائی بابِ تقدس پہ گنگناتی ہے

اُگی ہیں ہڈیاں اطہرؔ بدن کی کھیتی میں
لہو کی شاخ پہ اب راکھ لہلہاتی ہے

○

سفر کی گرد نہ جاں پر لپیٹتے کیسے
بکھر رہا تھا مکاں، مُڑ کے دیکھتے کیسے

دُکھوں کی ماری ہوئی رُوحِ عصر پوچھتی ہے
یہ لوگ آنکھ جھپکنے میں مر گئے کیسے

دریچے نقش بدیوار، صحن مُہر بلب
ہوئے ہیں شہرِ نگاراں میں حادثے کیسے

وہ گردشیں ہیں کہ باہر بھی جھانکنا مشکل
بنا گیا مرے اندر وہ دائرے کیسے

یہ ڈر ہے تیرا ہی چہرہ اُبھر نہ آئے کہیں
خلا میں ٹوٹتے بنتے ہیں زاویے کیسے

کھلے ہیں پھول مگر سر پہ راکھ اوڑھے ہوئے
وہ کر گیا ہے مرے نام تجربے کیسے

انجم سلیمی

○

وحشت سی ہو رہی ہے عجب مخمصے میں ہوں
شاید خود آگہی کے کسی مرحلے میں ہوں

اب تک میں اپنے آپ پہ ظاہر نہیں ہوا
محسوس ہو رہا ہے، ابھی تجربے میں ہوں

کیسے کرے گا تو مری ہستی سے انحراف؟
میں تیرا عکس بن کے ترے آئینے میں ہوں!

مجھ کو سفر نے کوئی نیا پن نہیں دیا
یوں چل رہا ہوں جیسے کسی دائرے میں ہوں

اِک بوجھ ہو گئی ہے مرے واسطے حیات
میں تھک چکا ہوں اور ابھی راستے میں ہوں

○

کہاں سے جانے در آئی ہے بے حسی مجھ میں
جو بات پہلے تھی، اب وہ نہیں رہی مجھ میں

اب آئینے مری پہچان میں نہیں آتے
کہ چھپ گیا ہے کوئی شخص اجنبی مجھ میں

ابھی میں پوری طرح مطمئن نہیں خود سے
ابھی ضرور کسی شئے کی ہے کمی مجھ میں

میں راکھ راکھ ہوا ہوں، نہ اب کرید مجھے
وہ بجھ چکی ہے جو اِک آگ تھی دبی مجھ میں

اُگا رہے ہو عبث مجھ پہ پھول پھل انجمؔ
زمینِ سخت ہوں، اتنی کہاں نمی مجھ میں

خاور اعجاز

منظرِ شب کسی عنوان بدل جانے دے
اب چراغوں کی بجائے ہمیں جل جانے دے

آزمانا ہے تو پابندیٔ فطرت کیسی
شوق لہروں کو کناروں سے اچھل جانے دے

حاصلِ خواب ہیں اے چشمِ زمانہ ہم کو
اب کسی پیکرِ تعبیر میں ڈھل جانے دے

اپنے آنگن میں ہری شاخ کے کانٹے رکھ لے
ساتھ کے صحن میں اس شاخ کے پھل جانے دے

تنگیٔ چشمِ نظارہ! مجھے محدود نہ کر
منظرِ شوق کے اُس پار نکل جانے دے

دل بلندی پہ اُتر، مہرِ توجہ کی کرن!
کوہِ معنی پہ جمی برف پگھل جانے دے

مضطرب ہے مرے سینے میں جو اک موجِ طلب
بحرِ امکاں! اُسے طوفان میں ڈھل جانے دے

گھروندہ کانچ کا اور مہمان پتھر کے
بسائے دِل نے سبھی مہربان پتھر کے

جب اُس نے رائے طلب کی سجا کے آئینے
زبانِ خلق سے آئے بیان پتھر کے

یہ اگلے وقتوں کے منزل شناس لوگ نہ ہوں
ہمیں جو لگتے ہیں خالی نشان پتھر کے

تب ایک مسندِ گل سے ہوئی سرافرازی
ہزار پہلے ہوئے امتحان پتھر کے

حدِ زمیں میں عجب عکس اک مقید ہے
گرے ہیں جس پہ کئی آسمان پتھر کے

مجھے تری، تجھے میری خبر تو ہے لیکن
زمانے تیرے مرے درمیان پتھر کے

ن، م، دانش

○

ہجر کے موسم تنہائی کے دُکھ دیکھے
اک چہرے کے پیچھے کتنے دُکھ دیکھے

اک سناٹا پہروں خون رُلاتا ہے
اک آواز کی خاطر کیسے دُکھ دیکھے

میں بھی اپنی ذات میں تنہا پھرتا ہوں
تم نے بھی بے خواب رُتوں کے دُکھ دیکھے

ہم دونوں نے اک دُوجے کو جان لیا
ہم دونوں نے اک دُوجے کے دُکھ دیکھے

جس کو جینا ہے دُنیا میں، دستورا"
لازم ہے وہ سب سے پہلے دُکھ دیکھے

ہم لوگوں کا بچپن کیسا بچپن تھا
چھٹپن میں بھی بڑے بڑے سے دُکھ دیکھے

رات گئے تک میں نے اس کی یادوں میں
جتنے شعر لکھے تھے، اُتنے دُکھ دیکھے

○

اُجاڑ آنکھوں میں رت جگوں کا عذاب اُترا ہے نیم شب کو
جو درد جاگا ہے شام ڈھلتے تو شعر لکھا ہے نیم شب کو

میں خالی کمرے کے سرد گوشے میں روز تنہا یہ سوچتا ہوں
یہ کون ہنستا ہے دن ڈھلے تک، یہ کون روتا ہے نیم شب کو

دہکتے سُورج کا ظلم کچے گھروں کے باسی ہی جھیلتے ہیں
یہ بات سوچی نہیں تھی دن میں، جو خواب دیکھا ہے نیم شب کو

یہ سوچتا ہوں کہ کون سی شے دیے کی لَو چاٹتی رہی ہے
یہ دیکھتا ہوں کہ ایک سایا لرزتا رہتا ہے نیم شب کو

تمھاری یادوں کی دھیمی لے ہے کہ میں ہوں، یا پھر کوئی نہیں ہے
تو سُونے آنگن میں کون آکر دیا جلاتا ہے نیم شب کو

اگر کبھی تم ملو گے اس سے یہ جان لو نون میم دانش
وہ آدمی ہے جو دن کو روتا ہے، خواب بوتا ہے نیم شب کو

رفعت عباس

چاہے کچھ ہو آئینہ دکھلا مجھے
تجھ میں گر سچائی ہے، جھٹلا مجھے

تیرگی میں دفن کر دے شوق سے
روشنی کے نام سے بہلا مجھے

شہر میں تھا میری آوازوں کا شور
اور صدا دیتا رہا صحرا مجھے

اس قدر چہرے ہیں میرے سامنے
مل نہیں پاتا مرا چہرا مجھے

سب قرض چکا گیا ہے دریا
اب شہر تک آ گیا ہے دریا

صبحیں ہیں کہ مچل بنی ہوتی ہیں
کیا موج میں آ گیا ہے دریا

اڑتی ہی چلی گئیں ہیں کونجیں
بہتا ہی چلا گیا ہے دریا

کیوں کھول کے بادبان باندھے
کس گھاٹ لگا گیا ہے دریا

تصویر اتارنے لگے تھے
تصویر بنا گیا ہے دریا

طاہر عباس بخاری

○

حالات رہیں پیشِ نظر جاگتے رہنا
بستی پہ ہے شبخون کا ڈر جاگتے رہنا

ممکن ہے کہ تاریکیٔ شب میں کوئی غدّار
پھر کھول دے اس شہر کا در، جاگتے رہنا

پھر چال نہ چل جائیں اندھیروں کے مداری
پھر دور نہ ہو جائے سحر، جاگتے رہنا

آئیں گے ابھی اور کئی سخت مقامات
باقی ہے ابھی اور سفر، جاگتے رہنا

جب تک نہ ہو موصول کوئی خیر کا پیغام
جب تک نہ ملے کوئی خبر، جاگتے رہنا

○

لہجے میں فسوں کاریِ تسخیر عجب تھی
اُس نقرئی آواز میں تاثیر عجب تھی

کر سکتا نہ تھا کوئی ہلانے کی جسارت
آویزاں درِ عدل پہ زنجیر عجب تھی

میں بول رہا تھا مگر الفاظ تھے اُس کے
حاصل مجھے آزادیٔ تقریر عجب تھی

دم توڑ گئے میرے تراشے ہوئے پیکر
اُس نے جو دکھائی مجھے تصویر عجب تھی

میں اس میں سکونت کے بھی حق سے ہوا محروم
طاہر مرے اجداد کی جاگیر عجب تھی

شرافت عباس

○

نظر کو تیر بدن کو کڑی کماں لکھنا
کہ ہم تو بھول گئے مدحِ دلبراں لکھنا

کبھی اُداس جو ہونا تو سوچنا اُس کو
اور اُس کو سوچ کے تفسیرِ کہکشاں لکھنا

کبھی تراشنا اُس کے خیال کے پیکر
پھر اپنی پلکوں سے اُن پر حدیثِ جاں لکھنا

کبھی صبا کی ہتھیلی سے لے کے نکہتِ گل
شگفتِ غنچۂ لب کو مشامِ جاں لکھنا

کبھی نکالنا دفتر پرانی یادوں کے
پھر اُن میں تازہ گلابوں کی داستاں لکھنا

اور اب یہ حال کہ لکھنا کبھی جو نامۂ شوق
تو اب نہ رنگ نہ خوشبو نہ کہکشاں لکھنا

ڈبو کے خامۂ غم دل کی روشنائی میں
ستیزہ کاری و بے مہریِ جہاں لکھنا

غزل کے لہجے میں کرنا کلام کا آغاز
پھر اُس میں مرثیۂ مرگِ عاشقاں لکھنا

وہ تیرگی ہے کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا
اب ایسے حال میں کیا سوچنا، کہاں لکھنا

○

خندۂ گُل باغ کو نخلِ تمنا دے گیا
ایک قطرہ کتنے خشکابوں کو دریا دے گیا

گو بظاہر ایک ہی جیسا تھا اندازِ صبا
ہم کو چاکِ پیرہن، اُس کو سراپا دے گیا

ابر کیسا تھا کہ برسا جا کے سیلِ آب پر
کیا سمندر تھا کہ آبادی کو صحرا دے گیا

جاننے والے نے اُس کو حُسنِ آگاہی دیا
دیکھنے والا سنورنے کا سلیقہ دے گیا

سرد بازاری تو دیکھو کاروبارِ زیست کی
ایک لمحہ زندگی بھر کا خسارہ دے گیا

کس پہ کیجیے اعتبارِ چارۂ زخمِ جگر
جو بھی آیا، اک نیا جھوٹا دلاسہ دے گیا

افتخار بخاری

○

پل بھر ہوں اظہار کی خواہش وقت کی آنکھ مچولی میں
مجھ پر بھی اک بوند گرے تیرے رنگوں کی ہولی میں

کون سخی ہے جس نے اک شب جینے کا سامان کیا
کس نے چاند کا سکہ ڈالا شام کی خالی جھولی میں

سوچ کبھی اے سونے والی سجے سجائے کمروں میں!
جاگ رہی ہے یاد تری اک دل کی اجڑی کھولی میں

ہری رتوں میں سج کر جس کو اس بستی میں آنا تھا
وہ دلہن تو بوڑھی ہو گئی بیٹھے بیٹھے ڈولی میں

نانک ہو یا شاہ حسین، بخاری یا بھگت کبیر
سب نے ایک ہی درد لکھا ہے اپنی اپنی بولی میں

ناہید شاھد

○

بھٹکیں ترے مدار میں گردش نہ کر سکیں
ایسا نہ ہو کہ ہم تری خواہش نہ کر سکیں

ٹوٹے وہ قہر، ردّ و بدل جس کا کچھ نہ ہو
انسان شق زمیں پہ رہائش نہ کر سکیں

بستی میں ہوں پناہ گزیں فتنہ ساز لوگ
لیکن اسے جلانے کی کوشش نہ کر سکیں

پوچھے جو کوئی حال ہمارا تو ہنس پڑیں
ہم قاش قاش دل کی نمائش نہ کر سکیں

ہونٹوں پہ بے یقین دعائیں جمی رہیں
آنکھوں میں ابر آئیں تو بارش نہ کر سکیں

ارضِ وفا رہائی تری اس طرح سے ہو
باغی جو ہیں، وہ پھر کوئی سازش نہ کر سکیں

امتیاز ساغر

○

یہ جو طوفان اُٹھا ہے مجھ میں
کچھ نہ کچھ ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

یا تری یاد نے صورت پالی
یا کوئی میرے سوا ہے مجھ میں

ہجر میں وصل کی رعنائی ہے
کوئی تو جلوہ نما ہے مجھ میں

راہ میں چھوڑ کے جانے والے!
دیکھ کیا حشر بپا ہے مجھ میں

میں شبِ ہجر میں تنہا کب ہوں
تو بھی تو آن بسا ہے مجھ میں

مری کرچوں کو سنبھالے کوئی
آئینہ ٹوٹ رہا ہے مجھ میں

نیاز دانا

○

طلوعِ عظمتِ آدم کہاں ہے
جہالت کا اندھیرا درمیاں ہے

گلوں کی زندگی گو مختصر تھی
مگر خوشبو کا رشتہ جاوداں ہے

حصارِ جسم میں رکھا گیا ہوں
فسونِ لامکاں اندر مکاں ہے

سُلگتے ہیں نشیمن آرزو کے
شبستانِ محبت میں دھواں ہے

تری یادوں کے پہلو میں جو گزرے
وہی لمحہ متاعِ دو جہاں ہے

آصف ہمایوں

○

نگار خانۂ ایّام میں سنوار مجھے
متاعِ درد، مرے نام سے پکار مجھے

فصیلِ کرب کے اندر ہوں روشنی کا سراغ
سوالِ عام بنا دے مرے حصار، مجھے

شعورِ ذات کی کچھ منزلیں مقابل ہیں
مثالِ جنس نہ مانگے کوئی اُدھار مجھے

مری نمود کا ہر مرحلہ حسیں تر ہے
خزاں سے چھین کے لے جائے گی بہار مجھے

محبّتوں کی جبیں پر لکھا ہوا اک روز
کرے گا وقت کسی روز آشکار مجھے

میں ارتقائے مسلسل کی ایک منزل ہوں
نہ زمین ذرا سوچ کر اُتار مجھے

○

وہ مل چکا ہے مجھے یا ابھی ملا ہی نہیں
یہ مرحلہ تو مری جستجو کا تھا ہی نہیں

نہ جانے کیا ہوئے ساتھی دیارِ خوباں کے
گیا ہے جو بھی اُدھر کو، وہ لوٹتا ہی نہیں

اُڑا کے لے گئی ایسے نقوش، تیز ہوا
کہ جیسے نقش زمیں پر کوئی بنا ہی نہیں

شہیدِ وقت ہوا اپنی نجات کی خاطر
کہو کہ سامنے میرے تو کچھ ہوا ہی نہیں

نئی صدائیں نئی بازگشت لے آئیں
اَنا کا سنگ عجب ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں

نظر کی لوح پہ یادوں کا آخری منظر
ترے غریب نے شاید ابھی لکھا ہی نہیں

بجھی ہوئی ہیں یہ آنکھیں کچھ اس طرح اب تو
کہ اس دیار میں جیسے کوئی رہا ہی نہیں

ناصر بشیر

○

مثالِ برگِ خزاں، مَیں ہوا میں اڑتا ہوں
تلاشِ رزق میں نکلا ہُوا پرندہ ہوں

میں جاؤں گا تو کوئی آفتاب آئے گا
میں ایک بُجھتا ہوا، صبح کا ستارہ ہوں

مرے وجود پہ اُترا ہے تشنگی کا عذاب
مگر یہ زعم کہ کتنا قریبِ دریا ہوں

جواز اس سے بڑا ہوگا کیا جدائی کا
گلابِ تازہ ہے تُو، میں ہوائے صحرا ہوں

مرا قبیلہ مجھے مسخ کرکے چھوڑے گا
لکھی ہے جس پہ صداقت، میں ایسا چہرہ ہوں

○

موسم نے بھی میرے خلاف ہمیشہ سازش کی ہے
بارش برسی، جب تعمیر کی میں نے خواہش کی ہے

اپنی جانب کوئی مسیحا آنے والا نہیں تو
ہم نے خیابانِ ہستی کی کیوں زیبائش کی ہے؟

جب سے کتابیں پڑھ کے ہم آشفتہ حال ہوئے ہیں
تب سے ساری دنیا دشمنِ عقل و دانش کی ہے

آج ترا نام انجانے میں آیا ہماری زباں پر
ورنہ ہم نے اپنے کون سے دُکھ کی نمائش کی ہے؟

گنبدِ بے در میں گزریں گے عمر کے باقی دن بھی
ہم نے پکار کے تجھ کو اک بے فائدہ کاوش کی ہے

مشکل کام نہیں ہے مسافت وقت کی طے کر لینا
ناصرؔ ساری بات اک دوسرے کی فہمائش کی ہے

عطاء اللہ

○

ایسا نہیں کہ شہر میں قلت زیادہ ہے
ہم کو محبتوں کی ضرورت زیادہ ہے

یہ زندگی رہینِ مشیت بھی ہو تو ہو
لیکن رہینِ چشمِ عنایت زیادہ ہے

مجھ کو خبر ہے، حُسن کہانی ہے عارضی
وہ جانتا ہے، عشق حقیقت زیادہ ہے

کچھ یوں کہ وہ حواس پہ طاری ہے آج شب
کچھ یوں کہ چاندنی ہے سو وحشت زیادہ ہے

اس واسطے قبول نہیں وصلِ شوخ کا
محنت ہے دل کی کم، مگر اُجرت زیادہ ہے

اس کی چھٹی نہ یاد جھمیلوں میں بھی عطاؔ
اور آج کل تو خیر سے فرصت زیادہ ہے

○

اپنی اوقات سے باہر نہیں ہونے دیتا
عشق انسان کو خود سر نہیں ہونے دیتا

آس وہ روز بڑھا جاتا ہے ٹوٹے دِل کی
یوں وہ حالات کو بہتر نہیں ہونے دیتا

جیسے لمحات کے وہ خواب دکھاتا ہے مجھے
ایسے لمحات میسّر نہیں ہونے دیتا

آنکھ کو چبھتے ہیں سو بار جفا کے تیور
دِل ہی احساس ذرا بھر نہیں ہونے دیتا

آ کے بتا ہی نہیں پھول سی بستی میں عطاؔ
دل حسیں ہے، وہ حسیں تر نہیں ہونے دیتا

افشاں عباس

○

چاہت وگرنہ کس کو کھُلی آنکھ کی نہیں
جیسے خواب ہی کچھ ایسا کہ میں جاگتی نہیں

صدیوں سے ایک نقطے پہ ساکت ہوں کس لیے
جب میرے پاؤں میں کوئی زنجیر بھی نہیں

شاید نظامِ وقت نے رستہ بدل لیا
سورج کی ہے نمود مگر شب ڈھلی نہیں

اتنا رہے خیال، شبِ غم نصیب سے
میری بھی دوستی ہے، فقط آپ کی نہیں

شاید یہیں کہیں کوئی سامع ضرور ہے
یہ وجہ میری آنکھ کبھی بولتی نہیں

اک تو کہ راستے کے ہر اِک پیچ پہ رُکا
اک میں، کسی بھی موڑ پہ آکر رُکی نہیں

آئی پلٹ پلٹ کے جو آواز وقت کی
افراطِ رنگ و بُو میں کسی نے سُنی نہیں

○

پہلے ہوا کے سامنے شب بھر جلی ہوں مَیں
پھر جَل کے اپنی آگ میں کندن بنی ہوں مَیں

پتوں میں، برگ برگ میں، پھولوں کے رنگ میں
دیکھو جو غور سے تو نظر آ رہی ہوں مَیں

موجد ہوں تیرے شہر کے نقش و نگار کی
کہتے ہیں لوگ پھر بھی، یہاں اجنبی ہوں میں

چہرے بدل بدل کے جو آتے ہیں رُوبرو
تم فکر مت کرو، انھیں پہچانتی ہوں مَیں

تحلیل ہو گئی جو میں فن میں، تو پھر کہیں
اپنے سخن کی مانگ میں جا کر سجی ہوں مَیں

اشعار میرے کیوں نہ ہوں معیارِ فن کا رُوپ
تخلیق کے تمام ہُنر جانتی ہوں مَیں

افشاںؔ، ہجومِ یاس کے ہر پیچ و تاب میں
بکھری نہیں، چٹان کی صورت کھڑی ہوں میں

اشرفِ سلیم

○

جب قحط پڑا تھا شہر میں، تنہا میں تھا
پھر اُسکی تباہی دیکھ کے رویا میں تھا

دیوار گری تھی سیل بلا سے اُس پر
لیکن جو پسِ دیوار کھڑا تھا، میں تھا

افلاس کے ہاتھوں بھوک کے اس جنگل میں
کل رات گئے جو قتل ہوا تھا، میں تھا

جب مجھ سے بچھڑ کر دُور بہت جا پہنچا
پھر جس نے پلٹ کر مجھ کو دیکھا، میں تھا

انیل چوہان

○

صبح کے منظر دعاؤں کی سزائیں دے گئے
کیا اُجالے تھے، بصارت بھی اُچک کر لے گئے

ہم نے جن کو دوست سمجھا کس قدر بے فیض تھے
جیٹھ کے کم ظرف بادل آئے، بن برسے گئے

ناشناساؤں میں تو بے حد پذیرائی ہوئی
ہم خود اپنے گھر میں لیکن اجنبی سمجھے گئے

آدمی نے اپنی صورت پر تراشے دیوتا
اپنے جذبے مختلف انداز میں پُوجے گئے

دن میں بھی بجھنے نہیں دیتا چراغوں کو انیل
ظلمتوں کے ڈر کچھ اتنے ذہن میں بوئے گئے

اختر عثمان

○

تجھے پھر سے سرِ کوہِ تمنّا دیکھنے کا
ذرا سا بھی نہیں امکان ایسا دیکھنے کا

خزاں خواہوں نے اس میں سبز شیشے جڑ دیے ہیں
ہمیں خوش فہم ہی رکھتا ہے چشمہ دیکھنے کا

کچھ اُس کے جسم کی وہ شعلگی بھی بجھ گئی تھی
کچھ اپنا شوق بھی ویسا نہیں تھا دیکھنے کا

وہی جو صاحبِ کردار کا عکسِ جبیں ہے
تمنائی ہوں میں ویسا ستارا دیکھنے کا

زمانہ دُھند کی صورت ہمارے درمیاں ہے
تو پھر کیسے کوئی باندھے ارادہ دیکھنے کا

ابھی تو دیدۂ نرگس میں تابِ وصل بھی ہے
ابھی امید ہے، موقع ملے گا دیکھنے کا

بوقتِ آئینہ بینی پلک جھپکی تھی اخترؔ
تغافل میں گنوا بیٹھا ہوں لمحہ دیکھنے کا

○

کنارئی میں کفِ افسوس ملتا رہ گیا ہے
سرِ کشتِ تمنا بس بجوکا رہ گیا ہے

چلو سامانِ رسمِ مشک برداری اٹھائیں
فراتِ وقت پر پھر کوئی تشنہ رہ گیا ہے

پرائی روح تھی مائل بہ زہرہ ہو گئی ہے
مسہری پر کوئی پہلو بدلتا رہ گیا ہے

ترا نقشِ قدم تا حشر تُو دیتا رہے گا
ہمارے پاس اب اِس کے سوا کیا رہ گیا ہے

ہمیں پھر وسعتِ دشتِ جنوں کو ماپنا ہے
گماں سے ماورا اِک آدھا حصہ رہ گیا ہے

میں اب کشکول ہاتھوں میں لیے پھرتا ہوں اخترؔ
کہ دریوزہ گری ہی میرا ورثہ رہ گیا ہے

شاہدہ صدف

○

کسی سے کیا داد لیجیے اپنے حوصلوں کی
ہمیں کو رکھنا تھی لاج ماضی کے فیصلوں کی

نوازشیں اتنی بڑھ گئیں میرے دوستوں کی
کہ یاد آنے لگی ہے پھر سے گئے دنوں کی

امانتیں غم کی، آنے والوں کو سونپنی ہیں
نشانیاں ہیں یہ مجھ سے پہلے مرے ہُوؤں کی

سراب اُکسا کے آب تک لے گئے وگرنہ
مرے لیے ایک خواب تھی گردِ منزلوں کی

تمام عمر اک طرح سے آنکھوں میں کاٹنی ہے
نباہ کرنا بھی پاسبانی ہے سرحدوں کی

فصیل باقی ہے، شہر کب کا کھنڈر ہوا ہے
حکائتِ غم ہے یا کہانی سیاحتوں کی

نہ ذہن تھا منتشر صدف اور نہ سوچ باغی
نجانے کیسے بنا پڑی دل میں وحشتوں کی

○

کسوٹیاں دل ہیں یا کہ دنیا، زمانہ کیا اس سے بے خبر ہے
محبتیں اتنی معتبر ہیں تو پھر ہمیں کیا کسی کا ڈر ہے

دلوں سے گردِ ملال دھولو، فراق کے دن گزر چکے ہیں
سکوتِ شب بدگماں نہ ہو یہ مریض کی آخری سحر ہے

اداس ہونا تو سوچ لینا، کہ ربطِ باہم ہے ہم میں تم میں
مسافتیں ایک سی کٹھن ہیں، اگرچہ تنہائی کا سفر ہے

خدا کی بستی کے سارے باسی خدا کی شفقت کے سائے میں ہیں
گلہ نہیں اپنی بے گھری کا، کہ اس کی دُنیا ہی میرا گھر ہے

جدا کروں خود کو خود سے کیسے، اداسیاں تو سرشت میں ہیں
جو ساتھ رہتا ہے میرے ہردم، وہ میرے اندر کا نوحہ گر ہے

جو یوں نہ ہو تو مشیتوں کا صدف کسے اعتبار آئے
لہو سے اک عمر جس کو سینچا، بس اک وہی شاخ بے ثمر ہے

اسماء راجہ

○

آئیں کالی راتیں اور پھر گرد اُڑانے والے دن
گزرے ہوئے دن اچھے تھے یا آنے والے دن!

جی خوش ہو تو کٹ جاتے ہیں چند ہی لمحوں میں
ہفتوں اور مہینوں میں ڈھل جانے والے دن

دل پر یُوں تو بہت دنوں کا بوجھ پڑا ہے اب کے
لیکن یہ منڈلانے، اُڑنے، گانے والے دن

عمریں کھوج میں بیت گئی ہیں، ایسا کھویا وہ
ایک ذرا سی بات پہ روٹھا جانے والے دن

کالی تیز ہوا میں اُڑ گئے سارے عہد پرانے
اب کیا رنگ دکھائیں گے یہ آنے والے دن

موتیے، مخمل، چاندنی جیسی مرے "ابی" کی گود
پریوں جیسے خواب تھے اور من بھاتے والے دن

○

گو اسے بھولنا محال نہیں
اتنی ہمت نہیں، مجال نہیں

میں نے دیکھا شب گرفتہ بھی
تیرا پیکر فقط خیال نہیں

میں نے یوں زندگی بسر کی ہے
کوئی راحت، کوئی ملال نہیں

کیوں شکایت کسی سے ہو اسماؔء
ہاتھ پہ ہی خطِ وصال نہیں

جواز جعفری

○

سفر جو تھا مجھے درپیش، کٹ گیا آخر
مرا وجود بھی ٹکڑوں میں بٹ گیا آخر

فرار ہونے کا جب رَن سے راستہ نہ ملا
تو دشمنوں کے مقابل وہ ڈٹ گیا آخر

ہمارا عشق تو صحرا تھا، اب بھی پیاسا ہے
تمہارا حُسن جو بادل تھا، چھٹ گیا آخر

وفا کے جادۂ بے سنگِ میل کا یہ سفر
جفا رُتوں کی معیت میں کٹ گیا آخر

کچھ اِس طرح اُسے لوگوں نے بدگمان کیا
وہ شخص جو مرا بازو تھا، کٹ گیا آخر

○

جنونِ دربدری اور کششِ جہت کے عذاب
کہاں تک اور میں جھیلوں مسافرت کے عذاب

میں برف اوڑھ کے سوؤں گا سرد راتوں میں
مجھے قبول نہیں ہیں پرائی چھت کے عذاب

زبانِ خلق ہے اور میرے گھر کی باتیں ہیں
یہ کس نے بو دیے گھر میں منافقت کے عذاب

وطن بھی چھُوٹا، مدینے میں بھی اماں نہ ملی
ہیں چکھ رہا ہوں ابھی تک مہاجرت کے عذاب

اقبال حسین

○

طوفانوں میں ہوں، آنکھ اوجھل ساحل ہے
تجھ سے بچھڑ کے جینا کتنا مشکل ہے

تیری تلاش میں نکلے تو معلوم ہُوا
اِک دیوار نہ گرنے والی حائل ہے

ایک ستارہ، اک جگنو، اک کاہکشاں
شب کے مسافر کا یہ زادِ منزل ہے

پتّا کوئی گرتا ہے تو سوچتا ہوں
برسوں پیڑ کا دُکھ سہنا لاحاصل ہے

لوگ سمجھتے ہیں آساں شاعر ہونا
شعر تو کہنا جاں دینے کے مماثل ہے

○

گھر وہ ملا ہے جس کے در و دیوار نہ تھے
تعبیروں کو خواب مرے درکار نہ تھے

شب بھر چاٹیں دیواریں، ہلکان ہوئے
صبح رہائی کے لیکن آثار نہ تھے

اب، بستی والوں کی خیرہ آنکھوں کو
کرنوں کی خاطر روزن درکار نہ تھے

دیواروں پر دستک دے آئے ہوتے
دروازے اس شہر کے گر بیدار نہ تھے

خوفِ شکست و رسوائی تھا دامن گیر
آخری پتّا چلنے کو تیّار نہ تھے

تبصرے

ڈاکٹر حنیف فوق، ضیاء بٹ، یوسف حسن، ظفر منصور
کرامت بخاری، اظہر مسعود، زاہد حسن، احمد ندیم قاسمی

خوشبو کے جزیرے (افسانے) — قیمت: ۶۰ روپے
مصنف: شکیلہ رفیق — ناشر: نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

'خوشبو کے جزیرے' افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو خود دلیلِ خوشبو ہے۔ شکیلہ رفیق کے لکھے ہوئے ان افسانوں میں کرداروں کی نفسیات، بیرونی حقائق اور خود بیانِ واقعات میں بڑی یگانگت ملتی ہے ورنہ آج کل تو معاشرت کا وہ دور آ گیا ہے کہ ادب میں زندگی کا حوالہ نہیں ملتا اور تنقید ادب کے حوالے سے خالی ہے۔ حالانکہ بے حوالہ زندگی، ادب خود فریبی اور خود نمائی کی چیرہ دستی اور بے حوالہ ادب، تنقید خود فروشی اور خود خواہی کی خیرہ سری ہے۔ مچھر کو مارنے کے لئے توپ کے استعمال سے زیادہ مضحکہ خیز طور پر افسانہ اور تنقید دونوں میں کلیاتِ دانش کے بے ضرورت حوالے دیئے جاتے ہیں اور ادبی یا انسانی حقیقت کی دریافت کے بجائے، تقلیدی بیانات کی محکومیت ملتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ شکیلہ رفیق کے ان افسانوں میں نفیِ حقیقت اور ردِ افسانویت کی جگہ زندگی کے ہوش مندانہ مطالعے کی سادگی اور پرکاری پائی جاتی ہے۔

شکیلہ رفیق آج کی افسانہ نگار ہیں لیکن آج جب متعدد افسانے، افسانوں سے زیادہ دیوانوں کے خواب بن کر رہ گئے ہیں، وہ یہ کہنے کی جرأت بھی رکھتی ہیں کہ "ابلاغ شرطِ اولیں ہے"۔ چنانچہ "خوشبو کے جزیرے" کے افسانے بھی اس شرط کو پورا کرتے ہیں اور شکیلہ رفیق نے "سچی باتیں" کے عنوان سے جو پیش لفظ لکھا ہے، اس سے اُن کے اس ادبی تصور کا پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کو سچ کی ترازو میں تولتی ہیں اور ادب کے نام پر لفظوں کی تجارت نہیں کرتیں۔ یہ افسانے ایسے صاف اور رواں انداز میں لکھے گئے ہیں، جس سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے افسانے لکھنا اُن کے لئے سانس لینے کی طرح آسان اور ناگزیر عمل ہے۔ ایک جگہ بڑے فلسفیوں کا حوالہ دیتے ہوئے بھی سومرسیٹ ماہم کہتا ہے کہ لوگ اکثر اس لئے ناقابلِ فہم انداز میں لکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے کبھی واضح لکھنا سیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے۔ پھر وہ یہ ستم ظریفانہ اضافہ کرتا ہے کہ ایسے بیوقوف ہمیشہ مل جاتے ہیں جو ایسی تحریروں میں پوشیدہ معنی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ وہ خود جس درجے کا افسانہ نگار بھی ہو، لیکن اس کا یہ قول افسانے کے لئے بھی صحیح ہے اور تنقید کے لئے بھی۔ شکیلہ رفیق کے افسانوں کے صرف جو بھی ہوں اُن میں سلیقہ و ترتیب وضاحت اور خوش نمائی کی حکومت ہے۔

شکیلہ رفیق افسانے میں تجربات کی مخالف نہیں۔ خود ان کے بعض افسانوں مثلاً "یقین و گماں کے بیچ" "اور پل ٹوٹ گیا"، یا "خواب، گلاب اور آگ" میں کسی نہ کسی نوعیت کے تجربے ملتے ہیں، لیکن قاری اور افسانہ نگار کے درمیان تفہیم

کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ "خواب، گلاب اور آگ" مونتاج کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ایک زوردار دھماکہ جس کے الگ الگ گرداروں کے پرخچے اڑا دیتا ہے اور صرف بالسریوں کے ٹکڑے لڑھکتے رہ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں کرداروں کے گھر سے نکلنے کو بار بار پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس شہرِ آشوب کے کہرائی اختتام سے الگ شکیلہ رفیق کے اکثر افسانے ایک ایسی عورت کو پیش کرتے ہیں، جو کاروبارِ زندگی کی مصروفیت میں گھر سے نکل گئی نہیں بلکہ گھر سے نکلی ہے۔ لیکن "پردے کے پیچھے کی عورت" میں گھر کے اندر کی وہ عورت جو ہمیشہ فیصلوں کی پابند رہی ہے، عائد کردہ فیصلے کے برخلاف اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرتی ہے۔ اس کی یہ آزادی سیاسی اور جمہوری شعور کی پیدا کردہ ہے یا نفسیاتی بغاوت؟ دراصل "خوشبو کے جزیرے" کے بیشتر افسانے اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش ہیں۔ ان میں مسلکِ "طرفداریٔ زناں" تو نہیں لیکن عورت کی مظلومیت اور حق خواہی کی تصویریں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ یہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سماجی ناانصافی کے بڑے دائرے میں عورت اور مرد دونوں ہی مظلوم ہیں اور دونوں کو اپنے حقوق کے لئے مجادلے کی ضرورت ہے۔

شکیلہ رفیق کے ان افسانوں میں افسانوی پیچ و خم اور حیرت انگیز اختتام کے کئی گُروں سے کام لیا گیا ہے۔ پھر اُن کے بظاہر سادہ جملوں میں بھی افسانوی طنز و استہزا کی دھار ملتی ہے مثلاً

" اس ناکارہ ٹریکٹر سے سونا اگلوانے کا دعویٰ کر کے گیا ہے جو مٹی پیدا کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔" (سچا آدمی)

" نہ جانے کب آبا زیادہ کمانے لگا اور ماں اس سے لڑنا چھوڑے گی۔" (ڈراپ سین)

" انعام صاحب کو ساری محبت زاہدہ بانو پر خواب گاہ میں آتی تھی۔" (پیاسی روح)

" مسلمانوں نے مسلمانوں کو چاقو مار کر یہ تسلیم کرایا کہ وہ دونوں مومن ہیں۔" (خالی کشکول میں کنکر)

شکیلہ رفیق کے زیر نظر افسانوں میں افسانوی دلچسپی کے کئی پہلو موجود ہیں۔ اسلوب کو شخصیت کہا گیا ہے لیکن کبھی کبھی شخص کا نام بھی اسلوب کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان افسانوں کو جو شکل دی گئی ہے اُسے خوب اور زیبا کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ادب اور زندگی کی رفاقت کا احساس ہوتا ہے اور قاری کو ششدر کرنے کے بجائے ہاتھ تھام کر قدم بقدم مشاہدات و تجربات کا سفر طے کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ مشاہدات و تجربات کی مزید وسعت سے زندگی کی آگہی کا دائرہ وسیع تر ہوگا اور شکیلہ رفیق کے نئے افسانوں سے اثباتِ زندگی کے نئے گوشے منور ہو جائیں گے۔

(ڈاکٹر) حنیف فوق

کلوز اپ (شخصی خاکے)

مصنف:۔ اعجاز رضوی

قیمت:۔ ۳۰ روپے

پبلشرز:۔ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساونڈز
لوئر مال لاہور

خاکہ نگاری یقیناً ایک مشکل کام ہے کیونکہ اس کے لئے عمیق مشاہدے کے علاوہ خاکہ نگار کو یہ دسترس بھی حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ الفاظ کے سنہرے نشتروں سے نہ صرف کسی کے خدوخال تراش سکے بلکہ اس کی داخلی شخصیت کو بھی اُجاگر کر سکے۔ خاکہ نگار کو اپنی بات نہایت احتیاط اور شگفتہ انداز میں کہنا ہوتی ہے تاکہ جس شخصیت کا خاکہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کی تضحیک بھی نہ ہو اور کہی ہوئی بات مدح سرائی کے زمرہ میں بھی نہ آئے۔ شاید اسی مشکل کے پیش نظر اردو ادب میں خاکہ نگاروں کی کمی رہی ہے۔ صرف چند مستند نام سامنے آتے ہیں۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ نوجوان ادیبوں میں

خاکہ نگاری کا رجحان مقابلتاً زیادہ ہے۔ نوجوان نسل یا تو طبعاً مشکل پسند ہے یا اس کی تجزیاتی نگاہ زیادہ تیز ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب "شناخت پریڈ" نظروں سے گزری تھی اور اب اعجاز رضوی کی "کلوز اپ" میرے سامنے ہے۔

کتاب کا نام پڑھ کر میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ مصنف نے "کلوز اپ" نام رکھ کر اپنے لئے یقیناً مشکل پیدا کر لی ہو گی۔ کیونکہ فوٹو گرافی کی اصطلاح میں کلوز اپ میں کسی کے خدوخال پوری مناسبت اور توازن سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک نئے لکھنے والے کے لئے مختلف دانشوروں اور ادیبوں کا کلوز اپ دینا شاید ممکن نہ ہو۔ دوسرا کھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے فہرست دیکھی۔ کتاب میں اکیس شخصیات پر خاکے شامل ہیں۔ ان میں چند تو کھلی کتاب کی مانند ہیں مثلاً احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، عطاالحق قاسمی، خالد احمد، امجد اسلام امجد اور اجمل نیازی۔ باقی شخصیات میرے خیال میں خاکہ نگاری کے لئے مشکل شخصیات تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اعجاز رضوی ان کے معاملہ میں شاید عجز کا شکار ہو جائے۔

کتاب پڑھنے کے بعد میرے خدشات یقیناً بہت ہی کم ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ اس نوجوان ادیب نے اتنے بہت سے دانشوروں اور ادیبوں کو کیسے اور کب "پڑھ" بھی لیا اور ان کے خاکے بھی لکھ ڈالے۔

اگرچہ کسی خاکے کا صحیح لطف وہی اٹھا سکتا ہے اور داد بھی دے سکتا ہے جو اس شخص کو کسی حد تک جانتا ہو جس کا خاکہ لکھا گیا ہو۔ مگر عام قاری کے لئے بھی اعجاز رضوی نے اکیس دانشوروں اور ادیبوں کے غائبانہ تعارف کا اہتمام نہایت شستہ اور شگفتہ خاکوں کے حوالے سے کیا ہے جن سے بھرپور مشاہدہ اور اعتماد ٹپکتا ہے۔ اعجاز رضوی کی کتاب اس بات کی غماز ہے کہ موصوف میں بڑے ادبی امکانات ہیں اور اسے اپنی صلاحیتوں کا استعمال بھی آتا ہے۔

ضیاء بٹ

اُردو میں انشائیہ نگاری — قیمت: ۹۰ روپے

مصنف: ڈاکٹر بشیر سیفی — ناشر: نذیر سنز پبلشرز، ۴۰۔ اے اردو بازار لاہور

ڈاکٹر بشیر سیفی اردو اور پنجابی کے جواں سال شاعر اور ادیب ہیں۔ انہوں نے "اردو کے انشائی ادب کا ارتقا" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۸۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے اس تحقیقی مقالے کو حذف و اضافہ کے بعد "اردو میں انشائیہ نگاری" کا روپ دیا۔ یہ کتاب آٹھ بابوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب انشائیہ کی اصطلاح، تعریف اور ہیئتی و معنوی شناخت کے مسائل پر ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی نے انشائیہ کو پرسنل ایسے یا لائٹ ایسے کا اردو متبادل تسلیم کیا ہے اور وہ ان کی تحقیق کے مطابق بھی:۔

"یہ بات درست ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے اختر اورینوی کے ہاں نظر آتی ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ انہوں نے انشائیے کی صنف سے مکمل آگاہی کا ثبوت دیا ہے۔"

(اردو میں انشائیہ نگاری" ص ۵۰۔ ۴۹)

لیکن وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی اصطلاح وضع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک مضمون سے جو اقتباس درج کیا ہے۔ اس میں پہلے سے موجود لفظ انشائیہ کو ایسے کی متبادل اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے برتنے کا دعویٰ موجود ہے۔ ان کے منقولہ اقتباس کی یہ سطریں دیکھئے:۔

"اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا جو ایسے کے لئے تو نہیں تھا لیکن انشا کے کسی ٹکڑے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ میرزا ادیب صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد "ادب لطیف" میں ایسے کے انشائیہ کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا اور خوش قسمتی سے مقبول بھی ہو گیا۔" (ایضاً ص ۵۱)

ڈاکٹر بشیر سیفی نے متعدد انگریزی اور اردو انشائیہ نگاروں اور نقادوں کی آرا کے تجزیے کے بعد انشائیہ کی تعریف اور نمایاں خصوصیات متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ انشائیہ یا پرسنل ایسے یا لائٹ ایسے اصل میں مضمون یا ایسے ہی کا ایک خاص انداز ہے۔ جو اپنی بعض انفرادی خصوصیات کی بنا پر مضمون کی دوسری اقسام علمی اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون وغیرہ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ موقف معقول ہے۔ ان سے پہلے محمد ارشاد بھی اپنے ایک مقالے (مطبوعہ فنون جولائی اگست ۱۹۸۲ء) میں اپنا یہی موقف بڑی وضاحت اور استدلال کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر بشیر سیفی، محمد ارشاد کے استدلال کو اپنے موقف کی تائید میں لانے کی بجائے اس سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

"محمد ارشاد کی یہ بات درست ہے کہ انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مضمون انشائیہ ہو جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۲۴)

حالانکہ محمد ارشاد کے سارے مقالے میں اور ڈاکٹر بشیر سیفی کی طرف سے اس کے منقولہ اقتباس میں بھی کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ ہر مضمون انشائیہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مغالطے کی وجہ سے محمد ارشاد پر یہ اعتراض وارد کرنے کے بعد انہیں حد و تعریف اور جنس و فصل کے معانی سمجھاتے ہیں جب کہ ان اصطلاحات کے معانی ڈاکٹر وزیر آغا کو سمجھائے جانے چاہئیں تھے، جو انشائیہ کی تعریف سمیت کسی بھی علمی موضوع کو علمی زبان میں بیان کرنے سے معذور ہیں اور تنقید و تحقیق میں بھی انشائیہ نگاری ہی کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر بشیر سیفی نے اپنی جانب سے انشائیہ کی تعریف یوں کی ہے کہ:۔

"انشائیہ وہ صنفِ نثر ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات بے تکلفی اور اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس صنف میں لکھنے والا موضوع کے حوالے سے ذہن میں در آنے والی دیگر باتوں کا ذکر بھی کر سکتا ہے، تاہم موضوع سے انحراف نہیں کرتا۔ نیز انشائیہ نگار موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈال کر قاری کو پُر تحیر مسرت بہم پہنچاتا ہے۔" (ایضاً ص ۳۶)

اس طویل تعریف و توضیح میں انشائیہ کی بعض انفرادی اور امتیازی خصوصیات یقیناً آ گئی ہیں، لیکن یہ جامع و مانع نہیں بن پائی۔ اس میں دو خصوصیات کا ذکر خاص طور پر بہت ضروری تھا:۔

۱۔ مضمون نما ہئیت

۲۔ فنی تمثالی اظہار

وہ ان دونوں خصوصیات کو انشائیہ کے لئے لازم تو سمجھتے ہیں لیکن انہوں نے انہیں تعریف کے اجزا بنانے کی بجائے اس کے دوسرے اوصاف میں شمار کیا ہے۔ ان خصوصیات کو تعریف میں بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا جبکہ موضوع کے

حوالے سے ذہن میں در آنے والی دیگر باتوں اور چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈال کر پُرتحیّر مسرت بہم پہنچانے کی خصوصیات تعریف میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو توضیحات میں لایا جا سکتا تھا۔

اردو انشائیہ کا آغاز کب اور کس نے کیا؟ اس سوال کے جواب میں انشائیہ پر سنجیدگی سے تحقیق و تنقیدی کام کرنے والوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے اور وہ سر سید احمد خاں کے بعض مضامین کے پیش نظر انہیں کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار ٹھہراتے ہیں۔ مگر ان کے برخلاف ڈاکٹر وزیر آغا اشاروں کنایوں سے اپنے آپ کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار منوانے پر مُصر ہیں اور ان کے چند ذاتی دوست نقاد بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر سیفی اس اعتبار سے سنجیدہ فکر نقادوں کی اکثریت کے ہم خیال ہیں کہ وہ بھی ڈاکٹر وزیر آغا کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار نہیں مانتے۔ تاہم انہوں نے سر سید احمد خاں کے بارے میں بھی معمولی سے اختلاف کا اظہار کیا ہے اور ان کے نزدیک سر سید احمد خاں کے جن مضامین (مثلاً گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، انسان کے خیالات، امید، کاہلی، خوشامد اور بحث و تکرار) کو دوسرے نقادوں نے پورے انشائیے قرار دیا ہے وہ انہیں انگریزی انشائیے کی تقلید میں لکھے گئے اردو انشائیے کے اوّلین خام نمونے ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے سر سید احمد خاں کے ساتھ مولوی ذکاء اللہ کے بعض مضامین (خصوصاً آگ، مطالعہ کتب، ذہانت اور تہذیب اور کتنا غلط خیال ہے کہ زمانہ بر سرِ تنزل ہے) اور محمد حسین آزاد کے "نیرنگِ خیال" کے مضامین کو بھی انشائیے کے خام نمونوں میں ہی شمار کیا ہے۔ اپنے نقطۂ نظر سے انشائیے کے ان خام نمونوں کی نشاندہی کے بعد انہوں نے عبدالحلیم شرر کو ان کے چند مضامین بالخصوص گل، انتظار، لالۂ خود رو اور خیال جاتا ہے کہاں اور آسمان کے حوالوں سے انہیں اردو کا پہلا باقاعدہ اور کامیاب انشائیہ نگار ثابت کیا ہے اور تحقیق کر کے بتایا ہے کہ شرر کے یہ انشائیے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۹ء کے دوران "دلگداز" میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی یہ تحقیق بہت اہم ہے۔ اگر کسی کو سر سید احمد خاں کے مقابلے میں شرر کو پہلا انشائیہ نگار ماننے میں کوئی عذر بھی ہو تو ان کے کم از کم کامیاب انشائیہ نگار ہونے پر تو کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ اس طرح گویا کامیاب اردو انشائیہ نگاری کی روایت بھی ایک سو سال سے چلی آ رہی ہے۔

شرر سے باقاعدہ اور کامیاب انشائیہ نگاری کی جو روایت چلی وہ ڈاکٹر بشیر سیفی کی تحقیق اور تجزیے کے مطابق میر ناصر علی دہلوی (یاد رہے "اوراق" کے ایک انشائیہ نمبر میں بھی ان کا ایک انشائیہ بعنوان "مسکرانا" دوبارہ شائع کیا گیا تھا) آغا شاعر قزلباش، سر ذوالفقار علی خاں، مولوی عزیز مرزا، حاجی محمد خاں، سجاد حیدر یلدرم، جوش ملیح آبادی، سجاد انصاری، فلک پیما، خلیقی دہلوی، قاضی عبدالغفار، حامد اللہ افسر، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور اور کرشن چندر سے ہوتی ہوئی دورِ جدید میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر بشیر سیفی کی رائے میں داؤد رہبر، جاوید صدیقی، اور ممتاز مفتی جدید اردو انشائیے کے پیش رو ہیں جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے 'اوراق' کے ذریعے جدید انشائیہ نگاری کو تحریک بنایا۔ مصنف اگر ڈاکٹر وزیر آغا کو جدید انشائیہ نگاری کی بجائے جدیدیت پسندانہ انشائیہ نگاری کے ایک ممتاز نمائندے اور راسی کو تحریک بنانے والے کے طور پر پیش کرتے تو شاید مناسب ہوتا۔

کتاب کا آخری باب جدید اور جدیدیت پسند انشائیہ نگاروں کے فن کے انفرادی تجزیوں پر مبنی ہے۔ اور اس میں ہر انشائیہ نگار کی انفرادیت دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس باب میں داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی، ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر، انور سدید، غلام جیلانی اصغر، سلیم آغا قزلباش، اکبر حمیدی

کامل القادری، رام لعل نابھوی، محمد یونس بٹ اور سلمان بٹ کی انشائیہ نگاری پر بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کا مرکزی موضوع تو اردو انشائیہ نویسی ہے مگر مصنف نے اس کے ساتھ ان روایتوں، صنفوں اور اسلوبوں کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے جن کا اردو انشائیے سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی ایسے، عربی فارسی اور اردو انشا پردازی، مضمون نویسی، انشائے لطیف اور طنز و مزاح خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں اردو رسالہ نگاری کی قدیم مقالی روایت کو بھی زیر بحث لانے کی ضرورت تھی، کیونکہ ابتدائی اردو انشائیہ کسی نہ کسی طرح اس روایت سے بھی متاثر ہوا۔

ڈاکٹر بشیر سیفی نے بڑی محنت کے ساتھ نیا انشائی مواد بھی تلاش کر کے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنا نقطۂ نظر تجزیے اور دلائل وضاحت کے ساتھ علمی زبان میں پیش کئے ہیں اور گروہی تعصبات سے بالاتر رہ کر دیانت اور متانت کے ساتھ یہ تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ اس سے انشائیے کے بارے میں بعض نقادوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں بڑی حد تک دور ہو جائیں گی۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث یہ کتاب بنیادی طور پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہونے کے باوجود ایک معتبر تحقیقی اور تنقیدی پیش کش ہے۔

یوسف حسن

بے راہرو (تراجم) — قیمت: ۶۰ روپے

مترجم: ڈاکٹر مرتضٰی عادل — پبلشرز: فطرت پبلی کیشنز لاہور

غیر ملکی ادب کے معیاری تراجم بلاشبہ کسی بھی زبان کے ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ثابت ہوتے ہیں۔ ترجمہ نگاری بنیادی طور پر ایک مشکل فن ہے کیونکہ اس کے لئے ترجمہ نگار کا دونوں زبانوں کا ماہر ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں کے ادب کی فنی و فکری جہات، لسانی و تہذیبی پس منظر اور جدید رجحانات سے آگاہ ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا اکثر ترجمہ نگار مطلوبہ معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث غیر ملکی ادب کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کی اصل روح کو صحیح معنوں میں اپنی زبان میں منتقل کرنے میں ناکام رہتے ہیں، لیکن جو معدودے چند ترجمہ نگار مذکورہ معیار تک پہنچ پاتے ہیں، وہ بلاشبہ ترجمے کو تخلیق کا درجہ عطا کر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مرتضٰی عادل کی کتاب "بے راہرو" شہرۂ آفاق فرانسیسی ادیب موپساں کی جنسی موضوعات پر اٹھارہ منتخب کہانیوں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل "موپساں" کی اٹھارہ نمائندہ کہانیوں کے اردو تراجم پر مشتمل موصوف کی ایک کتاب "موپسانے" موپساں کے مترجم کی حیثیت سے ان کی شناخت بن کر ادبی حلقوں میں داد پا چکی ہے۔ "بے راہرو" کے حوالے سے موصوف نے اپنی اس شناخت کو مزید مستحکم بنانے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔

موپساں بلاشبہ ایک نابغۂ روزگار نثر نگار تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں اَن گنت مضامین، تین سو کے لگ بھگ افسانے اور کم و بیش چھ ناول تخلیق کئے۔ جن میں سے بیشتر نے شہرتِ دوام پائی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے تراجم ہوئے۔ اردو زبان میں بھی موپساں کی کہانیوں کے بے شمار تراجم ہوئے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ جس غیر ملکی افسانہ نگار کی سب سے زیادہ کہانیوں کے اردو تراجم ہوئے وہ موپساں ہی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مرتضٰی عادل نے جس تسلسل، انہماک اور استقامت کے ساتھ موپساں کی کہانیوں کے تراجم کئے ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ یہی وہ خوبی ہے،

جو انہیں موپساں کے دیگر ترجمہ نگاروں سے نہ صرف ممیز کرتی ہے بلکہ موپساں کے ساتھ ان کے ذہنی ربط اور قلبی وابستگی کی بھی آئینہ دار ہے۔ جس کی بنیادی وجہ غالباً ان کا بحیثیت افسانہ نگار حقیقت پسندی کی روایت کے ساتھ منسلک ہونا ہے "بے راہرو" کے دیباچے سے بھی اسی بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مرتضیٰ عادل رقمطراز ہیں :-

"علامتی اور تجریدی کہانیاں لکھنے والے قلمکار تکنیک پر پورا نہ اُترنے والی تحریروں کو بھی کہانی کہنے پر مُصر ہیں جبکہ قاری ابلاغ کے فقدان کے باعث اردو کہانی ہی سے بدظن ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا . . . . اردو افسانہ پھر جمود کا شکار کیوں نہ ہو؟ . . . لہٰذا اردو افسانے پر چھائے ہوئے جمود کو توڑنے اور قاری کو از سرِ نو کہانی کی طرف راغب کرنے کے لئے میں نے تراجم کے لئے بالخصوص موپساں کا انتخاب کیا . . . "

ڈاکٹر مرتضیٰ عادل کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ان کا یہ نقطۂ نگاہ قابلِ غور ضرور ہے۔ "بے راہرو" کے تراجم میں کہانی کے مفہوم کو سادہ زبان، رواں لہجے اور عام فہم انداز سے واضح کرنے کی خصوصی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری کے لئے ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ "بے راہرو" کے تراجم اردو افسانے کی از سرِ نو کہانی کی طرف مراجعت کے سفر میں کسی حد تک ممد ثابت ہوتے ہیں، یا اردو افسانے سے قاری کے رشتے استوار کرنے میں کس درجہ معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا جواب تو آنے والا دور ہی دے سکے گا البتہ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ "بے راہرو" موپساں شناسی میں مستقبل کے محقق کے لئے ایک اہم دستاویز ہو گی۔

ظفر منصور

بیلے رمزاں دے (پنجابی شعری مجموعہ) قیمت :- ۳۵ روپے

مصنف :- قائم نقوی

پبلشرز :- گل ریز پبلشرز لاہور

جدید نسل کے جن شعراء نے گزشتہ دہائی میں اپنے منفرد موضوعاتی، لسانی اور اسلوبیاتی تجربات کے ذریعے پنجابی زبان کے شعری ادب میں فکری تموج اور فنی تنوع پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے ان میں قائم نقوی کا نام نمایاں ہے۔ ان کا تازہ پنجابی شعری مجموعہ "بیلے رمزاں دے" اس بات کی واضح دلیل ہے۔

"بیلے رمزاں دے" بلاشبہ پنجابی کے جدید شعری ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔ اس میں قائم نقوی کی ایک نعت، ایک سلام، ایک نوحہ، تین کافیاں، چار گیت، سات غزلیں اور چونتیس نظمیں شامل ہیں۔ میری نظر سے آج تک پنجابی شاعری کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں گزرا جس میں اتنی مختلف النوع اصنافِ سخن اس خوبصورتی اور مہارت سے یکجا کر دی گئی ہوں۔ یہ اوّلیت بھی اس مجموعے کے حوالے سے قائم نقوی کے حصے میں ہی آتی ہے۔

"بیلے رمزاں دے" قائم نقوی کی پنجابی شاعری کے کم و بیش تمام موسموں کا عکاس ہے اور اس کا ہر موسم اگرچہ اپنی جگہ انفرادیت کا حامل ہے۔ لیکن اس کی نظمیں اپنے متنوع موضوعات کی بنا پر اس مجموعے کی شاعری کے دیگر موسموں پر قدرے حاوی نظر آتی ہیں۔ ویسے بھی نظمیں اس مجموعے کی دیگر تمام اصنافِ سخن کی مجموعی تعداد سے دگنی ہیں۔ یہ بات دیگر اصنافِ سخن کی نسبت نظم کی طرف قائم نقوی کے خصوصی رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کی نظمیں سادگی میں پرکاری کا حسن لئے ہوتے ہیں۔ اس کی نگاہ ایسے معمولی معمولی سماجی واقعات میں بھی گہرائی تک اُتر جاتی ہے جو عام انسانی آنکھ سے اکثر اوجھل رہتے

ہیں اور یہ تجربہ جب نظم ہوتا ہے تو اس کے ہاں ایک ایسا شعری تجربہ جنم لیتا ہے جو ہمہ جہت بھی ہوتا ہے اور پُرتاثیر بھی۔ اس شعری حساسیت کے نمونے جستہ جستہ اس کی نعت، سلام، نوحے، کافی، گیت اور غزل میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس کی نظموں میں یہ کھنک قدرے نمایاں ہے۔

"بیلے رمزاں دے" کی شاعری کا خمیر اپنی دھرتی سے گہری وابستگی سے اٹھتا ہے۔ اس کے دیگر عناصر میں انسانی رشتوں کی اہمیت، عہد رواں کی ٹوٹتی ہوئی انسانی اقدار، بے سمتی، بے یقینی، منافقت اور غیر انسانی رویوں نیز انسان کی بے قدری پر احتجاج آمیز تاسف خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام عناصر کو قائم نقوی نے پنجابی زبان کے لوک لہجے کی جمالیاتی رمزیت اور تلازمات کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا ہے کہ اُس کے ہاں ایک ایسا شعری لحن وجود پذیر ہو گیا ہے جو دل میں اترنے کی تاثیر رکھتا ہے اور یوں اس مجموعے کی متنوع اصناف سخن کے تمام موسم ایک نقطے پر مجتمع ہو جاتے ہیں اور وہ نقطۂ اتصال ہے قائم نقوی کا طرزِ احساس جو عصری شعور سے ہم آہنگ اور شاعری کے جمالیاتی پہلو سے متصف ہے۔ "بیلے رمزاں دے" بلاشبہ ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو جدید پنجابی شعری ادب میں ایک نیا آہنگ اور منفرد مزاج لے کر وارد ہوا ہے۔

ظفر منصور

زرِ سخن (شعری مجموعہ)
قیمت:- ۸۰ روپے
مصنف:- شاہد واسطی
ناشر:- ماورا پبلشرز بہاولپور روڈ لاہور

عصری اور معاشرتی حقیقتیں اتنی واضح اور اٹل ہوتی ہیں کہ جب تک کوئی لکھنے والا ان کو اپنے زرِ سخن میں نہ ڈھالے وہ سخن ور نہیں کہلاتا۔ شعری ادب پر گفتگو کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ شاعری کا آج تک ایسا کوئی ہمہ گیر نظریہ وجود میں نہیں آیا، جو ہر طرح کی شاعری کا احاطہ کر سکے۔ بہر حال ایک متوازن و معتدل، مہذب و مقدس اور مضبوط و مربوط آہنگ والی شاعری اپنا آپ منوالیتی ہے۔ نئی سوچ، فکر اور مشاہدہ کی شاعری، نئے فکری حوالوں اور نئے طرزِ احساس کی شاعری خصوصاً وہ شاعری جس پر کوئی لیبل نہ لگایا جا سکے۔

پھر اس کا انحصار خیالات کے اظہار کے سلیقے، ابلاغ میں جلال و جمال اور لفظوں کے انتخاب پر بھی ہوتا ہے اور یہی چیزیں کسی سخنور کو اُس کے ہم عصروں سے منفرد کرتی ہیں۔ لفظوں کی نشست و برخاست، روانی و تسلسل اور موسیقیت بھی ایک اضافی جزو ہے۔ شاہد واسطی ایک سادہ اور معصوم آدمی ہے، فطرت کے نزدیک تر ہے۔ اُس کی گفتگو، اُس کا لہجہ اور اُس کے احساسات اُس کی ذات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اُس کی غزلیں اور نظمیں فکر کی بلندی، خیالات کی وسعت اور جذبات کی گہرائی کی امین ہیں۔ "زرِ سخن" کا شاعر نہ صرف ایک دردِ دل رکھنے والا انسان ہے بلکہ وہ ایک وطن پرست شہری بھی ہے۔ کائنات کے حوالے سے اس کی گفتگو میں آفاقیت کی چھوٹ پڑتی ہے۔

'زرِ سخن' کی شاعری ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی نظر میں سادگی اور معصومیت کی شاعری ہے۔ پیرائیہ آغاز میں مرزا ادیب اسے نئے فکری اُفق کا تخلیقی سفر گردانتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہد واسطی کے شعر جو دل پر تاثر چھوڑتے ہیں ان کی وضاحت ممکن نہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی رائے بھی ملیپ "پرُ سادہ مگر پُرکار" جیسے مکمل اور جامع الفاظ کی صورت میں موجود ہے۔ 'زرِ سخن' شاہد واسطی کے شعری سفر کی مسافت کی دوسری ارتقائی منزل ہے۔

کرامت بخاری

مہرِ دو نیم (شاعری) — **قیمت: ۴۵ روپے**

مصنف: افتخار عارف — ناشر: مکتبہ دانیال، کراچی

اب سے چند برس پہلے میں نے ہوچی منہ کی جبیہ شاعری پر گفتگو کرتے وقت کہا تھا کہ سیاست ہو یا فن — ہم بڑے کام سے زیادہ بڑے بول کے خوگر ہیں۔ ہماری شاعری میں کردار کے غازیوں کا انکسار کم ہے اور گفتار کے غازیوں کا شہادت کا مپلیکس زیادہ ہے۔ ہماری سیاست کا تقوی تھا چنا بھی گھنا باجتا ہے مگر آزمائش کی گھڑی آنے پر اس کی تان باطل سے مفاہمت پر آ ٹوٹتی ہے۔ جس زمانے میں افتخار عارف نے شاعری کا آغاز کیا اس زمانے میں ہمارے ہاں شاعری اور سیاست ہر دو آزمائش کی گھڑی سے گزر چکی تھیں اور احمد ندیم قاسمی کا یہ سوال کراں تا کراں گونج رہا تھا:

سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے تا حدِ نظر منظرِ دار[1]

اور دار و رسن کی پرچھائیں سے فرار، عمل کی رائیگانیت پر اصرار اور زندگی کی بے معنویت کے پرچار کے فلسفوں کا چلن مقبولِ عام ہو گیا تھا۔ نوجوان لکھنے والے ۳۶ء کے باغیوں کی روایت کے خلاف بغاوت کی دھن میں زندگی ہی سے منہ موڑ بیٹھے تھے اور ادیب کی سماجی ذمہ داری اور ادب کے انقلابی کردار کے تصورات کو مبتذل گردانتے لگے تھے۔ افتخار عارف اس رسم و رہِ عام سے ہٹ کر چلتے ہیں اور سماجی اور تہذیبی وابستگی کو اپنے فن کا بنیادی حوالہ بناتے ہیں۔

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیئوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

———

باغ بغیچے میرے جب جب زندہ لہو کی چاہیں
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

ہماری تہذیب میں زمین کی اہمیت فقط اس قدر ہے کہ یہ ہمارے اجتماعی خوابوں کا مستقر ہے۔ زمین ہمارے خواب کا بدن ہے۔ خواب نہیں تو جغرافیائی وجود کی مشتِ خاک، طوفانِ حوادث کے سامنے کہاں ٹھہرے گی؟ افتخار عارف کو اپنے خواب سے اٹوٹ وابستگی کا عہد اس لئے کرنا پڑا ہے کہ اس کے گرد و پیش لوگ خواب سے کٹ کر جینے میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ:

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

———

ہوا بھی ہو گئی میثاقِ تیرگی میں شریک
کوئی چراغ نہ اب رہگذر میں رکھا جائے

---

[1] انداز نظر، لاہور، صفحات ۱۴۲، ۱۴۴

جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری　　جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے
جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے　　جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
مٹی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی　　یوں ہو تو یہ زنجیر یہ زنداں بھی مرا ہے

افتخار عارف کے ہاں خواب اور خاک کا رشتہ کچھ یوں ہے کہ زمین بے شک اُن کے لئے آخری حوالہ ہے۔ اس سے بھی عظیم تر صداقت یہ ہے کہ "مٹی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی" اس لئے زنجیر اور زنداں کا سامنا لازم ٹھہرا۔ فیض اور ندیم کے بعد کی نسلوں کے ترقی پسند شاعروں میں دار و رسن اور زندان و مقتل کی لکیر پیٹنے والوں کی کمی نہیں مگر افتخار عارف دو وجہ سے ان شاعروں سے نمایاں طور پر مختلف شخص اور شاعر ہے۔ اوّل یہ کہ اُس کے ہاں جاں سپاری اور سرفروشی کے بلند بانگ مگر کھوکھلے ادّعا کی بجائے سلامتیٔ جسم و جاں کے لئے مفاہمت پسندی پر ندامت کا وہ جاں سوز احساس کار فرما ہے جو خود احتسابی کی کٹھن راہ اپنانے کا ثمر ہے۔

بیچ آئے سرِ قریۂ زر، جوہرِ پندار　　جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

کہاں کا خیر، کیسی حرمتِ لفظ و معانی　　، میں دنیا میں ہوں اور اسبابِ دنیا چاہتا ہوں

ظلم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر　　سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا
دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ　　فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے　　اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

اور دوم یہ کہ سرگزشتِ ملت بیعنا اُس کے فکر و شعور کا سرچشمہ اور جذبہ و احساس کی جنم بھومی ہے شہدائے کربلا کے ساتھ اپنی نسبتوں کا جیتا جاگتا احساس اس کے لئے فخر و ناز کا سرمایہ بھی ہے اور درد و کرب کا الاؤ بھی۔ شہدائے کربلا کے ساتھ اپنے ہم رشتہ ہونے کا شعور اُسے اپنے اجتماعی منصب کی یاد برابر دلاتا رہتا ہے چنانچہ وہ اپنے مقدر اور اپنی بستی کے مصائب پر داستانِ حرم ہی کے سیاق و سباق میں غور و فکر کرتا ہے۔

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم ہے　　مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے　　نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

سپاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر　　کس اہتمام سے، پروردگارِ شب نکلا

وہی پیاس وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے　　مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن　　راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ　　اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دل ان کے ساتھ مگر تیغ اور شخص کے ساتھ — یہ سلسلہ بھی کچھ اہلِ ریا کا لگتا ہے

وہ بستی جو افتخار عارف کی شاعری میں سہمی سہمی سانس لے رہی ہے اور جسے خود اُس نے کہیں نابینا بستی کہا ہے، کہیں قہرمان بستی کا نام دیا ہے اور کہیں شہرِ تہذیب سے موسوم کیا ہے، ظلم و ستم کی لپیٹ میں تھی۔ اس بستی کے در و دیوار پر خوف و دہشت مسلط تھے، اس کے مکین خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا میں بیٹھے اپنی ہی آواز سے ڈر رہے تھے، اپنے ہی چہروں سے شرما رہے تھے اور اپنے ہی سائے سے گھبرا رہے تھے۔ یہاں "نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے" اور

فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنوں ہے
سکون ہی سکون ہے.
مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے

(آخری آدمی کا رجز)

اس بستی کے لوگ جنہیں عارف نے اپنی ایک نظم میں اہلِ انتظار قرار دیا ہے، ناخداؤں کے جور و جفا سے نجات کے لئے اپنے خدا کو یوں پکارتے ہیں:

شکاری اپنے باطن کی طرح اندھے شکاری
حرمتوں کے موسموں سے نابلد ہیں
اور نشانے مستند ہیں
جگمگاتی جاگتی شاخوں کو بے آواز رکھنا چاہتے ہیں
ستم گاری کے سب در باز رکھنا چاہتے ہیں
خداوندا! تجھے سہمے ہوئے باغوں کی سوگند
صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگند
اڑانوں کے لئے پر تولنے والوں پر اک سایہ تحفظ کی ضمانت دینے والا
کوئی موسم بشارت دینے والا

(خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم)

اور اپنے مصائب پر اپنی تاریخ و تہذیب کی روشنی میں یوں تڑپ کر سوچتے ہیں:

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا
ہمارے سب خواب وقت کی بے لحاظ آندھی میں جل بجھیں گے
دو نیم دریا و چاہِ تاریک و آتشِ سرد جاں نوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟
تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟
خدائے زندہ! یہ تیری سجدہ گزار بستی کے سب مکینوں کی التجا ہے۔

کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ تجھ سے منسوب گل زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ عفو کی، درگذر کی، مہر و وفا کی بھولی روایتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ چاہتیں، وہ رفاقتیں، وہ محبتیں پھر سے لوٹ آئیں

(استغاثہ)

نہیں بھائی نہیں! ملوکیت کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کی التجائیں اللہ کریم نے کب سُنی ہیں اور حکمتِ فرعونی کے سہارے قائم سیاسی اور اقتصادی نظام میں اسلامی اخلاق کیونکر پنپ سکتا ہے؛ جس معاشرے کی سیاسی اقدار دورِ جاہلیت سے مستعار ہوں اس میں اسلامی حریت و مساوات کا خواب دیکھنے والوں کا مقدر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے:

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر اور ایک اکیلا میں
مرے ہاتھ عصا سے خالی (ابوالہول کے بیٹے)

اور:

یہ زمینوں آسمانوں کے عذاب اور میں اکیلا آدمی
میں اکیلا آدمی کب تک لڑوں
سارے دشمن در پئے آزار، لشکر صف بہ صف
لشکروں کے سب کمانداروں کے رُخ میری طرف
اور میں نہتا آدمی
میں نہتا آدمی کب تک لڑوں
میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں

(ھل من ناصرٍ ینصرنا)

شہر تذبذب میں فرعونوں کے لشکروں کے مقابلے میں اپنے یکہ و تنہا ہونے کا احساس انتخابِ عارف کو امان گاہِ مصلحت میں لا بٹھاتا ہے مگر یہ سوال یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا اور ضمیر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے کہ:

مرے آباؤ اجداد نے حرمتِ آدمی کے لئے
تا ابد روشنی کے لئے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو اُن کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا بہ زنجیر سر کو جھکائے احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی

سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

(ایک سوال)

بالآخر یہ خون جوش مارتا ہے اور وہ خیمۂ عافیت کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں جانتا تھا مرا قبیلہ سر بریدہ اور بے ردا سروں کی گواہیاں
لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذر سر لے کے آ گیا ہوں
تباہ ہونے کو ایک گھر لے کے آ گیا ہوں
میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں۔

(اعلان نامہ)

تذبذب سے یقین تک اور مفاہمت سے مزاحمت تک یہ ذہنی اور جذباتی ارتقا افتخار عارف کو اقبال کی انقلابی شعری روایت اور میرے دل سے قریب لے آتا ہے۔ اقبال تک پہنچی ہوئی اور اقبال کے ہاں نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہوئی مسلمانوں کی ادبی روایت کب سے اپنے وارثوں کی منتظر ہے۔

فتح محمد ملک

چشمِ تماشا (کالم) قیمت: ۹۹ روپے
مصنف: امجد اسلام امجد ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

شہرۂ آفاق مفکر ایمرسن کی نصیحتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے۔ چند نصیحتیں اس نے کتابیں پڑھنے والوں کو بھی کی تھیں۔ ایک موقع پر اس نے کتاب کے قارئین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ایسی کتابیں مت پڑھا کرو جنہیں شائع ہوئے ایک سال سے کم عرصہ ہوا ہو۔ صرف ان کتابوں کو پڑھا کرو جو بہت معروف ہوں اور یہ کہ جن کو دل سے پسند کرو صرف انہی کتابوں کا مطالعہ کیا کرو۔ مجھے حیرت ہے کہ ایمرسن یہ مشورہ دینا کیوں بھول گیا کہ مشہور لکھنے والوں کی کتابیں بھی پڑھ لیا کرو۔ مبادا اس میں بھی کوئی کام کی بات لکھی ہو۔ مجھے بھی اس کا خیال امجد اسلام امجد کی کتاب "چشمِ تماشا" پڑھ کر آیا ہے کیونکہ اس کتاب میں بھی کام کی بہت سی باتیں ہیں۔ جن کا ذکر میں ابھی تھوڑی دیر میں کروں گا۔ فی الوقت میں امجد اسلام امجد کا اپنے پیارے شہر میں خیر مقدم کرنا چاہتا ہوں گو اب اس شہر میں پُر امن ماحول میں مہمانوں کا خیر مقدم کرنا بد تہذیبی میں شمار ہوتا ہے۔ میں اپنے محترم دوست جناب عطاء الحق قاسمی کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں جو جم خانہ کے مشاعرے کے لئے اپنا دیوان اور اس تقریب کے لئے مضمون ساتھ لائے ہیں۔ اور کل فون پر کراچی کی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس

بات پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے کہ عجلت میں وہ اپنا کلاشن کوف ساتھ لانا بھول گئے۔ غالباً کلاشنکوف سے مراد ان کا قلم تھا۔ سبھی جانتے ہیں امجد اور عطا ملک گیر شہرت رکھنے کے باوجود ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست ہیں، ان کی دوستی ضرب المثل بن چکی ہے۔ عام زندگی ہی میں نہیں، ادب اور صحافت کی مختلف اصناف میں بھی وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً امجد ٹی وی ڈرامے لکھیں گے تو کچھ دنوں بعد عطا کی ٹی وی سیریل شروع ہو جائے گی۔ امجد ایک نظم کہیں گے تو عطا غزلیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیں گے۔ اسی طرح اگر عطا نے کالم نگاری میں اپنا نام پیدا کر لیا ہے تو امجد بھی اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے کچھ لمحے کالم نگاری کے لئے نکال ہی لیں گے۔ عطا کے سفرنامے مقبول ہوں گے تو امجد کے سفرناموں کی کتاب بھی لازماً بازار میں آ جائے گی۔ اس نفسا نفسی کے دور میں ایسی دانت کاٹے کی دوستی نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ ایک دن میں نے عطا سے امجد کی دوستی کا راز پوچھ ہی لیا۔ عطا چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر سوچا اور بولے "یار واقعی میں نے تو آج تک اس پر غور ہی نہیں کیا"۔ یہ جملہ انہوں نے کچھ اس انداز سے ادا کیا جیسے امجد سے دوستی کا راز اسی غور نہ کرنے میں مضمر ہے۔ میری اپنی رائے یہ تھی کہ دونوں کی دوستی کی گاڑی اسی وجہ سے چل رہی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں دونوں کے حصے میں کامیابیاں اور انعامات آتے ہیں۔ ایک کامیاب آدمی کی دوستی بالعموم دوسرے کامیاب آدمی سے ہوتی ہے۔ عطا صاحب نے میری اس بات سے اتفاق کیا۔ ان کی مقبولیت میں ان کی اس عادت کا بڑا دخل ہے۔ امجد اور عطا سے دوستی میں ایک سہولت یہ رہتی ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ پسند کرنا نہیں پڑتا۔ ایک کی تعریف کی جائے تو دوسرا بلا تکلف اسے اپنے حساب میں شمار کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں اگر تنقید اور اعتراض کی صورت میں بھی یہی ہو۔ دونوں دوستوں میں کچھ قدریں مشترک ہیں، دونوں بیک وقت خواص و عوام میں مقبول ہیں۔ خواص میں تو ہم اور آپ آتے ہیں۔ عوام میں سرکاری اداروں کے اعلیٰ افسران، کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور دیگر ہما شما شامل ہیں۔ دونوں کے دشمن بھی وہی ہیں جو ان کے دوست ہیں۔ دونوں وضعدار ہیں جس دبستان سے ایک بار وابستہ ہوئے اسی کے ہو رہے اور جس سے اختلاف ہوا اسے بھی مستقل مزاجی سے نبھایا۔ دونوں زبردست فقرے باز ہیں، دونوں کو سینکڑوں لطائف اس طرح یاد ہیں جیسے ہمیں دوسروں کے عیب یاد رہتے ہیں۔ ان دونوں سے مل کر زندگی بڑی تر و تازہ اور گنگناتی لگتی ہے۔ ان کی دوستی نعمت ہے اور ان سے دوری کفرانِ نعمت ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد مجھے اپنے اصل موضوع پر چند گزارشات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ امجد اسلام امجد کی کتاب 'چشمِ تماشا' جس کی تقریب میں آج ہم سب شریک ہیں اُن ۶۵ کالموں کا مجموعہ ہے جو تقریباً دو سال تک لاہور کے ایک معروف لیکن قلیل الاشاعت اخبار "امروز" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اخباری کالموں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کرنا اب ایک روایت سی بن گئی ہے۔ اس روایت کی اپنی افادیت ہے۔ "چشمِ تماشا" کا کتابی صورت میں شائع ہونا اس لئے بھی ضروری تھا کہ بقول خود مصنف ان کالموں میں READABILITY موجود ہے یعنی یہ اس لائق ضرور ہیں کر پڑھے جائیں۔ یہ خوبی کوئی معمولی خوبی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اخبارات میں روزانہ سینکڑوں ایسی تحریریں، مضامین اور کالم چھپتے ہیں۔ جن میں ایک مرتبہ بھی اپنے آپ کو پڑھوانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان لکھنے والوں کو حقیقتاً یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ تحریر میں وہ کون سا وصف ہوتا ہے جو قاری کو پہلی سطر سے کھینچ کر آخری سطر تک لے آتا ہے اور جہاں تک کالموں کا تعلق ہے تو وہ کالم ہی کیا جو اپنے آپ کو پڑھوا نہ سکے۔ غالباً ایسے کالم کثیر الاشاعت اخبارات

کی زینت اس لئے بن جاتے ہیں کہ اخبار کے مالک کو ان کی اشاعت کا معاوضہ ادا نہیں کرنا پڑتا۔

امجد اسلام امجد چونکہ ایک کامیاب COMMUNICATOR ہیں اس لئے انہیں معلوم ہے کہ مواد کو اسلوب سے کس طرح پیوست کیا جاتا ہے کہ تحریر میں ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ امجد کے بقول ان کے کالموں میں جمیل الدین عالی کی علمیت، رئیس امروہوی کا علم غیب، عطا الحق قاسمی کا بے ساختہ پن، ابن انشا کی رمزیہ شوخی انتظار حسین کا صاحبو اور نصر اللہ خاں کا تہذیبی رچاؤ نہیں ہوتا ___ مگر سوال یہ ہے کہ اگر ان کے کالموں میں بھی یہی خصوصیات ہوتیں تو پھر ان کے کالموں کی انفرادیت کیا ہوتی۔ ان کے کالموں کی اہمیت ہی یہ ہے کہ ان میں ان کا اپنا نقطہ نظر موجود ہے اور اسی کے ذریعے پڑھنے والے اپنے دور کے ایک اہم ڈرامہ نگار اور مقبول شاعر کے احساسات و خیالات سے واقف ہو جاتے ہیں۔

کالم نگاری امجد اسلام کا اصل میدان نہیں ہے اور نہ یہ ان کی شناخت اور تعارف کا وسیلہ ہے۔ لیکن ان کی شخصیت کالم نگاری کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ان کے کالموں کا مزاج ثقافتی یا کلچرل ہے۔ ان کی روزمرہ کی دلچسپیاں، مشاغل اور مصروفیات کی نوعیت چونکہ سماجی و ثقافتی ہوتی ہے۔ اسی لئے انہیں چلتے پھرتے بے شمار ایسے موضوعات مل جاتے ہیں جن پر اظہار خیال کا بہترین ذریعہ کالم ہی ہو سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن یا شو بزنس کی دنیا سے ان کا تعلق دیرینہ ہے۔ ادبی تقریبات اور مشاعروں میں بھی انہیں شرکت کا آئے دن موقع ملتا رہتا ہے۔ مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں اور انجمنوں سے بھی ان کا ربط خاطر ہے اور ان کے جلی و خفی معاملات سے بھی انہیں خوب واقفیت ہے۔ اندرون اور بیرون ملک انہیں سفر کے مواقع بھی ملتے رہتے ہیں۔ سو اتنی گہما گہمی اور بھرپور طریقے سے وقت گزارنے کے بعد لازماً ان کے پاس کہنے اور بتانے کے لئے بہت سی باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ کالم نگار کو اگر بھرپور FEED BACK ملتا ہے تو اس کا اثر اس کے کالموں کے معیار اور دلچسپی پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ کالم نگاری شاعری کی طرح تو ہوتی نہیں کہ ستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہو کر بھی لکھی جا سکتی ہے۔ کالم نگاری تو دو طرفہ عمل ہے۔ اگر ایک سرے پر کالم نگار ہو اور دوسرے سرے پر پڑھنے والا ہی غائب ہو تو پھر گفتگو کس سے ہو۔

اسی لئے دیکھا گیا ہے کہ اچھے کالم نگار جب معاوضے کی خاطر کسی چھوٹے اخبار سے وابستہ ہو جائیں تو گھٹن کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر تھوڑے دنوں میں انہیں معاوضہ حقیر اور قارئین زیادہ اہم محسوس ہونے لگتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ امجد کے یہ کالم کسی کثیر الاشاعت اخبار میں شائع ہوتے تو تعجب نہیں کہ یہ زیادہ محنت سے لکھے جاتے اور زیادہ مزیدار ہوتے۔ چونکہ امجد کے کالموں کی یہ کتاب ایک ایسے وقت منظر عام پر آئی ہے جب ان کا سلسلہ کالم نگاری منقطع ہے اسی لئے میں یہ مشورہ دینے میں حق بجانب ہوں کہ انہیں کچھ عرصہ کسی ایسے اخبار میں بھی کالم لکھنے چاہئیں جسے پڑھنے والوں کی اچھی بھلی تعداد میسر ہو۔

"چشم تماشا" کالموں کی کتابوں میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں جتنے کالم بھی شامل ہیں ان کی زبان رواں دواں اور بول چال کی زبان سے قریب ہے جیسا کہ کالموں کی زبان ہونی چاہئے۔ اس کے موضوعات میں تنوع ہے۔ امجد اسلام نے کتابوں، رسالوں، کھیلوں، اداکاروں، علمی و ادبی اداروں پر ہی نہیں لکھا، ایسے قومی اور سماجی موضوعات

پر بھی قلم اٹھایا ہے جو نہایت سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔ خواہ وہ سانحۂ نواب پور کا المیہ ہو یا نصاب تعلیم اور تعلیم کا مسئلہ۔ ثقافت اور کلچر کی بحث ہو یا پاکستان کی سفارتی پالیسی کی خامیاں اور خرابیاں۔ قومی اور علاقائی زبانوں کے تنازعے ہوں یا آرٹ اور آرٹ کونسلوں کے معاملات۔ امجد کی نظر اور نقطہ نظر میں وسعت ہے۔ چاہے آپ ان سے اختلاف کریں یا اتفاق، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے پر بھی اپنی ایک رائے ضرور رکھتے ہیں اور اسے سلیقہ اور عمدگی سے پیش کرنا بھی جانتے ہیں۔

"چشم تماشا" کے مطالعہ سے اس کے لکھنے والے کی جو تصویر ذہن میں بنتی ہے وہ ایک محب وطن پاکستانی کی ہے جسے اپنا ملک، اپنی تہذیب، اور اپنی اقدار عزیز ہیں۔ بظاہر یہ کتنی الم انگیز بات ہے کہ ہمیں ان باتوں کی تعریف بھی کرنی پڑتی ہے کہ جو لازماً کسی ملک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شہری میں بھی ہونی ہی چاہئیں۔ چونکہ ملک میں ہاتھی کے دانت رکھنے والے دانشوروں اور گندم نما جو فروشوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر کسی لکھنے والے میں پاکستانیت اور حب الوطنی کی سچی رمق بھی نظر آجاتے تو اس کی داد واجب ہو جاتی ہے۔ امجد کے سلسلے میں یہ بات زیادہ شدومد سے کہنی اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے لوگ ان کی کمٹ منٹ کے متعلق شک و شبے کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ یہ دائیں کے ہیں یا بائیں کے، سرخ ہیں یا سبز۔ اس لئے میں وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کم سے کم اپنی تحریروں میں امجد اسلام کی کمٹ منٹ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اسی ملک سے ہے اس کی تہذیب و اقدار سے ہے جس پر وہ کبھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک لکھنے والے کی تحریر میں سیاسی وابستگی تلاش کرنے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کا دل ٹھیک طریقے سے کام بھی کر رہا ہے یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے لکھنے والوں کے دل صحیح صحیح کام کرنے لگیں تو ادب وصحافت کا رُخ اور اس کی جہت ہی بدل جائے گی۔ "چشم تماشا" پڑھ کر مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی گواہی دیں گے کہ امجد اسلام کا قلب صحت مند ہے اور وہ ٹھیک طریقے سے فنکشن کر رہا ہے۔ ممکن ہے میری بات آپ پر واضح نہ ہوئی ہو۔ اس کے لیے میں ان کے ایک کالم کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ان کا ایک کالم 'عام آدمی' کے عنوان سے ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> "تاریخ کی کتابوں میں عام آدمی کا کوئی نام نہیں ہوتا، وہاں اسے ہمیشہ ہندسوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ سکندر اعظم کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر آیا۔ دوسری جنگ عظیم میں چار لاکھ آدمی مارے گئے اور یہ کہ ملکہ کی تاجپوشی کے جلوس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ عام آدمی کو ٹی وی کیمرہ لانگ شاٹ میں ہجوم کے حصے کے طور پر دکھاتا ہے، عام آدمی کا اپنا کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔"

آپ نے اس کالم میں امجد کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ایسی تحریر اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک بے نام لوگوں اور بے آواز گلی کوچوں سے پیار نہ ہو۔

ایک اور بات جو امجد کے کالموں میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ ہے اس کا بیک وقت سنجیدہ اور شگفتہ ہونا۔ وہ کسی بھی موضوع پر لکھیں نہایت شگفتہ انداز میں پہلے اس خاص مسئلے یا موضوع کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر نہایت سنجیدگی سے اس مسئلے کی جڑ میں عمومی رجحان ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اسی طرح وہ کالم کے عارضی پن کو ختم کر کے اسے مستقل

اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اپنے کالم "اقبالی مجرم" میں وہ اقبال شناسی کے سلسلے میں قومی رویئے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوں تو یہ ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے کہ ہم زندگی کو ہیرو اور ولن، فرشتے اور شیطان اور زمین اور آسمان جیسی دو بالکل متضاد اور مخالف سرحدوں کے بغیر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہمارے ہیرو کاغذ کی طرح گورے اور ولن رات کی طرح کالے ہوتے ہیں۔ ہمارا اچھا انسان فرشتہ اور برا شیطان بن جاتا ہے (انسان بہرحال نہیں رہتا) اگر ہماری اس تفریق میں کوئی کمی بیشی ہو تو ہم اپنا پورا زور لگا کر اپنی طرف سے کچھ جمع کر کے مطلوبہ حاصل جمع نکال لیتے ہیں۔ بعض اوقات ممدوح سے ہماری یہ محبت اس ریچھ کی محبت سے ٹکرا جاتی ہے جس نے مالک کے منہ سے مکھی اڑانے کے لئے پنجہ مار کر اس کا منہ غتربود کر دیا تھا۔ بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کی وفاداری کا یہ ثبوت ہمارے مذہبی رویے میں بھی نمایاں ہے۔ ہم خدا اور اسلام کی حفاظت اسی شدومد سے کرتے ہیں اور اس خود ساختہ ٹھیکیداری میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے نعوذ باللہ یہ دونوں ہمارے محتاج ہیں اور ذرا ہمارے ہاتھ سے ان کی انگلی چھوٹی تو یہ اس دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔"

اداکار وحید مراد کی موت پر اپنے کالم میں ان کی یہ سنجیدگی موت و زیست کی بحث میں کچھ اور گمبھیر ہو گئی ہے۔

"زندگی کے اسی مدوجزر اور وقت کے اس جھولے میں ہر چکر کے ساتھ انسانی زندگیوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں ہر چیز ہر لمحے تغیر پذیر ہے۔ وقت ایک دریا کی طرح رواں دواں ہے یا اس پل کی طرح مستقل اور قائم بالذات جس کے نیچے سے پانی گزرتا ہے۔ شاید پل اور دریا دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں اور شاید کچھ چیزیں ان دونوں کے علاوہ بھی ہیں۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے دنیا بھر کے سیانے آج تک حل نہیں کر سکے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مگر یہ سارے سوال تو زندگی کے اسی سمندر کے بارے میں ہیں جس میں افراد کی زندگیاں جزیروں کی طرح بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور جزیرہ چاہے کتنا بڑا یا کتنا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس کا اپنا وجود ہوتا ہے۔ تاریخ جغرافیہ ہوتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کائناتی وقت کے تناظر میں اس جزیرے کی زندگی بلبلے کی طرح بے حقیقت ہو لیکن وقت کی جس تقویم میں ہم آپ زندہ رہتے ہیں۔ اس میں تو بعض اوقات ایک ایک لمحہ صدیوں پر پھیل جاتا ہے۔ سو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم خس و خاشاک کی طرح آوارہ گزر گاہوں کا بوجھ بن کر ابد کی خزاں کا رزق بن جائیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں ہمیں جینا ہے، طوعاً و کرہاً نہیں، عالم جبر میں نہیں بلکہ اس طرح جیسے زندہ رہنے کا حق ہے۔

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بہادر کی طرح لڑتے اور مسکراتے ہوئے۔"

اب آپ یہ دیکھئے کہ ایک ایسے اداکار کی موت پر جو سالہا سال تک تماشائیوں کی آنکھ کا تارا رہا ہو اور جو اسی احساس کی حالت میں مرا ہو کہ اسے بیچ محفل سے اٹھا دیئے جانے کا قلق ہو۔ اس کی موت زندگی کو کتنی بے حقیقت اور اس سارے کاروبار کو کتنا بے معنی بنا دیتی ہے۔ امجد کے لئے یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ اس موضوع کے حوالے سے آہوں اور کراہوں کا طوفان اٹھا دیتے کہ یہ ہمارے قنوطی مزاج کو راس بھی آتا تھا۔ لیکن ایک اچھے کالم نگار کی حیثیت سے انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو تصویر کا روشن رُخ دکھایا اور یہ کہہ کر انہیں اُمید دلائی کہ "زندگی کے ہر روپ سے خود زندگی کو کشید کرتے رہنا چاہیئے۔ دھوپ اور چھاؤں کو ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ تسلسل سمجھنا چاہیئے۔" میں مبالغہ آمیزی سے ڈرتا ہوں۔ لوگ تعریف میں بھی مبالغہ کرتے ہیں اور تعریف کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں بھی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن میں نہایت احتیاط سے کہنا چاہتا ہوں کہ امجد کی کالمانہ سطروں میں فکر کی زیریں رو دوڑتی رہتی ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں پر غور کرتے رہتے ہیں اور جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ پوری زندگی کو آج تک سمجھا کون ہے، اس سے اپنے کلیے اور اصول وضع کرتے رہتے ہیں۔ جن کی جھلکیاں ان کے کالموں میں جابجا بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ان جھلکیوں میں امجد کا تخلیقی جوہر پورے آب و تاب سے نمایاں ہوتا ہے۔ کہیں ان کے جملے کاٹ دار ہوتے ہیں، کہیں ان کے پیراگراف میں ادبی حسن جلوہ گر ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو ان کا اوّلین رشتہ تو ادب ہی سے ہے۔

امجد کے کالموں میں اشعار اور لطائف کا حوالہ بکثرت ہے۔ وہ اپنے ہر کالم کو شعروں اور لطیفوں سے سجاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اکثر اشعار نہایت برمحل ہوتے ہیں۔ نثر میں شعروں کا اندراج غالباً اسی لئے ہے کہ امجد خود شاعر ہیں اور چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کالم میں اس کثرت سے لطائف ڈالنے کی کیا وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ بھی عطا سے دوستی ہو۔ جس طرح عطا الحق قاسمی اپنے کالموں میں ہنسنے ہنسانے کے لئے لطائف کو ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کم و بیش وہی طریقہ امجد نے اپنے لئے بھی اختیار کیا ہے۔ عطا کے کالموں میں تو لطائف اس لئے کھپ جاتے ہیں کہ وہ لطیفوں کا اطلاق نہایت خوبصورتی سے عصر حاضر کی کسی حقیقت پر کرتے ہیں جس سے نہ صرف لطیفہ بلکہ وہ حقیقت بھی معنی خیز ہو جاتی ہے لیکن لطائف کے استعمال میں خرابی یہ ہے کہ جب ان حضرات کے کالم کبھی غیر دلچسپ محسوس ہونے لگیں تو لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید لطیفوں کی کوئی تازہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے۔

امجد کے کالموں میں ایسے کالم بھی خاصے ہیں جس میں انہوں نے ایک ہی کالم میں ایک سے زائد موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ کالم نگار حضرات یہ طریقہ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب ان کے پاس لکھنے کے لئے موضوع نہ ہو یا جس موضوع پر وہ قلم اٹھا رہے ہوں اس میں پورے کالم کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ ہو۔ فی نفسہٖ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ کالم نگار نے اس موضوع کو برتا کس طرح ہے۔ امجد جب کسی کالم میں ایک سے زائد موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان مختلف موضوعات میں وہ ایک داخلی ربط بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ایک ہی احساس میں گندھے نظر آتے ہیں اور یہ متفرق موضوعات یکجان ہو

جاتے ہیں۔ ان کے ایسے کالموں میں "کتاب، ٹیلی فون اور داغ دہلوی" سب سے اچھی مثال ہے۔ جس میں انہوں نے بچوں کی نصابی کتابوں کے مہنگے دام، ٹیلی فون کے بلوں میں زیادتی اور بیتھوون اور شیلی کے کیے ہوئے داغ دہلوی کی شاعری کے انگریزی تراجم کو بیک وقت موضوع بنایا ہے۔ بظاہر ان موضوعات کا آپس میں کوئی تال میل نہیں لیکن امجد نے ان موضوعات کو برتنے میں کالم کا لہجہ کچھ ایسا دوستانہ اور بے تکلفانہ رکھا ہے جیسے آپ اپنے ڈرائنگ روم میں اپنے کسی دوست سے بات چیت کے دوران حالاتِ حاضرہ کا رونا روتے ہیں اور اس ایک گفتگو میں کتنے ہی موضوعات در آتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی بازیابی سے لے کر محلے کے خراب سیوریج سسٹم تک ہر ایک پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور گفتگو کا مجموعی موڈ اور تاثر کہیں غیر متوازن نہیں ہوتا۔ ایک اچھے کالم میں کالم نگار یہی طریقۂ کار اختیار کرتا ہے۔

امجد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تعلقاتِ عامہ کے آدمی ہیں، خاص طور پر سرکاری افسروں سے وہ مراسم سازی پر خاص توجہ دیتے ہیں، ان کے متعلق یہ رائے اتنی مستحکم اور عام ہے کہ میں اس سے اختلاف کی جراٴت نہیں کر سکتا۔ تعلقاتِ عامہ کے آدمی میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ سچا نہیں ہوتا۔ اس کے سچ پر بھی مصلحت کی ملمع کاری ہوتی ہے۔ روزمرہ کے معاملات میں امجد کا رویہ جیسا بھی ہو لیکن ان کے کالموں کی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی تحریریں بے لاگ ہوتی ہیں۔ وہ بیوروکریسی پر بھی کھل کر تنقید کرتے ہیں اور اپنے بزرگ ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں اعلانیہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اشفاق احمد اور صادقین سے ان کی نیازمندی ڈھکی چھپی نہیں لیکن دیکھئے ان کے متعلق امجد کی رائے کیسی کھری ہے۔

> اشفاق صاحب کی دنیاداری اور صادقین کی بے نیازی اصل میں دونوں ایک ہیں کہ اس عہد میں کتنا بھی سچا فنکار ہو اسے لوگوں کی نظروں میں رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی سوانگ بھرنا پڑتا ہے۔ یہ دور دکان میں رکھے ہوئے مال سے زیادہ اس کے نیون سائن کو دیکھتا ہے۔ خالص اور کھرا مال بھی نمائش اور پبلسٹی کے بغیر نہیں بکتا۔

امجد کے کالموں میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ فی الوقت میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور امجد کو ان کی نئی کتاب پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

("چشمِ تماشا" کی تقریب رونمائی منعقدہ آرٹس کونسل کراچی میں پڑھا گیا)

طاہر مسعود

خشک سمندر کی تھکان (افسانے) — قیمت:۔ ۴۰ روپے

مصنف:۔ طاہر اسلم گورا — ناشر:۔ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۲۵ لوئر مال لاہور

"خشک سمندر کی تھکان" نوجوان افسانہ نگار طاہر اسلم گورا کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ان کے فنی سفر میں ارتقاء کا غماز ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سفر آخر سفر ہے" کے نام سے شائع ہوا تھا تو نقاد

فن نے اسے جدید افسانوی ادب میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا تھا۔ "سفر آخر سفر ہے" کے افسانے اپنے اندر جہاں کہانی پن کے بھرپور رویے اور قاری کے لئے دلچسپی کے جملہ عناصر لیے ہوئے تھے، وہاں ان میں کائناتی حسن اور انسانی فطرت کے محاسن کی ایسی خوشبو بھی رچی بسی ہے جو قاری کو اس پُربہار فضا میں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ ان کے افسانے تکنیکی تجربے کی زد میں آکر اپنے اندر کے کہانی پن اور کردار نگاری کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

زیرِ نظر مجموعہ جو اپنے اندر خاصا زمانی خلا لیے آیا ہے چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی طاہر اسلم گورا کی تاثر نگاری ہے۔ جہاں ان کے افسانے ادبی دنیا میں لکھے جانے والے تاثراتی افسانوں کے معیار پر پورا اترتے ہیں، وہاں وہ اپنے اندر کہانی پن کے رچاؤ، کردار نگاری اور ماحولیاتی سحر بیانی کے ذریعے قاری کی حسیاتی جبلت کو جملہ لوازمات فراہم کر کے اس کے ذہن کو برقی جھٹکے کی صورت جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ "خشک سمندر کی تھکان" میں موجود افسانے اپنے اسلوبِ بیان، رومانی مزاج، جمالیاتی احساسات اور ذاتی تاثرات کے ذریعے اپنی علیحدہ شناخت لیے ہوتے ہیں۔ انشائے لطیف میں اپنے تاثرات کا کھلا اظہار، ان کا اپنی ذات پر مکمل اعتماد کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کردار نگاری میں جہاں بابا سوٹی، اماں بلیاں والی، اور "اپنی اپنی ذات کے دیو کار ڈز" جیسے خوبصورت افسانے ہیں، وہاں "صرف شرمیلی دھوپ گوڑھے بادلوں میں" اور "دھنسے شیشوں میں ستارے" جیسے تاثراتی شاہکار بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ "روشن نہر" جیسا افسانہ لکھ کر طاہر اسلم گورا نے تاریخ اور جغرافیے سے اپنی گہری وابستگی کا بین السطور اظہار فراہم کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جا بجا گلی محلوں، مزاروں، جلسہ گاہوں، ثقافتی اور تہذیبی تہواروں کا روپ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو جزئیات نگاری کے ذریعے جس خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، وہ قاری سے ان کے رابطے کا پتہ دیتی ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ طاہر اسلم گورا کا لہجہ ایک منفرد حوالے کی صورت میں زندہ رہے گا اور پڑھنے والے اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

زاہد حسن

شعلۂ مستعجل (تذکرہ)

قیمت :- ۵۰ روپے

مرتب :- اکرم رانا

ناشر :- مکتبہ کارواں کچہری بازار لاہور

"شعلۂ مستعجل" ایک مجاہد اور اس کے متوسلین کا متنوع تذکرہ ہے۔ چوہدری عبدالحمید اردو کتابوں کے ناشرین میں نیکی اور شرافت کی ایک مثال سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے تھے — عبدالحسیب — وہ پاکستان ایئر فورس میں فلائٹ لفٹیننٹ تھے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے مگر اپریل ۱۹۷۴ء میں ان کا طیارہ کریش ہوا اور وہ ۲۴ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اکرم رانا نے عبدالحسیب کے حوالے سے جہاں اس ذہین اور ایثار پیشہ نوجوان کے حالات اور اس کی موت پر تعزیت کے پیغامات اور نوحوں کو یکجا کر دیا ہے، وہیں مرحوم کے محترم نانا اور ایک معروف سیاست دان میاں عبدالباری، نیز مرحوم کے والد گرامی چوہدری عبدالحمید کے بارے میں بھی جتنا مواد جمع ہو سکتا تھا وہ مرتب کر دیا ہے۔ یوں نوجوان عبدالحسیب کی شخصیت پوری

تفصیل کے ساتھ ایک بھرپور پس منظر میں اُجاگر ہوتی ہے، اور پڑھنے والوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ خاص طور سے نوجوان پڑھنے والوں کو اس کتاب کے مطالعے سے ہمت و استقامت کا جذبہ حاصل ہوتا ہے اور ان کے دل و دماغ کے بہت سے دھندلے گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔

تعزیت ناموں کے حصے میں مرتب نے جہاں مختلف حضرات کی طرف سے چودھری عبدالحمید کے ساتھ اظہارِ عقیدت و محبت اور غمگساری کے خطوط و پیغامات جمع کئے ہیں وہیں منظوم خراجِ عقیدت کے ضمن میں انہوں نے فارسی اور اردو کے معروف اساتذۂ فن کے وہ نوحے بھی یک جا کر دیئے ہیں جو ایسے ہی المیوں سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ یوں یہ کتاب محض ایک نوجوان مجاہد کی روداد نہیں ہے بلکہ جواں مرگی کے موضوع پر بڑے بڑے لوگوں کی تحریروں کا مجموعہ بھی ہے۔ یہاں ہمیں کسی فارسی شاعر کے ایک نوحے کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو چودھری عبدالحمید صاحب کی نذر ہے۔

چون عزمِ سفر کردی و رفتی زبرِ ما
بستی کمرِ خویش، شکستی کمرِ ما

احمد ندیم قاسمی

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان نے اپنے قیام ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے ۱۵ سالوں کے قلیل عرصہ میں جس تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی کام کو متعارف کرایا ہے وہ کسی بھی دانش گاہ کی ساخت اور تعمیر کے لیے ایک مضبوط اساس مہیا کرتا ہے۔ اس عرصہ میں یونیورسٹی کے کیمپس کی تعمیر و ترقی، جدید علوم سے متعلقہ کلاسوں کا اجراء اور اشاعت و طباعت کے لیے کئی نادر کتب کے تراجم اور تحقیقی مجلے، نیوز بلیٹن اور میگزین جیسے شمارے اس کے علمی، تہذیبی کام کے عکاس ہیں

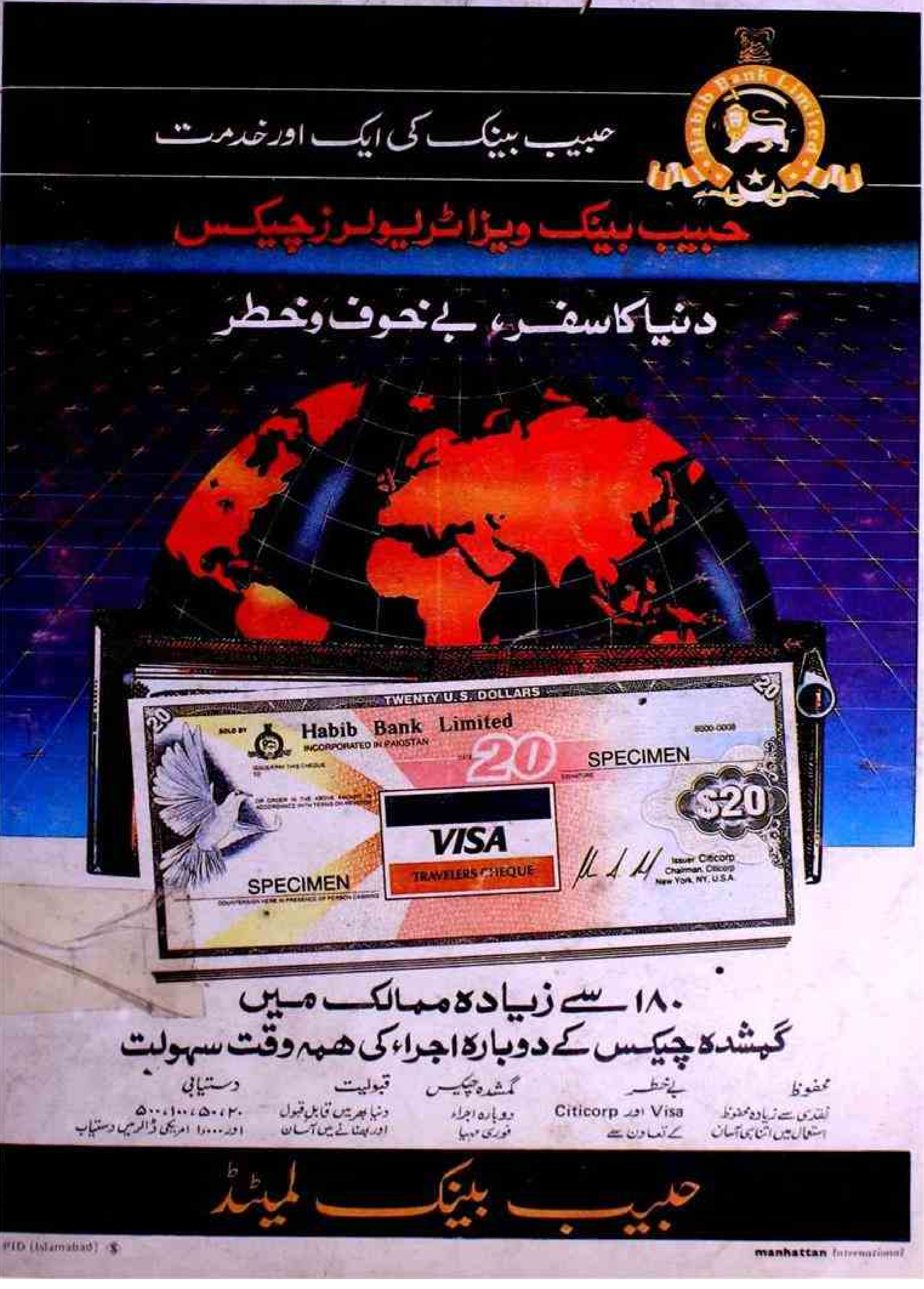
یہ انہی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ ملتان اور ڈیرہ غازی خاں جیسے پسماندہ خطوں میں علم و آگہی کے چراغ فروزاں ہوئے ہیں۔ ایک خوشگوار پُر امن تعلیمی فضا میں تحقیق اور تخلیق کے اسباب پیدا ہوئے ہیں۔

یونیورسٹی کے ادارہ تالیف و ترجمہ نے باوجود اپنے محدود وسائل کے درج ذیل کتب کی طباعت کا کام مکمل کیا ہے جسے اہل نظر اور اہل تجربہ نے بے حد سراہا ہے۔ علاوہ ازیں اس ادارے نے مرکز اردو سائنس بورڈ لاہور، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، بٹرورتھس لندن جیسے اداروں سے علمی روابط کو فروغ دیا ہے اور تصنیف و تالیف کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	تفصیل
۱	ارمغانِ حق جلد اول	۵۰/= روپے	مختلف زبانوں میں سیرتِ رسولِ مقبول پر شائع ہونے والی تحریروں کا مکمل اشاریہ۔
۲	ارمغانِ حق جلد دوم	۷۵/= روپے	" " " "
۳	لیکچر آن علامہ محمد اقبالؒ (انگریزی)	۱۰/= روپے	علامہ محمد اقبال کے افکار و خیالات پر معروف سکالر پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل کے لیکچر
۴	اقبالؒ اور قائداعظمؒ	۲۰/= روپے	علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں دانشوروں کی مستند تحریروں اور خطبات کا مجموعہ۔
۵	مبادیاتِ برقی کیمیا (مجلد)	۱۰۰/= روپے	ایلیمنٹری الیکٹرو کیمسٹری،
	(غیر مجلد)	۷۵/= روپے	اے۔ آر ڈینارو کی تصنیف کا عام فہم اردو ترجمہ
۶	اساسیاتِ نظری کیمیا (مجلد)	۵۰/= روپے	کوانٹم کیمسٹری پر پروفیسر
	(غیر مجلد)	۴۰/= روپے	اے۔ آر ڈینارو کی کتاب کا اردو ترجمہ
۷	ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ	۲۰۰/= روپے	ڈاکٹر روبینہ ترین کی تحقیق
۸	تحریکِ آزادی کے دس سال		دفتر تعلقاتِ عامہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
۹	ارشاداتِ قائداعظمؒ		" " " "
۱۰	تاریخ و ثقافت		" " " "
۱۱	PAKISTAN " The Ideological Dimension		" " " "
۱۲	Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, " A Negotiator of the Highest Order"		" " "

کریم ملک ڈپٹی رجسٹرار، طباعت و تعلقاتِ عامہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز ۱۸۷ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۶/۳۹ مال چیمبرز ٹولنٹن مال لاہور سے شائع کیا


حبیب بینک کی ایک اور خدمت
حبیب بینک ویزا ٹریولرز چیکس
دنیا کا سفر، بے خوف و خطر
TWENTY U.S. DOLLARS
Habib Bank Limited
INCORPORATED IN PAKISTAN
20
SPECIMEN
$20
VISA
TRAVELERS CHEQUE
SPECIMEN
Issuer Citicorp
Chairman, Citicorp
New York, NY, U.S.A.
۱۸۰ سے زیادہ ممالک میں
گمشدہ چیکس کے دوبارہ اجراء کی ہمہ وقت سہولت
محفوظ
نقدی سے زیادہ محفوظ
استعمال میں اتنا ہی آسان
بے خطر
Visa اور Citicorp
کے تعاون سے
گمشدہ چیکس
دوبارہ اجراء
فوری مہیا
قبولیت
دنیا بھر میں قابل قبول
اور بھنانے میں آسان
دستیابی
۲۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰
اور ۱۰۰۰ امریکی ڈالر میں دستیاب
حبیب بینک لمیٹڈ
PID (Islamabad)
manhattan International